

# سلطان محبوب

کتابخانه



## سلطان ٹیپو شہید

جنوبی ہند (بھارت) کے اس شہید وطن کی خون فشاں داستان جو برصغیر کی تاریخ میں ایک ایسا خونچکاں باب رقم کر گیا جو تا ابہ منور رہے گا۔

سلطنتِ خداداد میسور کو جسے نواب حیدر علی نے اسلامی سلطنت بنائے پیکر میں ڈھالا اور مسلمانوں کے اس تاج کو قائم رکھنے کے لیے نذرانہ بیاں پیش کیا۔

بنگال کے سراج الدولہ اور دکن کے سلطان شہید مسلمانوں کی آزادی کے لیے سنگ میل ہیں جن پر چلتے ہوئے ہم نے پاکستان حاصل کیا۔

الماس، ایم۔ اے





جنوبی بھارت میں بنگلور سے شمال مشرق کی جانب بائیس میل کے فاصلے پر وہ خوش نصیب  
 مہاراجہ کی بیوی جس کی سر زمین کو عظیم حکمران نواب حیدر علی خاں کے عظیم بیٹے ابوالفتح  
 علی شاہان پٹو کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہوا۔

۱۷۲۳ھ مطابق ۱۷۵۲ء پہلی ساعت میں سالم وجود  
 میں آیا۔

سلطان کی پیدائش قلعہ کے باہر ایک مکان میں ہوئی تھی۔ اب وہ مکان موجود نہیں البتہ  
 ایک بوتل ہے جس پر ایک گنبد لگا ہے جو سلطان کی تاریخ پیدائش بتاتا ہے۔ اس جگہ سے  
 لے کر اگر ایک چار دیواری میں گھسنی گئی ہے۔

سلطان ٹیپو کی پیدائش بڑے عجیب و غریب حالات میں ہوئی تھی۔ ان کے جلیل القدر  
 والد نواب حیدر علی خاں نے دو شادیاں کیں۔ حیدر علی کی عمر جب انیس سال کی تھی تو میسور کے  
 دیرینہ راجہ نے ان کی شادی اپنے خیرچ پر پیرزادہ شاہ میاں ساکن سرائی لڑکی سے کرا  
 لی۔ ان کی اس بیوی سے ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ اس کے بعد وہ بیوی معذور ہو گئی۔

کچھ دنوں بعد معذور بیوی نے خود حیدر علی کو مجبور کر دیا کہ وہ دوسری شادی کر لیں۔  
 اہل میسور نے دوسری شادی میر رضا علی خاں کی ہمشیرہ فاطمہ بیگم عرف غزالہ سے کی۔  
 معذور بیوی نے دوسری شادی کی اجازت اس وجہ سے دی تھی کہ دوسری بیوی کے بطن

سے حیدر علی کے اولاد زرمینہ پیدا ہونا کہ ان کی نسل برقرار ہے۔

حیدر علی خاں نے بھی دوسری شادی اسی لالچ میں کی تھی کہ انہیں نئی بیوی سے بیٹا حاصل ہوگا مگر ان کی بہرادر پوری ہوئی دکھائی نہ دے رہی تھی اور چھ سات سال گزرنے کے باوجود ان کا خاندان اقبال اس وقت مقصود سے خالی تھا جسے لڑکا کہتے ہیں۔

انہی دنوں فاطمہ بیگم کی کسی سہیلی نے اسے ٹیپوستان کا بہتہ بنایا اور ترغیب دی کہ ان کے مزار پر جا کر دعا مانگے تو کیا عجیب اے اولاد حاصل ہو۔

فاطمہ کے دل میں سہیلی کی بات لگ گئی۔ اس نے اس کا تذکرہ شوہر سے اس قدر شدت سے کیا کہ حیدر علی بیوی کو لے کر اسی وقت ٹیپوستان کے مزار کی طرف چل پڑے۔ یہ مزار ارکاٹ میں تھا۔

دونوں میان بیوی دہاں پہنچے اور ٹیپوستان کی وساطت سے بارگاہ ایزدی میں دعا مانگی۔ یہ دعا مستعمل ہو کر ادراج حسب منت، بچہ پیدا ہوا تو اس کا نام ٹیپوستان کے آپر ابوالفتح فتح علی ٹیپو سلطان رکھا گیا۔

ٹیپو سلطان کی بدلتش نے جیسے حیدر علی کی قسمت کھول دی۔ ایک ہی سال کے اندر وہ ترقی کے ڈنڈے لگیں گے گورنر ہو گئے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسے زور بازو کا مالک بنا دیا کہ ریاستوں اور بادشاہتوں کی قسمیں ان کے اشاروں کی محتاج ہونے لگیں۔

آئندہ چند برسوں میں ایسا ہوا کہ ۳۳ دیہات پر مشتمل ریاست میسور، دریائے کرشنا کے جنوب میں پورے جنوبی ہند پر محیط ہو گئی اور اس نے ریاست سے ایک عظیم مملکت کا روپ دھار لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ارکاٹ (والاجہ محمد علی) اور نظام دکن جو منبولا اسلامی ریاستیں تھیں، وہ کبھی تو سلطنت میسور کی طرف دوستی کا ہاتھ بٹھائیں اور کبھی میسور کی مضبوط جڑیں اکھاڑنے میں لگ پڑیں۔

اپنوں کے علاوہ غیروں یعنی انگریزوں، فرانسیسوں، دہندریوں اور مرہٹوں کو بھی حیدر علی سے پرغاش ہو گئی اور وہ تیزی سے بڑھتی ہوئی اس طاقت سے گھٹا ہٹ رہنے لگے۔

ایسی مشنوں مرادوں سے پیدا کرنے والے بچے کی تعلیم و تربیت کے لیے حیدر علی خاں نے کیسے کیسے علی استاد اور ماہرین فن مقرر کیے ہوں گے۔ پانچ سال کی عمر سے شہزادہ ٹیپو نے

فارسی زبان میں تعلیم حاصل کرنا شروع کی۔ ساتھ ساتھ انہیں جہان بینی اور جہانگیری سکھانے کے لیے بھی اعلیٰ پیمانے پر انتظامات کیے گئے۔

عجیب بات یہ تھی کہ سلطان ٹیپو کو انداز ہی سے "سبب دہلم" سے تقریباً یکساں طور پر دلچسپی تھی۔ پندرہ سولہ سال کی عمر میں شہزادہ ٹیپو ہیں ایک مکمل شہسوار اور دوسرے فنون جنگ میں ماہر سپاہی نظر آتا ہے۔ بلکہ اس سے صحت پختہ یعنی گیارہ سال کی عمر میں شہزادہ ہیں بدلتش کے میدان جنگ میں باپ کے ساتھ کھڑا دکھائی دیتا ہے۔

شہزادہ ٹیپو کے بچپن کے حالات میں سب سے دلچسپ اور حیرت انگیز وہ واقعہ ہے کہ جب ایک روز وہ سرنگاچیم کی ایک لگی میں ہم عمر بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا تو دھڑ سے ایک فقیر روشن ضمیر کا گزر ہوا۔

اس وقت سلطان ٹیپو کے والد حیدر علی راجہ میسور کی فوج میں محض ایک ناٹک کا حیثیت سے ملازم تھے اور زرمینہ تھے۔

فقیر روشن ضمیر نے ٹیپو سلطان کے پاس رک کر اس سے کہا: "تیری خوش نصیبی ایک دن تجھے اس ملک کا بادشاہ بنائے گی۔ جب وہ وقت آئے تو اس جگہ آبد۔ ایسی مسجد تعمیر کرنا جو زمانے میں تیری یادگار رہے۔"

ذہن شہزادے نے مسکراتے ہوئے بزرگ کو جواب دیا تھا: "جب میں بادشاہ ہوں گا تو ایسا ضرور کروں گا۔"

ایک بچے کا یہ یقین کتنی قدر تعجب خیز ہے کہ اس وقت اس کا باپ حیدر علی خاں راجہ میسور کا معتوب ہو کر میدان جنگ میں کھانڈے راڈ سے اپنی آخری بازی کھیل رہا تھا۔ اس کی ماں اور دوسرے اعزاق قلعہ میں امیر تھے مگر بچہ پر یقین انداز میں کہہ رہا تھا کہ فقیر روشن ضمیر کی پیش گوئی کی یقیناً تعمیل ہوگی۔

بچہ زمانے نے دیکھا کہ شہزادہ ٹیپو واقعی سلطان بنا اور اس نے اسی جگہ ایک عالیشان مسجد تعمیر کرائی جس جگہ کھڑے ہو کر فقیر روشن ضمیر پیش گوئی کی تھی اور شہزادے نے اس کے پورا کرنے کا عہد کیا تھا۔

ٹیپو سلطان کی بنائی ہوئی اس مسجد کا نام "مسجد علی" ہے جو آج بھی سرنگاچیم میں اس کی عظمت اور شہادت کی یاد دلاتی ہے۔



شہزادہ پندرہ سال کی عمر میں باقاعدہ طور پر حیدری نوج میں شامل ہو کر ایک ہلور سپاہی کی طرح واد شجاعیت دینے لگا تھا۔

پھر دو ہی سال کے اندر اس نے اپنی صلاحیتوں کا لوہا دوست اور دشمن سے منوایا اور حیدر علی نے جو ان سال بیٹے کو ایک جنرل کی طرح فوجوں کی علیحدہ کمان سپرد کر دی تھی۔

شہزادہ شیو کے تمام جنگی کارنامے جو اس نے اپنے والد نواب حیدر علی خاں کی حیات میں سرانجام دیے، ان کا حال اب کچھ اقساط میں ملاحظہ فرما چکے ہیں مگر یہاں دوبارہ سلسلہ قائم کرنے کے لیے ان کا اجمالاً ذکر کیا جا رہا ہے۔ (تفصیل کے لیے ہماری کتاب حیدر علی ملاحظہ کیجیے)

۱۷۷۴ء میں جب شہزادے کی عمر صرف اکیس سال تھی، حیدر علی خاں نے اسے آٹھ ہزار سوار بوجش پوشش اور بائیس توپوں کے ساتھ مرہٹہ سردار ترک راڈ کے مقابلہ پر روانہ کیا۔ شہزادہ پائیس گھاٹ پیسج کے میدان کا دیری میں خیمہ زن ہوا۔

اس وقت جاسوسوں نے اطلاع دی کہ مرہٹہ فوج دھرم پوری کو لوٹ رہی ہے اور اس کے ہمراہ دوسری آبادیوں کا وٹا ہوا سامان اونٹوں، بیلوں اور گائیکوں پر لدا ہوا بھی موجود ہے۔

شہزادے نے اپنی فوج کے چند دستوں کو مرہٹی لباس پہنوائے اور خود بھی مرہٹہ لباس پہن کے ان دستوں کو ساتھ لے کر دھرم پوری پہنچا۔ مرہٹہ فوج نے یہ سمجھتے ہوئے کہ یہ بھی مرہٹہ فوج کا حصہ ہیں، ان پر کوئی توجہ نہ دی۔

جب لوٹ مار ختم ہوئی اور سامان جانوروں پر بار کیا جانے لگا تو شہزادے نے مخصوص انداز اور آواز میں حکم کا حکم دے دیا۔

اس حکم کے ساتھ ہی شہزادے کے سپاہیوں نے مرہٹوں پر گولیاں برسانا شروع کر دیں۔ مرہٹے اس اچانک حملے سے ایسا گھبراتے کہ بے حواس ہو کر در تمام سامان چھوڑ کے بھاگ کھڑے ہوئے۔

وہ بھاگتے جا رہے تھے۔

اور گولیاں ان کا غائب کر رہی تھیں۔

اس طرح شہزادے کی حکمت علی کے طفیل سینکڑوں مرہٹے قتل ہوئے۔ شہزادے کو اس ہم میں چار ہزار گھوڑے، سینکڑوں بیل، اونٹ اور بیس گاتھی بھی ہاتھ آئے جن پر لوٹ کا سامان لدا ہوا تھا۔ شہزادہ یہ سامان و اسباب لے کر محلے گاڑی کی طرف واپس ہوا۔

اس جنگ میں ایک اور واقعہ پیش آیا جس میں شہزادے نے فراست اور شہر زنی کے جوہر دکھائے۔

شہزادہ دریائے ماگری درگ کے کنارے خیمہ زن تھا۔ اس کے ساتھ چھ ہزار سوار تین ہزار شتر سوار اور تین ہزار سواروں کے علاوہ توپ خانہ بھی تھا۔

ادھر دریائے رائے جی کے کنارے مرہٹوں کا رسد کا قافلہ آ کر ٹھہرا جس میں ۸۰۰ ہاتھی، اونٹ اور بیل وغیرہ تھے۔ ان سب پر سامان رسد بار تھا۔ اس قافلہ کی حفاظت پیدوس ہزار سوار ماورے تھے۔

شہزادے کو خبر ملی تو اس نے قافلہ پر شب خون مارا۔ رات بھر جنگ ہوتی رہی اور شہزادے کا لشکر مرہٹوں کا قتل عام کرتا رہا۔

صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ تمام مرہٹہ لشکر قتل ہو چکا ہے۔ صرف چند گنتی کے افراد جان بچا کر بھاگ سکے تھے۔

شہزادے نے تمام سامان رسد اور بہت سا اسلحہ جو اس قافلہ سے حاصل ہوا، فی الفور مرزا پیم روانہ کر دیا۔

۱۷۶۷ء کی میسوری پہلی جنگ میں شہزادہ شیو نے ایک اور معرکہ مارا۔

حیدر علی خاں نے شہزادے کو سات ہزار کا لشکر دے کر "نکر" کی طرف روانہ کیا جہاں انگریز لشکر مقیم تھا۔

شہزادہ بندر گاہ کو ڈیال پہنچا جہاں انگریزوں کے کئی جہاز ان کی مدد کو موجود تھے۔ قلعہ پر بھی انگریزوں کا قبضہ تھا اور قلعہ سے ساحل سمندر تک انگریزوں کا لشکر پھیلا ہوا تھا۔

شہزادے نے فوراً حملے کی نادرانی نہیں کی بلکہ باپ کو اطلاع دی کہ دشمن کا لشکر بے شمار ہے، قلعہ سے ساحل سمندر تک پھیلا ہوا ہے۔ اب کیا حکم ہے؟

حیدر علی اس مراسلہ کے جواب میں خود ملک لے کر پہنچ گئے۔ پھر شہزادے کو قلعہ پر حملہ کا حکم دیا۔

شہزادے نے ایسا طوفانی حملہ کیا کہ انگریزوں کو قلعہ چھوڑ کر جہازوں میں پناہ لینی پڑی۔ شہزادے نے دشمن کو ساحل پر بھی نہ ٹھہرنے دیا اور آخر کار انگریز اپنے بحری جہاز لے کر ماٹ کھڑے ہوئے۔

انام دکن اور انگریزوں سے کئی جنگوں میں الجھنا پڑ گیا۔ ان تمام جنگوں میں نو عمر شہزادہ بیوان نے ہر کاب تھا۔

پہلے قلعہ گتھی فتح ہوا۔ پھر قلعہ چقل درگ، علائقہ کڑپہ اور کئی کوٹہ سلطنتِ خدا داد میسور میں شامل کیے گئے۔

میسور کی دوسری جنگ وہ آخری جنگ تھی جس میں شہزادے نے اپنے باپ کے ماتے میں جو ہر شمشیر دکھائے۔

اس جنگ میں حیدر علی کو انگریزوں کے دہڑے جرنیلوں، کرنل ہیلی اور جنرل کوٹس سے مقابلہ کرنا پڑا۔

حیدر علی لشکر نے کرنل ہیلی کو جو شکست دی اس میں شہزادے بیو کی بہادری اور کارگزاری سب سے زیادہ دخل تھا۔

انگریزوں کا دوسرا جنرل سر آرم کوٹ انتہائی تجربہ کار جنرل تھا۔ اس نے ایک بار حیدر علی کو شکست بھی دی تھی مگر جس وقت محمود بندر پر لڑائی ہو رہی تھی تو حیدر علی خاں نے اپنی فوجوں کی کمان شہزادہ بیو کے سپرد کر دی تھی۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شہزادہ کس درجہ فوجی جنگ میں ماہر ہو گیا تھا!

ابھی میسور کی دوسری جنگ ختم نہ ہوئی تھی کہ شہزادے کا عظیم باپ نواب حیدر علی خاں اس دنیا سے رخصت ہو گیا۔

حیدر علی خاں کی موت اچانک نہیں ہوئی تھی۔ پچھلے چھ سات سال سے وہ سرطان کے موزی میں مبتلا تھے۔ ہر سال ان کی پیٹھ پر سرطان کا زہر پلا چھوڑا لگتا جس کا زہر لہڑائی کے ساتھ نکال دیا جاتا اور نواب بہادر آرام کرنے کے بجائے پھر گھوڑے کی پشت پر نظر آتے۔

۱۸۰۸ء میں دھیرے دھیرے ان کی طرف بڑھتی رہی۔ ۱۸۰۲ء کے آخری دنوں میں وہ بے حد کمزور ہوئے تھے مگر آرام کے نام سے جانتے تھے۔

آخر بھان اور مخلصان سلطنتِ خدا داد نے زبان کھولی :  
شایا۔ ہماری جانیں آپ پر تیار۔ اگر مناسب ہو تو شہزادے بیو کو بلا لیجیے اور کاروبار سلطنت ان کے حوالے کر کے مکمل صحت یابی تک آرام فرمائیے۔

معاہدین ایسی درخواستیں کئی بار پیش کر چکے تھے اور وہ دیکھ چکی تھیں لیکن اس بار

انگریزوں کے ساتھ اس پہلی جنگ میں مرہٹے اور نظام الدین انگریزوں کے حلیف تھے اور دکن میسور کے خلاف جگہ جگہ سہاڑ کھول رکھے تھے۔ حیدر علی نے اس وقت شہزادہ بیو کو ایک لشکر دے کر مدراس پر حملہ کے لیے بھیج دیا۔

شہزادے نے مدراس پر ایسا زبردست حملہ کیا کہ انگریز سراسیمہ ہو گئے اور انہیں حیدر علی کی شرائط پر معاہدہ کرنا پڑا۔

اسی سال نوجوان شہزادے نے بحیثیت سپہ سالار کے کڑپہ، کرنول، بلاری، انانگندی اور دھارواڑ پر شکست کھائی اور ان تمام معرکوں میں نصرت و فتح مندی نے اس کے قدم چومے۔ شہزادہ بیو کے ہر معرکہ اور کام میں حیرت اور استعجاب کا ایک پہلو ضرور نظر آتا ہے۔ یہاں تک کہ اس کی شادی بھی ایک حیرت انگیز واقعہ بن گئی۔

جب حیدر علی خاں کو لڑائیوں سے کچھ فرصت ملی تو انہوں نے شہزادہ بیو اور خاندان کے دوسرے شہزادوں اور شہزادیوں کی شادیوں کی طرز و وجہ دی۔

دوسرے شہزادوں اور شہزادیوں کے معاملات تو خوش اسلوبی سے طے ہو گئے مگر شہزادہ بیو کی شادی میں ایک زبردست رخصتہ پیدا ہو گئی۔

حیدر علی خاں جس جگہ شہزادہ بیو کی شادی کرنا چاہتے تھے وہاں ان کے خاندان والے اور خاص کر ان کی بیوی فاطمہ بیگم رہنا منہ نہیں تھیں۔ فاطمہ بیگم اور دیگر خواتین محل نے شہزادے کے لیے خاندان ہی کی ایک لڑکی رقیہ البت لالہ میاں، ہمیشہ برہان الدین، کو پسند کر لیا تھا جبکہ نواب بہادر نے اپنی بیوی کے لیے امام صاحب بخشی نامی لڑکی پسند کیا تھا۔ اس معاملہ پر میاں بیوی میں سخت اختلاف پیدا ہو گیا۔

آخر اس کا حل حیدر علی خاں کی والدہ محترمہ مجیدہ بیگم نے پیش کیا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ شہزادے کی شادی ان دونوں لڑکیوں سے کی جائے جنہیں حیدر علی اور فاطمہ بیگم نے الگ الگ پسند کیا ہے۔

اس طرح ایک ہی رات میں شہزادے کی بارات دوبار چڑھی۔ ایک بار بارات امام صاحب کے گھر گئی اور دوسری بار بارات لالہ میاں کے دولت گھر سے پر پہنچی۔ دونوں لڑکیوں کا شہزادے کے ساتھ عقد ہوا اور دہنیں سیاہ کر تے ہی محل میں آ گئیں۔

نواب بہادر حیدر علی خاں ابھی ان شادیوں سے بمشکل فارغ ہوئے تھے کہ انہیں مرہٹوں

نواب بہادر جاں نثاروں کی بات ٹال نہ سکے اور انھوں نے شہزادے کو لکھا:

”نور چشم راحت جان پدر!“

در صورتی کہ تمہیں اس نواح کے مفیدوں کی تادیب سے  
قرار واقعی اطمینان حاصل ہو تو چشم پدر کو اپنے دیدار راحت آثار  
سے جلد روشن اور منور کرو اور اگر کچھ کمک یا فوج کی احتیاج ہو  
نواس کا حال گزارش کرو۔“

ڈاکٹر درانی نے اپنی کتاب میں حیدر علی خاں کا خط بنام شہزادہ شیو پوری تفصیل سے درج  
کیا ہے۔ اس کی نقل یہاں پیش کرنا ضروری ہے کیونکہ اس خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ  
نواب بہادر نے اس خط کے ذریعے امراد اور مصاحبین کے اصرار پر شہزادے کو تمام اختیارات  
سونپ دیے تھے۔

خط اس طرح ہے:

”اگر تم اس علاقے کی تادیب سے مطمئن ہو چکے ہو تو چشم پدر  
کو اپنے دیدار راحت آثار سے روشن اور منور کرو۔ اس سے  
پہلے پورے معاملات کا جائزہ لے کر دیکھ لو کہ مزید فوج کی ضرورت  
ہے کہ نہیں۔ اگر ضرورت ہو تو اپنی مدد کے لیے اور فوج بلواؤ۔  
ہم تمہیں امور سلطنت کا اختیار جانتے ہیں اس لیے ایک پل کے  
لیے بھی سرکاری کاموں میں تھال اور تغافل نہ برتو۔“

جب شہزادے کو حیدر علی خاں کا یہ خط ملا تو وہ بالاکھاٹ میں انگریزوں کے مقابلہ پر غم  
ٹھونکے کھڑا تھا۔

انگریز لشکر کے سالار ہمبرسٹن اور کرنل روز بیگ تھے۔ دشمن بالاکھاٹ پر قابض تھا۔  
۲۰ نومبر ۱۷۸۲ء کو شہزادے نے ہمبرسٹن پر اس قدر دباؤ ڈالا کہ وہ چیتکھے ہٹنے پر مجبور ہو گیا  
اس طرح پسپا ہوتے ہوتے وہ دریائے پونانی کے کنارے پہنچ گیا۔

وہاں پہنچ کے ہمبرسٹن نے ایک جنگی چال چلی اور شہزادہ شیو کی فوجوں کو گھیرے  
لیے لیا۔

اس وقت شہزادہ شیو کے ساتھ فرانسیسی سردار موسیلا ل بھی تھا۔ ان دونوں نے کوشش

ر کے دشمن کا گھیرا توڑ دیا۔ پھر شہزادہ باپ سے ملنے کے لیے تیار ہوا۔  
اسی دوران اسے باپ کا خط ملا اور ۱۲ دسمبر کو وہ اپنا لشکر لے کر میسور کی طرف  
روانہ ہو گیا۔

یہ بیان کیا جا چکا ہے کہ جب حیدر علی لشکر نے ارکاٹ کا قلعہ فتح کر لیا تو والاباہ محمد علی کے  
نام امراد اور اراکین ریاست گرفتار کر کے حیدر علی کے حضور پیش کیے گئے۔  
ان گرفتار ہونے والوں میں اچنا پڈت، ارشد بیگ خاں، چشتی بابر خاں، اسید حیدر خاں  
بنو نائٹر اور میر صادق علی وغیرہ شامل تھے۔ ان لوگوں نے حیدر علی سے معافی کی درخواست  
کی اور عظمت میسور کے لیے اپنی خدمات پیش کیں۔

حیدر علی نے ان امرایں کو نہیں معاف کیا بلکہ عام معافی کا اعلان کر دیا۔ والاباہ کے ان  
امین میر صادق سب سے زیادہ چالاک، مکار، چرب زبان اور کبیہ پرور تھے۔ میر صادق  
نظام اکبر کے درباری امیر، میر عالم کا بھائی تھا مگر یہ رازم خرد وقت تک کسی کو معلوم نہ ہونے کا  
میر صادق نے حیدر علی پر ایسا روانہ قاز ملا کہ وہ بھی فریب کھا گئے اور انہوں نے اس خفاقی کو  
افسر محمولات بنا دیا۔

حیدر علی کے انتقال کی خبر کو پوسشیدہ رکھا گیا مگر یہ خبر شہزادہ شیو کو ملنے سے پہلے مرگا پٹم  
پہنچ گئی۔ اور وہاں موجود اراکین سلطنت نے شہزادہ شیو کے چھوٹے بھائی کریم صاحب کو  
نائب نشان کر دیا۔

کہتے ہیں کہ یہ قدم مصلحتاً اٹھایا گیا تھا لیکن ایک خیال یہ بھی ہے کہ شہزادہ شیو کے بجائے  
کریم صاحب کو تخت نشین کرانے میں ارکاٹ کے نائب ہونے والے امرجن میں پیش  
پیش میر صادق تھا، کایہ منصوبہ کار فرما تھا کہ ان کے خیال میں شہزادہ شیو پر قابو پانا مشکل تھا  
بہت شہزادہ کریم صاحب ایک کمزور طبیعت کا جوان تھا جس پر آسانی سے قابو لایا جاسکتا تھا۔  
میسور کے اندرونی حالات اتنے خوفناک نہیں تھے جتنا کہ شہزادہ شیو وہاں سے دور بیٹھا  
بگھور میں محسوس کر رہا تھا۔ تاہم کچھ خطرات تھے ضرور۔

مرگا پٹم میں اس کے چھوٹے بھائی کریم صاحب کو تخت نشین کیا جا چکا تھا۔ یہ ایک نڈھال

نہیں تو خطرناک بات ضرور تھی۔

دوسرا خطہ جو زیادہ نمایاں معلوم ہوتا تھا، وہ راجہ میسور کی بغاوت کا امکان تھا، جس کا بیج انگریزوں نے چلے آ رہے تھے۔

میسور کا کاغذی راجہ کرشن راج دوم ۱۷۹۱ء میں آجمنائی ہو گیا تھا۔ اس کی جگہ نواب مرحوم نے اس کے بیٹے نند راج کو گدی نشین کیا۔ وہ بھی ۱۷۷۰ء میں مر گیا تو اس کی جگہ چھوٹے بیٹے چامراج کو راجہ بنایا گیا مگر چھ سال بعد وہ بھی چل بسا۔

ان حالات میں نواب مرحوم اگرچہ تندرست و تیز رو تھا مگر بڑی آسانی سے گدی نشین کر کے اس جھگڑے کو ہمیشہ کے لیے ختم کر سکتے تھے لیکن ان کی جھنڈ نے یہ گوارا نہ کیا اور انہوں نے اسی خاندان کے ایک بڑے کو خاصہ چراج کا نام دے کر راج گدی پر بٹھا دیا جو ایک طویل عرصے تک گدی نشین رہا۔

یہ کہا جاسکتا ہے کہ نواب بہادر نے میسور میں کاغذی راجاؤں کا سلسلہ برقرار رکھ کر اپنی آستین میں سانپ پال رکھے تھے کہ جب ایک مرتا تو وہ فوراً دوسرے کو راجہ بنا دیتے اور یوں مفت میں راجہ بننے والے اور راج محل کی رانیاں ہمیشہ سلطنت خدا داد میسور کی جڑیں کھوکھلی کرنے میں کوشاں رہتے۔ ان کی مسلسل یہ کوشش یہی کہ حیدر علی کو معزول کر کے میسور کے ہندو راجہ کو تخت نشین کیا جائے۔

نواب بہادر کے انتقال کے بعد اس طرح کی ایک زبردست سازش ہوئی تھی جسے "معاہدہ رانا" کا نام دیا گیا۔ اس سازش کا مختصر حال اس طرح ہے:

نواب حیدر علی نے راجہ میسور سے ملکی اور حکومتی تمام اختیارات لے کر اسے محض نانا کا راجہ بنا دیا تو جسے صرف مذہبی رسومات ادا کرنے اور بعض ہندو تہواروں پر نذرین وصول کرنے کے لیے دربار لگانے کی اجازت تھی۔

نواب مرحوم کی وفاداری کی یہ انتہا تھی کہ جب کسی تہوار پر راجہ اپنا دربار سمجھاتا تو اس کے تمام اخراجات خزانہ حیدر علی سے ادا کیے جاتے تھے۔

راجہ کو اگرچہ اخراجات کے لیے ایک بھاری رقم وظیفہ کے طور پر ادا کی جاتی تھی لیکن ایسے درباروں پر راجہ اس قدر رقم خرچ کر دیتا تھا جو اس کے سالانہ وظیفہ سے دس گنا سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔

آپ کے علم میں یہ بات ضرور ہوگی کہ ہندو مذہب میں آٹھ دن تہوار ہوا کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک بڑا تہوار ضرور ہوتا ہے۔ چنانچہ راجہ سال میں کم از کم چار تہواروں پر دربار لگانے کو نواسٹ ضرور کرتا اور نواب بہادر کو اس کے اخراجات برداشت کرنا پڑتے تھے۔

اس سوال صرف کثیر رقم کے خرچ کا ہونا تو بھی اسے برداشت کیا جاسکتا تھا لیکن ایسے اہل میں سلطنت میسور کے علاوہ ہندوستان کے دوسرے علاقوں کے بڑے بڑے ہندو بذاتِ اپو جاٹ کے نام پر بلائے جاتے جو درپردہ راج محل میں خلیفہ اجلاس کرتے جن کو نواب بہادر کو معزول کرنے کے طریقے سوچے جاتے۔

سب سے زیادہ لطف کی بات یہ تھی کہ ان درباروں میں جن کے پس پردہ نواب بہادر کے خلاف سازشیں تیار ہوتی تھیں، ان میں اکثر نواب حیدر علی اپنے تمام اراکین سلطنت کے اہل نفس و فہم نہایت کثرت کرتے اور ایک عام آدمی کی طرح راجہ کے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جاتے اور اسے نذر پیش کرتے تھے۔

لیکن۔

یہ سانپ اور سپہیلے جنہیں نواب بہادر دودھ پلا پلا کے زندہ رکھے ہوئے تھے، نواب کو ہر دم ڈسنے کے لیے آمادہ رہتے۔

اسی طرح ایک تہوار پر راج محل کی رانیاں، مری رنگنا تھ کے مندر کے بڑے پجاری اور ماہر کے گھامیو امندر کے پیشوا نے نواب بہادر کا تختہ الٹنے کی سازش تیار کی۔ اس سازش کا مرکز رانی مل کی بڑی رانی کا گامشتہ ترل راڈ تھا۔

ان سازشیوں کو معلوم تھا کہ اس سے پہلے بھی اس طرح کی کئی سازشیں ہو چکی ہیں جو سب میں موقع پر بے نقاب ہو گئی تھیں اور ان میں حصہ لینے والوں کو موت کا ذائقہ چکھنا پڑا تھا۔ اس لیے انہوں نے آپس میں طے کیا کہ اس مرتبہ وہ اپنی اس سازش میں حیدر علی کے سب سے بڑے دشمن یعنی انگریزوں کو بھی شریک کر دیں گے۔

چنانچہ طے یہ پایا کہ ترل راڈ جیسے بدل کے مدراس جملے گا اور وہاں انگریزوں کی حمایت اور سازش کی تفصیلات طے کرے گا۔

ترل راڈ کسی زمانے میں پونا میں رہ چکا تھا اور اس کے مرہمہ مرداروں سے بھی تعلقات تھے پس ترل راڈ مسلمان کا جیسے بدل کر راج محل سے نکلا اور سید حامد راس پہنچا۔

ان دنوں میسور کی دوسری لڑائی ہو رہی تھی اور انگریز حیدری لشکر کے سامنے زچ ہو کر رہ گئے تھے۔

ترمل راؤ نے جب انگریز گورنر کے سامنے اپنا منصوبہ رکھا تو وہ اچل بڑا اور اس نے لمبے پورے تعاون کا یقین دلایا مگر اس منصوبہ میں کچھ ایسی خامیاں تھیں کہ انگریز یہ منصوبہ ناکام ہو جاتا تو اس میں کئی ہزار انگریز مارے جاتے۔

اس خطرے کے پیش نظر گورنر مدراس نے منصوبے کو منظور کر کے لیے لکھتے (بنگالہ) بھیجنے کا فیصلہ کیا کیونکہ گورنر مدراس، بنگال کے لارڈ گورنر کے ماتحت تھا۔

لکھتے جانے کے لیے بھی ترمل راؤ نے اپنی خدمات پیش کیں۔ ترمل راؤ دراصل یہ چاہتا تھا کہ جیسے بھی ہو یہ سازش کامیاب ہو جائے اور راجہ رانی کے مدد سے کے مطابق وہ میسور کے پہلے وزیر اعظم کا عہدہ حاصل کر لے۔

مدراس کے گورنر نے اپنے ایک کپتان کے ساتھ ترمل راؤ کو لکھتے بھجوا دیا۔ سازش واقعی کچھ ایسی خطرناک تھی کہ بنگال کا لارڈ گورنر بھی اس کی ذمہ داری لینے پر آمادہ نہ ہوا اور اس نے گورنر مدراس کو مشروط اجازت دی۔

اس نے یہ شرط عاید کی کہ جب تک میسور کے محاذ پر لڑنے والا جنرل اس منصوبے کو منظور نہ کرے اس وقت تک اس پر عمل درآمد نہ کیا جائے۔

اس وقت حیدر علی کے خلاف میسور کے محاذ پر سرگڑ کوٹ تمام فوجوں کا کیمپ تھا۔ اس کی حیدر علی سے کئی جنگیں ہو چکی تھیں۔ ایک دفعہ اسے کامیابی بھی ہوئی تھی اور حیدر علی کو یہ پتا ہونا پڑا تھا، اس کے باوجود جب جنرل کوٹ کے یہ منصوبہ پیش کیا گیا تو اس نے اسے فوراً ہی منظور نہیں کیا بلکہ اس پر صرف غور کرنے کا وعدہ کر کے اپنے پاس رکھ دیا۔

رانی کے گشتے ترمل راؤ کو اس منصوبے کی کامیابی کا اس قدر یقین تھا کہ لکھتے جانے کے علاوہ وہ مدراس سے اس انگریز کپتان کے ساتھ جنرل آڈ کوٹ سے ملنے کے لیے میسور کے محاذ پر بھی گیا۔

پھر ایسا ہوا کہ جب وہ جنرل کوٹ سے مل کر مسلمانوں کے بھیس میں محاذ جنگ سے واپس آ رہا تھا تو اسے سرنگاپٹم کے ایک عوار نے شناخت کر لیا۔

"ترمل راؤ۔ تم یہاں کیا کر رہے ہو؟" عوار نے گھوڑے سے اتر کر اس کا گریبان پر ہاتھ

ترمل راؤ ایک مسلمان کی زبان سے اپنا نام اس کے گھبرا گیا اور بڑھلا ہٹ میں بولا:

"میں ترمل راؤ نہیں بلکہ تمہاری طرح ایک مسلمان ہوں۔"

سوار کا غصہ بڑھ گیا۔ اس نے کمر سے خنجر کھینچا اور ترمل راؤ کے سینہ پر رکھ دیا:

"اوکا فرنیجے۔ سچ بول، دے ورنہ یہ خنجر تیرے سینے کے پار کر دوں گا۔"

ترمل راؤ کا خون خشک ہو گیا:

"مجھے نہ مارو۔۔۔۔۔ میں۔۔۔۔۔ وہ گھلیا نے لگا۔

سوار نے خنجر پر زور دیا اور خنجر ترمل راؤ کے گڑتے سے گزر کر سینے سے ٹکرایا:

"سچ بولنے کا یہ آخری موقع ہے" سوار دانت پیس کر بولا۔

"ہاں ہاں۔ میں ترمل راؤ ہوں۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے رانی مانا نے لالچ دیا تھا میں بہک

گیا تھا۔ مجھے معاف کر دو۔"

سوار کے لیے صرف اقبال جرم ہی کافی تھا:

"معافی یا موت کا حکم تو صرف نواب بہادر ہی دے سکتے ہیں۔"

ترمل راؤ کو گرافا کر کے نواب بہادر کے پاس بھیج دیا گیا۔ نواب بہادر نے ترمل راؤ کو

قل اور راجہ کے تہنہ میں جتنی غلات تھے، ان کے داروغوں کو معزول کر دیا۔ رانی مانا اور راجہ

کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا اور ان کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھایا گیا۔

اس سلسلے میں ہندو قوم کی احسان فراہمی کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے۔ حالانکہ حیدر علی نے

بہارہ مدظل اور پیشواؤں کے علاوہ ان کی عبادت گاہوں کے ساتھ رواداری کا برتاؤ کیا تھا۔

دائیں کو یہ پڑھ کر شاید تعجب ہو کہ حیدر علی نے میسور کے لنگا سیوا مندر کے درمیان قبہ کو

تعمیر کرایا تھا۔

اس کے علاوہ سرنگاپٹم کے سری رنگا مندر کا ذکر بھی ضروری معلوم ہوتا ہے جسے حیدر علی

نے از سر نو تعمیر کرایا تھا۔

اس مندر کے متعلق سینکڑوں سوسائٹی جنرل (اپریل ۱۹۳۹ء) اپنے صفحہ ۴۵۲ پر اس طرح

رقم طراز ہے:

"۴۴ء میں قدیم الدین خاں نامی ایک شخص کے مکان میں آگ

لگ گئی۔ یہ مکان مرہی رنگا مندر کے متعلق واقع تھا۔ آگ اس قدر

شدید تھی کہ قدیم الدین خاں کا مکان اور سری رنگا تھ کا مندر دونوں  
ہی جل کر خاکستر ہو گئے۔

چنانچہ حیدر علی خاں نے چل قدیم الدین خاں کا مکان دوبارہ تعمیر  
کرا دیا وہاں اس نے اسی مندر کو بھی دوبارہ تعمیر کیا۔

اور اس مندر کا سب سے اہم کارنامہ یہ ہے کہ حیدر علی سے لے کر سلطان ٹیپو کی شہادت  
تک سلطنت خداداد میسور کے خلاف مرہٹوں، نظام کوکن اور انگریزوں کے علاوہ میسور کے  
راجہ اور رانیوں نے جتنی سازشیں کیں۔ جتنے منصوبے بنائے۔ ان میں اس مندر کا کوئی نہ کوئی  
پہنڈ یا ہتھیار ضرور شامل رہا۔

”معاہدہ رانا“ کے بارے میں تاریخ لکھتی ہے :

”میں اس میں انگریزوں اور ہندوؤں کے درمیان جو معاہدہ (رانا)  
امہندو شاہان کے لیے سخت کی بازیابی کے لیے ہوا تھا، اس پر  
رانی کے گائے تیل راڈ اور کمپنی کے نمائندے جان سیلون نے  
دستخط کیے تھے۔ . . . . یہ معاہدہ سرانگ کوٹ کے پاس بھی آیا  
تھا جس پر اس نے مناسب توجہ نہ دی۔ معاملہ وقتی طور پر دب  
گیا مگر چھکار دی سلگتی رہی۔“

شہزادہ ٹیپو کو باپ کے انتقال کی خبر ۱۲ دسمبر کو مل گئی تھی اور وہ ۱۲ دسمبر کو جل جہنم  
وہ ارکاٹ کے قریب پہنچ کر مر گیا۔

وہ باپ کے انتقال کی خبر سے ریخ داہم میں مبتلا تھا اور جلد از سرخیم گاہ پہنچا جہاں صاحب  
مصلحت اس کے قدم روک رہی تھی کیونکہ معاملہ اس کے بھائی کا تھا جو اس وقت تخت نشین  
ہو چکا تھا۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ حیدر علی کا انتقال ارکاٹ کے قریب، مری کے مقام پر ہوا تھا۔ پھر جب  
اس کی خبر سرنگا پٹم پہنچی تو وہاں اراکین سلطنت نے فوراً چھوٹے شہزادے کو مرہم صاحب کو  
تخت نشین کر دیا۔ یہ دونوں خبریں جب شہزادہ ٹیپو کو ملیں تو وہ مصلحتاً ارکاٹ کے قریب پہنچ کر

دراصل وہ مرحوم باپ کی خیمہ گاہ اور سرنگا پٹم کے دربار کا اپنے بارے میں ردِ عمل معلوم  
کرنا چاہتا تھا۔

مؤرخین نے اس سلسلے میں اس بات کا شبہ بھی ظاہر کیا ہے کہ شہزادہ ٹیپو کو یہ خطرہ پیدا ہو  
سکتا تھا کہ ایسا نہ ہو وہ خیمہ گاہ پہنچے اور اس کا بھائی کریم، جو بادشاہ بن چکا تھا، سرنگا پٹم سے  
شہر ہی فوج لے کے اس کے مقابلہ پر آ جائے۔

شہزادے کے خدشات ایک حد تک درست تھے۔ اس لیے کہ کریم صاحب کو تخت  
الے میں میر صادق آگے آگے تھا۔ یہ وہی حکمران تھا جسے حیدر علی نے افسر لیاٹ بنایا تو  
وہ ملکہدان نے فوراً اعتراض کیا تھا کہ :

”اب بادشاہ آپ سلطنت کے مالک و مختار ہیں۔ جس کو چاہیں بخش دیں اور  
نہ چاہیں مولی پر چڑھا دیں مگر میں یہ گستاخی کہنے پر خود کو مجبور پاتا ہوں کہ  
اے ملکہ خواروں کو نظر انداز کر کے آپ نے والا جاہ کے سب سے زیادہ قریبی  
مسامحہ برساتی ہو افسر مال بنایا ہے۔ قدیم وفادار خواہ زبان سے شکوہ نہ کریں  
مگر ان کے دلوں کو بھیس ضرور پہنچے گی۔“

اب بادشاہ اپنے وفادار سردار کے اس بے باکانہ مگر ایک سچے اعتراض پر جو بے ضرر  
تھے۔ انہوں نے دل میں سوچا جس ہو گا کہ واقعی انہوں نے پرانے وفاداروں کی حق تلفی کی  
ہے۔ بات تو راقبت ہی ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے فوراً بات بنا دی تھی کہ :

”میں اپنی بات نہیں۔ میں اپنے وفاداروں کو اس سے بہتر حد سے دوں گا۔  
اس میں میرا ساد کو افسر لیاٹ بنا چکا ہوں، اسے بغیر کسی وجہ کے معزول  
نہ کرنا۔ اس طرح میں یہ سبب بیان تم بھی خیال رکھو۔ اگر اس کی طرف سے ذرا بھی  
دبانہ ہوئی تو اسے نہ صرف معزول کیا جائے گا بلکہ ایسے سزا ملے گی کہ اس کے  
موت نہ ٹھکانے آجائیں گے۔“

مگر

اس کا وقت ہی نہ آ سکا اور نواب بہادر اس دنیا سے رخصت ہو گئے۔ اب ان کی جائنتی  
نہ ہو گیا تھا۔

یہ سوچتے ہی وہ دوانسا منہ ہانک کر لڑا۔  
 "مرداران گرامی! یہ غلطی تو مجھ پر نہ نصیب سے ہوئی ہے۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ حالات دوسرا  
 رخ اختیار کر لیں گے۔"

اس کا تہنیت علی یہ ہے کہ آپ میرا سر قلم کر کے شہزادہ ٹیپو کے حضور روانہ کر دیجیے۔  
 اور ان کو مطلع کیجیے کہ وہ بد بخت انسان اب اس دنیا میں نہیں رہا جس نے ملک و ملت کے  
 مناد کی خاطر ایک غلط منصوبہ پیش کیا تھا۔  
 اور اس کے ساتھ ہی اس مکار کی آنکھوں سے جھانپ کر آنسو برسنے لگے۔ میرزا خاں نے آگے  
 بڑھ کر اسے تسلی دی:

"تم فکر نہ کرو افسرِ مایات! یہ غلطی تو ہم سب سے ہوئی ہے اور ہم سب مل کر اس کا تدارک  
 کریں گے۔ تم نے تو جلد ہی سوچ کے یہ مشورہ دیا تھا۔ اب ہماری قسمت کہ اس کا اثر اٹھا ہوا۔"  
 محمد علی کیدان پر میر صادق کے رونے دھونے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ اس نے میرزا خاں کو  
 مخاطب کیا اور کہا:

"میرزا خاں! بہتر ہے کہ ہم اس سلسلے میں شہزادہ ٹیپو سے گفتگو کر کے فوراً کسی نتیجے  
 پر پہنچیں۔"

میرزا خاں نے تائید کی:

"میں آپ کے ساتھ ہوں سردار۔ چلیے شہزادے کے پاس چلتے ہیں۔ یہ مسئلہ فوراً حل  
 ہونا چاہیے۔"

میر صادق نے ایک قدم آگے بڑھا کہ محمد علی کیدان کی چابوکی کی:

"آپ نے بالکل صحیح فیصلہ کیا سردار۔ ہم سب کو فوراً شہزادہ بہادر کے پاس  
 چلنا چاہیے۔"

"وہاں تم نہیں جاؤ گے میر صادق علی۔ کیدان نے ترش لہجے میں کہا۔

میر صادق کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا مگر اس نے خوشامد کا دوسرا پیر چلایا:

"دیکھیے نامردار! بات پہلے میں نے شروع کی تھی۔ میں شہزادے سے معافی طلب نہیں  
 کروں گا تو سارا الزام میرے سر آ جائے گا۔"

محمد علی کیدان کی آواز میں کچھ زیادہ تلخی کھل گئی اور لہجہ تند ہو گیا:

سب سرنگاٹم کے امرا کو معلوم ہوا کہ شہزادہ ٹیپو، ارکاٹ کے قریب ٹھہر گیا ہے اور وہ  
 نواب مرحوم کی خیمہ گاہ تک جانے میں پس و پیش کر رہا ہے تو وہ بہت فکر مند ہوئے۔  
 محمد علی کیدان نے اس وقت بھی سب سے پہلے زبان کھولی:

"کیوں میرزا خاں! ہم نے کریم صاحب کو تخت نشین کر کے غلطی تو نہیں کی؟"  
 میرزا خاں سب سے زیادہ پریشان تھا کیونکہ میر صادق کے اس منصوبے کی اس نے  
 سب سے پہلے تائید کی تھی کہ کریم صاحب کو وقتی طور پر تخت نشین کر دیا جائے تاکہ دشمنوں کو  
 سازشیں کرنے کا موقع نہ مل سکے۔

"مردارِ محترم!"

میرزا خاں نے اپنی صفائی پیش کی:

"اس وقت میں نے یہی مناسب سمجھا تھا کہ دشمنوں کی مخالفت سے بچنے کے لیے میں فوراً  
 شہزادہ ٹیپو کے مقابل کو تخت نشین کر دینا چاہیے اس لیے میں نے افسرِ مایات میر صادق کے اس  
 منصوبہ کی تائید کی تھی۔ بخدا میرے دل میں اس کے سوا اور کوئی ارادہ ہرگز نہ تھا۔"  
 "میرزا خاں! اس کا یہ مطلب سیر کہ میں آپ پر شبہ کر رہا ہوں۔ جو غلطی ہو نا تھی وہ تو  
 ہو گئی۔" محمد علی کیدان نے کہا:

"مجھے بتایا گیا ہے کہ شہزادہ بہادر نے اس بات کا اظہار کیا ہے کہ جب تک مرنگاٹم کی  
 فضا صاف نہیں ہو جاتی اس وقت تک نہ تو وہ ارکاٹ کی خیمہ گاہ میں داخل ہوں گے اور نہ ہی  
 مرنگاٹم آئیں گے۔"

محمد علی کیدان بڑا احاف گو بلکہ منہ پھٹ مردار تھا۔ سچ بولنے کے معاملے میں وہ حیدر علی خاں  
 کی بھی پروا نہ کرتا تھا۔

اس کے جاسوس نے اسے بتایا تھا کہ شہزادہ ٹیپو کو مرنگاٹم کے امرا کی ینتوں پر شبہ ہے  
 اس لیے اس نے اپنے قدم روک لیے ہیں۔

اس گفتگو کے وقت وہاں دوسرے سرداروں کے ساتھ وزیرِ مال میر صادق بھی موجود تھا۔  
 وہ محمد علی کیدان اور میرزا خاں کی گفتگو سے اس نتیجے پر پہنچا کہ انہیں کریم صاحب کی تخت نشینی  
 سخت ناگوار گزری ہے اور ممکن ہے کہ وہ اسے معزول کر کے اپنی غلطی کا ازالہ کرنے کی کوشش  
 کریں۔ اس صورت میں کریم صاحب کی تخت نشینی کی پوری ذمہ داری اس پر عاید ہو جائیگی۔

”معافی تو ہم سب کو مانگتا ہے۔“

پھر اس نے میر صادق کی طرف سے منہ پھیر کر میرزا خاں سے کہا:

”صرف آپ شہزادے کے پاس جائیں گے اور ہم سب کی طرف سے عرض کریں گے کہ شہزادے کے سرنگا پیٹ نہ آنے کی وجہ سے ہم تمام سردار متحمم، دردل شکستہ ہو رہے ہیں۔ ہم نے شہزادہ کو ہم صاحب کو تخت نشین کر کے جو اضطراری غلطی کی ہے ہم اس کی تحریری معافی مانگتے ہیں۔ خدا کے لیے کسی شہنشاہ کو دل میں جگہ نہ دیتے۔“

”ٹھیک ہے سردار مگر وہ تحریری معافی نامہ۔“

محمد علی کیدان نے میرزا خاں کو بات پوری نہ کرنے دی اور بولا:

”آپ تمام لوگ اپنے ہاتھ سے لکھ کر دیجیے کہ ہم نے شہزادہ کو ہم صاحب کو تخت نشین کرنے کی غلطی کی ہے۔ اس کے لیے ہم دست بستہ معذرت خواہ ہیں۔ یہ تمام معافی نامے میرزا خاں اپنے ساتھ لے جائیں گے اور شہزادے کے حضور پیش کریں گے۔“

مجلس میں موجود تمام سرداروں نے اپنے معافی نامے لکھ کر میرزا خاں کے حوالے کر دیے۔ میرزا خاں نے ایک لمحہ کی دیر نہ کی اور معافی نامے سمیٹتے ہی وہ ارکات کے لیے سوار ہو گیا۔

شہزادہ کیسے گزشتہ تاثرات نہ سوسکا تھا۔ کبھی خیمہ کے اندر اور کبھی خیمہ کے باہر ٹل ٹل کر اس نے سویرا کیا تھا۔

یوں تو بچپنی کی راتیں اس نے بے چینی سے کاٹی تھیں لیکن یہ رات اس کے لیے سب سے زیادہ پریشان کن تھی۔ اس کو بار بار یہی خیال سناتا تھا کہ خدا معلوم وہ کون لوگ کتنے جہنوں نے مجھے نظر انداز کر کے عیسوی کا تخت شہزادہ کو ہم کو پیش کر دیا۔

شہزادہ بہادر۔ میرزا خاں شریف لائے ہیں اور اذنِ قدم کے لیے۔

ایک پہرے دار نے خیمہ میں داخل ہو کر شہزادے کے پاس پہنچ کر کہا:

میرزا خاں نے داخل ہو کر شہزادے کو سلام پیش کیا پھر ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ شہزادے نے انتہائی افسانہ آمیز انداز میں میرزا خاں کو کچھ کہہ کر گامگاہ وہ خاموش رہا۔ تب شہزادہ کیسے لے کر نکلے۔

میرزا خاں انہما میرزا خاں کے نام سے زیادہ مشہور تھا۔



میرزا خاں: خوش آمدید۔ کو کیسے آنا ہوا؟

میرزا خاں: میرزا کا بیٹا ہے جو اب دیا:

شہزادہ بہادر: میں اور کا امرا نے جو اس وقت سرنگا پٹم میں جمع ہیں، ایک اضطراری اور سیاسی غلطی کی ہے، اس کی معافی مانگنے حاضر ہوا ہوں۔

شہزادے کے چہرے پر مسرت دوڑ گئی:

”اس غلطی کی کوئی وجہ، کوئی جواز تو ضرور ہوگا۔“ شہزادے نے اپنی طمانیت کے لیے

سوال کیا۔

”شہزادہ عالی مقام؟“

میرزا خاں نے سبیل کے کہنا شروع کیا:

”سرنگا پٹم کے امرا کو یہ پریشانی لاحق ہے کہ نواب والا تبار کے انتقال پر ملال کی خبر چاروں طرف پھیل چکی ہے۔ شہزادہ عالی مقام کو بھی مطلع کیا جا چکا تھا مگر آپ کی آمد میں تاخیر نے سردارانِ فوج اور امرا کو بدحواس کر دیا کہ سلطنت کے بدخواہ کہیں یہ سمجھ گئے کہ میسور کے تخت و تاج کے لیے اندرونِ خانہ اختلاف پیدا ہو گئے ہیں، سرنگا پٹم پر حملہ آور نہ ہو جائیں پس امرا اور سرداروں نے یہ بہتر خیال کیا کہ شہزادہ کریم کو مصلحتاً وقتی طور پر تخت نشین کر دیا جائے اور آپ کے سرنگا پٹم پہنچنے پر شہزادہ کریم تخت سے دست بردار ہو جائیں۔“

شہزادہ میسور کچھ دیر سوچتا رہا پھر ایک لمبی سانس لے کر بولا:

”دوسرے سرداروں نے کیا فیصلہ کیا ہے اس سلسلے میں؟“

”سب امرا، وزیر اور سردارانِ افواج بیک زبان معافی کے طلبگار ہیں شہزادہ بہادر۔“

میرے پاس اس کا دستاویزی ثبوت بھی ہے۔“

یہ کہتے ہوئے میرزا خاں نے بغلیں دبا ہوا ایک پلندہ شہزادے کی طرف بٹھا دیا اور

عاقبت ہی کہا:

”یہ وہ معافی نامے ہیں جو امرا، وزرا اور دیگر عمائدین سلطنت نے الگ الگ اپنے قلم سے

تحریر کیے ہیں، آپ ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔“

شہزادے نے پلندہ ایک طرف رکھ دیا پھر میرزا خاں کو اپنے قریب آنے کا اشارہ کیا۔ مہ

لحقہ باندھے آگے بڑھا۔ شہزادے نے اپنے بازو پھیلاد لیے:

”اے سلطنت میسور کے چکلتے دکلتے ستارے۔ آ اور میرے گلے سے لگ جا۔“

میرزا خاں نے بھی کمال مسرت سے بازو داکر دیے اور شہزادے کو اپنے بازوؤں میں گھسیٹ لیا۔ وہ اس وقت بہت خوش تھا اور اس خوشی کا اظہار اس کے ہتے ہوئے آنسوؤں سے بخوبی پور ہوا تھا۔

میرزا خاں سے بغل گیر ہونے کے بعد شہزادے نے سرداروں کے معافی ناموں پر ایک مرمی نظر ڈالی۔ دوسرے سرداروں کے علاوہ ان معافی ناموں میں افسر مالیات میر صادق علی کا معافی نامہ بھی شامل تھا۔

شہزادے اور میرزا خاں نے اس جگہ کا معائنہ کیا جہاں حیدر علی خاں کو ماضی طور پر دفن کیا گیا تھا۔ فاتحہ سے فارغ ہو کر شہزادے نے مسرت سے کہا:

”مہا میرزا خاں میرا دل اپنے امرا کی طرف سے صاف ہو گیا ہے۔ اب مجھے سرنگا پٹم جانے میں کوئی تکلف نہیں۔“

”تو پھر کوچ کا حکم فرمائیے شہزادہ بہادر۔“

میرزا خاں نے سرخم کر کے کہا:

”سرنگا پٹم کا تخت و تاج اور پچہ پچہ آپ کا منتظر ہے۔“

شہزادے نے اسی وقت کوچ کا حکم دے دیا۔

میرزا خاں نے روانگی سے پہلے دو تیز رفتار سوار سرنگا پٹم اس اطلاع اور حکم کے ساتھ روانہ کیے کہ دھڑت تاج و تخت اپنے تاج و تخت کی طرف آ رہا ہے۔ خاص دعا استقبال کے لیے

تیار رہیں۔

سرنگا پٹم میں شہزادے کی آمد کی خبر پہنچتے ہی عوام و خواص نے استقبال کی تیاریاں شروع کر دیں۔ امرا اور وزراء نے طے کیا کہ وہ سرنگا پٹم کی سرحد پر شہزادے کو خوش آمدید

کہیں گے۔

شہزادہ پٹو جلد از جلد سرنگا پٹم پہنچنا چاہتا تھا لیکن اس کی آمد کی خبر ہر طرف پھیل گئی تھی۔ اس لیے سرنگا پٹم جانے والے راستے پر عوام دور و بہ دور بٹھائے گئے تھے۔

۱۔ ہما میرزا خاں خصوصیت سے مدعو کیے گئے تھے۔

شہزادے نے کھانے کے دوران اچانک میرزا خاں سے سوال کیا:

"میرزا خاں۔ میں محسوس ہوا ہے کہ ہمارے استقبال کے لیے آنے والوں میں بعض امیر اور برشریک نہیں ہوئے، کیا اس کی وضاحت ہو سکتی ہے؟"

میرزا خاں کے ہاتھ میں نوالہ تھا۔ اس کا ہاتھ جہاں تھا وہیں رک کر رہ گیا۔ وہ جواب سوچ رہا تھا۔ محمد علی کیدان نے شہزادے کو اپنی طرف مخاطب کر لیا:

"شہزادہ بہادر۔ اس کا جواب میں عرض کرتا ہوں۔"

شہزادے نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

"شہزادہ بہادر!"

محمد علی کیدان نے منجھل کے کہنا شروع کیا:

"ذرا صبر صبر صبر علی کے اطوار و عادات شروع ہی سے خراب ہیں۔ یہ شخص والا جاہ محمد علی کا ہے۔ ہمارا صاحب تھا اور اس کے لیے شراب و کباب کی محفلیں آراستہ کرتا تھا۔ مرزا کاظم میں اس کے بعد اس کے اطوار درست ہونے کے بجائے اور بگڑ گئے۔"

شہزادے نے ہاتھ کے اشارے سے محمد علی کیدان کو روک دیا:

"بزرگ سردار۔ آپ ایک عظیم فوجی سالار ہیں اس لیے آپ کو میدان جنگ اور جنگی عمل پر زیادہ زور دینا چاہیے۔ اگر کسی امیر کے اطوار بگڑے ہوئے ہیں تو اس کی مدداری کو نوالہ شہزاد اور قاضی شہر پر عاید ہوتی ہے۔ آپ اپنے سران ذمے داریوں کو کیوں اٹا چاہتے ہیں؟"

محمد علی کیدان نے شہزادے کا احترام تو بقرار رکھا مگر جواب دیتے وقت اس کے لیے ہمواری کی مانگی پیدا ہو گئی:

شہزادہ بہادر۔ میرصادق پر شبہ ہے کہ اس نے شہزادہ کریم کو سلطان بنانے کا جو منصوبہ کیا تھا اس میں وہ مخلص نہیں بلکہ بددیانت تھا۔ اسی شبہ پر میں نے اسے اس کی جوبلی بائند کر دیا ہے۔"

"بزرگ سردار۔ یہ آپ نے کیا کیا؟"

شہزادے کی آواز ایک دم تیز ہو گئی: "کیا آپ کے پاس میرصادق کی بددیانتی کا کوئی

شہزادے کو مجبوراً اپنی رفتار کم کرنا پڑی۔ اسے جگہ جگہ ہاتھ ہلا کے ان کے پرجوش نعروں کا جواب دینا پڑتا تھا۔

شہزادے کے لیے آنکھیں تو فرش راہ تھیں لیکن عوام نے اس پر پھولوں کی اس قدر بارش کی کہ راستے پر پھولوں کا ایک فرش بچھ گیا۔

مرزا کاظم کی سرحد پر تمام امرا اور ورور نے شہزادے کا پرجوش استقبال کیا۔ شہزادہ گھوڑے پر سوار تھا اس لیے استقبال کو آنے والے تمام لوگ شہزادے کے احترام میں پیادہ ہو گئے۔

استقبال کرنے والوں میں سب سے آگے شہزادہ کریم تھا جس کی حیثیت اس وقت ایک میسور کے سلطان کی تھی۔

دقتی سلطان یعنی شہزادہ کریم پیادہ، پر وقار قدم اٹھاتا اپنی جگہ سے شہزادے کے مرکب تک پہنچا اور بڑے خلوص سے شہزادے کی رکاب کو بوسہ دیا۔

"میں شہزادہ عالی مقام کی مرزا کاظم آمد پر بہت دل سے مبارکیاؤ پیش کرتا ہوں اور اپنی اس دقتی سلطانی کے اعزاز کو جو مجھے مصلحتاً بخشا گیا تھا، سے خود کو سبکدوش کر کے شہزادہ بہادر کے سامنے سر تسلیم خم کرتا ہوں۔"

شہزادہ کریم کی آواز میں محبت اور خلوص کا ایسا درد بھرا تھا کہ شہزادہ ٹھپوٹے چہین ہو گیا۔ وہ فوراً گھوڑے سے اترا اور بھائی کو سینے سے لگا لیا۔

لوگوں نے دیکھا کہ دونوں بھائی گلے گلے ہوئے تھے اور ان دونوں کی آنکھیں اشکبار ہو گئی تھیں۔

امرا اور وزرا نے شہزادہ ٹھپوٹے سے درخواست کی کہ انہیں عظمت خداداد میسور (بعض تارکھوں میں سرکار خداداد میسور تھے) کے نمایان شان تاج پوشی اور جشن تاج پوشی کی اجازت دی جائے تاکہ سرزا کاظم میں ویسا ہی جشن منایا جاسکے جیسا کہ دہلی کے شہنشاہوں کی تاج پوشی کے مواقع پر اہتمام کیا جاتا ہے مگر شہزادہ ٹھپوٹے نے اس کی اجازت نہ دی۔

شہزادے کا جلوس مرزا کاظم میں ڈوبتے سورج کے وقت پہنچا تھا اس لیے طے پایا کہ رستم تاج پوشی دوسرے دن صبح کو ادا کی جائے۔

اس رات شہزادے نے خصوصی امرا کو کھانے کی دعوت دی۔ اس دعوت میں محمد علی کیدان

ثبوت ہے۔ اگر ہے تو پیش کیجیے۔

”شہزادہ بہادر۔ ثبوت بہت جلد مل گیا ہو جائے گا۔ محمد علی کیدان نے شہزادے کی ناراضگی کی پروا نہ کرتے ہوئے اطمینان سے جواب دیا:

”میر صادق پر یہ بھی شبہ ہے کہ اس نے آپ کی سرنگاہ میں اندر پر بھی آپ کو نقصان پہنچانے کا منصوبہ بنایا تھا مگر میں نے اسے اور اس کے ساتھیوں کو ان کے گھر میں قید کر دیا ہے تاکہ وہ کوئی ہنگامہ نہ برپا کر سکیں۔

یہ تو تم نے اور بھی ظلم کیا محرم سردار۔

شہزادے کو سخت غصہ آ گیا:

”آپ جانتے ہیں کہ بابا مرحوم نے ارکاٹ پر قبضہ کے بعد میر صادق کو میسور کا افسر مال مقرر کیا تھا۔ کیا اس کے خلاف غبن یا بددیانتی کا کوئی مقدمہ پیش ہوا؟“

”مقدمہ تو پیش نہیں ہوا لیکن۔“

محمد علی کیدان نے جواب دینے کی کوشش کی مگر شہزادے نے سختی سے اس کی بات کاٹ دی:

”پھر میر صادق کو کیوں نظر بند کیا گیا؟“

شہزادے کے لہجے میں شائد کھن گرج پیدا ہو گئی تھی۔

محمد علی کیدان نے کوئی جواب نہ دیا اس لیے کہ اس کے پاس کوئی تحریری ثبوت یا شہادت موجود نہ تھی۔

شہزادے نے میرزا خاں کو حکم دیا:

”میرزا خاں۔ یہ تمہاری ذمہ داری ہے کہ میر صادق اور دوسرے تمام لوگ جو ہمارے خلاف بغاوت اور فتنہ و فساد پیدا کرنے کے شبہ میں گرفتار ہوئے ہیں انہیں فوراً رہا کیا جائے۔ ہم انہیں کلی کی رسم تاج پوشی میں دیکھنا چاہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی ہم یہ اعلان کرتے ہیں کہ مرحوم بابا حضور نے امرا کو جن عہدوں پر مقرر کیا تھا وہ اسی طرح برقرار رہیں گے۔

دوسری بات یہ کہ آج سے کسی شخص کو غرض شبہ کی بنا پر گرفتار نہیں کیا جائے گا جب تک ٹھوس ثبوت موجود نہ ہو۔“

تمام نظر بندوں کو رات ہی میں رہائی مل گئی اور دوسرے دن وہ رسم تاج پوشی میں شریک تھے۔

رسم تاج پوشی کے لیے نہ دربار سلطانی کو کروفر سے سجا یا گیا اور نہ شہر میں آرائشی محرابیں لگائی گئیں۔ اس لیے کہ شہزادہ بیٹو ایک سادہ طبیعت انسان تھے اور انہیں تخت نشینی کے رسمی لوازمات سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

رسم تاج پوشی بڑی سادگی سے ادا کی گئی۔

یکشنبہ (پیر) ۲۰ محرم الحرام ۱۱۹۶ھ مطابق ۷۸۳ء شہزادہ بیٹو نے تاج بٹائی زیب سر کیا اور ”سلطان“ کا لقب اختیار کیا۔ واضح رہے کہ ”سلطان“ کا لفظ اس کے ناکا ایک حصہ بھی تھا۔

ارکانِ دولت کو لباسِ فاخرہ عطا ہوا۔ سلطان نے اپنے جانشینوں اور سرداروں کو پیش قیمت انعامات دیے۔ تمام قلعہ داروں، سواہداروں، ناظموں، گورنروں اور دیگر عمالِ دولت کو رقعے، خط اور فرمان اس موضوع کے روانہ کیے گئے کہ جو شخص مرحوم نواب بہادر کے حکم سے جس عہدے پر مقرر ہوا تھا اس پر قائم رہے گا۔

سرکاری طور پر جن کا کوئی اہتمام نہ کیا گیا مگر عوام کو اجازت دی گئی کہ وہ اپنے طور پر خوشی منا اور جشن کر سکتے ہیں۔

رسم تاج پوشی کے اختتام پر سلطان نے دربار میں ایک دولہ انگریز تقریر کی جس کی خاص خاص باتیں درج ذیل تھیں:

۱۔ میں ایک معمولی انسان ہوں۔

۲۔ یہ زندگی ناقابلِ اعتبار ہے۔

۳۔ حکومت اور وجاہت مٹ جانے والی چیز ہے۔

۴۔ میں جب تک زندہ رہوں گا وطن اور وطن والوں کے لیے جدوجہد کروں گا۔

۵۔ مجھے ظاہری شان و شوکت سے مرعوب کیا جا رہا ہے۔

۶۔ مجھے نہ مظاہرے ڈرا سکتے ہیں نہ دھمکیاں پیچھے ہٹا سکتی ہیں اور نہ قہر و جلال کے مناظر سے میرے ارادے متزلزل ہو سکتے ہیں۔

۷۔ اگر برقِ ستم مجھے ہلاک کر دے تو اس وقت بھی میری زبان پر یہ الفاظ ہوں گے:

اے زندہ رہنے والو!  
آگے بڑھو۔ خدائے قدوس تمہاری کوشش میں برکت دے اور  
تم اپنی منزل کو پہنچو۔

۸۔ آزادی وطن کے لیے ہزاروں انسان موت کے گھاٹ اتر سکتے ہیں کیونکہ جب وطن  
کے جذبات کبھی نہیں مٹ سکتے۔

ایک تاریخ کے مطابق سلطان یسویں نے اپنی پہلی تقریر میں مادر وطن کو مخاطب کر کے  
یہ الفاظ ادا کیے تھے:

"اے میرے پیارے وطن!  
میری محبت اور میرا دل تیرے لیے ہے۔ میری حیات اور میرا وجود  
تیرے لیے ہے۔ میرا خون اور میری جان تیرے لیے ہے۔"

جسٹ ناچوشتی کے اختتام سے پہلے امرا اور وزرا میں عہدوں کی تقسیم ہوئی۔ کچھ کے عہدے  
تبدیل ہوئے اور کچھ کو ترقی دی گئی۔  
میر صادق جو پہلے افرام تھا اسے ترقی دے کر سلطان یسویں نے وزیر اعظم (دیوان کا عہدہ  
عطا کیا جو سلطنت کا سب سے اہم عہدہ تھا۔  
میر صادق کے ساتھ پورنا کو وزیر مالیات بنا دیا گیا۔

سلطان یسویں نے جنوبی ہند کی سب سے بڑی سلطنت یعنی "سلطنت خداداد میسور" کی باگ ڈور  
ایک ایسے وقت میں سنبھالی تھی جب ہر طرف فرنگی کافروں کا دور دورہ تھا۔ عیسائی مشنریاں  
جگہ جگہ کام کر رہی تھیں۔ ہندو راج کے منہ بولے بنانے والے اپنی مین اکٹھا ہو رہے تھے اور  
دربارہ دہلی کی سطوت قلعہ دہلی میں قید ہو کر رہ گئی تھی۔ گلستان اسلام میں جھاڑ جھنکار اُگ  
اُٹے تھے۔

ان حالات میں ایک ایسے سچے مسلمان کی ضرورت تھی جس کی دُور رس نظریں مستقبل کی

تحریر پڑھ سکے۔ بدعت اور کفر کے اٹھتے ہوئے فتنہ کا سر پکھلنے کے لیے سر سے کفن باندھ کے  
میدان کارزار میں نکلے اور اپنی زندگی اسلام کے احیا اور بقا کے لیے وقف کر دے۔  
ایسے پُر آشوب دور میں سلطان یسویں جیسا صاحب یقین شخص اتنی اسلام پر آفتاب بن  
کر ابھرا۔ اس کی آمد گلستانِ وطن میں بادِ بھاری لے کر آئی۔ اس نے اسلام کے دشمنوں کا منہ  
پیر کر رکھ دیا۔

مگر۔

اس کو کیا گنا جانے کہ کچھ اہل وطن نے اپنے مفاد کی خاطر قبائے وطن کو تار تار کرنے کی  
قسم کھا رکھی تھی۔

سلطان قدم قدم پر آگے ہوئے اس خار و خشاک کو اکھاڑ تار مارا۔ وہ آگے بڑھتا رہا اور  
غدارانِ ملت اس کا دامن کیسے پھینچتے رہے اور یہ سلسلہ ایک زمانے تک یوں ہی چلتا رہا۔

حیدر علی خاں کے انتقال کے وقت انگریزوں سے جنگ ختم نہ ہوئی تھی۔ جنرل اسٹوارٹ اور  
جنرل لینک (لائنک) کے زیرِ کمان انگریزی فوج وائڈی وائش میں ڈیرے ڈالے پڑی  
تھی۔ سلطان یسویں ایک لشکر لے کر عمر و اور علور کے راستے آگے بڑھا اور وائڈی وائش  
سے پانچ میل دور انگریزوں کے سامنے خیمہ زن ہوا۔  
سلطان نے رات میں فوجوں کی ترتیب کا نقشہ تیار کیا۔ کچھ دنے مختلف مقامات پر رات  
ہی میں تعینات کر دیے گئے مگر صبح کو جب نکل کھلا۔

انگریزی فوج جو بڑے طعراق سے سامنے جہی ہوئی تھی، صبح ہوتے ہی اپنا بوریا بستر اپنیٹ  
میدان سے روانہ ہو گئی۔

بعد میں معلوم ہوا کہ گورنر مدراس نے اس لشکر کو فوراً مدراس واپس آنے کا حکم  
دیا تھا۔

سلطان بھی اپنے لشکر کو لے کر تودور کی طرف بڑھا اور دامن سپنج کے ڈیرے  
ڈال دیے۔

نواب حیدر علی خاں مرحوم کے زمانے میں لوگوں کو گڑ بڑ کرنے یا بغاوت کی جرأت کم ہوتی

نئی مگر ان کے دنیائے اٹھتے ہی مفندہ پردازوں نے پھر سراٹھایا۔ ان کا خیال تھا نوجوان سلطان میں حیدر علی جیسی خوبیاں نہ ہوں گی اور وہ اچھی طرح فوجوں کی کمان نہ کر سکے گا۔ چنانچہ بغاوتیں اور سازشیں جگہ جگہ ٹوٹ پڑیں۔

سلطان پٹوہ بھی یہیں پیچہ زن تھا کہ اسے بیک وقت بار بغاوتوں اور سازشوں کی اطلاع ملی :

ایک سازش حیدرنگر میں ہوئی۔ حیدرنگر وہی جگہ ہے جسے مرحوم حیدر علی خاں نے ایک معمولی قصبہ سے ایک خوبصورت شہر میں تبدیل کر دیا تھا۔ انہوں نے یہاں بہت سی عمارتیں بنوائیں اور دفاتر قائم کر کے اسے دوسرا دارالسلطنت بنایا۔

حیدرنگر، جو نگر کے نام سے زیادہ مشہور تھا، کا گورنر یا زخاں تھا۔ اس ہندو سپہ سالار حیدر علی خاں نے پال پوس کے جوان کیا تھا اور اپنا لے پاک بنایا تھا مگر اس احسان فراموش نے ان کی آنکھیں بند ہوتے ہی انگریزوں سے سازش کی اور کوڑیاں اور حیدرنگر کا سودا کر کے یہ دونوں شہر انگریزوں کے حوالے کر دیے۔

دوسری سازش کی اطلاع دارالسلطنت سرنگاپٹم سے موصول ہوئی۔ وہاں اپنے شائیلے تلعدار سے مل کر سازش کا ڈول ڈالہ اور دونوں میں یہ طے ہوا کہ حملات شاہی پر قبضہ کر کے حرم سلطانی کو قید کر لیا جائے۔

تیسری خبر گڑ پتہ سے عبدالحلیم خاں کے بھائی کی بغاوت اور خود مختاری کے اعلان کی آئی۔ اس نے چمپلی بندر میں انگریزوں سے معاہدہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔

چوتھی اور آخری خبر کٹمانہ میں بغاوت کی تھی۔ وہاں بالیا بنو نے سرکشی پر کمر باندھ رکھی۔ سلطان پٹوہ نے تمام معاملات پر ایک ساتھ توجہ دی۔ امدان کے لیے ایک ہی وقت میں احکامات صادر کیے۔

سلطان نے بدر الزمان ناٹھ، صلابت خاں بخشی، میر غلام علی اور میر معین الدین خاں کو انگریزوں سے پیٹنے کے لیے پائیں گھاٹ میں چھوڑا اور خود حیدرنگر کی طرف چلا۔ جیٹی گھاٹ پہنچ کے سلطان نے محمد علی کیدان کو اپنے شائیلے کو سرکوبی کے لیے سرنگاپٹم کی طرف بھیجا۔

خیال رہے کہ یہ وہی اپنے شائیلے سے جو پہلے والا جاہ محمد علی والی ارکاٹ کے درباریوں میں

شامل تھا۔ والا جاہ کے زوال پر یہ میر صادق وغیرہ کے ساتھ مرحوم نواب حیدر علی خاں کی خدمت میں حاضر ہو گیا تھا۔

گڑ پتہ کی طرف قمر الدین کو بھیجا گیا۔ وہاں عبدالحلیم خاں کے بھائی نے انگریزوں سے معاہدہ کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا تھا۔

ان سب کی روانگی کے بعد خود سلطان وپونہ کی مدد گری اور سردار کے راستے چتلا رگ کے نواح میں پہنچ گیا۔

ان چاروں بغاوتوں اور سازشوں کے قتل و خون اور غارت گری کے دوران ایک دلچسپ اور پراسرار داستان نے بھی جنم لیا۔

یہ پراسرار داستان کیفیت میسور کے دارالسلطنت سرنگاپٹم میں پیدا ہوئی جو شروع دن ہی سے سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔

نواب بہادر حیدر علی مرحوم کے عہد حکومت میں ہی یہاں کئی سازشیں جنم لے کر اپنی موت آپ مر چکی تھیں اور اب سلطان پٹوہ کے خلاف ہو ایک زبردست سازش کا آغاز ہوا تھا جس کی اطلاع سلطان کو مل چکی تھی اور اس سازش کو کچلنے کے لیے سردار محمد علی کیدان کو سرنگاپٹم جانے کا حکم دیا گیا تھا۔

دارالسلطنت، سرنگاپٹم میں ہونے والی ہر سازش میں راج محل کی رائیاں، خود راجہ رنجانا اور دوسرے مندروں سے پتہ دہندہ بالواسطہ شریک ہوتے تھے۔ اس سازش میں بھی یہ سب لوگ شریک تھے مگر نام صرف شاہی حملات کے قطعہ دار اپنے شائیلے کا سامنے آیا تھا۔

مکن تھا کہ یہ سازش کامیاب ہو جاتی اور پھر یہ نہیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلتا مگر وہ جو مشہور ہے کہ گولیوں کی سنسنی اور گولیوں کی گرج میں بھی عشق جنوں پیشہ کار فرمائیاں جاری رہتی ہیں، ایسی ہی کچھ صورت حال یہاں ہو پیش آئی۔

کہتے ہیں کہ نگوام کی ایک کینز فلعہ دار سرنگاپٹم کے محل میں تھی۔ یہ کینز حسن صورت اور حسن سیرت کا خوب نہیں رکھتی تھی۔

نگو کی ذات اور مذہب کا کوئی پتہ نہ تھا۔ یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ راج محل میں کیسے

پہنچی۔ بہر حال اس بات کا تو ثبوت موجود ہے کہ نگو نے ایک سال کے قریب راج محل میں گزارا تھا اور اپنے صحنِ میرت اور صحنِ صورت کے طفیل تمام کرائیوں راج ماما اور راج محلوں کے ملازمین کے دل جیت لیے تھے۔

ہندو رانیوں میں اس قدر مقبول ہو جانے کے بعد بھی نگو کو دہاں پھین نہ ملا اور راج ماما اور ایک رانی کے اختلاف کی وجہ سے اسے راج محل سے نکلنا پڑا۔

راج ماما اور رانی دونوں کو شبہ تھا کہ نگو دوسرے فروق کے لیے اس کی جاسوسی کرتی ہے اس طرح اسے مردود کر کے اپنے شہیا کے سپرد کیا گیا کہ اس فتنے کو ہمیشہ کے لیے زمین میں دفن کر دیا جائے۔

اپنے شامیا نے نگو کے صحن کو دیکھا تو حیران رہ گیا اور اس نے اس کینز کو یہ کہہ کر فاطمہ بیگم (والدہ سلطان ٹیپو) کے حضور پیش کیا کہ یہ ایک بے سارا مسلمان لڑکی ہے اور آپ کے زیرِ سایہ وہ کر زندگی گزارے گی۔

فاطمہ بیگم کو نگو کی صورت ایسی پسند آئی کہ انہوں نے اسے اپنی کینزوں میں داخل کر لیا۔ یہ نگو کے عروج کا زمانہ تھا مگر کچھ دنوں بعد محل میں ایک سازش ہوئی اور اس سازش کا پورا الزام نگو کے سر قیوب دیا گیا۔

نگو والدہ سلطان کی خدمت میں نئی نئی آئی تھی اس لیے اپنی معافی پیش نہ کر سکی اور فاطمہ بیگم نے اسے قلعہ دار کے حوالے کیا کہ اس سازشی کینز کو قتل کر دیا جائے۔

مگر—

بدقسمت یا خوش قسمت نگو قتل ہونے سے بچ گئی کہ اس کی بھولی صورت نے بیمار بھی کام کیا اور قلعہ دار نے اسے اپنی دانت نہ بنا کے رکھ لیا اور فاطمہ بیگم کو یقین دلادیا کہ نگو اپنے انجام کو پہنچ گئی۔

نگو کو فاطمہ بیگم سے بہت محبت تھی۔ فاطمہ بیگم بھی اس کا بہت خیال رکھتی تھیں مگر جب فاطمہ بیگم نے نگو کا وہ دزاری کا ذرا خیال نہ کیا اور اسے سازشی سمجھنے پر اسے قتل کرنے کے لیے قلعہ دار کے حوالے کر دیا تو نگو کو بہت صدمہ ہوا۔ اور اس نے سوچ لیا کہ ایسی زندگی سے تو موت ہی

موت۔ موت نے ہی اسے نہیں بچایا اور قلعہ دار نے اسے داشتہ ہی نہیں بنایا بلکہ اسے ایک

زرخیز کو نڈی کی طرح اپنے دوست احباب کو پیش کرنا شروع کر دیا۔  
نگو کو تو اب ساری دنیا سے نفرت ہو گئی اور وہ اپنی زندگی ختم کرنے کی فکر میں لگ گئی اسی دوران ایک شب نگو نے قلعہ دار اور اپنے شامیا کی گفتگو کے دو ایک کالے سنے تو اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

اپنے شامیا اور قلعہ دار شراب پینے میں ایسے دھت فتنے کہ انہیں یہ بھی خیال نہ رہا کہ ایک کینز پر دس کے پیچھے کھڑی ان کی باتوں کو غور سے سن رہی ہے۔

بات یہ تھی کہ اپنے شامیا اور قلعہ دار نے یہ منصوبہ بنایا کہ شاہی حرم کی تمام خواتین کو گرفتار کر کے قید کر دیا جائے اور قلعہ میں سلطان ٹیپو کے جس قدر ہمدرد اور طرفدار ہیں ان سب کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔

یہ کام کرنے کے بعد سلطان ٹیپو کو اطلاع دی جائے کہ فاطمہ بیگم سخت بیمار ہیں۔ ظاہر ہے کہ سلطان والدہ کو دیکھنے کے لیے محاذ چھوڑ کر واپس آئے گا۔ پھر جیسے ہی سلطان قلعے میں داخل ہو قلعہ دار کے وفادار فوجی اس پر حملہ کر کے اس کا خاتمہ کر دیں۔

یہ باتیں سن کے نگو اپنا دکھ درد بھول گئی اور فاطمہ بیگم اور سلطان ٹیپو کو بچانے کی فکر میں لگ گئی۔

چنانچہ اسی رات جب قلعہ دار اور اپنے شامیا شراب پی کے ایسے مدموش ہوئے کہ انہیں تن بدن کا ہوش نہ رہا تو نگو چپکے سے قلعہ دار کی حویلی سے نکلی اور سیدھا فاطمہ بیگم کے محل پر پہنچی۔

نگو کو قلعہ دار کی حویلی اور فاطمہ بیگم کے محل کی تمام کینز میں اور غلام جانتے تھے اس لیے اس کی کوئی رک ٹوک نہ ہوئی۔ صرف اس وقت بات ذرا کچھ بگڑتی ہوئی معلوم ہوئی جب نگو نے فاطمہ بیگم کی کینز خاص سے فاطمہ بیگم کو بیدار کرنے کو کہا۔

کینز خاص فاطمہ بیگم کو جگاتے ہوئے ہچکچاہتی تھی۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ جس جگہ آج وہ کام کر رہی ہے اس جگہ نگو بھی کام کرتی رہی ہے اور فاطمہ بیگم اس کا بہت خیال رکھتی تھیں مگر سوال ان کو جگانے کا تھا جبکہ اس وقت شب نصف سے زیادہ گزر رہی تھی۔

"دیکھو نگو! میں تمہارے مقام اور مرتبہ کو جانتی ہوں۔" کینز خاص نے معذرتانہ انداز میں کہا: "مگر بغیر کسی خاص سبب کے میں ماور ملکہ کو کس طرح بیدار کر سکتی ہوں۔ تم بھی اگر میری جگہ

ہو نہیں تو یہ جرئت نہ کرتیں؟

ننگو ہر صورت اسی دقت فاطمہ بیگم سے ملنا چاہتی تھی اس لیے اس نے انتہائی خوشامد انداز سے ایک بار پھر درخواست کی:

”میری نیک بہن! میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ میں بلا سبب رات کے اس پسر مادرملکہ سے نہیں ملنا چاہتی بلکہ جیسا کہ میں نے تمہیں بنایا ہے کہ میرے پاس ایک شاہی راز ہے جو میں فوراً مادرملکہ تک پہنچانا چاہتی ہوں۔

کاش! میں تمہیں سب کچھ بتا سکتی۔ ہاں میں تمہیں یقینی دلائی ہوں کہ مادرملکہ اگر ناراض ہوئیں تو اس کی ساری ذمہ داری میں اپنے اوپر لے لوں گی۔“

”مگر ننگو! دیکھنا۔ میں... میں ایک معمولی کینز۔“ کینز خاص نے کہنا چاہا مگر ننگو نے اسے بولنے نہ دیا:

”ایک بات کان کھول کر سن لو۔“

اس نے تلخی سے کہا:

”اگر میرا اس وقت، مادرملکہ سے نہ مل سکی اور صبح کو انہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو میں تائی کی عدالت میں صاف کہہ دوں گی کہ اس کی ذمہ داری تم ہو۔ تم نے مجھے مادرملکہ سے ملنے نہیں دیا تھا۔“

ننگو کا یہ حربہ کامیاب ہوا اور کینز فوراً مادرملکہ کے پاس چل گئی۔ اس کے جانے کے بعد ننگو کو ایک اور فکر سنا نے لگی۔ وہ یہ کہ قلعہ دار نے مادرملکہ کو بتا دیا تھا کہ اس نے ننگو کو قتل کرا دیا ہے۔ اب جب کینز خاص یہ کہے گی کہ ننگو ان سے ملنا چاہتی ہے تو مادرملکہ کو کیسے یقین آئے گا۔

ننگو اسی شش و پنج میں مبتلا تھی کہ کینز خاص واپس آتی دکھائی دی۔ ننگو کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

اس نے آتے ہی کہا:

”ننگو! عجیب بات ہے۔ مادرملکہ تو ہمیں مردہ سمجھتی ہیں۔ جب میں نے انہیں بتایا کہ ننگو نے خود مجھے پکے پاس بھیجا ہے تو انہیں بڑی مشکل سے یقین آیا۔ مجھے بتاؤ تو یہ تمہارے مردہ ہونے کا کیا قصہ ہے؟“

”میری بہن!“

ننگو نے اسے جھجھوڑ ڈالا:

”میں تمہیں سب بتا دوں گی۔ پہلے تم یہ بتاؤ کہ مادرملکہ نے مجھ سے ملنے کے بارے میں کیا کہا ہے؟“

اُس نے ننگو۔ مادرملکہ تو تم سے ملنے کے لیے بے چین ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں تمہارے زندہ ہونے کی بہت خوشی ہے۔

کینز خاص نے ننگو کو بڑی سرعت سے بتایا اور اس کا ہاتھ پکڑ کے مادرملکہ کی خواب گاہ پر لے گئی۔

ننگو کو دروازے پر چھوڑ کر وہ ایک لمحوں کے لیے اندر گئی پھر واپس آکر بولی:

”جاؤ ننگو۔ مادرملکہ تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔“

ننگو جھپاک سے اس خواب گاہ میں داخل ہوئی جہاں کبھی اس کا بے دھڑک جانا نہ تھا۔ سامنے بڑے پتھر کھٹ پر بیٹھی مادرملکہ آنکھیں پھاڑے اسے متا دیکھ رہی تھیں۔

”اری ننگو۔ تو زندہ ہے۔ اللہ کا شکر ہے۔ مجھے سب معلوم ہو گیا۔ دشمنوں نے تجھ پر جھوٹا الزام لگا یا تھا۔“

اور ننگو نے فرش پر بیٹھ کر مادرملکہ کے پیرو پکڑ لیے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے آنسو جاری ہو گئے۔

فاطمہ بیگم نے ننگو کے سر پر ہاتھ تھپ تھپ کیا کہ اسے تسلی دی:

”ننگو! اب بتا کہ تجھ پر کیا گزری اور تیری زندگی کس طرح ہوئی؟“

ننگو نے آنسو پونچھتے ہوئے جواب دیا:

”مادرملکہ! یہ دقت ایسی باتوں کا نہیں ہے۔ میں تو آپ کو یہ اطلاع دیے آئی ہوں کہ قلعہ دار اپنے شامیانے آپ کو گرفتار کرنے اور میرے منہ میں خاک، سلطان معظم کو قتل کرنے کی سازش کی ہے۔“

مجھے یہ تو معلوم نہیں ہو سکا کہ اس سازش میں اور کون کون لوگ شامل ہیں بہر حال آپ اپنا جو انتظام کر سکیں کریں۔“

فاطمہ بیگم بہت فکر مند ہوئیں۔ انہوں نے پوچھا:

”نگو کہ کم از کم یہ تو بتا کہ تجھے یہ باتیں کس طرح معلوم ہوئیں اور ان کا ثبوت کیا ہے؟“

”مادر ملکہ۔“ نگو افسردگی سے بولی:

”میں کوئی ثبوت پیش نہیں کر سکتی مگر میں نے یہ باتیں اپنے کانوں سے سنی ہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ قلعدار نے مجھے اپنی داستانہ بنا کر اپنی حویلی میں رکھ چھوڑا ہے۔ اعلانے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ وہ مجھے اپنے دوستوں کی خدمت اور انہیں خوش کرنے پر بھی مجبور کرتا ہے۔ آج وہ دہلو حد سے زیادہ شراب پی گئے اور۔“

”دونوں سے تیری کیا مراد ہے نگو؟ یہ دوسرا کون ہے؟“ مادر ملکہ نے قطع کلام کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا۔

نگو نے سنبھل کے اور واضح الفاظ میں جواب دیا:

”مادر ملکہ۔ قلعدار کے بہت سے دوست ہیں جو اس کے پاس آتے جاتے رہتے ہیں لیکن اپنے خا میا اس کا گہرا دوست ہے اور وہ اپنی راتیں قلعدار کے ساتھ اس کی حویلی میں ہی گزارتا ہے اس وقت بھی وہ اور قلعدار شراب میں مہموش پڑے ہیں اور میں ان کی غفلت سے فائدہ اٹھا کر آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”اچھا۔ اب تو اطمینان سے میرے پاس رہ۔ میں ان کم بختوں کا ابھی انتقام کرتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے فاطمہ بیگم اٹھ کھڑی ہوئیں۔

”نہ مادر ملکہ۔ ایسا غضب بھی زیبیے گا۔“

نگو فاطمہ جوڑ کر ان کے سامنے کھڑی ہو گئی:

”یہاں کے کسی آدمی پر اعتماد نہ کیجیے۔“

فاطمہ بیگم نے اسے پیار سے دیکھا اور بولیں:

”اری تو باوٹی تو نہیں ہو گئی۔ آہز میں اپنی حفاظت کا کوئی انتظام تو کروں گی نا!“

”آپ انتظام ضرور کیجیے مادر ملکہ۔“ نگو نے جواب دیا:

”مگر اس طرح نہیں۔ آپ کسی طرح اس سازش کا حال سلطان معظم کے کانوں تک پہنچا دیں

وہ آپ ہی سب انتظام کر لیں گے۔“

فاطمہ بیگم فکر مند لہجے میں بولیں:

”اور اگر سلطان کے آنے میں دیر لگی تو یہ بد بخت نہ جانے کیا کر بیٹھیں۔ میں کیسے

سنبھالوں گی؟“

”آپ اطمینان رکھیے مادر ملکہ۔“

نگو نے انہیں تسلی دی:

”ابھی ان ظالموں کی سازش مکمل نہیں ہوئی ہے۔ وہ ابھی راج محل کی رانیوں سے بات چیت کر رہے ہیں۔ جتنی دیر میں ان کی بات چیت مکمل ہوگی، سلطان معظم کوئی نہ کوئی انتظام کر دیں گے۔“

”اچھا۔ میں ابھی کچھ کرتی ہوں۔“

فاطمہ بیگم نے اپنے محل کے داروغہ کو بلانے کے لیے ایک کینز کو بھیج دیا۔

”اچھا مادر ملکہ۔ اب مجھے اجازت دیجیے۔“

نگو اٹھ کے کھڑی ہو گئی:

”خدا آپ کو اپنی حفاظت میں رکھے۔“

”یہ تو کیا کہہ رہی ہے بیگم۔“

فاطمہ بیگم نے اسے گھور کے دیکھا:

”اب میں تجھے ان ظالموں میں واپس نہیں جانے دوں گی۔“

”مادر ملکہ۔“ نگو نے اطمینان سے کہا:

”میرا جانا بہت ضروری ہے۔ اگر میں واپس نہ گئی تو بات کھل جانے کا خطرہ ہے۔ پھر

اور مشکلات پیدا ہو سکتی ہیں۔“

نگو نے مادر ملکہ کو بمشکل سمجھایا اور بات ان کی سمجھ میں آ گئی۔

نگو کی اس اطلاع پر فاطمہ بیگم نے خفیہ طور پر ایک قاصد سلطان معظم کے پاس روانہ کیا اور

قاصد سے اس سازش کا پتہ چلتے ہی سلطان نے محمد علی کیدان کو دارالسلطنت سرنگاپٹم کے

امالات کی درستی کے لیے بھیج دیا تھا۔

محمد علی کیدان، بنگلور کے راستے سے سرنگاپٹم کے قریب پہنچا اور اس نے اپنی مختصر فرج

یہ ساتھ کھڑی گڑ میں قیام کیا۔ یہاں اس نے مشور کیا کہ وہ کرگ ہو نا ہوا حیدر نگر جا رہا ہے



قلعدار نے اطمینان سے کہا:

”مردار محمد علی کیدان کو ہمارا سلام کہنا اور ہماری طرف سے عرض کرنا کہ دارالسلطنت مرنگا پٹم آپ کا گھر ہے۔ آپ بے تکلف تشریف لا سکتے ہیں اور اپنے بال بچوں میں جتنے دن چاہیں گزار سکتے ہیں۔“

قاصد سلام عرض کر کے واپس ہو گیا۔

اجازت ملتے ہی محمد علی کیدان نے پچاس سوار اپنے ساتھ لیے اور باقی لشکر کو قلعہ کے ارد گرد چھب جانے کا حکم دیا۔ انہیں تجھا دیا گیا کہ جب قلعہ کے اندر بگل بجنے کی آواز بلند ہو تو وہ سیڑھیاں لگا کر قلعہ پر چڑھ آئیں اور پہرہ داروں کو قتل کر کے قلعہ پر قبضہ کی کوشش کریں۔

قلعدار نے قلعہ کے صدر دروازے کے پہرے داروں کو حکم بھجوا دیا تھا کہ محمد علی کیدان اور اس کے چند آدمیوں کو صدر دروازے کے اندر کے چھوٹے دروازے سے قلعہ میں داخل کر لیا جائے چنانچہ جب محمد علی کیدان اپنے ۵ آدمیوں کے ساتھ قلعہ کے دروازے پر پہنچا اور اپنے آنے کی اطلاع کو اٹی تو قلعہ کے پہرے داروں نے چھوٹا دروازہ کھول کے محمد علی کیدان اور اس کے ساتھیوں کو اندر داخل کر لیا۔

قلعہ مرنگا پٹم میں داخل ہوتے ہی محمد علی کیدان اور اس کے ساتھیوں نے تلواریں سونت لیں اور پہرے داروں پر ٹوٹ پڑے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے بگل بجانے شروع کر دیے۔ بگل کی آواز سننے ہی فصیل قلعہ کے قریب بھیجی ہوئی محمد علی کیدان کی فوج فصیل پر حملہ آور ہوئی اور سیڑھیاں لگا کر اوپر چڑھ گئی۔

فصیل کے پہرے دار گھبرا کر ادھر ادھر بھاگنے لگے۔ ان کی سچھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے۔

دوسری طرف محمد علی کیدان کے ساتھیوں نے پہرہ داروں کا صفایا کر کے قلعہ کا بڑا دروازہ کھول دیا اور باقی کا لشکر صدر دروازے سے قلعہ میں داخل ہو گیا۔

اس دو طرفہ حملے سے گھبرا کر محافظوں نے ہتھیار ڈال دیے یا پھر قتل ہو گئے اور محمد علی کیدان نے قلعہ پر قبضہ کر لیا۔

اس کے فوراً بعد محمد علی کیدان نے قلعہ دار اپنے شاہیا کی رہائش گاہوں کو گھر سے میں لے کر دونوں کو گرفتار کر لیا۔

جہاں کے حالات کچھ بگڑے ہوئے ہیں۔

کڑی لگنے امرنگا پٹم سے صرف چند میل کے فاصلے پر تھا۔ وہاں سے اس نے ایک قاصدے ذریعے قلعہ دار مرنگا پٹم کو ایک خط بھیجا جس میں اس نے درخواست کی کہ وہ کرگ کے راستے حیدرنگر جا رہے ہیں اس لیے اگر قلعہ دار اجازت دے تو وہ ایک رات اپنے بیوی بچوں کے ساتھ گوارے۔

محمد علی کیدان کا خط لے کر جب قاصد قلعہ دار کے پاس پہنچا تو اتفاق سے اس وقت اپنے شاہیا اس کے پاس ہی بیٹھا تھا۔

قلعدار نے خط پڑھ کر قاصد کو انتظار کرنے کے لیے باہر بھیج دیا۔ پھر اس سلسلے میں اس نے اپنے شاہیا سے مشورہ کیا۔

قلعدار نے اپنا خیال ظاہر کیا:

”اپنے شاہیا سردار محمد علی کیدان کا حیدرنگر جانے کا سبب ہے کہ ہمارے منصوبے کا ابھی تک کسی کو دقتی بھر پتہ نہیں اور سلطان اور اس کے حواری اپنے اپنے کاموں میں بگے ہوئے ہیں“

اپنے شاہیا نے ہلکا سا قہقہہ لگایا اور بولا:

”قلعدار ہاں درودہ منصوبہ ہی کیا جس کا راز کھل جائے۔ ہم نے اس قدر خفیہ طریقے سے کام شروع کیا ہے کہ کسی کو کاناں کان خبر نہیں ہو سکتی۔“

”پھر تمہارا کیا خیال ہے؟“ قلعہ دار نے پوچھا:

”محمد علی کیدان کو ایک رات کے لیے قلعہ میں آنے کی اجازت دے دی جائے۔ کوئی حرج تو نہیں اس میں؟“

”لوجی۔ یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔“

اپنے شاہیا ہنسا:

”محمد علی کیدان کو ایک رات قلعہ میں لے کر آنے کی اجازت ضرور ملنی چاہیے۔ یہ تو ہمارے منصوبہ کے لیے اور بھی بہتر ہو گا۔ اگر اس وقت تک کسی کو ہماری نیتوں پر شبہ ہو گا تو محمد علی کیدان کے قتل میں رات گزارنے سے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔“

اس وقت قلعہ دار نے اس کے قتل کے لیے حکم دیا کہ دریاقت کیا:

”ہم قلعہ دار کے حکم سے قلعہ میں داخل ہوئے۔ قلعہ دار نے بتایا ہوا جواب دہرا دیا۔“

یہ تمام کام اس قدر تیزی اور سلیقہ سے ہوا کہ قلعہ کے باسیوں کو اس کی اطلاع بھی نہ ہو سکی۔ صبح جب وہ سوکے اٹھے تو یہ دیکھ کے حیران رہ گئے کہ قلعہ کے محافظوں کے بجائے قلعہ پر محمد علی کیدان کا لشکر قابض ہے۔

خوڑی ہی دیر بعد قلعہ والوں کو قلعہ دار اور اپنے شامیہ کی سازش اور ان کی گرفتاری کا حال معلوم ہو گیا۔

قلعہ دار کی گرفتاری کے وقت اس خطہ کو سازش کی جڑ نگو، قلعہ دار کی جوبلی میں موجود تھی۔ وہ فوراً وہاں سے نکل کے شاہی محل پہنچی اور فاطمہ بیگم کے حضور پیش ہوئی۔ انہوں نے اسے بہت سا انعام دیا اور پھر اپنی خالص کینزوں میں شامل کر دیا۔

ایک روایت کے مطابق مادر ملکہ (فاطمہ بیگم) نے نگو کا عقد معزلی دروازے کے سردار کے جواں عمر بیٹے سے کر دیا تھا مگر نگو نے شوہر سے یہ اجازت حاصل کر لی تھی کہ وہ تمام دن فاطمہ بیگم کی خدمت میں رہے گی اور رات اپنے شوہر کے گھر گزارا کرے گی۔

دوسری صبح قلعہ دار اور اپنے شامیہ کا مقدمہ مادر ملکہ کے حضور پیش ہوا اور محمد علی کیدان نے فاطمہ بیگم کے حکم سے قلعہ دار اور اس کے کئی ساتھیوں کو توپ کے منہ سے باندھ کر اڑا دیا۔ اپنے شامیہ کے لیے حکم ہوا کہ سلطان کی واپسی تک اسے پابہ زنجیر قید خانہ میں رکھا جائے۔ چنانچہ اسے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ اسد خاں رسالدار کو قلعہ دار اور سید محمد خاں کو گورنر سرنگاپٹم مقرر کیا گیا۔

سرنگاپٹم سے فراغت حاصل کر کے محمد علی کیدان اپنے لشکر کے ساتھ منر لیں اراتا ہوا سلطان پٹو کے حضور پہنچا اور اسے سرنگاپٹم میں گزرے ہوئے تمام حالات سے آگاہ کیا۔ سلطان اس کی کارگزاری سے بہت خوش ہوا اور اسے خلعت فاخرہ عطا کی۔

اس کے بعد سلطان، محمد علی کیدان کو ساتھ لے کر حیدرنگر کی طرف بڑھا جہاں نواب مرحوم کے بے پناہ ایاز خاں نے اودھم مچا رکھا تھا۔

حیدرنگر پہنچنے سے پہلے یہ بتنا بہتر معلوم ہوتا ہے کہ ایٹ انڈیا کمپنی کے بڑے بڑے کارکن بلکہ کرنل جنرل تک ہمیں لڑتے جھگڑتے اور ایک دوسرے کے خلاف سازشیں

کرتے رہتے تھے۔

۱۷۸۱ء میں جنرل میجر نٹی بنگال سے مدراس کا گورنر ہو کے آیا۔ میگارنٹی اور جنرل کوٹ میں ہمیشہ سے کھٹ پٹ چلی آ رہی تھی۔

جنرل میگارنٹی، جنرل کوٹ سے اس قدر بغض رکھتا تھا کہ اس نے بنگال میں اپنے ایک دوست میکفر بین کو خط لکھا تو اس میں جنرل کوٹ کے بارے میں یہ جملے تحریر کیے:

”میرے خیال میں جنرل کوٹ کی حیثیت ایک عورت سے زیادہ نہیں۔ وہ جب بچوں جیسی حرکتیں کرتا ہے تو مجھے اس کے حال پر ہنسی آتی ہے۔“

اس وقت جنرل کوٹ کے پاس کرناٹک کے عاذا کی کانپٹی۔ جنرل میگارنٹی نے مدراس کا گورنر ہوتے ہی آڑ کوٹ کو بنگال واپس بھیجا دیا اور اس کی جگہ جنرل جیمز اسٹوارٹ کو کرناٹک اور پائیں گھاٹ کا محاذ سونپ دیا۔

انہو دنوں نواب حیدر علی خاں کا انتقال ہو گیا اور انگریز فوجوں کو آگے بڑھنے کا موقع مل گیا۔ جیمز اسٹوارٹ فوراً لشکر لے کر آگے بڑھا مگر اجماعی وہ وانڈی داس ہی پہنچا تھا کہ گورنر میگارنٹی نے اسے مدراس واپس بلا دیا اور اس کی جگہ جنرل میتھوز کو یہ محاذ دیا گیا۔

جنرل میتھوز کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ حیدرنگر کے زرخیز علاقہ پر جلد از جلد قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔

قارئین کو ارم جانئے ہیں کہ مرحوم نواب حیدر علی خاں نے ۱۷۶۲ء میں بد نور پر قبضہ کر کے اس کا نام اپنے نام پر حیدرنگر رکھا تھا۔ مرحوم نواب اس علاقہ کی شادابی اور سرسبزی سے اس قدر متاثر ہوئے کہ انہوں نے اسے اپنا دوسرا دارالسلطنت بنالیا۔ انہوں نے یہاں ٹکسال قائم کی اور بہت سی صنعتیں لگا کر اسے ایک خوشحال شہر میں تبدیل کر دیا۔

حیدرنگر زرخیز زمینوں اور شاداب علاقے پر مشتمل تھا۔ اس کے بیشتر حصے میں قیمتی لکڑی کے جنگلات تھے۔ یہاں کے گورنر ایاز خاں نے نواب بہادر کی موت کے اعلان کے ساتھ ہی طم بغاوت بلند کر دیا تھا اور انگریزوں سے ساز باز شروع کر دی تھی۔ چنانچہ جب جنرل میتھوز اندہ پور کے علاقہ پر قبضہ کے بعد حیدرنگر کے قریب پہنچا تو احسان فراموش ایاز خان، وہاں اس کے استقبال کو موجود تھا۔

جنوری ۱۸۸۳ء میں سلطان ٹیپو نے ایک خاص قاصد کے ذریعے حاکم حیدرنگر ایاز خاں کے نائب لطف علی بیگ کے نام ایک خط بھیجا جس میں درج تھا کہ ایاز خاں کی جگہ لطف علی بیگ کو حیدرنگر کا گورنر مقرر کیا جاتا ہے اور یہ کہ لطف علی کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ ایاز خاں کا سر قلم کر کے حضورِ سلطانی میں بھجوائے۔

قاصد سلطان کا خط لے کر حیدرنگر پہنچ تو گیا مگر وہ نہ تو ایاز خاں کو پہچانتا تھا اور نہ ہی لطف علی بیگ کو۔ اسی کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسی نے کسی شخص سے لطف علی بیگ کو پوچھا تو ایاز خاں کے آدمیوں کو اس پر شبہ ہو گیا اور وہ اسے پکڑ کر ایاز خاں کے پاس لے گئے۔

ایاز خاں نے قاصد سے اس کی جان بخشی کا وعدہ کیا اور اس سے سلطان کا خط حاصل کر لیا۔

ایاز خاں بالکل ان پڑھ تھا اس لیے وہ خط لے کر ایک برہمن کے پاس گیا۔ برہمن نے اسے

خط پڑھ کر سنا دیا۔ ایاز خاں خط کا مضمون سن کر گھبرا گیا کہ اگر کسی اور کو اس خط کا علم ہو گیا تو ایک طرف لطف علی اور اس کے وفادار دستے اس (ایاز خاں) کے دشمن ہو جائیں گے اور دوسری طرف وہ انگریزی فوج جو معاہدہ کر رہا ہے وہ کھٹائی میں پڑ جائے گا۔

یہ سب سوچ کے اس نے فیصلہ کیا کہ اس خط کے مضمون کو راز میں رکھنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس برہمن کو جہنم رسید کر دیا جائے۔

خط پڑھنے والا برہمن اب تک ایاز خاں کے سامنے انعام کی توقع میں کھڑا تھا کہ ایاز خاں نے اس کے سینے میں خنجر مارا کہ یہ راز جاننے والے اس پہلے اور آخری خرم راز کو ہمیشہ کیلے ختم کر دیا۔

ادھر سے فارغ ہو کر اس نے ایک انگریز قیدی کپتان ڈونالڈ کیمبل کو بلوایا اور اسے جیل میں بٹھوڑے کے نام ایک خط لکھوایا جس میں حیدرنگر کا قلعہ انگریزوں کے حوالے کرنے کے لیے اس میں دو شرطیں رکھی گئیں۔

پہلی شرط یہ تھی کہ قلعہ پر قبضہ کے بعد انگریز اسے (ایاز خاں کو) حسب سابق واپس لوٹنے کا حق رکھیں گے۔ دوسری شرط میں کہا گیا تھا کہ انگریز ایاز خاں کی دولت چھیننے کی کوشش نہیں کریں گے۔

میتھوز کو خط لکھا کہ ایاز خاں نے کیمپٹن کو آزاد کر دیا اور وہ خط لے کر جیل میں بٹھوڑے کے پاس پہنچا۔

شرائط میں کوئی قابل اعتراض بات نہ تھی چنانچہ جیل نے دونوں شرائط تسلیم کر لیں۔ ایاز خاں نے قلعہ کے دروازے انگریز فوج پر کھول دیے اور میتھوز بغیر ایک قطرہ خون بہائے حیدرنگر چلیے خوبصورت اور مالدار شہر پر قبضہ ہو گیا۔

سقو حیدرنگر کے بعد ایاز خاں کے حکم سے اردگرد کے بہت سے قلعے انگریزوں کے حوالے ہو گئے صرف قلعہ انت پور نے ایاز خاں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور حکومتِ ندوہ کی وفاداری کا اعلان کر دیا۔

انگریزوں نے اس قلعہ پر شدید حملہ کیا۔ قلعہ کے اندر صرف چار سو فوجی موجود تھے مگر انہوں نے اس قدر سخت مدافعت کی کہ انگریزوں کے دانت کھٹے ہو گئے۔

سلطان ٹیپو کے یہ وفادار شام تک مقابلہ کرتے رہے۔ رات لڑتے رہے جب ان کی تعداد ۲۰۰ سے بھی کم رہ گئی تب انہوں نے ہتھیار ڈال دیے مگر انگریزوں کو تسلیم کرنا پڑا کہ سلطان کے وفادار بڑے جوش و جذبہ سے مقابلہ کرتے ہیں۔ اس وفاداری کی یادداشت میں قلعہ کی آبادی کو شدید مصائب اور ذلت کا سامنا کرنا پڑا۔

انگریزوں نے بڑھو اور بچوں کو بے دریغ قتل کیا۔ عورتوں کی عصمت دری کی اور ان کے پستان کاٹ دیے۔ تمام خوبصورت لڑکیوں کو انگریز فوجی پکڑ کر لے گئے جن کا کوئی پتہ نہ چلا۔ یہ ہیں اس کمپنی اور دغا باز قوم کے سپاہ کار نامے جو تجارت کے پردے میں ہندوستان پر قابض ہوتی چلی جا رہی تھی اور خود ہمارے مفاد پرست بھائی ہند اس کی مدد کر رہے تھے۔

انگریز لشکر کی ان سپاہ کاریوں اور بد معاہدہوں پر اس قدر شور مچا کہ پورا ہندوستان گونج اٹھا۔ لوگوں نے ایٹ انڈیا کمپنی کی شکایت انگلستان تک پہنچائی۔ وہاں سے جواب طلبی ہوئی۔ ۵۲ افراد پر مشتمل ایک کمیشن بھیجا اور اس نے ماہ تحقیقات کر کے جو رپورٹ پیش کی اس میں

صرف یہ درج تھا:

”صرف ایک عورت قتل ہوئی اور ایک کے ساتھ بیہیمانہ سلوک ہوا، جس کے نتیجے میں وہ زخمی ہو گئی تھی۔ دو بچے لڑائی کے دوران مارے گئے تھے۔“

ہیل کے ٹوٹے ہوئے حصے سے باہر نکلے اور پانی بھر بھر کے اندر لے جانے لگے۔ اندھیرے کی وجہ سے پہلی رات تو سلطان لشکر کو کچھ بہتہ نہ چل سکا مگر دوسری رات کو سلطان کا لشکر پہلے سے نکلا تھا۔

قلعہ کے انگریز لشکر کی جب دوسری رات قلعہ سے نکل کے تالاب پر پہنچے اور انہوں نے بڑے سے ڈرموں، پیسوں اور برتنوں میں پانی بھرنا شروع کیا تو سلطان کے فوجی جو گھات لگائے بیٹھے تھے ان پر ٹوٹ پڑے۔

پانی بھرنے والے انگریزوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ تھی۔ انہوں نے مقابلہ کرنا چاہا مگر دمنٹ سے زیادہ نہ ٹھہر سکے اور مرہ پیر رکھ کر قلعہ کی طرف بھاگے۔ اس افرائقی میں انہوں نے اپنے سینکڑوں آدمیوں کو پیر دلتے پلے ڈالا۔ جو باقی بچے ان پر سلطان لشکر گویاں برسا رہا تھا۔ نتیجہ ہوا کہ باہر آنے والوں کی کثیر تعداد ماری گئی اور بہت کم فوجی زندہ بچ کر جا سکے۔

پانی نہ ملنے کی وجہ سے قلعہ والوں کی حالت روز بروز ابتر ہو رہی تھی۔ ان کے پاس سوائے مارٹر لانے کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا۔ چنانچہ میجور نے نائب قلعہ دار محمد علی شجاع کے توسط سے ایک گشتگرہ شروع کی۔

جنرل میجور نے خود اپنی طرف سے مندرجہ ذیل شرطیں لکھ کر سلطان کے پاس بھیجیں اور سلطان دینین دلا یا کہ اگر سلطان ان شرطوں کو تسلیم کر لیں تو قلعہ اور شہر ان کے حوالے کر دیا جائے گا۔

شرائط:

۱۔ انگریز فوج جب قلعہ خالی کر کے نکلے تو شہر کے لوگ اور سلطان کے فوجی ان کے منہ پر نہ تو تھوکیں گے نہ گالی دیں گے اور نہ زخمی کریں گے۔

۲۔ انگریزی فوج صرف اپنا نجی سامان اپنے ساتھ لے جائے گی۔ بندوقیں، توپیں اور دوسرا سامان حرب سلطان لشکر کے قبضہ میں دے دیا جائے گا۔

۳۔ انگریزی فوج کے قبضہ میں سلطنت، خدا واد کا جو درہیم، مال اور سامان ہو گا وہ سب کا سب سلطان کو دیا جائے گا۔ اگر کسی فوجی کے پاس سے کوئی رقم یا مال نکلے گا تو اسے سخت سزا

یہ رپورٹ میجر جے۔ ایس۔ ٹوریانو نے تیار کی تھی۔

اس کے علاوہ شاہی نوکرانہ کے سرجن جان موڈی نے بیان دیا تھا کہ: "قتل ہونے والی عورتوں اور بچوں کی تعداد صرف چھ تھی۔"

ان متضاد بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریزوں نے قلعہ کے تمام عورتوں، بچوں اور بوڑھوں سے جو کچھ بھی نہ کیا وہ قتلوار ہے۔ برطانوی حکمرانوں اور لشکر کی داستانیں اس قدر بھیاںک اور ہیما نہ ہیں کہ جن کے تصور سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

سلطان ٹیپو کو انگریزوں کے ظلم و ستم کی تمام داستانیں ایک ایک کر کے پہنچ رہی تھیں۔ اس کے غضب کا پارہ پڑھتا جا رہا تھا۔ آخر وہ چند ہی روز بعد شیر کی طرح گر جتا اور دھاڑتا نہ زور کے میدان میں پہنچ گیا۔ انگریز فوجیں بھی اس کے سامنے آکر صف آرا ہوئیں۔ اس وقت سلطان نے ایک جنگی جال چلی۔

وہ انگریزوں کو دھوکا دے کر ان کے عقب میں پہنچ گیا اور ادھر سے حملہ کرنا ہی چاہتا تھا کہ مخبری ہو گئی اور انگریزوں کو پتہ چل گیا کہ سلطان ٹیپو کا لشکر پشت سے حملہ آور ہونے والا ہے۔ یہ خبر پانے ہی جنرل میجور فوراً اپنے لشکر کو لے کر قلعہ میں واپس چلا گیا اور قلعہ بند ہو گیا۔ سلطان ٹیپو نے آگے بڑھ کے قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور سلطان ٹیپو نے قلعہ پر آگ برسانا شروع کر دی۔

کتنے ہیں کہ قلعہ کے اندر تفصیل کے ساتھ ہی ایک بہت بڑا کنواں تھا۔ قلعہ کی واحد کنواں تھا جس سے پورے قلعہ والے پانی حاصل کرتے تھے۔ ادھر تفصیل قلعہ پر رات دن گولہ باری کا سلسلہ جاری تھا۔

اس شدید گولہ باری کا یہ اثر ہوا کہ تفصیل کا وہ حصہ جس کے نیچے بڑا کنواں تھا اٹوٹ کر کنویں پر گری اور کنواں بند ہو گیا۔

کنواں کیا بند ہوا کہ ہر طرف سے العطش العطش کی صدائیں بلند ہونا شروع ہو گئیں اور لوگ پیل سے تڑپنے لگے۔

قلعہ سے باہر ایک تالاب تھا۔ انگریز فوجی پیاس سے بے دم ہو رہے تھے۔ ایک رات وہ

دی جائے گی۔

- ۴۔ انگریزی فوج کو حفاظت سمندر تک پہنچایا جائے گا۔  
۵۔ سلطنتِ خداداد کے چند جہاز انگریزی فوج کو واپس لے جانے کے لیے دیے جائیں گے اور سفر کے لیے انہیں اناج اور دوسرا ضروری سامان بھی دیا جائے گا۔ جس کی قیمت وہ اپنی منزل پر پہنچ کر بھجوا دیں گے۔

۶۔ جو لوگ خشکی کے ذریعے جانا چاہیں گے ان کی حفاظت کے لیے جیسی تک۔ ایک حفاظتی دستہ دیا جائے گا۔

۷۔ سلطنتِ خداداد کے دو بڑے افسر انگریزوں کے جہازوں پر سوار ہونے تک بطور یہغال انگریزوں کے پاس رہیں گے اور اسی طرح انگریزوں کے دو افسر سلطان کے پاس رہیں گے۔ جب سلطان افسر واپس آجائیں گے تو انگریز افسر واپس کر دیے جائیں گے۔

**سلطان ٹیپو اور انگریزی فوج کے جنرل میتھوز (جو حیدرنگر کے قلعہ میں محصور تھا)**  
اس کے درمیان جو معاہدہ ہوا تھا، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ انگریز فوج کی جانبیں پوری طرح سلطان کے ہم درگم پر تھیں اور ان کے چشم و ابرو کے ایک اشارے پر ان کا خاتمہ ہو سکتا تھا۔

سلطان ٹیپو نے بھی اس دقت اسی شرافت اور رحمدلی کا ثبوت دیا جو اس کے والد مرحوم و اب حیدر علی خاں نے صلحِ مدراس کے موقع پر دکھائی تھی۔ اس صلح نامہ میں بھی ایسی ہی آسان شرائط تھیں جن پر بعد میں مسلمانوں نے خود اعتراض کیا تھا کہ ظالم اور فریب کار انگریزوں کے ساتھ اسی قدر آسان شرائط پر نواب بہادر کو صلح نہیں کرنی چاہیے تھی۔

تاہم اس کو کیا کیا جائے کہ "چور چوری سے جانا ہے مگر میرا پھیرا سے نہیں جاتا" کے مسداق انگریز قوم کے لیے دنیا کی تمام اقوام کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ انگریز دنیا کی سب سے زیادہ مکار، فریبی اور احسان فراموش قوم ہے۔ چنانچہ اس قدر آسان شرائط پر صلح کے باوجود اس قوم نے اپنی فطری مکاری اور فریب کاری کا دامن نہ چھوڑا اور خود اپنے جال میں پھنس گئی۔ اس معاہدہ کا نام "معاہدہ منگلور" رکھا گیا تھا۔

اس کی ایک شرط یہ تھی کہ انگریز فوج اپنے ساتھ مولائے اپنے ذاتی سامان کے قلعہ کے آس پاس سامان یا مال و دولت میں سے کچھ بھی اپنے ساتھ نہیں لے جائے گی اور اگر کوئی ایسا کرے گا تو اسے

یہ شرائط صبح کو جنرل میتھوز نے لکھ کر اپنے دستخطوں کے ساتھ سلطان کے پاس بھیجیں۔ سلطان انہیں تسلیم کرتے ہوئے ان پر دستخط کر دیے۔ یہ معاہدہ انگریزی اور فارسی زبان میں لکھا گیا۔ اسی طرح ۱۸ روز کی جان توڑ کوشش کے بعد قلعہ پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔ اسی فتح کے موقع پر کسی شاعر نے فی البدیہہ یہ تاریخ لکھی تھی:

حیدرنگر گرفتہ

۱۱۹۷ھ

فوجیوں کی جامہ تلاشی سے جو میرے جواہرات برآمد ہوئے ان کا ایک اونچا ڈھیر  
دش پر لگ گیا۔  
سلطان کا غصہ انتہا کو پہنچ گیا۔ اس نے بیچ کر کہا:

"کس قدر مکار اور بے ایمان جو تم لوگ، تم نے معاہدے پر عمل کرنے سے پہلے ہی اس  
کی دھجیاں اڑا کے رکھ دیں۔

تم لوگ اس ملک کے بامیوں کو احمق سمجھتے ہو۔ تم نے ہماری زمی اور رحمدلی سے ناجائز  
فائدہ اٹھایا ہے۔ تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہارے ساتھ کوئی رعایت کی جائے۔ ہم اس معاہدہ کو  
منسوخ کرنے کا اعلان کرتے ہیں۔"

معاہدہ منسوخ کرنے کے بعد سلطان نے حکم دیا کہ:  
"انگریزی فوج اور جنرل میٹھوز کو سرنگا پٹم پہنچایا جائے اور ان سب کو قید میں رکھا جائے۔"  
اس طرح انگریزی فوج جو معاہدہ کے مطابق بغیر ایک جان ضائع کیے بیٹھی پہنچ سکتی تھی،  
خوابچی بے ایمانی اور مکاری کے ہاتھوں قید خانے میں پہنچ گئی۔

حیدرنگر کا باغی قلعہ دارا باز خاں پہلے ہی منگور بھاگ گیا تھا۔ اسے جب حیدرنگر پر سلطان  
کے قبضہ اور انگریز فوج کی گرفتاری کی اطلاع ملی تو وہ منگور سے بھاگ کے سورت پہنچا۔ پھر  
جب اسے وہاں بھی خطرہ محسوس ہوا تو انگریزوں کے پاس بھی پہنچ گیا۔

جنرل میٹھوز اس شکست اور گرفتاری سے اس قدر دل برداشتہ ہوا کہ قید کے دوران  
بیمار ہوا اور کچھ دنوں بعد مر گیا۔

انگریزوں نے میٹھوز کی موت پر بہت شور مچایا۔ انہوں نے الزام لگایا کہ سلطان نے  
اسے زہر دے کر مار ڈالا ہے۔

یہ بات کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ اگر سلطان کو میٹھوز کو ختم کرنا ہی مقصود ہوتا تو اسے زہر کیوں  
دیتا۔ وہ تو اسے معاہدہ کی بدعہدی کی پاداشی میں گولی سے اڑوا سکتا تھا۔

حیدرنگر کی تسخیر کے بعد سلطان پٹنہ لشکر لے کر منگور کی طرف بڑھا۔ راستہ میں جاسوسوں  
نے اطلاع دی کہ کرنل گیمبل ایک بڑے لشکر کے ساتھ حیدرنگر جارہا ہے تاکہ وہاں انگریز فوج

سخت مزادی جلائے گی۔

اس کھلی ہوئی شرط کے باوجود انگریز فوجیوں نے مکاری، فریب کاری اور ہیرا پھیر  
سے کام لیا۔

سلطان نے معاہدہ کے تحت انگریز فوج کی قلعہ سے روانگی سے پہلے اپنے ایک سردار  
قلعہ میں بھیجا کہ وہ جاکر خزانہ پر قبضہ کر لے اور لوگوں سے دریافت کرے کہ انگریزوں  
کسی معاملہ میں بددیانتی یا خود در دسے کام تو نہیں لیا۔

لوگوں سے تو کچھ معلوم نہ ہو سکا البتہ جب خزانہ دیکھا گیا تو معلوم ہوا کہ وہ بالکل خالی  
پڑا ہے۔

اس اطلاع پر سلطان کو سخت غصہ آیا۔ اس نے میٹھوز کو بلا کر سخت باز پرس کی۔  
"جنرل میٹھوز، کیا قصہ ہے کہ خزانہ بالکل خالی پڑا ہے جبکہ اس میں کروڑوں روپے  
میرے جواہرات موجود تھے؟"

میٹھوز نے صاف انکار کر دیا:

"میں یا میرے کسی آدمی نے حیدرنگر کے خزانے کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔"

سلطان کا غصہ تیز ہو گیا۔

"تم نے ہاتھ نہیں لگایا تو کیا خزانہ فرشتے اٹھا کے لے گئے؟"

"مجھے اس بارے میں کچھ علم نہیں۔"

میٹھوز اپنے انکار پر اڑ گیا۔

سلطان نے حکم دیا:

"انگریز فوج کے سرسپاہی کے سامان اور لباس کی تلاشی لی جائے۔"

چنانچہ انگریز فوجیوں کو قطاروں میں کھڑا کر کے جامہ تلاشی شروع ہوئی۔

اب ذرا اس قوم اور افراد قوم کی مکاری ملاحظہ ہو۔

جس سپاہی کی جامہ تلاشی لی گئی اس کے لباس کی اندر کی تہوں میں میرے جواہرات پھرے ہوئے  
نکلے۔ لباس کے علاوہ فوجیوں نے ساتھ لے جانے والی روٹیوں کے اندر، پاپٹ اور حقوں کی تہ  
اور پینڈوں کے اندر، یہاں تک کہ ساتھ لے جانے والے بکروں کی گردنوں میں سے جو ہیرے  
جواہرات برآمد ہوئے۔

کی مدد کرے۔

سلطان نے فوراً کرنل کیمبل پر حملہ کا حکم دے دیا۔ اس وقت سلطان کے پاس ایک لاکھ چالیس ہزار جانا زوں کا لشکر تھا۔

سلطانی لشکر میدان کے کنارے ایک تالاب پر مورچے لگائے اور توپ خانہ نصب کیے کیمبل کا منتظر تھا۔ کیمبل نے بھی سامنے آ کر لشکر ترتیب دیا اور جنگ پر آمادہ ہوا۔ سلطان نے توپ خانہ کو اتنا رہ کیا۔ توپ خانہ نے اس قدر گولے برسائے کہ آسمان پر دھوئیں کے بادل چھا گئے۔

کیمبل نے بھی جوابی گولہ باری کی۔ دونوں لشکروں میں دوپہر تک جنگ ہوتی رہی۔ پھر انگریزوں کا گولہ بارود ختم ہو گیا اور کیمبل کو میدان چھوڑنا پڑا۔ اس کے تین ہزار سپاہی ہتھیار ڈال کر گرفتار ہوئے اور ایک ہزار فوجی انگریز بھی پکڑ لیے گئے۔

جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے کہ سلطان منگلور کی طرف جارہا تھا کہ درمیان میں کرنل کیمبل سے دو دو ٹکڑے کرنا پڑے۔ ادھر سے فارغ ہو کر سلطان پھر منگلور کی طرف روانہ ہوا اور وہاں پہنچ کر شہر کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرے کو تین ماہ گزرے تھے کہ بارش کا موسم شروع ہو گیا اور اس قدر برسات ہوئی کہ سارا علاقہ جل ہی ہو گیا۔

اس دوران سلطان کو خبر ملی کہ دشمن کو سمندر کے راستے رسد مل رہی ہے۔ چنانچہ سلطان نے چار پانچ جنگی کشتیاں سمندر میں اتار دیں۔ ان کشتیوں نے سمندر سے بچنے والی رسد کو بالکل روک دیا۔

منگلور کے محاصرہ کے طول کھینچنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں اور فرانسیسیوں میں معاہدہ دارستانی ہو گیا تھا جس کی سولہویں شق کے مطابق ان دونوں قوموں میں جنگ بند رہے گی۔ یہ جنگ یورپ میں بند ہوئی تو دونوں فریقوں نے تجارت میں بھی اپنے اپنے طور پر جنگ بند کر دی۔

سلطان کے لشکر میں فرانسیسی فوج بھی تھی۔ اس معاہدہ کی اطلاع پا کر اس نے بھی رٹنا بند کر دیا کیونکہ اس کے مقابلہ پر انگریز تھے۔ فرانسیسیوں کی اس خاموشی نے بھی منگلور کے محاصرہ کو طول دیا۔

موسلا دھار بارشوں کے باوجود سلطان نے منگلور کے محاصرے میں کوئی نرمی نہیں برتی۔ اس نے فرانسیسی فوج کی خاموشی کو بھی نظر انداز کر دیا۔

جوں جوں محاصرہ طول پکڑ رہا تھا تلخہ کے محصورین کی بے بسی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ مدراس کے گورنر لارڈ میکارڈنی کی کوشش تھی کہ کسی بھی طرح سلطان سے صلح ہو جائے لیکن کلکتہ و بنگال گورنر لارڈ ہسٹنگز جانتا تھا کہ سلطان سے اس کی شرائط پر صلح کی جائے۔ اس سلسلے میں اس نے کلکتہ سے براہ راست دو کمشنروں کو سلطان کی طرف روانہ کیا تھا جو بارشوں کی وجہ سے راستے میں پھنسے ہوئے تھے۔

سلطان نے منگلور کے محاصرے میں اور زیادہ شدت پیدا کر دی تھی۔ اس پر گھبرا کر منگلور کے محصورین نے ڈنڈیگل میں انگریز فوج کے کرنل فلنٹن کو مدد کے لیے بھیجا۔ کرنل فلنٹن نے اطلاع ملنے ہی فوجوں کو تیار کیا اور ڈنڈیگل سے روانہ ہو گیا مگر بجائے منگلور جانے کے اس کا رخ سرنگاپٹم کی طرف تھا۔

کرنل فلنٹن کا خیال تھا کہ ڈنڈیگل سے منگلور جانا، جو وہاں سے ڈھائی سو میل دور تھا، اس سے یہ زیادہ بہتر اور مفید ہو گا کہ وہ سرنگاپٹم پر حملہ کر دے جو نسبتاً قریب تھا۔ اس حملہ کی خبر جب شیو سلطان کو پہنچی کہ تو وہ دارالسلطنت کو بچانے کے لیے منگلور کا محاصرہ ختم کر کے واپس ہو جانے لگا۔

چنانچہ کرنل اپنے منصوبہ کے مطابق پالا گھاٹ پہنچا اور اس پر قبضہ کر کے آگے بڑھا۔ یہ وہ وقت تھا کہ بنگال کے گورنر ہسٹنگز کے دونوں کمشنر سرنگاپٹم پہنچ چکے تھے اور وہاں کے گورنر معین الدین سید صاحب سے ان کی صلح کے سلسلے میں گفتگو شروع ہو چکی تھی اور بات آگے بڑھ رہی تھی۔

اسی دوران سید صاحب کو کرنل فلنٹن کے پالا گھاٹ پر قبضہ کرنے کی خبر ملی۔ سید صاحب نے اس اطلاع پر صلح کی گفتگو روک دی اور کرنل فلنٹن کو خط کے ذریعے پیغام بھیجا کہ وہ ڈنڈیگل واپس ہو جائے مگر مغرور فلنٹن نے اس خط کو پڑھنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی اور اسے لانے والے کو واپس دے دیا۔ اس کا لشکر اب کو بمبوتر پہنچ چکا تھا اور اسے یقین تھا کہ وہ جلد ہی سرنگاپٹم پر قبضہ کر لے گا۔

کو بمبوتر کے قبضہ کے دوران کرنل فلنٹن کو دونوں کمشنروں کا بھی ایک خط ملا جس میں تحریر تھا

دو نوں کشنڑیاوس ہو کر سلطان سے ملاقات کے لیے روانہ ہو گئے۔

اُدھر کرنل کیمبل اور اس کی انگریز سپاہ کا محاصرے میں ہوا حال ہیروانا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ کرنل کیمبل نے کسی ذریعے سے جنرل میکلوڈ کو بھی اپنی مدد کے لیے بلوایا تھا۔ کرنل میکلوڈ کئی جہازوں میں سامان اور فوجی بھر کر منگور کے قریب ساحل سمندر پر تو پہنچ گیا مگر اسے خشکی پر کوئی ایسی جگہ نظر نہ آئی تھی جہاں اتر کر وہ محصورین کی مدد کے لیے پہنچ سکے۔

ایک دن اس نے جہاز ساحل سے لگا کر سامان اور فوج اتارنے کی کوشش کی مگر اسے جلد ہی یہ احساس ہوا کہ اسے گہرے میں لیا جا رہا ہے۔ یہ محسوس کرتے ہی اس نے فوراً سامان جہازوں پر لاد دیا اور سوار ہو کر گہرے سمندر میں پہنچ گیا۔ اور مشہور یہ کر دیا کہ ساحل پر پانی اور رسد کا معقول انتظام نہیں تھا۔

ایک ہفتہ سے زیادہ جہازوں کو سمندر میں گمانے پھرانے کے بعد کرنل میکلوڈ کنا نور کی طرف چلا گیا۔ وہاں کی رانی نے کرنل میکلوڈ کے جہاز کے غلہ اور کچھ فوجیوں کو قید کر رکھا تھا۔ کرنل میکلوڈ نے کنا نور پر آسانی سے قبضہ کر لیا اور اپنے ساتھیوں کو قید سے آزاد کر لیا۔ اس نے کنا نور سے حاصل ہونے والے مال غنیمت پر خود قبضہ کر لیا۔ جب عیسائی حکومت نے اس سے مال غنیمت کا حساب مانگا تو اس نے جواب بھجوا دیا کہ:

”میں نے مال غنیمت کا نصف حصہ یعنی ۲۳۱۲۱ روپے اپنے لیے رکھ لیے اور باقی نصف حصہ سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جو ان کا واقعی حق تھا۔“

”قلعہ منگور کا محاصرہ بھی کچھ عجیب تھا۔ سلطان نے بازار کھلوا دیے تھے اور لوگوں کو سامان خریدنے کی عام اجازت تھی۔ اس کے باوجود قلعہ کی نصف محصورین پر شمل آبادی، جو بھوک پیاس اور بیماری سے بچ گئی تھی، اس نے تنگ آ کر قلعہ کا دروازہ کھول دیا اور صلح کا پرچم اُسی باہر آ گئی۔ سلطان نے ان سب باہر آنے والوں کو قیدی بنایا۔ ان قیدیوں میں کرنل کیمبل بھی شامل تھا۔“

کہ وہ آگے نہ بڑھے کیونکہ صلح کی گفتگو اپنے آخری مراحل میں ہے مگر کرنل فلرٹن نے اس صلح کی بھی کوئی پرواہ نہ کی اور سرنگاپٹم کی تسخیر کے لیے فوجیں آگے بڑھائیں۔

اٹھائے راہ کرنل فلرٹن کی ملاقات، پادری فریڈرک شوارز سے ہوئی۔ شوارز کشنڑوں کا ایک پیغام لے کر سلطان کے پاس بارہا تھا۔ اس نے کرنل فلرٹن کو سامنا ہوتے ہی کہا: ”کرنل۔ انتہائی افسوس کی بات ہے کہ سلطان سے صلح کی بات چیت چل رہی ہے اور کامیابی کی نوبت سے فیصلہ امید ہے۔ لیکن تم نے ایسے موقع پر بالاکھاٹ اور کوئٹہ کو نہ وبالاکر کے رکھ دیا ہے۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ سلطان اس اطلاع کے بعد صلح نامے پر دستخط کرے گا؟ میرا خیال ہے کہ وہ ہرگز ایسا نہیں کرے گا۔“

پادری نے خود ہی سوال کیا اور خود ہی اس کا جواب دے دیا۔

اس پر کرنل نے مسکرا کر مگر بڑی رکھائی سے جواب دیا:

”فادر۔ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یعنی میں آپ کو کوئی جواب ہی نہیں دیتا؟“ پادری اپنا سامنہ لے کر رہ گیا اور کرنل کی طرف سے رخ پھیر کر اسی وقت سلطان کی طرف روانہ ہو گیا۔

سرنگاپٹم میں وہاں کے گورنر معین الدین سید صاحب اور دو نوں کشنڑوں میں صلح کی گفتگو بارہا لگتی اور اس کے ساتھ ہی ساتھ کرنل فلرٹن کے برابر آگے بڑھنے کا اعلانات بھی موصول ہو رہی تھیں۔

انہی روز سید صاحب کو سلطان کا ایک مختصر مگر انتہائی اہم پیغام ملا۔ یہ پیغام روشن خاں لے کر آیا۔ اس نے سید صاحب سے بیان کیا:

”سید صاحب آپ کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ کرنل فلرٹن کی پیشقدمی روکنے کے لیے چار ہزار سواروں کا ایک دستہ روانہ کر دیا گیا ہے۔ یہ دستہ گرہٹ ہلی گاٹ کے قریب فلرٹن کو روکنے کے لیے پہنچ چکا ہے۔“

یہ پیغام سننے ہی سید صاحب نے ددڑر کشنڑوں سے مزید گفتگو کرنے سے انکار کر دیا اور



کر لی کھیل کو قلعہ کے ہمراہ کے پہلے ہی دن تپ ہو گیا تھا۔ چنانچہ سلطان نے اسی کی بیماری کے پیش نظر اسے اپنی فوج کے ہمراہ بھیجی جانے کی اجازت دے دی مگر بد قسمت کر لی کہیں ایک ماہ بعد ٹی بی کے مرض سے بھیجی میں انتقال کر گیا۔  
دونوں کمشنروں کا وفد منگلور کے قریب پہنچا تو سلطان کی طرف سے دوا فردوں نے ان کا استقبال کیا۔ وفد نے سلطان کی خدمت میں جو تحفہ بھیجا اس میں ایک مرتضیٰ طائی خلعت، سرخ اور سبز زربفت کی ایک چادر، سرخ اور نیلے رنگ کی ایک اور چادر، ایک تلوار، ایک ہاتھی اور دو گھوڑے شامل تھے۔  
وفد سے صلح کی گفتگو کا آغاز ہوا۔

سلطان کی طرف سے پورنیا اور کمرشن راؤ نے نیات کی جو کڑ بند تھیں۔ سلطان نے جو صلح نامہ مرتب کر کے بھیجا، اس کی شرائط حسب ذیل تھیں:

۱۔ مالابار کے ساحل پر انگریزی متبوضات واکزار کر دیے جائیں، جن کے بدلے میں اتنی ہی تعداد کے کرناٹک کے قلعے سلطان کو دیے جائیں۔

۲۔ جزائر نما کے اطراف میں تمام انگریزی متبوضات مع ان ۵۵ ہزار گھوڑوں کے جو کرناٹک فکرن نے بالاد گڈ میں حاصل کیے، واکزار کیے جائیں۔

۳۔ غلام زادہ ایاز خاں کو سلطان کے حوالے کیا جائے۔

۴۔ کمشنر اس وقت تک کرناٹک کی طرف واپس نہ جائیں جب تک ہر معاملہ پورے طور پر طے نہ ہو جائے۔

انگریزوں نے شرطوں میں سے ایاز خاں کی واپسی اور گھوڑوں کی واکزاری ملنے پر تیار نہ تھے۔ صلح کی بات جیسے نہ نکلا، ہونے لگی تو کمشنروں نے منگلور سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا مگر راز فاش ہو گیا۔

آخر ۱۱ مارچ ۱۷۹۲ء کو معاہدہ طے پایا۔

معاہدہ کی ۹ شرطیں تھیں۔ بن کی رو سے:

فریقین ایک دوسرے سے جنگ نہ کریں گے۔

اور نہ ایک دوسرے کے دشمنوں کی مدد کریں گے۔

فریقین کے علاقوں کو واکزار اور قیدیوں کو واپس کر دیا جائے گا۔

آبنود اور سات گڑھ کے قلعے سلطان کے پاس رہیں گے۔

کرناٹک اور ڈنڈیگل کے قلعے اس وقت تک انگریزوں کے پاس

رہیں گے جب تک دوسری شرائط پوری نہیں ہو جائیں۔

اس صلح نامے میں مندرجہ بالا ۵۵ ہزار گھوڑوں کی واپسی کا کوئی ذکر نہ تھا۔

اس کے بعد ہی گورنر اس میں کاربھی اور گورنر جنرل ملارڈ سمیٹنگز کو انگلستان واپس بلا لیا گیا

اور میکفرسن قائم مقام گورنر جنرل کا کام کرنے لگا۔

معاہدہ منگلور سلطان کی ایک زبردست فتح تھی۔ اس لیے جب سلطان منگلور سے سرنگاپٹم

پہنچا تو وہاں نظاما دکن اور پونا کے مرہٹہ پیشوا کے نمائندے اسے اندریں پیش کرنے اور مبارکباد

دینے کو حاضر تھے۔

دونوں ممالک کے نمائندوں کو سلطان نے خلعتیں اور جو اہرات عطا کیے لیکن مرہٹہ سردار نے

ساتھ ہی اپنا خراج طلب کر لیا۔

سلطان اس بے موقع مطالبہ پر غضب ناک ہو گیا۔ اس نے مرہٹہ پیشوا کے نمائندے کو

تلخ لہجہ میں جواب دیا:

’کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ نواب مرحوم حیدر علی خاں نے تمہارے اکسانے پر پاٹیں گھاٹ کی

جنگ لڑی تھی جس میں سلطنت کا سارا خزانہ اور ممالک محروسہ کے تین سالہ عسول کی رقم بھی خرچ

ہو گئی تھی اور تم نے منصوبے اور معاہدے کے باوجود اس جنگ میں نواب مرحوم کا کوئی ساتھ

نہیں دیا تھا۔

اس کے بعد حیدرنگر کے احسان فراموش صوبیدار نے بھی دھوکہ دیا اور سلطنت کی تمام

دولت لے کر بھاگ گیا۔ ہم نے دشمن سے حیدرنگر کو واپس لے لیا مگر اس کے خزانے کا ایک

پیسہ بھی واپس نہیں مل سکا۔

پھر جب ہم تخت نشین ہوئے تو نواب مرحوم کی وراثت میں چند توپوں، بندو قوں، تلواروں

اور ڈھالوں کے سوا ہمیں کچھ بھی نہ ملا۔

اس وقت ہمارا خزانہ بالکل خالی ہے البتہ سلطنت کے بند و بست کے بعد تمہاری رقم کی

ادائیگی کا حکم دے دیا جائے گا۔

اس کے ساتھ ہی سلطان نے محمد عثمان کو جو نواب مرحوم کا قدیم ملازم تھا، چند تحفے دے کر  
پلونا کے سفیر کے ساتھ روانہ کیا تاکہ مرہٹے دوبارہ میسور پر نہ چڑھ دوڑیں۔

محامرو اور فتح حیدرنگر کے بعد ایک دردناک واقعہ پیش آیا جس کے ذکر ہی سے رد گھٹے  
کھڑے ہو جاتے ہیں۔

یہ واقعہ نواب مرحوم حیدر علی خاں کے دست راست، اور سلطان پٹنہ کے عظیم سردار  
محمد علی کیدان کی خودکشی ہے۔

یورپی مؤرخین نے اپنی خواہش کا اس میں بھی ثبوت دیا ہے اور اس کی ساری ذمہ داری  
سلطان ٹیپو پر ڈال دی ہے حالانکہ سلطان نے جو بھی قدم اٹھایا وہ اصول مملکت کے اعتبار سے  
بالکل درست تھا۔

واقعہ یوں ہے کہ نواب بہادر حیدر علی خاں کے انتقال کے بعد مملکتِ ندوادی میسور میں ہمسو  
شورشیں اور بغاوتیں پھوٹ پڑیں جن کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس میں ایک بغاوت حیدرنگر کے گورنر  
ایاز خاں کی تھی۔

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ایاز خاں ایک ہندو بچہ تھا جسے حیدر علی نے پالا تھا اور جوان ہونے  
پر اپنا لے پانک بیٹا بنایا تھا۔

ایاز خاں کے دل میں کیا تھا، اس کا تو کسی کو علم نہیں لیکن بظاہر وہ نواب مرحوم کا بڑا وفادار  
اور تابعدار دکھائی دیتا تھا۔ چنانچہ نواب مرحوم نے اسے حیدرنگر کا گورنر مقرر کر دیا تھا۔

حیدرنگر جس کا پہلا نام بدوڑ تھا، اسے نواب نے ترقی دے کر ایک بڑے شہر میں تبدیل  
کر دیا تھا اور یہ سرنگاپٹم کے بعد سلطنتِ خداداد کا سب سے بڑا شہر بن گیا تھا۔

ایاز خاں کے دل میں جو کچھ تھا وہ نواب بہادر کی وفات کے ساتھ ہی سامنے آ گیا اور اس  
احسان فراموش اور نیک حرام نے سلطان پٹنہ کے خلاف بغاوت کر کے حیدرنگر کو انگریزوں کے  
حوالے کرنے کے لیے سودے بازی شروع کر دی۔

ایاز خاں اگرچہ گورنر تھا مگر حیدرنگر کا قلعہ دار قاسم علی خاں تھا۔ اس کا یہ فرض تھا کہ جب

ایاز خاں کے قدم بلکے تھے تو اسے سمجھانا یا پھر سلطان کو اس کی خبر کرنا کیوں وہ خود اس سازش میں  
شریک ہو گیا۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ انگریزوں نے قاسم علی خاں کو قلعہ دار کے ساتھ ساتھ نائب گورنر  
بنانے کا لالچ بھی دیا تھا۔

بہر حال کچھ بھی ہو، قاسم علی خاں بھی اس بغاوت میں شریک ہوا اور حیدرنگر کا قلعہ جنگ  
کے بغیر انگریزوں کے حوالے کر دیا گیا۔

پھر جب حیدرنگر فتح ہوا تو ایاز خاں جان بچا کر مدراں بھاگ گیا اور مدراں قاسم خاں نے محمد علی  
کیدان سے پناہ طلب کر اور اس کی پناہ میں آ گیا۔

قاسم علی خاں کے محمد علی کیدان کی پناہ میں آ جانے کی خبر جب سلطان کو پہنچی تو اس وقت وہ  
خاموش رہا کہ اسے منگلوڑ پہنچنے کی جلدی تھی لیکن جب منگلوڑ بھی فتح ہو گیا اور انگریزوں نے ہتھیار  
ڈال دیے تو سلطان نے قاسم علی خاں کو سب کے سامنے بلایا اور اس سے باز پرس کی۔

سلطان کو قلعہ دار قاسم علی خاں کی غداری پر سخت غصہ تھا۔ اس نے بڑے ضبط سے  
قاسم علی خاں سے سوال کیا:

"یہ بنا کہ قلعہ حیدرنگر میں غذا کے ذخائر، سامان جنگ، منظم فوج اور مدافعت کے تمام  
سامان موجود ہونے کے باوجود تو نے قلعہ بغیر جنگ کے انگریزوں کے حوالے کیوں کر دیا؟"

قاسم کے ہاتھ پیر کا پیر رہے تھے۔ اس نے لرزتا آواز میں کہا:

"سلطان معظم — سلطان معظم — ایاز خاں نے سب کچھ —"

"جو اس مت کر۔"

سلطان نے اسے ڈیڑھ دیا:

"تو اس کا نام کیوں لیتا ہے۔ اس غلام زادے نے اپنی کم ظرفی کی بنا پر کفرانِ نعمت اور  
بغاوت کی راہ اختیار کی لیکن تو تو شریف زادہ تھا۔ تو نے اپنے ناموس پر کیوں بٹے لگا یا اور  
اتنے مضبوط قلعے کی پاسبانی کے فرائض سے کیوں منہ موڑا؟"

"سلطان معظم۔"

قاسم علی خاں نے خود کو سنبھالنے کی کوشش کی:

"بلاشبہ قلعہ میں سامانِ جنگ، آلاتِ حرب اور رسد کے تمام ذخائر موجود تھے لیکن ایاز خاں کے

تا کہ میں حکم سلطان کے تحت اسے دار پر چڑھاؤں مگر سردار کیدان نے میری درخواست کے جواب میں کہا کہ قاسم علی خاں ان کی پناہ میں ہے اور بہتر ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے ورنہ اسے دار پر چڑھانے سے پہلے انہیں پھانسی دینا ہوگی۔

سلطان نے قتل اور جرد باری کا مظاہرہ کرتے ہوئے قاسم کی پھانسی اُس دن کے لیے منسوخ کر دی اور محمد علی کیدان کو ننہانی میں طلب کر لیا۔

”سردار محمد علی کیدان! آپ کو معلوم ہے کہ قاسم علی خاں سلطنت کا مجرم ہے اور اسے پھانسی کا حکم دیا جا چکا ہے اس لیے قانون اور حکومت کا دقار برقرار رکھنے کے لیے اسے پھانسی دینا لازمی ہے۔“

سردار محمد علی کیدان نے سلطان کو کوئی جواب نہ دیا۔ ہاں مگر وہاں سے اٹھا اور بغیر سلام کے واپس آ گیا۔

سلطان کو اس کا یہ رویہ ہنسٹا۔ آمیز اور ناگوار گزرا مگر اس نے پھر بھی قتل کا دامن نہ چھوڑا اور اس کی سابقہ کارگزاریوں اور وفاداریوں کی وجہ سے خاموش ہو رہا۔

دوسرے دن سپاہیوں نے قاسم علی خاں کو سردار کیدان سے حاصل کر لیا اور اسے دار پر چڑھانے کے لیے قتل کی طرف لے چلے۔

ابھی وہ قتل میں پہنچے ہی نہ تھے کہ سردار کیدان ہاتھی پر سوار وہاں پہنچ گیا۔ اس نے قاسم کو سپاہیوں سے چھین کر اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹھالیا۔

اس قانون شکن اور ناروا حرکت کے ساتھ ہی اس نے مجمع کی طرف دیکھا جو قاسم کی پھانسی کا تماشا دیکھنے کے لیے وہاں موجود تھا اور جیج کر کہا:

”جو شخص میرے ساتھ آنا چاہے بے خوف و خطر آجائے۔“

مقتل میں عوام کے علاوہ بڑی تعداد میں فوجی دستے موجود تھے۔ ان میں کچھ لشکری ایسے تھے جو سردار کیدان کی کمان میں جنگ کر چکے تھے اور اس کی سپہ گری کے قائل تھے۔

چنانچہ اس کی آواز پر دو تین سو آدمی اس کے ساتھ ہو لیے۔

اب اس کا رخ سرنگا پٹم کی طرف تھا۔ اس کے ارادے کیا تھے؟ اس کا کسی کو علم نہ تھا۔

مگر بظاہر یہ کھلی ہوئی بغاوت تھی۔

محمد علی کیدان کے اس اقدام کی خبر فوراً سلطان کو پہنچائی گئی۔

اشارے پر نائیکوں نے میرے حکم سے سرتابی کی اور بغیر میری اجازت کے دشمنوں سے ملاش کر کے انہیں قلعہ میں داخل ہونے کا موقع فراہم کر دیا۔ اس لیے میں مجبور ہو گیا۔ میں قلعہ سے نکل کر حصو، تک کیسے پہنچ سکتا تھا؟“

یہ سب سراسر جھوٹ تھا اور قاسم علی خاں کی مکاری تھی۔ اس نے ایاز خاں کی بغاوت کی نہ صرف حمایت کی تھی بلکہ سلطانی فوجوں کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

سلطان نے اس کے عذر پر اس سے دہرا سوال کیا:

”اگر تیرا یہ کہنا درست ہے کہ تیرے ماتحتوں نے تیرا حکم ماننے سے انکار کر دیا تھا، تو تو نے اس کی خبر سلطان یا سلطانی لشکر کو کیوں نہیں بھجوائی؟ تیرے خود آنے کی کیا ضرورت تھی؟ تو یہ خبر کسی بھی خبر کے ہاتھ بھیج سکتا تھا۔ اس سے ثابت ہو تا ہے کہ تو نے غداری کی تھی اور اب تو جان بچانے کے بہانے تراش رہا ہے۔“

قاسم کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا!

سلطان نے اس سلسلے میں اراکین سلطنت سے مشورہ طلب کیا اور سب نے یک زبان ہو کر اس غداری گردن مار دینے کا مشورہ دیا۔

چنانچہ سلطان نے اس کے لیے پاسی کا حکم دے دیا۔

دوسرے دن بخشی زین العابدین کو حکم پہنچا کہ وہ عدار قاسم علی خاں کو پھانسی پر چڑھا دے، شاہی حکم کے تحت زین العابدین خاں، محمد علی کیدان کے پاس گیا اور کہا:

”سردار مجرم! مجھے حکم پہلے ہے کہ میں قاسم علی خاں کو پھانسی پر چڑھا دوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ آپ قاسم خاں کو میرے حوالے کر دیں تاکہ میں شاہی حکم کی تعمیل کر سکوں۔“

محمد علی کیدان نے سراٹھا کر بخشی زین العابدین کو دیکھا اور لاپرواہی سے جواب دیا:

”بخشی! کیا تمہیں معلوم نہیں کہ قاسم میری پناہ میں ہے۔ بہتر ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے ورنہ اسے پھانسی پر چڑھانے سے پہلے مجھے پاسی لگانا ہوگی۔“

بخشی، محمد علی کیدان کے مرتبہ سے واقف تھا اس لیے اس نے بھٹ نہ کی اور نہ ہی قات کو زبردستی اس سے چھیننے کی کوشش کی بلکہ وہ وہاں سے خاموشی کے ساتھ اٹھا اور سیدہ

حضور سلطان میں حاضر ہوا۔

”عالی باہ! میں نے سردار محمد علی کیدان سے کہا کہ قاسم علی خاں کو میرے حوالے کر دیجے

موت کی مزا اور کچھ کے ناک بان کاٹنے کا حکم ہوا۔  
مزا پانے والوں نے اس کا مورد الزام محمد علی کیدان کو ٹھہرایا۔ وہ چیخ چیخ کے پکارنے لگے کہ:

اے خانہ خراب ہم تیری وجہ سے برباد ہو گئے۔ تیری ہمدردی میں ہمارے ناک بان کاٹے گئے اور تجھے صرف نظر بندی کی مزا ملی۔ خدا تیرا بیڑہ غرق کرے۔

محمد علی کیدان اپنے ساتھیوں کی آہ وزاری سے بہت پریشان، مژمندہ اور لیشمان تھا۔ اسے ایک مکان میں نظر بند کر دیا گیا۔

اور۔

اس نے پہلی ہی رات کو اماں کی کئی چاٹ کے اپنی زندگی ختم کر لی۔ اماں اس کی انگوٹھی میں نکلنے کی جگہ جڑا، اٹھا۔

ایک اور بیان میں کہا گیا ہے کہ محمد علی کیدان نے قید خانے میں اپنی زبان باہر کھینچ کے جان دیدی تھی۔

سلطان کو جب محمد علی کیدان کی خود کشی کی خبر ملی تو اسے افسوس ہوا۔

محمد علی کیدان بہت خوبصورت تھا۔ وہ ایک بہترین شہسوار، شہنشاہ اور سالار فوج تھا۔ اس نے بڑے بڑے موتیوں پر اپنی ذہانت سے دشمنوں کو شکست سے دوچار کیا تھا۔ ان خوبصورتی کے ساتھ ساتھ اس کی فطرت اور غریب پروری سب سے اہم خوبی تھی۔ اس دھڑلے پر دونوں وقت دس بیس فقر ضرور موجود ہوتے تھے۔

محمد علی کیدان کی سخاوت اور دیادلی کا یہ حال تھا کہ اسے تنخواہ اور تنخواہ کے علاوہ جو کچھ الغام میں حاصل ہوتا وہ تمام اپنے سپاہیوں یا فقیروں میں بانٹ دیا کرتا تھا۔ یہاں تک کہ اگر شاہی خزانہ بھی کہیں اس کے ہاتھ لگ جاتا تو وہ بھی اس کی دیادلی اور سخاوت کی صیغہ چڑھ جاتا تھا۔

مگر۔

اس کے ساتھ ساتھ وہ ایک انسان، ایک بندہ بشر بھی تھا۔ اس میں خوبصورتی کے ساتھ کچھ سیوہ بھی تھے۔

اس نے اپنے گھر پر کبھی توجہ نہیں دی۔ خود سری اور ضد کا یہ عالم تھا کہ ایک بار نواب مرحوم

شاہ اسرار محمد علی کیدان نے مقتل میں پہنچ کے قاسم کو زبردستی سپاہیوں سے چھین لیا ہے اور اب وہ اسے اپنے ساتھ ہاتھی پر بٹائے سرنگا پیٹ کی طرف جا رہا ہے۔ اس نے درغلز کرد و تین سو سپاہیوں کو اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور وہ اس کے جلو میں رواں دواں ہیں۔

سلطان کے چہرے پر گہری شکنیں ابھر رہیں اور اس نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔ وہاں تقریباً سب ہی مردار موجود تھے۔

سلطان نے غصے سے کانپتے ہوئے حکم دیا،  
غازی خاں! تم اور سید حمید ان کے پیچھے جاؤ اور جس طرح بھی ہو انہیں واپس لے کے آؤ۔

سلطان کا حکم پاتے ہی غازی خاں اور سید حمید دربار سے اٹھے اور چند دستے ساتھ لیکر تیزی سے محمد علی کیدان کے تعاقب میں روانہ ہوئے۔

مردار کیدان مشکل سے چار کوس پہنچا تھا کہ غازی خاں آندھی اور طوفان کی طرح اس کے سر پر پہنچ گیا۔

اس نے اپنا گھوڑا ہاتھی کے سامنے روکا اور بولا:

”مردار محمد علی کیدان! حکم سلطان ہے کہ میں آپ کو آپ کے ان حواریں سمیت ہر صورت میں واپس لے جاؤں۔ آپ واپس چلنے کو تیار ہیں یا نہیں؟“

اس وقت محمد علی کیدان کا دماغ شاید ٹھکانے تھا۔ اس نے قبل بان کو ہاتھی واپس موڑنے کا حکم دیا۔ غازی خاں کے دستوں نے ان لوگوں کے گرد گھیر ڈال دیا۔

ہاتھی واپس ہوا تو باغی دستے جس اس کے ساتھ ہی واپس چلنے لگے۔ غازی خاں ان سب کو حراست میں لیے ہوئے سلطان کے حضور پہنچا۔

سلطان کی نظر سب سے پہلے قاسم پر پڑی۔ اس نے فوراً حکم دیا:

”اس خداری گردن اڑا دی جائے۔“  
جلاد کہیں قریب ہی موجود تھا۔ اس نے سلطان کے حکم کی فوراً تعمیل کی اور عجب مہم اپنے کیفر کردار کو پہنچ گیا۔

پھر سلطان نے محمد علی کیدان کو نظر بند کرنے کا حکم دیا اور باغی سپاہیوں میں سے کچھ کو

نے اسے اسی خود سری کی بنا پر سزا دل کر دیا تھا اور اب اسی سزا اور خود سری نے اس کی جان لے لی تھی۔

سناوت کی انتہا یہ تھی کہ مرنے کے بعد اس کے گھر سے ایک ٹوٹی اور چند پڑے کپڑوں کے علاوہ اور کچھ نہ نکلا۔ اور اس کی بیوہ کو مادرِ ملکہ نے اپنے سایہِ عافیت میں لے کر اس کے گزر اوقات کا بندوبست کیا۔



یہ عجیب بات تھی کہ سلطان شیو کو، سلطان بنے پندرہ ماہ ہو چکے تھے اور اُسے اب ہمہ دارِ سلطنت کی صورت دیکھنا نصیب نہ ہوا تھا۔ آخر فتح منگور کے بعد سلطان نے سرنگاپٹم کا رخ کیا۔

راستے میں مختلف بناؤں کو فرو کرنے کے لیے بل اور کورگ کی طرف لشکر روانہ کیے اور کچھ سرکشوں کی گرفتاری کرتا ہوا سلطان عین موسم گرما میں سرنگاپٹم میں وارد ہوا۔ سلطان کے ورود پر عائدینِ سلطنت نے اس کا پُر جوش استقبال کیا کیونکہ یہ پہلا موقع تھا کہ سلطان دارِ سلطنت میں بحیثیت سلطان کے تحت سلطنت پر متمکن ہوا تھا۔ اس کی آمد پر شاہی عملات میں چراغاں کیا گیا۔ ہندو راج عکوں میں بھی دکھاوے کا اظہار خوشی کیا گیا۔ راج مانا لکشم اور رانی دیواجی مئی نے سلطان کو نذرین بھیجوائیں۔

سلطان نے فوراً انتظامِ سلطنت پر توجہ دی۔ عاملِ سلطنت کو ذرا میں بھیجے گئے اور سلطنت نداداد کے گوشوارے مرتب کیے گئے۔

ان گوشواروں کی رو سے مندرجہ ذیل صورتحال سامنے آئی:

- ۱۔ شاہی خزانے میں کل اسی کروڑ روپے کے ہیرے جواہرات موجود تھے۔
- ۲۔ جانوروں میں ۹۰۰ ہاتھی، ۶۰۰ اونٹ، ۶۰ ہزار گھوڑے، ۴ لاکھ گائیں، ۶۰ لاکھ بھیڑیں بکریاں اور دیگر سارے سامان تھا۔

- ۲- سلطنت خداداد کی وسعت ۸۰ ہزار مربع میل تھی جس میں ساحل مالابار کے ایک ہزار جزیرے بھی شامل تھے۔
- ۴- سالانہ خراج ۲ کروڑ روپے تھا۔
- ۵- آبادی ۶۰ لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔

سلطان نے سب سے زیادہ توجہ عسکری نظام پر دی اور اپنی اصلاحات اور اختراعات کو فتح الہیادین کے نام سے مرتب کرایا۔ یہ کتاب میرزین العابدین شومتری کے نام سے مشہور ہے جس کا تعلق ایران کے علاقہ شومتر سے تھا۔ وہ حیدر آباد کن کے وزیر میر عالم کا چھوٹا بھائی تھا اور ٹیپو سلطان کی خدمت میں عرصہ سے چلا آ رہا تھا۔

سلطان نے اپنے فوجی نظام کو مندرجہ ذیل خطوط پر استوار کیا:

- ۱- فوج کا سپہ سالار سلطان خود ہوتا تھا۔
- ۲- اس کے ماتحت ۲۳ سالار ہوتے تھے جن میں سے گیارہ مرن مرزا کا پٹم میں رہتے تھے۔
- ۳- ہر سالار کے تحت بیس سے تیس تک مردار ہوتے تھے۔
- ۴- سلطان کی کل فوج ۳ لاکھ ۲۰ ہزار تھی جو مختلف قلعوں اور سرحدی پجوں میں موجود رہتی تھی۔
- ۵- فوج کے پاس ۹۰۰ ہاتھی، ۶ سو اونٹ، ۲۰ ہزار گھوڑے، ۲ لاکھ بیل، ۳ لاکھ توڑے دار بندوقیں، ۳ لاکھ چھماق دار بندوقیں، ۲ لاکھ ۲۲ ہزار تلواریں اور ۹۲۹ توپیں مع گولہ بارود کے موجود تھیں۔
- ۶- سلطانی فوج ۵ ہزار ڈویژن پر مشتمل تھی۔
- ۷- ہر ڈویژن میں ۲۷ رجمنٹیں (قشون) ہوتی تھیں۔
- ۸- ہر رجمنٹ (قشون) میں چار سالے پیادوں کے اور ایک رسالہ سواروں کا ہوتا تھا۔
- ۹- ہر رسالہ میں ۱۳۹۲ سپاہی ہوتے جن میں ۱۰۵۶ بندوقی اور ایک توپ خانہ ہوتا تھا۔

- ۱۰- ہر توپ خانے میں ۲۸ توپچی ہوتے تھے۔
- ۱۱- سو سپاہیوں کو "جوق" کا نام دیا گیا۔
- ۱۲- ایک جوق میں دو سرخیل (چوڑے سردار) دس جمدار اور دس دفدار ہوتے تھے۔
- ۱۳- سواروں کے دستے کو "عسکر" کہتے تھے جن میں ۳۰۰ سواروں کو ٹیپ کہا جاتا تھا۔
- ۱۴- رسالہ کا سردار رسالدار اور جوق کا سردار جوقدار کہلاتا تھا۔
- ۱۵- ہر رسالے میں چار ٹیپیں ہوتی تھیں اور ٹیپ کا سردار ٹیپ دار کہلاتا تھا۔
- ۱۶- عسکر کے نقیب کو شرباشون (انگریزی و اجینین) کہا جاتا اور قشون اور رسالہ کے نقیب کو سیاقچی کہا گیا تھا۔

سلطان ایک خالص اسلامی فوج ترتیب دینا چاہتا تھا اس لیے فتح الہیادین کے پہلے باب میں عقائد، نماز، نماز کو نوشی، غداری، انکح حرامی، ترکہ، وراثت اور جہاد وغیرہ کے مسائل بیان کیے گئے تھے۔ آخری باب میں سرکار امدالہی فوج کے لیے فوجی ترانے، رد و فارسی اشتعار، مختلف جانوروں کے کاٹنے اور ان کے زہروں کا علاج درج کیا گیا ہے۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ سلطان نے منگلور سے مرزا کا پٹم روانگی کے دوران بعض ملاؤں پر فوج کشی کے لیے لشکر روانہ کیے تھے۔ ان میں ایک لشکر پنڈور اور دن ہلی کی لرن بھی گیا تھا۔

اس لشکر میں سید غفار، امام خاں اور سید عمر شامل تھے۔ دوسری مہم زکندہ کی سرکوبی کو روانہ کی گئی تھی۔ سلطان کے ان دونوں لشکروں نے ماطرخواہ کامیابی حاصل کی۔

سلطان کی تیسری مہم "کورگ" کے خلاف تھی۔ یہ بڑی اہم مہم تھی۔ یہاں کے لوگ ہمیشہ سے ہی بغاوتیں کرتے رہتے تھے۔ نواب حیدر علی خاں مرحوم کے زانے میں بھی یہاں کئی بغاوتیں ہوئی تھیں۔ اب سلطان ٹیپو نے بہ نفس نفیس اس مہم پر جانے کا ارادہ ظاہر کیا اور بارہ ہزار یادہ، دس ہزار سوار اور بائیس ضرب توپ لے کر نکلا۔

سلطان جب کوگ کی سرحد پر پہنچا تو اس نے سواروں کو پرہیز کیا، سدا پورا اور منظر آباد پر حملہ کا حکم دیا اور خود پیادہ فوج کے ساتھ اندرون ملک بڑھا۔ سلطان کا مقابلہ رن منڈل پر باغیوں سے ہوا۔ سلطانی لشکر فرانسسیسی سالار موسیہ لائی کے زیرِ کمان قلعہ پر حملہ آور ہوا اور ایک سخت مقابلہ کے بعد ملن ہلی اور خوشمال پور پر سلطان کا قبضہ ہو گیا۔

باغیوں نے میدان میں مقابلے کے بجائے گھنے جنگلوں میں پناہ لے لی اور وہاں سے سلطانی لشکر پر شب خون مارنے کا سلسلہ جاری کیا۔

سلطان ایسے حالات سے نواب مرحوم کی زندگی میں گزر چکا تھا۔ اس نے فوراً جنگل کاٹنے کا حکم دیدیا۔ پھر باغیوں کے مقابلہ کے لیے حسین علی خاں بخشی ناٹھ، میر محمد دہام خاں اور موسیولائی کو روانہ کیا۔

سلطان آٹھ ماہ تک کوگ میں مقیم رہا۔ اس عرصہ میں پورا کوگ از سر نو تسخیر ہوا۔ میر حسین خاں بخشی نے یہاں بڑی ناموری پیدا کی اور اس کا نام ”بنی نواب“ پڑ گیا۔ بنی کے معنی آگ کے ہوتے ہیں یعنی ”آگ کا نواب“۔

ایک انداز سے کے مطابق اس جنگ میں انتہی ہزار مرد اور عورتیں گرفتار ہوئے۔ ان میں ان کے دوسرے دارموی ناٹھ اور دونوں کا ٹہر بھی شامل تھے۔

سلطان نے گرفتار ہونے والوں کے سامنے اسلام پیش کیا اور ان لوگوں نے قبول کر لیا چنانچہ سلطان نے ان نو مسلموں کی باقاعدہ ایک الگ فوج بنائی جس کا نام ”جماعت احمدی“ رکھا گیا۔ یہ فوج بالکل اُس طرح کی تھی جس طرح سلطان ترکی نے ”بنی چری“ فوج بنائی تھی۔

کوگ کی زمین قیمتی ٹکڑی ہے شاد پھل، پھول اور پھلوں سے بھری پڑی تھی۔ یہاں کی عورتیں بہت خوبصورت تھیں جنہیں دیویاں یا پریاں کہا جاتا تھا۔ ان کے جسم پر بہت مختصر لباس ہوتا تھا۔ یہاں کے مردوں میں قوتِ مردی کی کمی ہوتی تھی چنانچہ ایک عورت سے چار چار مرد شادی کرتے تھے اور ان کی اولاد مشترک کہلاتی تھی۔

جس زمانے میں سلطان وہاں ٹھہرا ہوا تھا تو اس کے سامنے ایک بہت دلچسپ مقدمہ

پیش ہوا۔ اس کے سامنے چار مردوں اور ایک عورت کو لایا گیا۔ وہ سب آپس میں جھگڑ رہے تھے۔ سلطان نے جھگڑے کی نوعیت پوچھی تو اسے بتایا گیا کہ: ”یہ چاروں اس عورت کے شوہر ہیں۔“ سلطان اس پر چونکا اور اس نے وضاحت طلب کی۔

ایک ترجمان نے بتایا:

”عالی جاہ۔ اس علاقے کے مردوں میں قوتِ مردی کی اس قدر کمی ہے کہ چار چار مرد صرف ایک عورت سے شادی کرتے ہیں اور ان کی جو اولاد ہوتی ہے وہ چاروں باپوں میں تقسیم کر دی جاتی ہے۔“

سلطان کی تیوریاں چڑھ گئیں۔ اس نے لشکر کے قاضی کو بلوایا اور ان سے دریافت کیا: ”کیا ایک عورت سے بہ یک وقت چار مرد شادی کر سکتے ہیں؟“

قاضی نے جواب دیا:

”عالی جاہ۔ اسلام میں جس طرح ایک مرد کو بعض تعظیلات کے ساتھ یک وقت چار عورتوں سے شادی کی اجازت ہے۔ اسی طرح اس علاقے میں رواج ہے کہ ایک عورت چار بھائیوں کے ساتھ شادی کر سکتی ہے اور باری باری سے ایک ایک رات ہر مرد کے ساتھ گزار سکتی ہے۔ اس رواج کو یہاں محبوب نہیں سمجھا جاسکتا اس لیے کہ ایسا کرنا ان کی ضرورت ہے۔“

سلطان کے دریافت کرنے پر قاضی نے مزید وضاحت کی:

”یہاں کے مردوں میں قوتِ مردی کی بہت کمی ہے بلکہ اکثر مرد بالکل نامرد پیدا ہوتے ہیں اس لیے ایک عورت کو چار مردوں کی ضرورت پڑتی ہے اور اسے چاروں مردوں کے ساتھ رہنے کی اجازت ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ یہاں کے لوگ عام طور پر ناجائز اولاد ہیں۔ ہم اس حرام کاری کی ہرگز اجازت نہیں دے سکتے۔ یہ رسم آج سے متروک کی جاتی ہے۔“

سلطان کے اس اعلان کے بعد اصل جھگڑا پیش ہوا۔

ان چار مردوں میں اختلاف یہ تھا کہ ان کی مشترکہ بیوی کے چار بچے پیدا ہوئے تھے۔

اس لیے وہاں کے دستور کے مطابق ہر مرد ایک بچے کا باپ تھا لیکن چاروں میں سے ایک مرد کو دعویٰ تھا کہ اُن چاروں مردوں میں سے صرف وہی ایک مرد ہے اور چاروں بچوں پر صرف اس کا حق ہے۔

اس سلسلے میں جب عورت کا بیان کیا گیا تو اس نے اس بات کی تصدیق کی کہ ان چاروں میں سے واقعی صرف ایک مرد میں قوت مردی ہے باقی سب اس طاقت سے محروم ہیں۔

اس بیان کی روشنی میں قاضی نے فیصلہ دیا کہ چاروں بچے اس مرد کو دے دیے جائیں جو عورت کے بیان کے مطابق مرد تھا۔

مگر عورت نے قاضی کے اس فیصلے کی شدید مخالفت کی۔ قاضی نے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے وجہ بتانے سے انکار کر دیا۔

اب یہ مقدمہ سلطان کے سامنے رکھا گیا۔

سلطان کو اگرچہ اس مقدمے سے نفرت سی ہو رہی تھی لیکن سلطان ہونے کی حیثیت سے اسے کچھ نہ کچھ فیصلہ تو کرنا ہی تھا۔

سلطان نے بھی عورت سے کئی سوال کیے۔ اس نے تمام سوالوں کے جواب دیے لیکن اپنی مخالفت کی وجہ بتانے سے انکار کرتی رہی۔

آخر سلطان نے ایک ایسا فیصلہ کیا کہ سب کی عقل دنگ رہ گئی۔

سلطان نے حکم دیا:

”چاروں بچوں کو پیش کیا جائے۔“

بچے پیش کیے گئے تو سلطان نے جلد کو بلوا کر حکم دیا:

”چاروں بچوں کو ان کی ماں کے سامنے قتل کر دیا جائے۔“

یہ حکم سنتے ہی عورت دھاڑیں مار مار کر رونے لگی اور دہائیاں دینے لگی۔ اس نے ہاتھ بھڑکے قاضی سے التجائی کہ وہ سلطان سے قتل کا حکم واپس لینے کے لیے کہے۔ میں اصل وجہ بتانے پر تیار ہوں۔

سلطان نے دراصل عورت کی زبان کھلوانے کے لیے ہی یہ حکم دیا تھا۔ سلطان کے حکم واپس لینے پر عورت نے قاضی کو بتایا کہ:

”جب مجھے معلوم ہوا کہ میرے چار میں سے تین شوہر ناکارہ ہیں اور صرف ایک شوہر میرے

پورے حقوقِ زوجیت ادا کرنے میں ناکام ہے تو مجھے مجبوراً تین اور مردوں سے تعلقات پیدا کرنے پڑے۔ اس لیے ایک بچہ میرے اس شوہر کو دیا جائے اور باقی تین اُس مردوں کو دیے جائیں جو خفیہ طور پر میرے پاس رہتے تھے۔“

قاضی نے یہ تفصیل سلطان کو بتائی تو اسے اس بات پر اور زیادہ گھن آئی۔ اس نے حکم صادر کیا:

”اس علاقے میں حرام کاری درحرام کاری کی جو رسم جاری ہے وہ فوراً غمخ کی جاتی ہے۔ یہاں کے تمام بچوں کی پرورش شاہی نگہداشت میں ہوگی۔“

چنانچہ تمام بچوں کو شاہی پرورش میں دے دیا گیا۔ اس سے ان لوگوں میں سے اسی فیصد سے زیادہ مسلمان ہو گئے اور اس حرام کاری سے ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو گئے۔

سلطان کے فوجی نظام کا ذکر کیا جا چکا ہے لیکن قارئین کو یہ معلوم کر کے خوشی ہوگی کہ سلطان پشپور صغیر کا پہلا حکمران تھا جس نے ملک میں جمہوری نظام رائج کیا۔

اس نے تمام اختیارات و زرا کی کینٹ کو سونپ دیے اور خود آئینی مربراہ کی حیثیت اختیار کر لی مگر انیسویں صدی کے ہندوستانیوں کو جمہوری طرزِ حکومت پسند نہ آیا اور لوگوں نے اسے سلطان کی کمزوری تصور کرتے ہوئے ملک و ملت سے غلامی شروع کر دی۔

سلطان نے جو کینٹ بنائی اس کا نام صدر الصدور رکھا۔

اس کینٹ (کابینہ) میں اٹھارہ وزیر ہوتے تھے۔ وہ سب ایک عمارت میں بیٹھتے تھے جسے اٹھارہ کچری کہا جاتا تھا۔

حکومت کے محکمے بابِ حکومت کہلاتے۔

ہر محکمہ کا ایک سیکرٹری ہوتا جو میرِ آصف کہلاتا۔

سلطان نے سب سے پہلے پشپورٹ رائج کیا۔

سلطنتِ خداداد کے سات صوبے تھے۔ انہیں بڑھا کر نو، پھر سترہ کر دیا گیا۔

ہر صوبہ میں بیس سے تیس تنگ اضلاع ہوتے تھے۔

ہر ضلع کے دو حاکم ہوتے۔



سول کا حاکم آصف، فوج کا فوجدار ہوتا۔ ہر ضلع پر ایک عامل مقرر ہوتا جس کے ماتحت ۳ عمر، ایک سررشتہ دار، ہم تفصیل دہوتے تھے۔

ہر شہر اور ہر موضع میں عدل و انصاف کے لیے پنچایت مقرر تھی۔ رسل و رسا کے لیے حکمہ ڈاک قائم تھا۔ ملازمین کو نقد تنخواہ ملتی۔

ملازمین کے لیے پیشن کی سہولت موجود تھی۔

آب پاشی کے لیے دریاؤں پر بند باندھ کر تالاب بنائے گئے اور نہریں نکالی گئی تھیں۔ ٹکسال نواب مرحوم کے زمانے میں قائم ہو چکے تھے۔ سلطان نے ان میں اضافہ کیا مگر جو سکہ ڈھالا جاتا اس پر سلطان کی تصویر بنانے کی ممانعت تھی۔

تجارت اور عوام کی سہولت کے لیے ہندوستان میں سب سے پہلے سلطان پیٹونے بنکر قائم کیے۔ ہر جگہ سرکاری دکانیں تھیں جو امداد باہمی کے اصولوں پر چلتی تھیں (آج کل کے پوسٹی سٹور ان کی نقل ہیں)۔

چاندی کا سکہ سب سے پہلے سلطان نے جنوبی ہند میں ڈھلایا۔

دو روپے کے سکے کو "نقرئی حیدری" کا نام دیا گیا۔

سلطانی روپیہ کو "امالی" کہا جاتا۔

نصف روپیہ "عابدی" یعنی حضرت زین العابدینؑ کے نام پر تھا۔

پاؤ روپیہ "باقری"، حضرت باقرؑ کے نام پر تھا۔

اسی طرح پرا روپیہ یعنی دونوں کو حضرت امام جعفر کے نام پر "جعفری" کہتے تھے۔

ایک آنے کو کاٹھی اور ٹکے کو خضریٰ کہا جاتا تھا۔

سکہ کے ایک طرف بحری سن اور ٹکسال کا نام فارسی میں لکھا جاتا۔

دوسری طرف سلطان کی صفات عدل اور سال مدت جلوس کندہ ہوتا۔

تانبے کے چھوٹے سکوں کو بھی سلطان نے رواج دیا۔

غلاموں اور کینزوں کی خرید و فروخت ممنوع قرار دے دی گئی۔

انسانوں کی قربانی بند کی گئی۔

مندروں اور مسجدوں پر ٹیکس ختم کیا گیا۔

تمام مسافر خانے جن میں قیام اور طعام دونوں کا انتظام ہوتا، سرکاری خرچ پر چلتے تھے۔

مندروں میں لڑکیوں کو خدمت کے لیے دیا جاتا مگر وہ غامشی اور عیاشی کے لیے استعمال ہوتی تھیں۔ سلطان نے مندروں میں لڑکیوں (داسیوں) کا داخلہ بند کر دیا۔

شراب، گانجے اور انہوں کی دکانیں ختم کر دی گئیں۔

سلطان نے مردم شماری اور خانہ شماری جاری کی۔

ہندو مسافروں کا انتظام ہندو برہمن کرتے۔ وہاں مفت رہائش کے علاوہ مسافروں کی تواضع و دودھ دہی اور مکھن سے کی جاتی۔

مندر کے بیمار یوں اور برہمنوں پر ٹیکس پہلے ہی معاف تھا۔ سلطان نے قاضیوں اور اسلحہ فروش مسلمانوں کو بھی ٹیکس سے آزاد کر دیا۔

مندروں، مسجدوں اور درگاہوں کی جاگیر مقرر کی۔

مندروں کو سالانہ ۵۹۲۱۳۹ کنٹی رائے پگہ ڈے (جنوبی ہند کا سکہ) کی رقم دی جاتی تھی جبکہ مسجدوں کو صرف ۲۰ ہزار پگہ ڈے اور درگاہوں کو ۵۰ پگہ ڈے ملتے تھے۔ ان کے علاوہ انعامات، پیشن اور اعزازات الگ تھے۔

سلطنت خدا داد میسور کے سلطان پیٹو کی فوجی اور سول انتظامیہ کی جو تفصیل بیان کی گئی ہے یہ فضول دردِ سری نہیں ہے بلکہ آپ اسے پڑھیے اور تعجب کیجیے کہ آج کا ہمارا فوجی اور سول تمام کا تمام نظام اب سے دو سو سال پہلے سلطان پیٹونے رائج کیا تھا۔

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سلطان صرف ایک اعلیٰ درجے کا فوجی جرنیل ہی نہ تھا بلکہ ایک نہایت اعلیٰ دماغ کا مالک، بیدار مغز حکمران بھی تھا جسے مسلمانوں کے علاوہ اپنی ہندو رعایا نے معادلت کا بھی پورا پورا خیال رہتا تھا۔

لیکن —

کسی قدر افسوس ناک بات ہے کہ اس نابغہ روزگار سلطان کو مفاد پرستوں اور غداروں نے ایک دن بھی چین نہ لینے دیا۔

ان مفاد پرستوں میں سب سے آگے ایسٹ انڈیا کمپنی کے بددیانت انگریز ہیں جنہوں نے تجارت کا فریب دے کر ہندوستان پر قبضہ کیا اور جنوبی ہند میں سلطان کے خلاف حربوں، نظام دکن، میسور کے ہندوؤں اور قوم نائٹھ کے خود فریب مذہبی ٹھیکیداروں نے انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دے کر ہمیشہ کے لیے اپنے ناک پر بٹہ لگالیا۔

ان لوگوں کے علاوہ جنوبی ہند میں مسلمانوں کے ایک فرقے نے جو اہل نائٹھ کے نام سے مشہور تھا، اس نے بھی سلطان کو بچا دکھانے میں انگریزوں کا بھرپور ساتھ دیا۔

اہل نائٹھ کو سلطان کے خاندان سے مرحوم نواب بہادر کے زمانہ سے ہی عداوت اور دشمنی تھی لیکن نواب مرحوم نے اہل نائٹھ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی اور نہ سلطان ٹیپو نے ان کی مخالفت کا تصور کیا۔ چنانچہ سلطان کے زمانے میں بد الزماں نائٹھ، میسور کے سرنگاپٹم کے بعد سب سے بڑے اور اہم صوبے حیدرنگو کا گورنر تھا۔

اہل نائٹھ کے بارے میں مشہور سیاح ابن بطوطہ نے لکھا ہے:

”جب مسلمان ہندوستان میں آئے اور انہیں عروج حاصل ہوا اور دارالسلطنت دہلی پر ان کا قبضہ ہو گیا تو ان کی سخاوت اور قدروانی کے چرچے حدود بھارت سے نکل کر ایران، عراق اور عرب تک پہنچے جس کے نتیجے میں ایرانی، عراقی اور عربی جوق در جوق ہندوستان میں وارد ہونا شروع ہوئے۔“

آنے والوں میں عربوں کی تعداد زیادہ تھی اور ہندوستانی مسلمان عربوں کو اس لیے قابل احترام سمجھتے تھے کہ ان کا تعلق دیار حبیب یعنی رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وطن سے تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے مسلم بادشاہوں اور حکمرانوں نے شمالی و جنوبی ہند میں اسی احترام کے پیش نظر اپنی حکومتوں میں مذہبی عہدے ان لوگوں کو دینا شروع کر دیے۔ پھر ایک رسم سی ہو گئی کہ تمام مذہبی عہدے ان لوگوں کے لیے مخصوص ہو گئے۔

یہ بات اپنی جگہ پر مسلم ہے کہ یہ لوگ اپنی دینداری اور مذہبی علمیت میں دوسرے مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ نمایاں ہوتے تھے مگر انہیں (جو اب نائٹھ کے نام سے مشہور تھے) یہ زعم اور غلط فہمی ہو گئی کہ وہ اپنے نسب کی وجہ سے ہندوستان کے مسلمانوں سے افضل اور برتر ہیں۔

یہ ایک بڑا غلط خیال تھا اس لیے کہ جس نسب پر وہ ناز کرتے تھے اس نسب کے سردار، سرکارِ دہلیام حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود رنگ و نسل کی تفریق کو مٹانے ہوئے صاف اور واضح الفاظ میں اعلان فرمایا تھا کہ نہ گورے کو کالے پر اور نہ عربی کو عجمی پر کسی طرح کی فوقیت ہوگی، سوائے اس کے کہ وہ زیادہ متقی ہو۔“

فوقیت اور افضلیت کا یہ مانہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صرف تقویٰ کو قرار دیا تھا مگر اہل نائٹھ اپنے عرب ہونے پر اس قدر مغرور ہو گئے تھے کہ باقی تمام قوموں کو وہ اپنے سے حقیر سمجھتے اور انہیں اپنی بیٹی نہ دیتے تھے۔

چنانچہ — نواب مرحوم کے زمانے میں بھی اہل نائٹھ اور نواب بہادر مرحوم کے خاندان میں یہ اختلاف پیدا ہوا تھا۔

نواب مرحوم نے امام صاحب بخش نائٹھ کی بیٹی کو اپنے بیٹے شہزادہ ٹیپو کے لیے منتخب کیا تھا لیکن خاندانِ نائٹھ نے اس رشتہ کو نہایت غیر مناسب اور بے جوڑ خیال کیا۔ ان کے نزدیک والی میسور حیدر علی خاں کی ذات، اہل نائٹھ سے کمتر تھی۔

امام صاحب بخش نائٹھ رشتہ دینے سے نوا انکار نہ کر سکے مگر شادی کے بعد کے حالات نے یہ ثابت کر دیا کہ وہ خود اور ان کے خاندان کے تمام لوگ اس رشتہ کے مخالف تھے۔

سلطان ٹیپو جو اسی وقت ایک متعلیٰ المزاج شہزادہ سے تھے، شادی کے بعد انہیں بخش صاحب کی بیٹی کے غورہ اور خاندانی تبرکے کا سامنا کرنا پڑا۔

بعض روایتوں کے مطابق شہزادہ ٹیپو کو ان کی نائٹھ بیوی ہر وقت اپنی غفلت اور برتری کے طعنہ دیتی رہتی تھی اور اسے حقیر نظروں سے دیکھتی تھی لیکن شہزادہ نے اس کے خلاف کوئی قدم

ہو گئیں۔

ایک روایت کے مطابق برہان الدین اور اس کے خاندان والے اس رشتہ کے شدید مخالف تھے۔ خود لڑکی اور اس کی والدہ کے بارے میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار کیا گیا ہے۔

لیکن — ایک دوسری مسند قدروایت میں صاف طور پر بیان کیا گیا ہے کہ برہان الدین اس کے لڑکوں اور خاندان کے دوسرے لوگوں نے باہمی مشورہ کر کے لڑکی کو شادی سے قبل ختم کر دینے کا فیصلہ کیا اور جب شادی کی تاریخ مقرر ہو گئی تو انہوں نے معصوم لڑکی کو ایک کنویں میں دھکا دے کر ختم کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی یہ مشہور کر دیا کہ لڑکی نے کنویں میں کود کر خودکشی کر لی ہے۔

یہ واقعہ جس قدر دردناک ہے اتنا ہی عبرت انگیز بھی۔ اگر سلطان ٹیپو نے اپنی شاہی کے زور پر برہان الدین کی اہل ناطہ میں زبردستی شادی کی کوشش کی تھی (یہ ایک مفروضہ ہے) تو اہل ناطہ جو خود کو مذہب کا ٹھیکیدار سمجھتے تھے، انہوں نے بیٹی کو قتل کر کے کونسانیک کام کیا؟



سلطان ٹیپو ایک آزاد حکمران تھا۔ وہ آزادی کی قدر و قیمت جانتا تھا۔ اس کا یہ قول تاریخ کے صفحات میں جگہ گار ہے:

’شیر کی ایک دن کی زندگی‘

گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

ایک آزاد مملکت کے آزاد حکمران ہونے کے باوجود اس وقت بھی اس نے مغل شہنشاہ دہلی، شاہ عالم نانی کی سیادت سے روگردانی نہیں کی تھی اور نہ اپنی مطلق العنانی کا اعلان کیا تھا۔ چنانچہ وہ شاہ عالم نانی ہی کو ناجدار مہند تھجھا تھا۔

سلطان ٹیپو ایک عظیم سیاستدان بھی تھا اور اس کی اس خوبی کی وجہ سے اس سیاستدان کو مدراس کانگریس گورنر لارڈ میکارتھی، راستے سے ہٹانا چاہتا تھا کہ جو انگریزی فتوحات کے راستے کا سب سے بڑا روٹا تھا۔

نہ اٹھا یا بلکہ صبر اور رواداری کا مظاہرہ کرتے رہے۔ اس کے برخلاف شہزادے کی دوسری بیوی رقیہ بیگم جو انہی کے خاندان سے تھیں، ایک بھدر اور موٹس و غمخوار بیوی ثابت ہوئیں۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ جب سلطان کو کورگ کی فتح کے بعد کچھ سکون حاصل ہوا اور اس کے سامنے اس کے برادر نسبتی (سالے) کی شادی کا مسئلہ پیش ہوا تو اس نے بھی برہان الدین کے لیے گورنر حیدرنگر بدر الزماں ناطہ کی بیٹی کا منتخب کیا۔

سلطان کو اہل ناطہ میں اپنی شادی کے خراب نتائج کا تلخ تجربہ تھا۔ اس کے باوجود اس نے اس تجربہ کو بصرہ ہرانے کی کوشش کیوں کی؟ اس کی کوئی خاص وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اس سلسلے میں ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ سلطان اپنے برادر نسبتی کی شادی اہل ناطہ میں کر کے یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ اس کے دل میں اہل ناطہ کا احترام باقی ہے۔ اگرچہ اس کی ناطہ بیوی نے اسے کچھ سکھ نہ دیا لیکن یہ دلیل کچھ زیادہ وزنی نہیں معلوم ہوتی۔ اس لیے کہ فارسی کی ایک مثل بہت مشہور ہے کہ:

آزمودہ را آزمودن جہل است

(یعنی آزمائے ہوئے کو دوبارہ آزمانا جہالت ہے)

بعد کے جو واقعات پیش آئے انہوں نے اس مقولے کو سچ کر دکھایا۔

سلطان نے والی حیدرنگر بدر الزماں ناطہ کو طلب کیا۔ بدر الزماں ناطہ جب دربار میں آئے تو سلطان نے ان کا پر جوش استقبال کیا اور انہیں تحفے مخالف پیش کیے۔ اس کے بعد سلطان نے انہیں تنہائی میں بلایا اور پیش کش کی:

’اے والی حیدرنگر بدر الزماں! ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمارے برادر نسبتی برہان الدین خاں کو اپنی دامادی میں قبول کیجیے۔‘

بدر الزماں ناطہ نے ذرا توقف کیا تو سلطان نے کہا:

’کیا والی حیدرنگر کو اس رشتہ پر کوئی اعتراض ہے؟‘

والی حیدرنگر گھبرا گیا اور گہر بڑا کر بولا:

’جی نہیں سلطان۔ مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے؟‘

سلطان نے اسی وقت شادی کا اعلان کر دیا اور برہان الدین کی شادی کی تیاریاں شروع

صلح نامہ جنگور کی نقل انگلستان پہنچی تو انگریزوں نے اس کا سوگ منایا۔ اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ یہ صلح نامہ انگریزوں کی صاف اور واضح شکست کا غماز بلکہ انہماق تھا چنانچہ لارڈ میکالٹن اور بنگال کے دیگر عدسے داروں کو ہٹا کر ان کی جگہ نئے افسران زیادہ اختیارات دے کر ہندوستان بھیجے گئے۔

ان نئے آنے والوں میں سب سے کمینہ فطرت اور مکار لارڈ کارنوالس تھا جو نیا گورنر جنرل بن کے ہندوستان آیا تھا۔

ایک حوالے کے مطابق جب کارنوالس انگلستان سے روانہ ہوا تھا تو اس نے دہلی کے حکام کو یقین دلایا تھا کہ وہ سلطان ٹیپو کو نیست و نابود کر دے گا۔ اس لیے کہ سلطان کا نام انگریزوں کے لیے ہوتا بن گیا تھا۔ ہندوستان کے علاوہ انگلستان کے انگریز بچوں کو جب ڈراما مقصود ہوتا تو ان کی مائیں کہتیں:

”چپ ہو جا۔ ٹیپو آ رہا ہے۔“

پورا ہندوستان اور انگلستان سلطان کی دہشت سے لرز رہا تھا۔ دہشت کے ساتھ ساتھ انگریزوں کو سلطان ٹیپو سے اس قدر نفرت تھی کہ وہ اپنے کتوں کا نام ”ٹیپو“ رکھتے تھے۔

قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ آگے کے پل کے مسلمانوں نے انگریزوں سے اس نفرت انگیز سلوک، کا یہ بدلہ لیا کہ انہوں نے اپنے کتوں کا نام ”ٹامی“ رکھنا شروع کر دیا۔

ٹامی انگریزوں کی اس ناجائز (حرامی) اولاد کو کہتے ہیں جو ہسپتالوں میں پیدا ہوتی ہیں یا پھر پیدا ہونے پر ان حرامی بچوں کو مرٹک کے کنارے ڈال دیا جاتا ہے اور انگلستان کی حکومت ان ناجائز بچوں کی پرورش کرتی ہے۔

ایسے ناجائز بچے ماں باپ کی شفقت سے محروم ہوتے تھے اور جب یہ جوان ہوتے تو انہیں انگریزی فوج میں بھرتی کر لیا جاتا۔

یہ ”ٹامی“ تمام اخلاقی اور مذہبی قدروں سے آزاد ہوتے اور دنیا کے ہر عیب میں حلقہ مشاق ہوتے تھے۔

برسبیل تذکرہ اس سلسلے میں ایک اور بات سننے چلیے:

خلافت خرمیک کے دو بھائی علی برادران کے نام سے مشہور ہوئے۔ یہ دونوں بھائی مولانا محمد علی جوہر اور مولانا شوکت علی گوہر تھے۔ یہ ہماری تحریک آزادی ہند کے مہربان بھی کہلاتے

ہیں۔ محمد علی جوہر بڑی خوبیوں کے مالک تھے جن کی تفصیل تو یہاں بیان نہیں ہو سکتی، آپ صرف یہ بات یاد رکھیے کہ انگریزوں کو جس قدر مسلمانوں اور ہندوستانیوں سے نفرت تھی، اس سے کہیں زیادہ محمد علی کو انگریزوں سے نفرت تھی۔

ایک مرتبہ مولانا محمد علی جوہر انگریز حکومت سے گفت و شنید کرنے انگلستان تشریف لے گئے۔ جب وہ انگلستان کے ساحل پر جہاز سے اترنے لگے تو انہیں ایک ادبھی عمارت پر ایک سائٹ بورڈ نظر آیا جس پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا:

DOGS AND INDIANS ARE NOT ALLOWED.

(کتوں اور ہندوستانیوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے)

انگریزوں کی نظر میں ہندوستانی اور کتے برابر تھے یعنی وہ ہندوستانیوں کو کتا کہہ کر ان کی تذلیل کرتے تھے۔

مولانا نے یہ بورڈ پڑھا تو خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔

پھر جب مولانا انگلستان سے واپس آئے تو انہوں نے بمبئی کے ساحل پر ایک ادبھی عمارت پر اس عبارت کا ایک سائٹ بورڈ لگوادیا:

DOGS AND BRITISHES ARE NOT ALLOWED.

(کتوں اور انگریزوں کو آنے کی اجازت نہیں ہے)

اس طرح مولانا محمد علی جوہر نے انگریزوں سے توہین کا انتقام لے لیا۔

جنوبی ہند میں انگریزوں نے سلطنت حداداد میسور کے خلاف جو جال بچھایا اس کی بنیاد انہوں نے دو باتوں پر رکھی:

اول یہ کہ سلطان ٹیپو کو ہمسایوں کے ساتھ جنگ میں مصروف رکھنا۔

دوم یہ کہ میسور کے طول و عرض میں یہ پروپیگنڈہ کرنا کہ انگریز اس بات کے خواہشمند ہیں کہ سلطنت میسور کو سلطان ٹیپو سے چھین کر اس کے اصل حاکموں (راجہ) کو واپس دلائیں۔

اس طرح وہ ایک طرف تو سلطان کو جنگوں میں الجھا کر اپنی طاقت بڑھا رہے تھے اور دوسری طرف ان کے پروپیگنڈے سے میسور کی ہندو آبادی میں سلطان کے خلاف ایک بے جینی سی

پیدا ہوا شروع ہو گئی تھی۔

سلطان انگریزوں کی جیلہ ساز یوں اور چال بازیوں سے ناواقف نہیں تھا۔ اُن کے خطرناک عزائم کے پیش نظر سلطان نے شہنشاہِ دہلی کو متعذر خطوط لکھے جن میں اُس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ دشمنِ اسلام انگریزوں کے خلاف صف آرا ہے اس لیے شہنشاہ کو چاہیے کہ وہ دینِ اسلام کی بقا کے لیے اس کی مدد کرے۔

چنانچہ سلطان ٹیپو نے شہنشاہِ ہند شاہِ عالم ثانی کو ۲۳ جون ۱۷۸۵ء کو مندرجہ ذیل خط لکھا تھا:

”یہ خادمِ اسلام دینِ محمدی کی حمایت میں نصرائیوں کی مرکوبی میں معروف ہے جنہوں نے اس سرزنش کی تاب نہ لاکر ایک ذلیل صلح (صلح بنگلور ۱۷۸۴ء) کر لی ہے۔ یہ صلح نامہ اس قدر مشہور ہے کہ اس خط میں اس کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔

خدا کے فضل و کرم پر بھر دوسرے ہوئے اس خادمِ دینِ محمدی کی خواہش ہے کہ دشمنانِ دین سے جنگ کرے اور انہیں مٹا دے۔ لیکن شہنشاہِ ہند خود اپنے معاملات میں اس قدر الجھا ہوا تھا کہ سوائے طفل تکیوں کے اور کچھ نہ کر سکا۔

ادھر سے نابوس ہو کر سلطان نے اپنے ہمسایہ ممالک ایران، عرب، افغانستان اور ترکی کے سربراہان کو اس علیٰ جماد میں تعاون کی دعوت دی اور ان سے اپنے تاجرانہ تعلقات استوار کیے۔ سلطان ٹیپو کی فرانسیسیوں سے دوستی اور مرہٹہ پیشوا سے معاہدے وغیرہ بھی انگریزوں کے خلاف نئے حلیفوں کی تلاش تھی لیکن فرانسیسیوں نے معاہدہ وارسا کے بعد اپنے تعاون سے ہاتھ کھینچ لیا تھا حالانکہ سلطان نے اس سلسلے میں ایک سفارت بھی فرانس بھیجی تھی۔

انہی ایام میں سلطان نے انگریزوں کے خلاف ایک اعلانِ جماد بھی شائع کرایا تھا جس کا مضمون اس طرح تھا:

”خاتمِ پیغمبر (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کے وقت مسلمانوں کو جو احکام دیے گئے تھے انہیں مسلمانوں نے بھلا دیا ہے جس کی وجہ سے زوال آ گیا۔ اس وقت ہم خدا کے فضل و کرم سے ان احکام کو اپنے

دستخط اور مُهر سے دوبارہ جاری کرتے ہیں تاکہ مسلمان آگاہی اور ہدایت حاصل کر دیں۔

آپ سے امید ہے کہ آپ ان احکام کو بہتر سے بہتر طریقوں سے عام مسلمانوں تک پہنچائیں گے کیونکہ ان احکامِ جماد کا مقصد ہی یہ ہے کہ ان سے ہر مسلمان آگاہ ہو۔

آپ کو چاہیے کہ ان احکام کی بے حساب نقلیں کر کے تمام مسلمانوں میں تقسیم کر دیں۔

یہ ہماری دلی خواہش اور پکا ارادہ ہے کہ ان ناقابلِ اعتبار اور سرکش لوگوں سے جنہوں نے مسلمانوں سے اپنی گردن موڑ کر بغاوت کا علم بند کیا ہے، اس وقت تک لڑتے رہیں جب تک کہ وہ اسلام کی سیدھی راہ یا ”جزیہ دینا“ قبول نہ کر لیں۔ خصوصاً اس وقت تک جبکہ ہندوستان کے حاکموں کی کمزوریاں دیکھ کر اس قوم نے یہ بیہودہ خیال قائم کر لیا ہے کہ مسلمان بزدل، کمزور اور لائقِ نفرت ہو گئے ہیں انہوں نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جنگی تیاریاں کر کے مسلمانوں کے علاقوں پر چڑھ دوڑے ہیں اور اپنے ظلم و زبردستی کا ہاتھ مسلمانوں کے مال اور آبرو پر دراز کر دیا ہے۔

اس لیے ہم خدا کی طاقت اور تائید پر بھروسہ کرتے ہوئے اپنے مذہب کے احکام پر عمل کرتے ہیں اور ان احکامِ خداوندی پر مبر جھکاتے ہوئے ہم نے معتمدِ ارادہ کر لیا ہے کہ ہم ان سے جاد کریں۔ اس لیے آپ کو چاہیے کہ نزدیک اور دور کے ہر طبقہ کے مسلمانوں کو اصلی احکامِ اسلام سے آگاہ کریں اور ان کے کانوں سے غفلت کی روٹی نکالیں اور خصوصاً ان لوگوں کو توجہ دلائیں جو قرآن مجید کو پس پشت ڈال کر کافروں کی اطاعت کر رہے ہیں اور ان بدبختوں کی ملازمت میں داخل ہیں۔ اس لیے ان مسلمانوں کو جو کافروں کی حکومت میں رہتے ہیں یہ حکم خداوندی سنایا جائے کہ:

"اور اطاعت نہ کرو کافروں اور منافقوں کی تحقیق اللہ جانتے والا

اور حُکْمُ وَاللَّهِ"۔

ان مسلمانوں پر جس پر ان آیات کا اطلاق ہوتا ہے، فرض ہے کہ وہ ان کافروں کے علاقوں کو خالی کر کے اپنے فلاح پر یقین اور ایمان رکھتے ہوئے ہمارے ہاں آکر آباد ہو جائیں جہاں خدا کے کرم سے ان کی حالت ان کی موجودہ حالت سے بہتر ہوگی اور ان کی آبرو اور مال نہ ان کی حفاظت میں رہیں گے اور ان لوگوں کے لیے جنہیں وہاں گزارے کے لیے ذرائع حاصل نہیں ہیں، یہاں انہیں گزارے کا بہترین ذریعہ حاصل کرنے میں مدد دی جائے گی۔

ہم نے اسی مقصد کے لیے اپنا پوری سلطنتِ خداوندی میں احکام جاری کر دیے ہیں کہ:

جو لوگ سلطنتِ خداوندی میں آکر پناہ لینا چاہیں، حضوری میں (سلطان کو) ان کی پوری معلومات ہماری جائیں تاکہ ان کے گزارے کا انتظام کیا جائے۔

جو شخص بھی ان الفاظ (اعلان) پر توجہ نہ کرے گا یا ان احکام خداوندی کے خلاف کرے گا تو اس بد بخت کے متعلق سمجھا جائے گا کہ اس میں غیرتِ ایمانی باقی نہیں ہے اور وہ ان برکات سے محروم ہو چکا ہے جو خدا نے اپنے نیک بندوں کے لیے رکھے ہیں اور ایسا شخص دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جائے گا اور اس کا شمار کافروں میں ہو گا۔

سب لوگ جانتے ہیں کہ شہنشاہِ دہلی علی طور پر بے بس ہو گیا ہے اس لیے اب خطبہ میں اس حکمران کا نام شامل کرنا چاہیے جو بالکل آزاد اور خود مختار ہو اور جس کی زندگی کا مقصد دینِ اسلام کی خدمت کرنا ہو اس لیے حکم دیا جاتا ہے کہ خطبہ جمعہ میں ہمارا نام بطور سلطان پڑھا جائے۔

سلطان ٹیکو کو داغ دیا کہ اس کا نام خطبہ جمعہ میں پڑھا جائے کیونکہ نہ تو وہ ہندوستان کی کسی طاقت کا ماتحت تھا اور نہ کسی بیرونی طاقت کے زیر اثر تھا۔

سلطان نے اس اعلان کے ساتھ ہی شومتری (ایرانی عالمِ دوا شنور) کی مرتب کردہ کتاب "مؤید الجاہدین" کے نسخے قاضیوں اور اماموں میں تقسیم کرائے تاکہ وہ اس میں دیے گئے منظوم خطبات کو اپنے دروس میں شامل کریں۔

چنانچہ آئندہ جمعے سے سلطنتِ خداوندی کی ہزاروں مساجد میں خطبہ جمعہ میں سلطان کا نام پڑھا گیا اور یہ اعلان تھا ایک "خود مختار" سلطان ہونے کا۔

پھر جب سلطان ادھوئی کا قلعہ فتح کرنے کے بعد مرہٹوں سے نبرد آزما تھا تو ادھوئی کے فوجدار قطب الدین خاں نے جمعہ کے خطبہ میں سلطان کا نام پڑھنے کی اجازت مانگی۔ سلطان نے اسے بذریعہ خط جواب دیا،

ہم نے تجویز کیا ہے کہ ہمارا نام جمعہ کے خطبہ میں پڑھا جائے۔ خطبہ کے متعلق قانون یہ ہے کہ اس میں سب سے پہلے خداوند تعالیٰ کی حمد و ثنا، اس کے بعد پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعت ہو، اس کے بعد ایسے بادشاہ کا نام لیا جائے جس کی زندگی کا مقصد اسلام کی خدمت اور اس کے نام کو سربلند کرنا اور اس کی عظمت کے لیے اپنی جان تک دے دینا ہو۔ ایسے سلطان کا نام خطبہ میں پڑھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

ان کم غفلوں کو کیا کہا جائے جو دہلی کے شاہِ عالم ثانی کا خطبہ میں اب تک نام پڑھتے ہیں جبکہ وہ مرہٹہ پیشوا سے پندرہ ہزار روپیہ پیشین حاصل کرتا ہے۔

وہ برائے نام شہنشاہ ہے اور اس کے اقتدار کی حیثیت صفر

سلطان جب کوہِ گدگ کی بغاوت فرو کر کے سرنگاپٹم آیا تو ایک دن اس نے دارالسلطنت کے عوام اور تمام عامہ بین سلطنت کو مسجدِ لال باغ میں جمع ہونے کا حکم دیا۔ اس مجمع میں سلطان نے اعلان کیا:

سے زیادہ نہیں۔

ایسی صورت میں جبکہ وہ دوسروں کا تابعدار ہے اور خود آزاد نہیں تو اسلامی عقائد کی رو سے یہ سخت گناہ ہے کہ اس کا نام خطبہ میں پڑھا جائے۔ لہذا آپ کی تجویز کے مطابق اطلاع دی جاتی ہے کہ آئندہ سے ہمارا نام خطبہ میں پڑھا جائے۔“

سلطان کو بطور سلطان سب سے پہلے مرہٹوں نے معاہدہ ۱۷۸۷ء میں تسلیم کیا۔ پونا کے پیشوا کے وزیر نانا فرنیس نے اسے ”ٹیپو سلطان خان بہادر“ کے لقب سے یاد کیا۔ اس کے کچھ عرصہ بعد انگریزوں کو بھی اسے ”سلطان ٹیپو“ تسلیم کرنا پڑا۔

سلطان نے محمد بیگ خاں بہادری اور کٹی ریاستوں کے امیروں کے نام خطوط مکھے اور عوام میں تقسیم کرنے کے لیے اعلان جہاد اور فتح المجاہدین کے پہلے تین ابواب کی نقلیں بھجوائیں۔

سلطان نے نظام دکن کو مرہٹوں سے دور رکھنے کے لیے محمد غیاث کو حیدرآباد میں مدرسہ ذیل خط دے کر بھیجا تھا:

”میں یعنی ٹیپو سلطان مسلمانوں کی سلطنت کو تقویت دینا اور اپنی جان و مال کو سچے مذہب اسلام پر قربان کرنا چاہتا ہوں۔ ایسی حالت میں تمام مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ میرا ساتھ دیں نہ کہ بہت پرستو کا ساتھ دے کہ اسلامی ممالک کو تاخت و تاراج کریں جیسا کہ نواب نظام علی خان بہادر بار بار مرہٹوں کا ساتھ دیتے رہے اور دونوں کے لشکر مل کر میرے علاقوں کو تباہ و برباد کرتے رہے۔“

افسوس کہ میں نے نظام علی خاں کو کئی بار مخفی پیغامات کے ذریعے سمجھایا لیکن وہ مرہٹوں کی لیغار کو اپنے ملک سے دور رکھنے کے لیے ان کی دوستی کو غنیمت سمجھتے رہے حالانکہ مرہٹوں نے حیدرآباد کو بے انتہا نقصان پہنچایا۔ انہوں نے لا تعداد مسجدوں اور خانقاہوں کو ویران کیا۔

اس سب کا نقصان تو یہ تھا کہ وہ میری طاقت کو اپنی طاقت سمجھتے

اور جب دونوں طاقتیں مل جاتیں تو مرہٹوں کو اپنے علاقے سے باہر نکلنے کی ہمت بھی نہ ہوتی۔

اس کا سب سے بڑا سبب انگریزوں کی وہ چال ہے جس نے ہمیں اور نظام کو ملنے نہیں دیا۔

اب میرے اور نظام علی خاں کے متحد ہونے کی صورت یہ ہے کہ میرے خاندان کی لڑکیاں نظام کے بیٹوں اور بیٹیوں سے اور نظام کے خاندان کی لڑکیاں میرے بیٹوں اور بیٹیوں سے بیاہی جائیں تاکہ طرفین میں یگانگت کے دروازے وا ہوں اور سب کو معلوم ہو جائے کہ ہم دو اسلامی ملکوں میں اتحاد اور اتفاق ہو گیا ہے۔“

اس خط کے ساتھ سلطان نے نظام دکن کے لیے قیمتی جواہرات اور تحائف اور اُمرائے کے لیے خلعتیں بھی بھیجیں۔

غیاث الدین نے دکن پہنچنے کے خط اور تمام چیزیں نظام کے سامنے پیش کیں۔ خلعتیں اُمرائے میں تقسیم ہوئیں۔ سوائے چند اُمرائے باقی سب نے یہ منصوبہ پسند کیا۔ نظام بھی اس منصوبہ پر راضی نظر آتا تھا۔

لیکن —

جب نظام دربار سے اٹھ کے حرم سرا میں پہنچا تو غداروں اور مفاد پرستوں نے اپنا کام دکھایا۔ پس وہ بیگمات اور کنیزیں جو غداروں کے کہنے سننے میں تھیں، انہوں نے اس منصوبے کی سخت مخالفت کی:

”منصوبہ تو اچھا ہے مگر سلطان اگر ہماری طرح اونچے حسب نسب کا مالک ہو تا تو پھر اس رائے کو پسند کیا جاسکتا تھا۔ ایک بیگم نے رائے دی۔“

”بالکل ٹھیک ہے۔“

دوسری نے تائید کی:

”کہاں دکن کی شہزادیاں اور کہاں تاکہ خاندان کے کم ذات شہزادے۔ محل میں ٹاٹ کا پیوند کیسے لگ سکتا ہے؟“

ایک اور خاتون نے زہر اُگلایا:

میں کہتی ہوں کہ ٹیپو کو دکن کے شاہی خاندان میں رشتہ کرنے کی جرات کیسے ہوئی؟  
اعلیٰ حضرت نظام دکن کو چاہیے کہ وہ والی میسور کی نذر میں اس کے سفیر کے منہ پر ماریں اور اسے دربار سے بے عزت کر کے نکال دیں۔

جب پورا حرم مخالفت پر آمادہ ہو جائے تو نظام کیا کر سکتا تھا۔ چنانچہ اس نے اس منصوبہ کو ناقابلِ عمل قرار دے کر نیاٹ الدین کو واپس کر دیا۔

ادھر سے ایڈمس ہو کر سلطان ٹیپو نے ترکی کی طرف دیکھا۔  
ترکی کی سلطنت اسلامیہ اگرچہ علیٰ طور پر بے بس تھی لیکن ترکی کا حکمران مسلمانوں کا خلیفہ سمجھا جاتا تھا اور اس سے سید سلطانی حاصل کی جاتی تھی۔ پس سلطان ٹیپو نے ایک سفارت عثمانی خلیفہ کے دربار میں قسطنطنیہ روانہ کی۔

اس سفارت کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ قسطنطنیہ سے فرانس جلائے اور حکومتِ فرانس سے ایک دیر پا معاہدہ کرنے کی کوشش کرے۔ پھر فرانس سے یہ سفارت انگلستان جلائے اور وہاں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم سے حکومت انگلستان کو آگاہ کرے۔

ترکی اور فرانس کو جو سفارت بھیجی گئی اسی کے مقاصد حسبِ ذیل تھے:  
ترکی میں سفارت بھیجنے کا پہلا مقصد یہ تھا کہ عثمانی خلیفہ سے ایک فوجی اور تجارتی معاہدہ کیا جائے۔

دوسرا مقصد یہ تھا کہ ترکی سے بصرہ کی بندرگاہ مانگی جائے جہاں سلطان کے لیے بحری بیڑہ اور بحری اڈہ قائم ہو۔ اس کے بدلے میں سلطان ٹیپو ترکی کو اپنی ایک بندرگاہ دینا چاہتا تھا۔

تیسرا مقصد یہ تھا کہ صنعت و حرفت کی ترقی کے لیے سلطان کو کاربگروں کی ضرورت تھی۔ یہ کاربگر ترکی اور فرانس سے منگوائے جائیں۔ اگر ترکی میں صنعت و حرفت نہیں ہے تو میسور سے وہاں کاربگر اور ماہرین بھیجے جائیں۔

چوتھا مقصد یہ تھا کہ ترکی اور فرانس سے سونا، گندھک اور کوئلہ وغیرہ نکالنے کے لیے ماہرین منگوائے جائیں۔

پانچواں مقصد فرانس سے ایک بائیدار فوجی معاہدہ کرنا تھا کہ ہند میں

فرانسیسی فوج بوقتِ ضرورت سلطان ٹیپو کی مدد کرے جس کے صلہ میں سلطان فرانس کو تجارتی مراعات دینے پر تیار تھا۔  
اس سفارت کا چھٹا اور آخری مقصد یہ تھا کہ انگلستان جاکر شاہ انگلستان کو ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے مظالم سے آگاہ کیا جائے۔

اس سفارت کے لیے مندرجہ ذیل افراد کا انتخاب ہوا:

میر غلام علی خاں لنگرہا

لطف علی بیگ

نور اللہ خاں

جعفر خاں اور

بخشی محمد حنیف!

سلطان نے اس سفارت کے ساتھ بے شمار قیمتی تحائف جن میں چار ہاتھی بھی شامل تھے روانہ کیے۔ یہ تمام لوگ ساحلوں کے ایک قافلے کے ساتھ بحری جہاز میں روانہ ہوئے۔  
اُس زمانہ کے بحری جہاز میں چار ہاتھیوں کا بھیجا جانا یقیناً محفلِ نظر ہے لیکن اس تاریخی بیان کو نظر انداز کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے۔ جبکہ آگے چل کر ان ہاتھیوں کا صاف الفاؤ میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے کہ:

”خلیفہ شاہِ فرانس اور شاہ انگلستان کو بھیجے جانے والے چاروں ہاتھی راستہ ہی میں دم توڑ گئے۔“

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ہاتھی سونے چاندی کے بنے ہوئے نہیں تھے بلکہ اصلی اور جاندار تھے۔ بہر حال اس کی حقیقت خدا ہی بہتر جانتا ہے۔

اس سفارت کو جسے سلطان ٹیپو نے بڑی امیدوں سے بھیجا تھا اور جسے بحرِ قلم (بحرِ احمر) اور بحرِ ہوتے ہوئے سب سے پہلے قسطنطنیہ جاکر عثمانی خلیفہ کے حضور میں پیش ہونا تھا، وہ بحرِ قلم کے بجائے خلیج فارس کی بندرگاہ ”بصرہ“ پر پہنچی۔ پھر وہاں سے شط العرب کے راستے بغداد پہنچی۔



کو ہندوستان سے نکال دوں کیونکہ تم لوگ مکار اور دھوکے باز ہو۔ اگر خلیفہ نے ہمارے منصوبوں کی تائید نہ کی تو بھی ہم انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کے رہیں گے۔

یہ اور اس طرح کی دوسری باتوں سے میرنگڑ نے اس مقدس راز کو افشا کر دیا جسے پہچانے کے لیے سلطان شیونے اسے قسطنطنیہ بھیجا تھا۔

انگریزوں نے یہ راز معلوم ہوتے ہی ترکی کے وزیر اعظم کو خبردار کر دیا کہ وہ خلیفہ کو بتائے ہی اس بات پر آمادہ کر لے کہ وہ سلطان شیون کی مدد اور تائید سے انکار کر دے۔ وزیر اعظم تو انگریزوں کے ہاتھوں میں کھیل ہی رہا تھا۔ پس اس نے اسی دن سے سلطان شیون کے خلاف خلیفہ کے کان بھرنا شروع کر دیے۔

پھر جب نوابہ کے طویل عرصے کے بعد میر غلام علی خاں ننگڑا کو خلیفہ کے سامنے پیش کیا گیا تو خلیفہ کا رویہ خشک اور سرد مہری کا تھا۔

سلطان شیون نے خلیفہ کو جو خط بھیجا تھا اسے وزیر اعظم ترکی نے خلیفہ کو پڑھ کر سنایا۔ اس میں کچھ اس طرح تحریر تھا:

”میں انگریزوں سے جہاد میں معروف ہوں اس لیے آپ کی تائید چاہتا ہوں۔

میری خواہش ہے کہ بصرہ کی بندرگاہ، سلطنتِ خدا داد کو دے دی جائے تاکہ وہاں سے ہندوستان کے ساحلوں کی حفاظت ہو سکے۔ اس کے عوض سلطنتِ خدا داد کی کوئی بندرگاہ ترکی کو دے دی جائے گی۔ ہماری معادنت کے لیے خلیفہ جس قدر فوج بھیجیں گے اس کے اخراجات سلطنتِ خدا داد برداشت کرے گی۔

سلطنتِ خدا داد میں تو ہیں اور بدوقیہ نہایت اعلیٰ معیار کی تیار ہوتی ہیں۔ اگر خلیفہ مناسب خیال فرمائیں تو توپ اور بندوق ساز ترکی بھیجے جاسکتے ہیں۔

آخر میں میری یہ گزارش ہے کہ چونکہ نجف اشرف میں پانی کی قلت ہے اس لیے دریا ئے فرات سے ایک نہر نکالنے کی اجازت دی جائے۔“

بغداد سے اس سفارت نے مزید ایک ہزار میل کا فاصلہ طے کیا۔ تب جا کے یہ سفارت بلقان قسطنطنیہ پہنچی۔

سفارت کا یہ راستہ جو طویل بھی تھا، بڑا دشوار گزار تھا۔ نیلغ خارس میں اس کا جہاز تباہ ہو گیا اور پچاس آدمی لقمہ اجل بن گئے۔ سلطان کی سفارت میں شامل بخشی محمد صلیب بصرہ کے قریب مرگیا اور تحفہ میں بھیجے جانے والے چاروں ہاتھی راستہ میں دم توڑ گئے۔

سفارت کو پانچ ماہ تک بصرہ میں ڈکنا پڑا۔ اس تاخیر کی وجہ یہ تھی کہ عثمانی خلیفہ کی طرف سے سفارت کو قسطنطنیہ آنے کی اجازت نہ ملی تھی۔ آخر میر غلام علی خاں ننگڑا قسطنطنیہ گیا لیکن پورے نواہ تک اسے خلیفہ کے حضور پیش ہونے کا موقع نہ ملا بلکہ اسے یہ موقع نہیں دیا گیا۔ اس کے فرائض کے خوف سے انگریز، خلیفہ ترکی کو اپنا خلیفہ بنانا چاہتے تھے اور ترکی کا سفیر اور دیگر وزیر انگریزوں کے ہاتھوں کا کھلنا نہ چاہتے تھے۔ ایسے وقت میں انہوں نے مناسب نہ سمجھا کہ ہندوستان سے آئی ہوئی سفارت کو باب عالی میں پیش کر دیں۔

سلطان شیون کی سفارت کا خلیفہ سے ملاقات نہ کرنے کے معاملہ میں دہاں موجود انگریز کاسب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ یہ انگریز بھی انگلستان سے سفارت پر آئے ہوئے تھے اور خلیفہ فرائض کے خلاف بھڑکا کر انگریزوں سے معاہدہ کرنے پر مجبور کر رہے تھے۔

ان انگریزوں کو ہندوستان میں انگریزی سیاست کے بارے میں بھی پوری معلومات حاصل تھیں اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ انگریزوں اور خلیفہ کے درمیان معاہدہ ہو جائے۔ پہلے ہندوستانی سفارت کو خلیفہ سے ملنے دیا جائے۔

اور آخر کار۔

انگریزوں کی چال بازی اور مکاری نے قسطنطنیہ میں بھی زبردست کام کیا۔ ترکی کے وزیر اعظم کے ذریعے میر غلام علی خاں ننگڑا کو انگریز سفیروں نے اپنے جال میں پھنسا لیا۔ انگریزوں میں شراب جاڑ ہے اور سب ہی انگریز شراب کے عادی ہوتے ہیں۔ یہ شراب بھی شراب کا عادی تھا اور اکثر انگریزوں کی محافل میں شریک ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اسے بہترین شراب بلکہ آخروہ راز معلوم کر لیا جس کے لیے وہ اتنے دن سے کوشاں تھے۔ میر غلام علی خاں ننگڑا نے شراب کے نشے میں اگل دیا:

”میں قسطنطنیہ اس لیے بھیجا گیا ہوں تاکہ عثمانی خلیفہ کی تائید سے تم انگریزوں

۲۹ دسمبر ۱۷۸۹ء — یہ وہ دن تھا جب سلطان لشکر ڈاونکور کی مرحد سے آخری روز اپنا پورا ملک تھا۔

سفارت کے بعض ارکان نے سلطان سے شکایت کی کہ میر غلام علی خاں نے ترکی کو بھیجے جانے والے تحائف میں خود زبرد کیا ہے۔

یہ الزام اتنی زبردست شہادتوں کے ساتھ لگایا گیا کہ سلطان نے فوراً میر غلام علی خاں کے گھر کی تلاشی کا حکم دے دیا۔

میرنگڑا کے گھر کی تلاشی کی گئی تو وہ تمام سامان برآمد ہو گیا جس کا الزام لگایا گیا تھا۔ سلطان نے اس چوری کے جرم میں میرنگڑا کو موت نظر بندی کی سزا دی۔ پھر کچھ دنوں بعد سلطان نے عفو و درگزر سے کام لیتے ہوئے اسے معاف کر دیا۔

میاں ملک نوخیز غنیمت تھا مگر سلطان نے اسے وزیر بکر یہ بنا دیا اور وہ بد ذات بجائے احسان ماننے کے سلطان کا دشمن ہو گیا۔

سلطان نے میر صادق کو بھی اسی طرح معاف کر دیا تھا اور یہ حقیقت ہے کہ سلطان نے ان دونوں کو معاف کر کے دراصل آستین میں سانپ پال لیے تھے جنہوں نے آگے چل کر اسے ڈس کے پھونکا۔



واضح رہے کہ ان دنوں بخت انور سلطنت ترکی کے ماتحت تھا۔

چونکہ خلیفہ سلطان سلیم اپنے وزیر اعظم اور دوسرے وزرا کے کہنے سننے پر انگریزوں سے معاہدہ کرنے پر آمادہ ہو چکا تھا اس لیے اس نے سلطان شیو کے کسی منصوبہ کی بھی تائید نہ کی بلکہ محض ایک رسمی سادستی کا خط دے کر سفارت کو رخصت کر دیا۔

انگریزوں کو میر غلام علی خاں لنگڑا کے ذریعے سلطان شیو کے خیالات پہلے ہی معلوم چکے تھے۔ اب اس خط کے مندرجات بھی وزیر اعظم ترکی نے انگریز سفارت تک پہنچا دیے اور جو کچھ باقی تھا اس سے بھی انگریز پوری طرح واقف ہو گئے۔

پس —

انگریزوں نے رد عمل کے طور پر سلطان شیو کے خلاف ترکی کے علاوہ عرب اور ایران میں بھ پروپیگنڈہ شروع کر دیا۔ عرب اس وقت شریف مکہ کے زیر اثر تھا جو عرب میں اپنی آزاد مملکت قائم کرنا چاہتا تھا۔ وہ انگریزوں سے پہلے ہی ملا ہوا تھا۔ انگریزوں نے اسے سلطان شیو کے خلاف اور زیادہ بھڑکا دیا اور سلطان شیو کو ترکی کے علاوہ عربوں سے بھی قسم قسم کا نفاق و باغ حاصل ہو سکی۔

انگریزوں نے صرف اسلامی ممالک ہی میں سلطان شیو کے خلاف اپنا پروپیگنڈہ تیز نہیں کیا بلکہ پورے ہندوستان میں سلطنت خدا واد کے خلاف ایک زبردست تحریک کا آغاز ہو گیا اور یہ سب میر غلام علی خاں لنگڑا کی قبل از وقت (شراب پی کر) بکواس کرنے اور خلیفہ کے دربار میں انگریزوں کے زبردست اثر و رسوخ کی وجہ سے ہوا۔

یہ ناکام سفارت جس کا سربراہ میر غلام علی خاں لنگڑا تھا، اسکندریہ سے دریائے نیل، پھر سوئز سے قلمز اور جدہ پہنچی۔

میر غلام علی خاں کو فرانس اور انگلستان جانے کا حکم بھی دیا گیا تھا مگر وقت بہت گزر چکا تھا۔ پھر غلام علی خاں لنگڑا کی حالتوں کی وجہ سے سفارت پہلے ہی قدم پر ناکام ہو گئی اس لیے یہ لوگ واپس ہوئے۔

شریف مکہ نے بھی کوئی معقول جواب نہ دیا۔

اس طرح ۱۷۸۹ء میں جانے والی سفارت چار سال بعد ۲۹ دسمبر ۱۷۸۹ء میں ناکام

نامراد واپس آئی۔

مرہٹوں کی طرف سے ہوئی تھی جو سلطان ٹیپو کے عروج سے عدد درجہ خائف تھے۔ مندرجہ بالا کتاب کا مصنف رقم طراز ہے:

”جب پونا کے پیشوا کو معلوم ہوا کہ انگریزوں اور سلطان ٹیپو کے درمیان صلح ہو رہی ہے تو انہیں خیال ہوا کہ انگریزی کی پتی معاہدہ عالی کو ختم کرنے پر آمادہ ہو گئی ہے۔ اس اطلاع پر مرہٹوں نے سلطان ٹیپو کے پاس بغرض مصالحت، اور خراج کی وصولیابی کے لیے ایچی رڈا سے جواب دہ سلطان ٹیپو نے کھلا بھیجا کہ ان کے والد نے مرنے پر چند شرطیں تو یہ اور بند دتوں کے علاوہ ترکہ میں کوئی اور چیز نہیں چھوڑی جس کے ساتھ میں حاضر ہوں۔“

اس تحریر سے خائف اور بد دل ہو کر مرہٹوں نے یہ تجویز کی کہ نظام علی شاہ کے ساتھ اتحاد کر کے ٹیپو سے وہ علاقے واپس لیے جائیں جن پر اس نے قبضہ کر لیا تھا۔“

چنانچہ معاہدہ ہوتے ہی مرہٹوں اور نظام حیدر آباد کی متحدہ فوجیں سلطان ٹیپو کی سرحدوں میں سلطنتِ خداؤ کی طرف بڑھیں۔

مرہٹہ لشکر کی کمان مرہٹہ وزیراعظم نانافرنویس کے ہاتھ میں تھی۔ اس کے لشکر میں اسی ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے مع توپ خانہ کے تھے اور نظام کے ساتھ چالیس ہزار سوار اور پچاس ہزار پیادے مع توپ خانہ کے تھے۔

مرہٹوں اور نظام کا متحدہ لشکر جو مجموعی طور پر ایک لاکھ بیس ہزار سوار اور نوے ہزار پیادوں پر مشتمل تھا، آندھ اور طوفان کی طرح گر جتا۔ اس سلطنتِ خداؤ کی سرحدوں کی طرف بڑھا۔ مرہٹہ پر سلطان کا قلعہ باوا کی تھا جسے حملہ آور لشکر نے اپنے گہرے میں لے لیا۔

حملہ آوروں کا خیال تھا کہ قلعہ دار لشکر کی کثرت، دیکھ کر ہی قلعہ حوالے کر دے گا مگر اس پر اس عظیم لشکر کا قری قری برابر اثر نہ ہوا۔

نانافرنویس نے جنگ سے بچنے کے لیے قلعہ دار کے پاس پیغام بھیجا کہ اگر وہ قلعہ حوالے کر دے تو قلعہ میں نہ لوٹ مار ہوگی اور نہ تباہی بربادی کی باتے گی بلکہ قلعہ دار کو بھی اس کے منصب پر بحال رکھا جائے گا۔

اس وقت اختیار کیا جب اس نے دوست دشمن اسب سے اپنی طاقت کا لوہا منوایا تھا۔ انگریز تو اس سے اس قدر خائف ہو چکے تھے کہ ہندوستان سے انگلستان تک انگریز عورتیں اپنے بچوں کو ”ٹیپو“ کے نام سے ڈراتی تھیں۔

جنوبی ہند نے آج تک کوئی سلطان نہ دیکھا تھا سوائے سلطان ٹیپو کے۔ پھر جنوبی ہند کی دو اور طاقتیں مرہٹہ اور نظام اس کی عظمت اور سلطانی کو کس طرح قبول کرتیں۔ ان کے خیال میں تو ”میسور“ ایک چھوٹی سی باجگزار ریاست تھی جسے مرہٹے اور نظام ہمیشہ ڈرایا دھکایا کرتے تھے۔

آخر اس سلسلے میں پونا کے مرہٹہ پیشوا اور دکن کے نظام میں گفت و شنید شروع ہوئی جو کہ وہ دونوں سلطان کے مشترکہ دشمن تھے۔

ان دونوں کے درمیان معاہدے میں طے پایا کہ پونا اور دکن کے لشکر یکجا ہو کر سلطنتِ خداؤ پر اپنا کرہیں اور اس وقت تک جنگ جاری رکھیں جب تک (خدا نخواستہ) سلطنتِ خداؤ کا خاتمہ نہ ہو جائے۔

یہ معاہدہ ”آیت گیر“ کے مقام پر ہوا تھا اور اسی نام سے مشہور ہے۔

”نظام علی شاہ“ مطبوعہ حیدرآباد کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس معاہدہ کی تحریک

بادامی کے قلعہ دار کے پاس سامان حرب کے علاوہ کھانے پینے کے سامان کی بھی وافر مقدار موجود تھی اس لیے اس نے قلعہ حوالے کرنے سے صاف انکار کر دیا۔

نانا فرنویس کا قاصد ناما کم ہو کر واپس ہوا۔ جس وقت قاصد قلعہ سے نکلا تو قلعہ دار کے اشارے پر قلعہ کے ایک برج پر چڑھی ہوئی توپ سے حملہ آور لشکر کی طرف ایک گولہ داغا گیا۔ یہ اس بات کا اعلان تھا کہ قلعہ دار حملہ آوروں کی تابعداری کے بجائے اُن سے جنگ پر آمادہ ہے۔

پس—

دونوں لشکروں نے ایک ساتھ قلعہ پر حملہ کر دیا اور دونوں کے توپ خانے نے قلعہ پر گولہ باری کرنے لگے۔

حملہ کرتے وقت نانا فرنویس کا خیال تھا کہ قلعہ دار دو چار دن سے زیادہ مدافعت نہ کر سکے گا مگر وہاں ہفتہ گزرا۔ پھر ایک مہینہ ہو گیا اور گولوں کا طوفان اور سنسناتے تیروں کی آواز حملہ آور لشکر کی بار بار گوشہ نشینوں کے باوجود قلعہ دار اور قلعہ کی سپاہ اس کے مقابلہ پر ڈٹی رہی۔

دواہ، حارماہ، مہاں تک کہ آٹھ ماہ سے زیادہ بیت گئے اور قلعہ کا سر ہوتا تو ان کے حملہ آور لشکر قلعہ کی تفصیل کے قریب بھی نہ پھٹک سکا۔

مدافعت کا یہ انداز واقعی قابلِ فخر تھا۔  
مرہٹہ لشکر اور نظام کے وہ سوار جو جبالے کھلاتے تھے، سب کے سب مارا جا کر ہونے تمام دن وہ کوشش کرتے اور شام کو بھرتے، دیاں قلعہ کو دیکھتے اور آہیں بھرتے واپس آ جاتے۔

پھر نانا فرنویس کہ مرہٹوں کا اصل دماغ تھا، اس نے ایک ترکیب سوچی۔ یہ ترکیب اس نے انگریزوں کی جنگی چالوں سے سیکھی تھی۔ انگریز بھی جب کسی جگہ قبضہ کرنے میں ناکام ہو جاتے تو اسی تدبیر کا سہارا لیتے۔ یہ تدبیر ایک تیر بہدف قسم تھا۔

اور یہ نسخہ تھا— ”لڈلچ“  
انگریزوں کا یہ سب سے بڑا ہتھیار تھا۔ انہوں نے بنگال اور جنوبی ہند میں جتنی بھی جنگیں جیتیں یا کامیابیاں حاصل کیں، فریب، دہی، دھوکہ بازی کے علاوہ ”لڈلچ“ کا اُن میں سب سے

زیادہ دخل دیا۔

نانا فرنویس نے جنگ روک دی اور دوستی کے پیامبر قلعہ دار کے پاس بھیجنے شروع کیے۔ اس نے بڑی چالاکی سے قلعہ دار کو قلعہ حوالے کرنے کے لیے اپنی شرطیں پیش کرنے کی تجویز پیش کی۔ اس نے واضح الفاظ میں قلعہ دار کو پیغام دیا کہ قلعہ دار قلعہ کے بدلے میں جو بھی شرط رکھے گا، وہ پوری کی جائے گی۔

اس طرح دو لاکھ سے زیادہ لشکر، نو ماہ تک ہزاروں سواروں اور سپاہیوں کو قربان کرنے کے باوجود جس قلعہ بادامی کا بال بھی بیکانہ ہو سکا وہی قلعہ بادامی قلعہ دار نے منہ مانگی قیمت پر مرہٹہ حملہ آوروں کے ہاتھ فروخت کر دیا اور سلطان فی جہند آقلعہ سے اتار دیا گیا۔  
غداروں کی کسی دور میں کمی نہیں رہی۔ وہ قلعہ دار جو پور سال تک پامردی سے دشمن کے سامنے ڈٹا رہا، وہ چاندی سونے کے جوتے سے مار کھا گیا۔

قلعہ بادامی پر حملہ آوروں کا قبضہ ہو گیا۔  
اس کامیابی نے زبردست جشن منایا۔ سلطنت، خداداد کی مرحر پر یہ ان کی پہلی کامیابی تھی اور نہ قلعہ دار کی زبردست مدافعت سے تو حملہ آور اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ یہ قلعہ ناقابلِ تسخیر ہے۔ اس لیے اسے اس کے حال پر چھوڑ کے آگے بڑھ جانا چاہیے مگر ”نانا فرنویس“ کی فراست اور سیاست کام آگئی اور اس نے پابندی سونے کا جو تار مار کر قلعہ دار کا مرہٹہ کا دیا۔  
اس پہلی زبردست کامیابی کے بعد متحدہ حملہ آوروں نے چاروں طرف چھوٹے چھوٹے لشکر روانہ کیے۔

قلعہ بادامی کی تسخیر کی خبر ہر طرف پھیل گئی تھی اس لیے چھوٹے قلعہ داروں نے بغیر جنگ و جدل کے اپنے قلعے دشمنوں کے حوالے کر دیے۔ اس طرح دریائے کرشنا، نا اور دریائے تنگ، بیدرا کے درمیان بیشتر قلعوں پر قبضہ ہو گیا۔ ان میں دھار وار، جالی دار، کچندرا، نو کندہ اور رنگندہ وغیرہ کے قلعے شامل تھے۔

جہاں تک چھوٹے زمینداروں (پالیکاروں) کا تعلق تھا تو وہ عام طور سے ہندو تھے اور مرہٹوں سے پہلے ہی سے ساز باز یہی ہوتے تھے۔ انہوں نے اپنے علاقے خود ہی اتحادیوں کے حوالے کر دیے۔

جب سلطان کو ان مفاد پرست اتحادیوں کے ایک جملہ کی خبر ملی تو وہ مرنگا پٹم سے ایک بڑا لشکر لے کر نکلا اور جنگور ہوتا ہوا ادھونی پہنچ گیا۔ قلعہ ادھونی کا حاکم نہایت جنگ نہا جو رسالت جنگ کا بیٹا تھا اور اس کے اندر نظام کن کی بیٹی تھی۔ اس نے جب سلطان کے آنے کی خبر پائی تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے حرم سرا میں کمرام پج گیا اور سب کو اپنی اپنی جان کی خبر دے گئی۔ نہایت جنگ نے دیوان اسد علی خاں کو اپنی حرم سرا میں بلوایا۔ اگر نہایت جنگ کا چہرہ دھواں دھواں تھا تو اسد علی خاں کا رنگ بھی تو تھا سلطان کی دہشت سے دونوں کے جسم پر لہر سا طاری تھا۔

نہایت جنگ نے لرزیدہ آواز میں کہا: "اسد علی خاں۔ سلطان آپ سے رسالہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کوئی ایسی صورت، بتاؤ جس سے ہم سب کی جان بچتی ہو سکے۔" دیوان احمد اصل وزیر اعظم ہوتا تھا، وہ بڑے دل گردے کا مالک مشہور تھا مگر اس وقت خوف کی وجہ سے اس کا پورا بدن ٹھنڈا پڑ گیا تھا۔ اس نے ہلکاتے ہوئے کہا: "شہزادہ بہادر۔ سلطان کو اطلاع بھجوا دیجیے۔" ان کی خدمت میں عرض کیا جائے کہ وہ ہمیں اور ہماری خواتین کو قلعے سے نکل جانے دیں۔ پھر وہ قلعہ پر قبضہ کر لیں۔ "یہی تو میں بھی کہہ رہا ہوں۔"

نہایت جنگ نے ہوش و حواس درست کرتے ہوئے کہا: "مگر سوال یہ ہے کہ یہ پیغام کس سلطان کے پاس کون جائے گا؟" "میرا خیال ہے۔۔۔ ہاں میرا۔۔۔ میرا خیال ہے مگر یہ بھی ہو سکتا ہے کہ میرا خیال غلط ہو۔ کیوں شہزادہ بہادر۔ میں ٹھیک کہہ رہا ہوں ناں؟" دیوان اسد علی دراصل گڑ بڑا گیا تھا۔ اس کی نگاہ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ شہزادہ اس کی بات

لجھتے ہوئے بولا: "مگر تم کہہ کر رہے ہو اسد علی۔ کیا بات درست ہے اور کیا نادرست۔ یہ فیصلہ تو تب ہوگا جب تم کچھ کہو گے۔" دیوان اسد علی کہتے ہوئے ڈر رہا تھا مگر اب بات اس پنج پر پہنچ چکی تھی کہ اسے صاف لہ

کہنا پڑا: "شہزادہ بہادر۔ میری ذاتی رائے یہ ہے کہ صلح کا پیغام لے کر ہمارے کسی بہت ہی اہم آدمی کو جانا چاہیے تاکہ سلطان کو یہ سمجھ نہ ہو کہ ان سے بات کرنے کے لیے قلعہ ادھونی سے کسی معمولی آدمی کو بھیجا گیا ہے۔" شہزادہ نہایت جنگ اپنے دیوان کی اس پیچ در پیچ گفتگو کا مطلب سمجھ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے رفع شک کے لیے کہا:

"اسد علی۔ مجھے تمہاری اس بات سے بھی اتفاق ہے۔ جہاں تک کسی اہم شخصیت کو سلطان کے پاس بھیجنے کا سوال ہے تو اس کے لیے قلعہ ادھونی میں صرف در آدمی ایسے ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں ان میں سے ایک تم ہو اور دوسرا میں۔ کیا خیال ہے تمہارا اسد علی؟" "شہزادہ بہادر نے میرے منہ کی بات چھین لی۔"

دیوان نے فوراً جواب دیا: "اگر قلعہ کے تمام انتظامات نہ کرنے ہوتے تو میں ضرور خود کو پیش کر دیتا۔ ہاں اگر شہزادہ بہادر مجھے جانے کا حکم دیں گے تو مجھے کوئی مدد نہ ہو گا۔" نہایت جنگ بہت فکر مند تھا اور خیالات بار بار اسے الجھا لیتے تھے۔ اس نے اسد علی خاں کی پرفریب باتیں سن لیں۔ پھر بھی اس نے تجل سے کہا:

"اسد علی۔ سفارت لے کر کون جائے گا۔ اس کا فیصلہ ہم بعد میں کریں گے۔ پہلے تم یہ کہو کہ ایک خاصہ کو فوراً سلطان کی لشکر گاہ میں اس پیغام کے ساتھ بھیج دو کہ ادھونی کے حکمران نہایت جنگ نے سلطان سے درخواست کی ہے کہ وہ قلعہ پر اس وقت تک حملہ آور نہ ہوں جب تک صلح کی سفارت کسی نتیجہ پر نہ پہنچ جائے اور یہ کہ صلح کے سفیر جو یہاں سے گھنٹے کے اندر اندر سلطان کی خدمت میں پہنچ جائیں گے۔"

دیوان اسد علی چاہتا تھا کہ شہزادہ خود سلطان کے پاس صلح کی درخواست لے کر جائے۔ اس کی دودھیں تھیں:

ایک تو یہ کہ اس کی معلومات کے مطابق سلطان بڑا رحم دل واقع ہوا تھا، خصوصاً امرا، وزرا اور دیوانہ ریاست کے ساتھ اس کا سلوک قابل تعریف رہتا تھا۔

دوسری وجہ جو کہ زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے وہ یہ تھی کہ اسد علی خاں کو اپنی گرفتار نہ ہونا

تھا۔ کیونکہ ادھونی کا اصل حکمران تو یہی دیوان اسد علی تھا۔ شہزادہ تو محض نام کا حاکم تھا۔  
مگر۔

مہابت جنگ اس قدر بے وقوف نہ تھا جتنا اسد علی سمجھ رہا تھا۔

وہ دیوان اسد علی کی بات خوب سمجھ گیا تھا مگر وہ بھی یہ خطہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔ اس لیے اس نے فیصلے کے لیے وقت طلب کر لیا تھا۔

مہابت جنگ اس سلسلے میں دراصل اپنی بیگم سے مشورہ کرنا چاہتا تھا جو کہ نظام دکن کی بیٹی تھی اس کے لیے مشورہ تھا کہ وہ اپنے شوہر سے کہیں زیادہ عقلمند اور سمجھدار تھی اور امور سلطنت اسی کے مشورہ سے چلتے تھے۔

مہابت جنگ نے دیوان کے بولنے سے پہلے ہی اپنا رخ موڑ لیا اور تیزی سے زنان خانہ کی طرف چل پڑا۔

حرم میں سب ہی خاموش خاموش، چپ چاپ اور گہرائے گہرائے تھے۔ مہابت جنگ بیگم شہزادی دکن نے شوہر کو اندر آتے دیکھا تو لپک کر اس کے پاس پہنچی۔

"تم نے کیا فیصلہ کیا شہزادے؟"

وہ اُسے "نہ" کہہ کر ہی مخاطب کیا کرتی تھی۔

شہزادے نے اسے بتایا:

"دیوان اسد علی کی بھی یہی رائے ہے کہ سلطان کو قلعہ حوالے کر کے جانیں بچالی جائیں۔"

"تو آپ نے سلطان کو اس شرط سے آگاہ کر دیا؟" شہزادی دکن نے اس کی بات کاٹ کر وقت کی نزاکت کے پیش نظر وہ کم از کم گفتگو کرنا چاہ رہی تھی۔

شہزادے نے جواب دیا:

"ہاں۔ میں نے سلطان سے درخواست کی ہے کہ قلعہ پر اس وقت تک حملہ نہ کیا جائے جب

تک "صلح کی سفارت" ان سے گفتگو نہ کر لے۔"

شہزادی جس قدر عقلمند تھی، اسی قدر رنگ مزاج بھی تھی۔ اس نے سخت لہجے میں کہا:

"گو با شہزادہ بہادر نے سلطان مسعود کو حکم دیا ہے کہ وہ قلعہ پر حملہ نہ کرے۔ کیا آپ کا

یہ ہے کہ سلطان اس قلعہ پر قبضہ کرنے نہیں بلکہ ادھونی میں شکار کھیلنے آیا ہے۔ شہزادے

کبھی تو عقل کی بات کیا کر دے!"

"ناراض نہ ہو شہزادی!"

مہابت جنگ گہرا گیا:

"سلطان بے حد شریف انسان ہے۔ وہ ہماری بات مان لے گا اور حملہ میں تاخیر کرے گا۔"

شہزادی نے اسے گھور کر دیکھا:

"سلطان کتنا ہی شریف سی لیکن وہ یہ بھی تو سوچ سکتا ہے کہ ہم تاخیری حربہ استعمال کر کے اپنا دفاع مضبوط کرنا چاہتے ہیں۔ یا پھر ہمیں کہیں سے لگ آنے کی امید ہے اس لیے ہم ابھی جنگ کو ٹالنا چاہتے ہیں۔"

"نہیں شہزادی۔ ایسا نہیں ہوگا۔"

مہابت جنگ نے بات کو سنبھالنے کی کوشش کی:

"ہم نے سلطان سے درخواست کی ہے۔ وہ سفارت کا انتظار کریں گے۔"

شہزادی نے اچانک سوال کیا:

"سلطان کے پاس یہ درخواست لے کر کون گیا ہے؟"

شہزادے نے جواب دیا:

"میں نے دیوان سے کہہ دیا ہے کہ وہ کسی معقول آدمی کے ذریعے یہ درخواست فوراً

سلطان کے حضور پہنچا دے۔"

شہزادے کا لہجہ اتنا ہی نرم تھا جتنا کہ شہزادی کا انداز جارحانہ تھا۔ یہ سننے ہی شہزادی چڑ

گئی اور چیخ کے بولی:

"بہت خوب۔ بڑی عقلمندی کی ہے آپ نے۔ جو آدمی درخواست لے کے گیا ہے کیا آپ اس

کے ذریعے سلطان سے یہ درخواست نہیں کر سکتے تھے کہ ہم قلعہ کا قبضہ دینے کو تیار ہیں صرف

ہمیں قلعہ سے بحفاظت نکل جانے کی ضمانت یا اجازت دی جائے۔"

مہابت جنگ کے پاس اس کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اس وقت اس نے دیوان اسد علی کی

گفتگو کا سہارا لیا۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو شہزادی۔ ایسا ہو سکتا تھا لیکن دیوان اسد علی کا مشورہ یہ ہے کہ

صلح کی گفتگو کے لیے ادھونی کی کوئی اہم شخصیت جائے اور یہ شخصیت یا میں ہوں یا پھر دیوان

اسد علی خاں ہے۔

”پھر دیکھیں ہو رہی ہے۔ آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“ شہزادی دکن بڑی بے بسی سے بولی  
اب شہزادے نے پینسٹر ابدلہ:

”اسی مشورہ کے لیے تو میں تمہارے پاس آیا ہوں۔“

”اد میرے خدا یا!“

شہزادی نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا:

”جب یہ فیصلہ ہو گیا کہ آپ یا دیوان میں سے ایک کو سلطان کے پاس جانا چاہیے تو آپ مجھ سے  
کیا مشورہ کرنے آئے ہیں؟“

اب شہزادے نے ذرائع کے کہا:

”دیوان اپنی جان بچانے کے لیے کہتا ہے کہ اس کے بچاؤ کے مجھے سلطان کے پاس

جانا چاہیے۔“

”دیوان ٹھیک کہتا ہے۔“

شہزادی نے جواب دیا:

”ایک سلطان سے ایک حکمران ہی اچھی طرح گفتگو کر سکتا ہے۔“

شہزادہ گھبرا گیا:

”یہ تم کیا کہہ رہی ہو شہزادی۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ سلطان کے باپ حیدر علی خاں مرحوم  
نے کھانڈے راؤ کو اپنا طربا بنانے کے لیے اسے پتھر سے میں بند کر دیا تھا اور وہ اسی پتھر سے میں  
مر گیا تھا۔ میں یہ خطہ مول نہیں لے سکتا۔“

شہزادے:

شہزادی نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا:

”تم کھانڈے راؤ ہو اور نہ سلطان، حیدر علی خاں۔ اُس وقت کے حالات آج کے حالات  
جیسے نہیں تھے۔ پھر ایک سلطان کسی حکمران کو قاتل کر کے قید یا موت کی سزا نہیں دیا کرتا، بلکہ  
اس کا دل جیتنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسے اپنے ماتحت لانا چاہتا ہے۔ سلطان کو قلعہ چاہیے۔  
ہم قلعہ چھوڑنے کو تیار ہیں۔ پھر جھگڑا کب سے کا؟“

”تم کچھ بھی کہو۔ میں سلطان کے پاس نہیں جاؤں گا۔“ عہادت جنگ نے فیصلہ کن انداز

میں کہہ دیا۔

”اچھا تو پھر یوں کر دو۔“

شہزادی اٹھ کے کھڑی ہو گئی:

”تم عملی راہیں تشریف رکھو۔ میں نقاب ڈال کے سلطان سے سب کی جانوں کی بھیک  
مانگنے جاتی ہوں۔“

”میں یہ بھی نہ ہونے دوں گا۔“

عہادت جنگ اکر گیا:

”اگر سلطان مجھے بر غمال بنا سکتا ہے تو وہ تمہیں بھی قید کر سکتا ہے۔“

شہزادی کی تیوریاں جڑو گئیں:

”تو پھر جاؤ اور دیوان کے بچے کو کم دد کر دو تمہارا پیغام لے کر سلطان کے پاس چلے۔“

اگر دیوان ذرا بھی حیل و حجت کرے تو اسے فوراً قتل کر دو۔“

شہزادی کی یہ بات عہادت، جنگ کے دل کو لگ گئی۔

اس نے سوچا کہ ادھوئی کے اہم آدمیوں میں میرے بعد اسد علی خاں دیوان کا نانا آتا ہے۔

پھر وہ مجھے ہی کیوں بھیجنا چاہتا ہے۔ اگر اسے اپنی گرفتاری یا جان جانے کا خطرہ ہے تو یہ خطرہ

اس سے زیادہ مجھ سے۔ شہزادی نے ٹھیک کہا ہے۔ دیوان اپنے سر سے بلا ٹان چاہتا ہے۔

میں اسے ابھی دیکھتا ہوں۔ اگر اس نے جانے سے انکار کیا یا کوئی بہانہ تراشا تو میں اسے فوراً

قتل کر دوں گا۔

ایسے ہی خیالات میں ڈوبا ہوا عہادت جنگ زنا خانے سے باہر نکل گیا۔

دیوان اسد علی خاں نے عہادت جنگ کے حکم کے بموجب ایک آدمی کو سلطان کے لشکر کی  
طرف روانہ کر دیا تھا اور مطمئن ہو کے بیٹھ گیا تھا کہ اب اسے سلطان کے پاس نہیں جانا پڑے گا  
لیکن ٹھیک اسی وقت عہادت جنگ زنا خانے سے برآمد ہوا۔

دیوان نے اس کی چال ہی سے جان لیا کہ معاملہ بگڑا ہوا ہے اور یقیناً کوئی مصیبت آنے

والی ہے۔

مہابت جنگ اس کے پاس پہنچتے ہی بولا:

"دیوان اسد علی۔ تم اب تک سلطان کے پاس نہیں گئے؟"

دیوان اس کے سوال سے پریشان ہو گیا۔ مہابت ناں کا مزاج بھی برہم نظر آ رہا تھا۔ اس نے فوراً جواب دیا:

"شہزادہ بہادر نے ایک معتبر کو سلطان کے پاس بھیجنے کا حکم دیا تھا۔ میں نے اس کی تعمیل کر دی ہے۔ آپ نے مجھے جانے کا حکم نہیں دیا تھا ورنہ میں ضرور چلا گیا ہوتا۔"

شہزادے کا دماغ کچھ ٹنڈا پڑ گیا۔

"دیکھو دیوان اسد علی! اس نے کہا:

"ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ کسی آدمی کو سلطان کے حضور بھیجنا مناسب نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ سلطان اسے اپنی شان کے خلاف سمجھے اس لیے تم فوراً سلطان کے پاس جاؤ اور اسے بتاؤ کہ اس کا مقابلہ نہیں کرنا چاہتے بلکہ اس سے صلح کے خواہشمند ہیں۔ ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ سلطان اس کا کیا جواب دیتا ہے!"

دیوان کے پاس اب سونے جانے کے اور کوئی راستہ نہیں رہ گیا تھا۔ پھر بھی اس نے ایک آخری کوشش کی:

"شہزادہ بہادر کا حکم مرا نکھوں پر۔ مجھے جانے میں کوئی عذر نہیں۔ جس آدمی کو بھیجا گیا ہے اس کے واپس آتے ہی میں سلطان کی طرف روانہ ہو جاؤں گا۔"

"نہیں دیوان!"

شہزادے نے اس کی بات کاٹ دی:

"ہم ذرا بھی تاخیر نہیں کر سکتے۔ ہم نے سلطان سے قلعہ پر حملہ نہ کرنے کی درخواست کی ہے اور وہ بھی ایک ہر کار سے کے ذریعے۔ سلطان کو اس پر غصہ بھی آ سکتا ہے۔ تم ابھی اور اسی وقت روانہ ہو جاؤ۔"

شہزادہ مہابت جنگ نے وہ کھڑکی بھی بند کر دی جسے دیوان اسد علی خاں نے کھولنے کی کوشش کی تھی۔

دیوان نے سمجھ لیا کہ جب اس کی موت آئی گئی ہے تو پھر ڈرنا کیسا! چنانچہ اس نے گھوڑا تیار کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس پر سوار ہو کر بڑے طعرات سے سلطان کے لشکر میں پہنچا۔

سلطان کے لشکر یوں نے فوراً اندازہ کر لیا کہ یہ سوار کوئی اہم شخصیت ہے اس لیے ان کے ایک سردار نے نہایت مذہب طریقے سے اسے خوش آمدید کہا۔

"معزز سوار۔ اگرچہ ہم آپ کی شخصیت سے واقف نہیں ہیں لیکن ہمارا اندازہ ہے کہ آپ صلح کی گفتگو کے لیے تشریف لائے ہیں؟"

دیوان اسد علی گھوڑے سے اترا اور بولا:

"میرا نام اسد علی خاں ہے اور میں علاقہ ادھونی کا وزیر اعظم اور شہزادہ مہابت جنگ کا نائب اور فرستادہ ہوں اور صلح کی گفتگو کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ سلطان کو اطلاع دیجیے کہ ادھونی کا دیوان قدیموی کے لیے حاضر ہے۔"

یہ سنتے ہی محافظ سردار فوراً اسد علی خاں کو سلطان کے خیمہ پر لے گیا۔ سلطان نے اطلاع پلٹے ہی اسے اندر بلا لیا۔

اندر اُس وقت اسد علی خاں کا بھیجا ہوا آدمی بھی موجود تھا۔ دیوان نے سلطان کو شاہی کورنش پیش کیا۔ سلطان نے مسکرا کے اسے اپنے بالکل قریب سے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

دیوان اسد علی کے بیٹھنے پر سلطان نے گفتگو میں پہل کی:

"دیوان اسد علی۔ اہل قلعہ اور شہزادہ مہابت جنگ کی زبانی درخواست ہم تک تہہ ارے آدمی نے پہنچا دی ہے۔ ہم نے لشکر کو حکم دے دیا ہے کہ تا حکم ثانی قلعہ ادھونی پر نہ حملہ کیا جائے اور نہ محاصرہ کیا جائے۔"

دیوان نے لوگوں سے سلطان کے اخلاق کی جو باتیں سنی تھیں، سلطان ان سے بھی زیادہ بااخلاق نکلا۔

دیوان نے سلطان کے جواب میں کہا:

"سلطان معظم۔ آپ کی نوازش اور کرم فرمائی کے لیے میں اہل قلعہ اور شہزادہ مہابت جنگ کی طرف سے آپ کا دلی شکریہ ادا کرتا ہوں۔"

شہزادہ بہادر کا التماس ہے کہ آپ کے مقابلہ کی نہ تو ہم میں ہمت ہے اور نہ یہ ہماری خواہش ہے۔ قلعہ کے دروازے کھلے ہیں۔ آپ کا لشکر جب چاہے بغیر حملہ کر سکتا ہے۔

شہزادے نے مزید درخواست کی ہے کہ انہیں اور شاہی حرم کو قلعہ ادھونی سے بھڑائی نکل جانے کی اجازت اور ضمانت دی جائے تو مزید نوازش اور کرم نوازی ہوگی۔"



سلطان نے کمال متانت سے کہا:

دیوان اسد علی خاں۔ ہم نہ تو قلعہ کو براؤ کرنا چاہتے ہیں اور نہ اس پر قبضہ کے خواہشمند ہیں ہمارا اختلاف مہابت جنگ سے نہیں بلکہ نظام علی خاں سے ہے۔ شہزادے کو اطمینان دلاؤ کہ اداہونی پر حملہ نہیں ہوگا۔ ہاں ہمارا لشکر شہر میں ضرور داخل ہوگا۔ اچھا فطرد ہم مہابت جنگ تحریری جواب بھیجتے ہیں۔

سلطان نے میرمنشی کو بلاکر مہابت جنگ کو خط لکھوایا جس کے مندرجات ذیل میں دیا جاتے ہیں:

”مجھے تم سے کوئی عداوت نہیں مگر چونکہ نواب نظام علی خاں نے بلاوجہ ہم سے چھوڑ چھڑ شروع کر دی ہے اور مرہٹوں سے اتحاد کر کے اس سلطنتِ خدا داد کی تباہی پر مکر باندھ لی ہے۔ میں اس کا بدلہ لینا چاہتا ہوں۔

نظام کو اسلامی اخوت کا کوئی لحاظ نہیں۔ اس نے دشمنانِ اسلام کے ساتھ مل کر سازشیں کی ہیں۔ اس دفعہ نظام کی وجہ سے مرہٹے مسلمانوں کے معبودوں، مدرسوں، مسجدوں اور گھروں کو بے حرمت کر رہے ہیں۔ ابھی وقت ہے کہ نظام آہم سے اتفاق کر لے اور دونوں مسلم سلطنتیں باہم متحد ہو کر پونا پر چڑھائی کریں۔ ہم مذہب و ملت کی لاج رکھتے ہوئے اس خدا کی رضا اور خلقِ خدا کی فلاح کے لیے جہاد پر مکر باندھیں جو ایک مسلمان کی سرخروئی کا باعث ہے۔

اگر تم ہمارے ہمراہ رہو تو صرف اتنا کافی ہوگا کہ تم اپنی بہترین فوج کو ہمارے ساتھ بھیج دو کہ چونکہ ہم صرف دینِ متین کی سرپرستی اور رب العالمین اور رسولِ امین صلی اللہ علیہ وسلم کی خوشنودی کے لیے اسن قائم کرنے کی خاطر ان کافروں کے خلاف جہاد کر رہے ہیں۔ اگر کوئی ساتھ نہ دے تو بھی ہم یہ فریضہ از خود یکا و تنہا انجام دیں گے۔

دیوان اسد علی خاں، سلطان کا یہ خط لے کر قلعہ اداہونی واپس ہو گیا۔

مہابت جنگ نے سلطان کا خط پڑھا تو ایک عجیب الجھن میں پھنس گیا۔ ایک طرف سلطان کا اذیت کہ اس نے قلعہ پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ دوسری طرف نظام دکن سے اس کی دوسری سے داری۔ نظام اس کا سہم بھی تھا اور چچا بھی۔ اس صورت میں اگر وہ اپنی فوج سلطان کے والے کرنا تو نہ حیدر آباد واپس جاسکتا تھا نہ اہل خاندان کو منہ دکھا سکتا تھا۔

مہابت جنگ کے باپ بسالت جنگ اور نظام دکن میں نہ صرف جینی بھائیوں کا رشتہ تھا بلکہ وہ ایک زمانے سے ایک دوسرے کے سیاسی اور فوجی حلیف بھی چلے آتے تھے۔

ایک طرف تو دونوں بھائیوں کی رشتہ داری اور سیاسی تعلقات کا تقاضہ تھا کہ وہ سلطان کی اس پیش کش سے انکار کر دے مگر دوسری جانب اس وقت قلعہ اداہونی کو بچانے کا سوال تھا۔ قلعہ کی حفاظت کے علاوہ مہابت جنگ کو وہ وقت بھی یاد تھا جب سلطان کے والد نواب حیدر علی مرحوم نے مہابت جنگ کے باپ بسالت جنگ کی مدد کی تھی۔ یہ واقعہ ۱۷۶۱ء کا ہے۔

یہ وہی سال ہے جب مرہٹوں نے احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں ایسی شکست کھائی تھی کہ شمال ہند میں ان کے اقتدار کا چراغ ہیبت کے لیے گل ہو گیا تھا۔ اس وقت حیدر آباد دکن آپس کی سازشوں کا شکار تھا۔ تخت و تاج دکن کے تین بھائیوں صلابت جنگ، بسالت جنگ اور نظام علی خاں امیدوار تھے اور ان کے درمیان خانہ جنگی ہو رہی تھی۔

اس خانہ جنگی کے نتیجہ میں صلابت جنگ قید کر دیا گیا اور باقی دو بھائی بسالت جنگ اور نظام علی خاں ریاست کے حکمران ہوئے۔

ان دونوں بھائیوں میں ریاست کا بٹوارہ ہمارے کرشمے کے جنوب کا بڑا حصہ بسالت جنگ کے حصے میں آیا جس کا مستقر بھی اداہونی بنایا گیا جس کے سامنے اس وقت سلطان ٹیپو اپنے لشکر سمیت خیمہ زن تھا۔

بسالت جنگ کو جب پانی پت کے میدان میں مرہٹوں کی شکست کا حال معلوم ہوا تو وہ صوبہ مراٹر کو مرہٹوں سے واپس لینے کے لیے نکلا اور قلعہ ہو سکڑ کا محاصرہ کر لیا۔

بسالت جنگ چونکہ قلعہ کشائی کے حربوں سے واقف نہ تھا اور ہو سکڑ کا محاصرہ طویل کھینچنا چاہا رہا تھا اس لیے اس نے نواب حیدر علی خاں مرحوم سے مدد کی درخواست کی۔

نواب مرحوم اس وقت سلطنتِ میسور کے حاکم تھے۔ چنانچہ بسالت جنگ اور نواب مرحوم کے

درمیان ایک معاہدہ ہوا کہ اگر نواب حیدر علی خاں قلعہ ہوسکوٹ کو فتح کر دیں تو دیگر شرائط کے علاوہ قلعہ کا تمام سامان اور آلات حرب بسالت جنگ کو ملیں گے اور قلعہ ہوسکوٹ اور اس کے مضافات نواب مرحوم کو دیے جائیں گے۔

حیدر علی خاں مرحوم نے اپنے ناقابل شکست لشکر کے ساتھ چند ہی دنوں میں قلعہ ہوسکوٹ کو فتح کر لیا اور معاہدے کے مطابق قلعہ کا تمام سامان بسالت جنگ کے حوالے کر دیا گیا اور قلعہ ہوسکوٹ اور اس کے مضافات سلطنت میسور کا حصہ بن گئے۔

اس سلسلے میں میسور میں ایک روایت بہت مشہور تھی۔ وہ یہ کہ بسالت جنگ نے قلعہ ہوسکوٹ کا سامان اور تمام آلات حرب حاصل کرنے کے بعد سب کے سب نواب حیدر علی مرحوم کے ہاتھ فروخت کر دیے تھے اس لیے نواب مرحوم بسالت جنگ کو ہمیشہ "تاجر" کے لقب سے یاد کرتے تھے۔

اس واقعہ کا ذکر اس لیے بھی کیا گیا ہے کہ بسالت جنگ اور نواب مرحوم کے درمیان بھی دوستانہ مراسم تھے اور اسی وجہ سے مہابت جنگ کو کسی نتیجے پر پہنچنے میں دقت ہو رہی تھی۔ مہابت جنگ نے اس سلسلے میں دیوان سے کم ہی گفتگو کی اور سلطان کا خط لے کر اپنی بیوی شہزادی دکن کے پاس پہنچا۔

شہزادی سلطان کا خط پڑھ کر بہت متاثر ہوئی اور اس کی زبان سے بے اختیار نکل گیا: "کاش ابا حضور اعلیٰ حضرت، نظام دکن اور سلطان ٹیپو کے لشکر متحد ہو سکیں۔" "میں تمہاری اس دعا میں پوری طرح شامل ہوں شہزادی۔"

مہابت جنگ نے بیوی کی تائید کی: "لیکن یہ خیال خام ہے۔ اعلیٰ حضرت کسی ایسے اتحاد کے لیے کبھی رضامند نہیں ہو سکتے نہیں معلوم ہے کہ سلطان نے ایک خط کے ذریعے اعلیٰ حضرت سے اس بات کی خواہش کی تھی کہ دونوں سلطنتوں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک خاندان کے رٹ کے لڑکیوں کی شادیاں دوسرے خاندان کے رٹ کو لڑکیوں سے کر دی جائیں مگر اس کا کیا انجام ہوا؟"

شہزادی نے ایک ٹھنڈی سانس لی: "اعلیٰ حضرت ابا حضور نے اس منصوبہ کو پسند فرمایا تھا مگر پتہ نہیں کہ عسکر کی شاہی خواہشیں کس نے بھڑکا دیا کہ انھوں نے سلطان کے خاندان کو "بیچ" کر اس منصوبہ کو رد کر دیا۔"

"خیر ان باتوں کو چھوڑ دو۔ تم یہ بتاؤ کہ سلطان کو اس کا کیا جواب دیا جائے۔" مہابت جنگ نے بات کو مختصر کیا:

"سلطان نے جواب کے لیے صرف آج رات تک کا وقت دیا ہے۔ اس کے بعد وہ پہلے پریقینہ کو رہے گا۔ پھر وہ کوئی بھی قدم اٹھانے میں حق بجانب ہوں گے۔" "مگر سلطان نے قلعہ پر حملہ نہ کرنے کا بھی تو وعدہ کیا ہے۔" شہزادی نے یہ کہہ کر مہابت جنگ کی ادھی پریشانی ختم کر دی۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو شہزادی۔"

مہابت جنگ بڑی مسرت سے بولا: "جب تک ہم سلطان کو جواب نہیں دیتے تو قلعہ پر حملہ نہیں کر سکتے۔"

وہ رات بالکل سکون سے گزری۔

جب صبح کو سلطان کو قلعہ سے کوئی جواب موصول نہ ہوا تو اس نے لشکر کو ادھونی شہر پریقینہ کرنے کا حکم دے دیا۔

شہر اگرچہ سلطانی لشکر کے گھیرے میں تھا مگر اس کے معمولات میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اناعدہ دکانیں کھلتی تھیں اور لوگ خرید و فروخت میں مصروف رہتے۔ سلطانی فوجی بھی خریداری کے لیے بازار میں آتے اور قیمت ادا کر کے سامان لے جاتے۔ اب جو چاہم فوج شہر میں داخل ہوئی تو وہاں بھگدڑ مچ گئی۔ عوام خوفزدہ ہو کر قلعہ کی طرف بھاگ اٹھے۔

مہابت جنگ کو اطلاع دی گئی کہ شہر پر سلطانی فوج نے قبضہ کر لیا ہے اور عوام ہزاروں کی تعداد میں قلعہ کے دروازوں پر پناہ حاصل کرنے کے لیے جمع ہو گئے ہیں۔ مہابت جنگ نے حکم دے دیا کہ قلعہ کے تمام دروازے کھول دیے جائیں اور اس وقت تک گھلے رکھے جائیں جب تک تمام لوگ قلعہ میں داخل نہیں ہو جاتے۔

اس موقع پر سلطان کے سردار رستم جنگ نے دست بستہ عرض کیا:

"عاجیہ قلعہ ادھونی کے تمام دروازے کھلے ہیں۔ ہم بغیر قلعہ پر حملہ کیے یا ہتھیار اٹھائے

قلعہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ حضورِ عالی سے اجازت کی درخواست ہے۔

سلطان نے رستم جنگ کو گھور کے دیکھا۔

وہ مزید کچھ کہنے کو تھا کہ موسیٰ لالی، جو سلطان کے ماتحت فرانسسیسی دستوں کا سالار تھا

ادب سے بولا:

"سلطان۔ آپ نے قلعہ پر حملہ نہ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ رستم جنگ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ ہم اس وقت بغیر حملہ کیسے قلعہ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ قلعہ کے اندر داخل ہونے کا یہ بڑا اچھا بہانہ ہے۔"

"موسیٰ لالی!"

سلطان نے سخت لہجہ میں کہا:

"تم ہمارے وعدے کو جھٹلانا چاہتے ہو۔ تم قلعہ میں داخل ہو گئے تو کل ہی کہا جائے گا کہ سلطان نے قلعہ دار کو فریب دے کر قلعہ پر قبضہ کیا۔"

مہابت جنگ نے ہمارے وعدے کا اعتبار کرتے ہوئے بے خوف و خطر اپنے غلام کے لیے قلعے کے دروازے کھول دیے ہیں۔ ہم اس کے اعتماد کو مجروح نہیں کر سکتے۔ خبردار! ایک۔ یا اسی بھی قلعہ میں داخل نہ ہو۔"

قلعہ دوپہر تک کھلا رہا

مگر۔

سلطان نے اپنے وعدے کے مطابق قلعہ پر قبضہ نہ کیا۔

مہابت جنگ نے نواب نظام الملک والی دکن کو اسی وقت خبر بھجوا دی تھی جب سلطان کا لشکر بنگلور سے ادھونی کی جانب بڑھ رہا تھا۔ چنانچہ نظام نے داماد اور بیٹی کی حفاظت اور مدد کے لیے ایک لشکر ادھونی کی طرف روانہ کر دیا تھا۔

اس ملک کے آنے کی اطلاع جہ۔ سلطان کو ملی تو اس نے حیدر حسین، بخشی اور غازی خاں کو ایک لشکر کے ساتھ بھیجا کہ وہ ملک کو قلعہ تک نہ پہنچنے دیں۔

حیدر بخشی اور غازی خاں نے آگے بڑھ کر حیدر آباد سے آنے والی ملک کے راستے میں اپنے مورچے قائم کر لیے۔

حیدر آباد کی فوج کے سردار مشیر الملک اور سیف جنگ تھے۔ انہوں نے آتے ہی حیدر بخشی

اور غازی خاں کے مورچوں پر حملہ کر دیا۔

یہ حملہ اس قدر زوردار تھا کہ حیدر بخشی اور غازی خاں اس کی تاب نہ لا سکے اور سپاہیوں کو واپس ادھونی پہنچ گئے۔

ادھر مشیر الملک اور سیف جنگ کو معلوم ہو گیا کہ سلطان بیٹو قلعہ کا محاصرہ کیسے چلا رہے۔ اسی لیے انھوں نے اپنی رفتار سست کر دی اور جنگی حکمتِ علی پر غور و خوض کرنے لگے۔ انیس یہ بھی بتایا گیا کہ سلطان ایک رست بڑے لشکر کے ساتھ ادھونی آیا ہوا ہے۔

ادھر یہ لوگ سلطان کے بارے میں سوچ رہے تھے ادھر سلطان نے فیصلہ کیا کہ حیدر آباد سے آئی ہوئی ملک کو قلعہ تک صحیح سلامت نہ پہنچے رہا ہائے۔ اسے حیدر بخشی اور غازی خاں کی شکست کا بدلہ بھی لینا تھا۔ چنانچہ سلطان لشکر لے کر اپنے مورچوں سے نکلا اور دم کے دم میں آنے والی ملک کے سر پر پہنچ گیا۔

سلطان نے مشیر الملک اور سیف جنگ کے مقابل آنے ہی توپ خانے کو گولہ باری کا حکم دے دیا۔

پھر تو سلطانی توپ خانے نے فینیم پر اس قدر شدید گولہ باری کی کہ حیدر آبادی لشکر درہم برہم ہو گیا اور یہ شکست خوردہ اور تتر بتر لشکر بھاگتا ہوا قلعہ ادھونی پہنچا اور وہاں پناہ حاصل کی۔

سلطان نے اپنے لشکر کو تعاقب سے روک دیا۔ وہ چاہتا تو حیدر آبادی ملک کو چاروں طرف سے گھیر کر پوری طرح ختم کر سکتا تھا لیکن اس کا ادھونی کا محاصرہ بھی عجیب طرح کا تھا اور یہ جنگ بھی عجیب ہی تھی۔

سلطان نے شکست خوردہ فوج کو خود قلعہ کی طرف بھاگنے اور دہاں جا کے باہر حاصل کرنے کا موقع فراہم کیا۔ دشمن کے میدان چھوڑ جانے کے بعد سلطان اپنے مورچوں کے اندر واپس آ گیا۔

مہابت جنگ نے اس موقع سے فائدہ اٹھا یا اور جب سلطان مشیر الملک اور سیف جنگ کی فوجوں سے ہمدردی نہ تھا تو مہابت جنگ مع شامی حرم اور دیگر سرداران فوج اور امرا کی تہذیب کے راجپوتوں کو روانہ ہو گیا۔

ان کا رد یہ اب بھی کچھ عجیب تھا۔ وہ قلعہ پر قبضہ کر سکتا تھا۔ مہابت جنگ اور نظام

کی بیٹی کو یہ غمال بنا کر نظام پر دباؤ ڈال سکتا تھا۔  
لیکن۔

سلطان نے ان دونوں میں سے ایک کو اپنی بیٹی کا  
غور کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کا یہ رویہ انتہائی شریفانہ اور مدبرانہ تھا۔ اس کا  
خیال تھا کہ نظام دکن میں ذرا سی بھی غیرت یا شرافت ہوگی تو وہ اس کے اس سلوک کے  
بدلے میں سلطنت خداداد سے اگر معاہدہ نہ بھی کرے گا تو کم از کم اس کی مخالفت ہی سے  
باز آجائے گا مگر نظام نے یہ معلوم ہونے کے بعد کہ اس کے داماد اور بیٹی کو سلطان نے قلعہ  
ادھونی میں نظر بند کر رکھا ہے، بجائے سلطان سے نرم رویہ اختیار کرنے کے مشیر الملک اور  
سیف جنگ کو لشکر دے کر قلعہ ادھونی بھیج دیا۔  
اس کا یہ خیال کس قدر غلط اور ناقابل اندیشہ تھا۔ سلطان کی جگہ اگر کوئی دوسرا  
حملہ آور ہوتا تو پہلے ہی دن قلعہ ادھونی کی اینٹ سے اینٹ بکارتا۔

دوسرے دن سلطان نے قلعہ ادھونی پر یورش کا حکم دے دیا۔ ادھونی کا قلعہ بہت مضبوط  
تھا۔ محبت جنگ نے اسی لیے اسے اپنا صدر مقام بنایا تھا۔ وہاں ایک بڑا لشکر بھی موجود تھا  
اور اب توحید آباد کا لشکرست خوردہ لشکر بھی وہاں پہنچ چکا تھا لیکن وہ سلطان کے طوفانی حملے  
کا ایک دن سے زیادہ مقابلہ نہ کر سکے اور ہتھیار ڈال دیے۔  
اس قلعہ کی جنگ اور فتح کے سلسلہ میں ایک دوسرا مؤرخ اس طرح رقم طراز ہے:  
”اٹھارہ دن کی سخت لڑائی اور محاصرہ کے بعد قلعہ ادھونی جو  
نہایت مضبوط اور ناقابل تسخیر خیال کیا جاتا تھا، سلطان فیوجن  
نے فتح کر لیا۔“

مؤرخین کا یہ اختلاف یقیناً محض نظر ہے۔ قلعہ ادھونی ضلع بلاری میں واقع ہے۔ یہ قلعہ  
راجگان وجیاننگو کا بنایا ہوا اور نہایت مضبوط و ناقابل تسخیر تھا۔ محبت جنگ قلعہ سے جاتے  
وقت پورا خزانہ اپنے ساتھ لے گیا تھا اس لیے بال غنیمت میں بسالت جنگ مرحوم کا کتبہ  
اور اسلحہ خانہ سلطان کے ہاتھ آ گیا۔ سلطان نے پورا کتب خانہ سرنگاپٹم بھجوا دیا۔

سلطان نے قطب الدین خاں کو قلعہ ادھونی کا قلعہ دار اور دولت رائے کو ادھونی کا صوبیدار  
کر دیا۔ قلعہ اور اطراف کی پہاڑیوں کے پائیں حصار (فصلیں) سب توڑ دیے گئے۔  
ادھونی سے خارج ہو کر سلطان کپین گڑھ پہنچا۔

یہاں کی رانی سلطنت خداداد سے مرکشی اختیار کر چکی تھی۔ اس معرکے میں وہ خود توفرار  
دہلی اس کا بیٹا گرفتار ہوا۔ یہ ”صاحب جامع اوراق“ کے مطابق بعد میں مسلمان ہو گیا اور اس کا  
اٹل مردان خاں رکھا گیا۔

اس وقت تک موسم برسات شروع ہو چکا تھا اور ندی نالے آسمان کی آنکھیں دکھا رہے تھے۔  
ہواؤں میں طغیانی آگئی تھی۔

سلطان جلد سے جلد نظام اور مرہٹوں کو ان کی یلغار کو سزا دینا چاہتا تھا لیکن بارش نے  
اس کا راستہ روک لیا تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ دربار کو ضرور عبور کرے گا۔ لیکن اس بار اس کا  
امرداد برہان الدین دشمنوں میں گھرا ہوا جنگ کر رہا تھا۔

سلطان اپنے چند سرداروں کو لے کر دریائے تنگ بھدر کے کنارے پہنچا۔ دربار میں طغیانی  
لڑ ہوئی تھی اور دوسرا گنبد مشکل سے نظر آتا تھا۔

سلطان نے سرداروں سے دریافت کیا:

”ہمارا ارادہ دربار پار کر کے برہان الدین کو مدد کو پہنچنے کا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

”سلطان معظم“ ایک سردار نے منانت سے جواب دیا:

”دربار میں طغیانی آئی ہوئی ہے۔ اوپر سے موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ ایسے میں دربار پار  
رہنا مناسب نہیں ہوگا۔“

سلطان نے دوسرے سرداروں کو طرف دیکھا۔

اس نے بھی دست بستہ عرض کیا:

”عالی جاہ۔ دریائے طوفانی موجوں میں لشکر دربار پار نہیں کر سکتا۔ اگر فوج کو کشتیوں پر بٹھکڑوں  
میں لاد کر لے جائے تو اس بار موجود دشمن انہیں آسانی سے ختم کر سکتا ہے۔ چند روز انتظار  
رہنے میں کوئی حرج نہیں۔“

سلطان نے تیسرے سردار کو دیکھا تو اس نے سب سے زیادہ بھیانک صورت پیش کی۔  
وہ نے بڑے اطمینان سے کہا:

عالی جاہ۔ دریا پار بہری پنت پھڑکیا اور نظام کا لشکر جس میں ایک لاکھ سوار اور ہتھیارے ہیں، نیچے گاڑے پڑا ہے۔ اگر ہم نے کشتیوں میں دریا پار کرنے کی کوشش کی تو رکاؤٹ سے لگا اور ہمارے اُن گنت لشکری بے موت مارے جائیں گے۔

سلطان کو اپنے سرداروں کا کوئی مشورہ پسند نہ آیا۔ اس نے ذرا تلخ لہجہ میں کہا: دریا اور پہاڑ لشکروں کے رستے نہیں رد کا کرتے۔ ہم اپنے ایک جاں نثار سردار (۱) کو دشمنوں کے نرغے میں زیادہ دن اکیلا نہیں چھوڑ سکتے۔

دوسرے دن سلطان دو پیادہ رجمنٹوں کے ساتھ کشتیوں پر سوار ہوا اور دریائے تگہ کی موجوں سے لڑتا دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔

اُدھر پہنچتے ہی سلطان نے ایک بلند جگہ پر اپنا علم نصب کر دیا۔ پھر تمام کشتیوں کو سوار لانے کو بھیج دیا۔ پھر تو لشکریوں کے دریا پار کرنے کا تاتا بندھ گیا اور چار دن کے اندر لشکر دریا پار پہنچ گیا۔

اس موقع پر سلطان ٹیپو نے کہا:

"آئندہ جو لوگ دریا پار کرنا چاہیں انہیں بھی سب سے پہلے پیادہ

فوج کو دریا پار اتارنا چاہیے۔ اس کے بعد سوار فوج کو اور پھیر

دوسرے لوگوں کو بھیجنا ہے۔"

سلطان کے دریا پار کرنے کے سلسلے میں میسور میں ایک روایت بہت مشہور ہے روایت ہے کہ سلطان نے طبعیاتی کی وجہ سے دریائے تگہ بھر دیا پار کرنے کے لیے دو روز انتظار کیا مگر جب دریا طبعیاتی میں کوئی فرق نہ پڑا اور پانی کم ہونے کے آثار دکھا دیے تو سلطان نے توپچی کو حکم دیا:

"یہ دریا ہمارے دشمن کا ہر دل دستہ ہے جو ہمارا رستہ ردک رہا ہے۔ اس لیے دریا اکیس گولے مارے جائیں!"

سلطان کے حکم کی تعمیل ہوئی۔ توپ کے اکیس گولے دریا میں پھینکے گئے اور قدرتِ الہی کہ گولے پھٹتے ہی دریا کا پانی کم ہونے لگا اور دریا پایاب بن گیا۔

اس واقعے کا لشکر اور دوسرے دیکھنے والوں پر ایسا اثر ہوا کہ انہوں نے اسے سلطانِ کرامت قرار دیا اور اس کی فتح و نصرت کے نعرے لگائے۔

سلطان دریا پار پہنچا تو بہری پنت (پنڈت) اور دشمن کے دوسرے سپہ سالار دریائے پارچا کے کنارے بیٹھ گئے اور انہوں نے قزلباشی جنگل اور پہاڑ میں پناہ لی۔

دشمن نے تین چار روز خاموشی سے تیاری کے بعد سلطان پر حملہ کیا مگر یہ حملہ سپاہِ کرار کے طرح تین چار حملے ہوئے جو سب کے سب سپاہِ کرار کے لیے گئے۔

اب سلطان نے شبِ خون کا منصوبہ بنایا اور ہمارا زخاں کو سوار دستے دے کر بھیجا۔ سلطان اودھی نصف راستہ تک ساتھ گیا تاکہ وہاں ٹھہر کر رہنمائی کر سکے مگر دشمن کو خبر ہو گئی اور اس نے گولہ باری شروع کر دی۔ جواب میں سلطان توپ خانہ نے بھی گولہ باری کی لیکن یہ شبِ خون ناکام ہو گیا۔

اگلے دن مرہٹے اپنا توپ خانہ لے کر سلطان کے مقابلے پر آئے اور تین توپوں سے گولے برسانا شروع کیے۔ سلطان کے توپ خانہ نے بھی جوابی گولہ باری کی۔

اس وقت سلطان نے ایک طرف سے ہمایہ زخاں اور حسین علی خاں کے ماتحت غازی خاں، دلی محمد خاں کابلی، ابراہیم خاں اور کابل خاں سپہ وار کو اپنے اپنے دستوں کے ساتھ اور دوسری طرف سے قادر خاں، امام خاں اور میر محمد کو آگے بڑھایا۔

دونوں بازوؤں سے یہ دستے اس طرح آگے بڑھے کہ مرہٹے فوج ان کے گھیرے میں آ گئی۔ میران پر ایسا دباؤ پڑا کہ مرہٹہ سردار اپنے بال بچوں کو میدان میں پھوڑ کے جانیں بچانے کے لیے جاگ کھڑے ہوئے۔

سلطان اس معرکہ میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ بھاگنے والے سرداروں کی خواتین امیر کے اس کے سامنے پیش کی گئیں۔

سلطان نے ان خواتین کے ساتھ نہایت عزت اور شفقت کا برتاؤ کیا اور انہیں زرد جو اہر دے کر یوٹا بھجوا دیا تاکہ وہ وہاں جا کر صلح و شہنشاہی کا پیغام دیں۔

سلطان نے یہاں سے کوچ کر کے بالا پور کی ندی کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔ مرہٹے بھی وہاں سے تین میل دور پر ایک جنگل کے سامنے ٹھہرے ہوئے تھے۔ سلطان نے غازی خاں کی سپہ سالاری میں امام خاں، فاضل خاں اور میر محمد کو ایک لشکر کے ساتھ دشمن پر حملہ کرنے کے لیے روانہ کیا۔

غازی خاں نے وہاں پہنچ کے ایک بڑی دلچسپ ترکیب آزادی۔

غازی خاں نے سپاہیوں کو کھیل اڑھاکر راتوں رات جنگل کے راستے سے مرہٹہ فوج کا عقب میں پہنچا دیا۔ یہ مرہٹوں کی چھاپہ مار فوج تھی۔ اس نے سلطان کی دستوں کو روکا اور ان کی اپنی ساخت کمرانے کو کہا۔

غازی خاں بڑی روانی سے مرہٹی زبان بولتا تھا۔ اس نے مرہٹہ سردار کو بتایا:

"ہمیں نظام کے راجپوت سے ملک کے طور پر بھجوا ہے۔"

مرہٹوں کو معلوم تھا کہ نظام آکر نہ لگا اور وہاں قلعہ اودھوٹی چھوڑ کے راجپوت فرار ہو گئے۔ اس لیے انہیں غازی خاں کی بات کا اعتبار نہ کیا۔ وہ خوشی خوشی غازی خاں اور اس کے فوجی دستہ کو اپنے لشکر میں لے گئے۔

جب غازی خاں وغیرہ مرہٹہ لشکر کے درمیان میں پہنچے تو انہوں نے بند و تین سیدی چلی اور نعرہ مار کر مرہٹوں پر گریز کی بارش کر دی۔

مرہٹے اس اچانک حادثے سے گھبرائے اور اپنے حواس کھو بیٹھے۔ ان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ وہ گویا کون چلا رہا ہے اور کدھر سے آ رہی ہیں۔ ان پر ایک دم سلطان کی دست خطا ہو گئی۔ وہ بھی سمجھے کہ سلطان کا لشکر اچانک وہاں آ پہنچا ہے اور مرہٹوں کو گولیوں سے بھونک رہا ہے۔ اس بدحواسی کے عالم میں وہ جہاں تھے اور جس حال میں تھے اسی طرح گھوڑوں کی سڑکی پر چڑھ کر سواری ہو کر بھاگ نکلے۔ ان کے ساتھ خواتین بھی تھیں مگر ان کی جانوں پر یہی تھی۔ وہ ان کی طرف توجہ دے بغیر جس کا جدھر منہ اٹھا، اُدھر بھاگ نکلے۔

غازی خاں اس نعم میں کامیاب و کامراں ہو کر سلطان کے پاس پہنچا۔ اس کے ہمراہ مرہٹہ سرداروں کی بیویاں، بیٹیاں اور بہنیں بھی تھیں۔ سلطان نے ان تمام خواتین کو پاکیزوں میں بٹھا کر غریبوں کے لشکر میں بھجوا دیا۔

ان خواتین کے ساتھ سلطان نے خفیہ طور پر ہری پنت پہنچا دیا اور وہاں دھوکہ چار لٹھی اور تیز رفتار گھوڑے تحفہ کے طور پر بھجوا کر انہیں اپنا ممنون احسان کرنے کی کوشش کی۔

چونکہ غازی خاں اور اس کے دستوں نے ایک بڑا کارنامہ انجام دیا تھا اس لیے سلطان نے سب کو "فر" انعام دیا اور اس سے بے وفار کیا۔

مرہٹہ فوج میں دریائے ننگ بھدرا کے میدان سے شکست کھا کر بھاگیں تو سیدی چلی شا

تھیں، جہاں نظام کی فوجیں ان کا انتظار کر رہی تھیں۔ مرہٹوں نے حاکم شاہنور عبدالحمیم سے سازش کرنے کے قریب ہی ایک تالاب کے کنارے پڑاؤ ڈالا۔

دوسری طرف سلطان کی لشکر بھی شاہنور کی طرف بڑھا۔ عبدالحمیم خاں کو سلطان کی شکر کے آنے کی خبر ملی تو وہ اپنے اہل و عیال کے ساتھ مرہٹہ لشکر میں چلا گیا اور شہر میں اپنے بیٹے خیر الدین عرف "خیرا" کو چھوڑ گیا۔

اسی رات سلطان شاہنور کے سامنے آ کر خیمہ زن ہوا۔ اس نے میر صادق اور مہدی خاں کو شہر میں سامان رسد اکٹھا کرنے کو بھیجا۔ یہ دونوں اپنے دستہ کے ساتھ حکیم خاں کے محل پر پہنچے اور نقد و جنس، فرش فروش، ظروف و اسلحہ وغیرہ جو کچھ ان کے ہاتھ لگا وہ سب اٹھا لائے اور اس سامان کی ایک فہرست بنا کر سلطان کو پیش کر دی۔

عبدالحمیم خاں کا بیٹا خیر الدین عرف خیرا خود ہی سلطان کے سامنے پیش ہو گیا۔

سلطان نے اس سے کہا:

"تمہارے باپ کو آخر کیا ہو گیا ہے۔ وہ در بدر مارا مارا پھر رہا ہے۔ ہم نے احوال سے کوئی زیادتی نہیں کی بلکہ عزیزداری کا لحاظ کر کے ہم سے مراعات دینا چاہتے ہیں مگر اسے تہہ نہیں کیا ہو گیا ہے کہ ہمارا ساتھ دینے کے بدلے دشمنوں سے ساز باز کر کے ہماری مخالفت پر مگر باندھ لی ہے۔ اس کا خیازہ وہ ضرور بھگتے گا۔"

سامان رسد حاصل کرنے کے بعد سلطان شمال میں جوبین گڑھ میں جا خیمہ زن ہو گیا۔

اس نے لشکر کو چند روز آرام دیا۔ پھر لشکر کی تنظیم نو کی۔

سلطان نے لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کیا۔ اس طرح مرحہ لشکر میں سوار اور پیادوں کے علاوہ پندرہ توپیں تھیں۔ سلطان نے ہر لشکر پر ایک سالار مقرر کیا:

ایک حصہ لشکر پر میر الدین سید صاحب،

دوسرے پر برہان الدین،

تیسرے پر مامیرزا خاں اور حسین علی خاں میر بخشی کو سالار مقرر کیا گیا۔ خود سلطان چوتھے

اور پڑے لشکر کے ساتھ جوبین گڑھ میں ٹھہرا تا کہ دشمن کے قلب لشکر پر حملہ کر سکے۔

اس انتظام کے بعد ایک شب جب کہ مولادھار بارش ہو رہی تھی، سلطان نے تمام

لشکروں کو دشمن پر حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھایا۔  
دشمن اس دھواں دھار بارش میں کسی حملے کا تصور بھی نہ کر سکتا تھا مگر سلطان نے اس موقع سے فائدہ اٹھا یا اور لشکر کو حملہ کا حکم دے دیا۔

یہ خیال رہے کہ اس وقت تک دائرہ بلیس کی ایجاد نہیں ہوئی تھی اور لشکر کے مختلف حصوں تک پیغام رسانی کا کام بدوقتی کی گولیوں یا توپ کے گولوں سے لیا جاتا تھا۔ سلطان نے بھی اپنے اشارے مقرر کر رکھے تھے جن سے بندوچیں اور توپچیوں کے سردار آگاہ رہتے تھے۔  
مرہٹہ لشکر، سلطان افواج سے کچھ زیادہ دور نہ تھا اس لیے سلطان نے طلائیہ کو اپنے ساتھ ہی رکھا تھا۔

سب سے پہلے سلطان نے اپنا لشکر آگے بڑھایا۔ تھوڑی سی دیر بعد سلطان کا طلائیہ دشمن کے طلائیہ کے سامنے پہنچ گیا۔

جو کہ رات کا وقت تھا اور بارش کا طوفان اٹھا ہوا تھا۔ ایسے میں دشمن کا طلائیہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ اس کے سامنے آنے والے سوار دستے کس لشکر کے ہیں۔  
پس —

دشمن کے طلائیہ کے سواروں میں سے ایک نے آواز دے کر پوچھا:  
"تم لوگ کون ہو اور تمہارا تعلق کس لشکر سے ہے؟"  
چونکہ سلطان اپنے طلائیہ دستوں کے ساتھ ساتھ آ رہا تھا اس لیے اس کے طلائیہ کے سواروں نے اپنی زبانیں بند رکھیں۔

دشمن کو جب کوئی جواب نہ ملا تو اُن کے سوار کچھ اور آگے بڑھ آئے اور انھوں نے پھر اپنا سوال دہرایا۔

اس وقت تک سلطان اپنے طلائیہ کے بالکل برابر پہنچ گیا تھا اور اس نے اندازہ لگایا تھا کہ دشمن کے طلائیہ سواروں کی تعداد دو ڈھائی سو سے زیادہ نہیں۔ اس لیے اس نے فائدہ کھولنے کا حکم دے دیا۔

لے طلائیہ ان فوجی دستوں کو کہا جاتا ہے جو لشکر کے آگے آگے چلتے ہیں اور دشمن کی خبر دیتے ہیں۔ انہیں گشتی دہستے بھی کہتے ہیں۔

اس اچانک فائرنگ سے دشمن کے طلائیہ کے بیشتر سوار مارے گئے۔ کچھ بڑے گولہ باز

سلطان نے ان بھاگنے والوں کا تعاقب کیا اور دوسرے کیمپ کے بالکل قریب پہنچ گیا۔  
اس وقت سلطان نے ایک توپچی کو گولہ داغنے کا حکم دیا۔  
یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ سلطان کی توپ کی آواز سننے ہی پر لشکر بھی اپنے ہدف پر حملہ کر دیں۔

اس توپ کے جواب میں صرف ایک جانب سے توپ رانی گئی۔ اس کا مطلب تھا کہ صرف ایک لشکر اپنے ہدف پر پہنچ سکا ہے۔ باقی لشکریوں کی طرف سے کوئی جواب نہیں دیا گیا۔

سلطان کو اس وجہ سے پریشانی لائن ہوئی کہ خدا معلوم دوسرے لشکریوں پر کیا گوری مگر وہ مردوں کے جواب کا انتظار بھی نہ کر سکتا تھا اس لیے کہ اس کا لشکر دشمن کے کیمپ تک پہنچ چکا تھا۔  
ایسے وقت میں اگر وہ کیمپ پر حملے میں تاخیر کرتا تو وقت نکل جاتا اور اُسے فائدہ سے کچھ بچا نہ لے سکتا تھا۔

سلطان نے اندھا نام لے کر توپ نالے کو گولہ باری کا حکم دے دیا اور دشمن کے کیمپ میں داخل ہو گیا۔

اسی وقت سلطان نے باقی مردوں کے لشکروں کی توپ کے الگ الگ فائر کی آواز سنی۔  
یہ اس بات کا ثبوت تھا کہ وہ بھی اپنے اپنے ہدف پر پہنچ گئے ہیں۔  
اب صبح کی سفیدی نمودار ہو گئی تھی۔

سلطان دشمن کے کیمپ میں صرف تین سو سپاہیوں اور اسے توپ کے ساتھ داخل ہوا تھا۔  
مگر جلد ہی اس کا پورا لشکر اس کے پاس پہنچ گیا۔

اس اچانک اور بالکل غیر متوقع حملے سے دشمن نے گھبراہٹ کا شریعہ شروع کر دیا اور سامنے کی پہاڑیوں پر چڑھ گیا۔

صبح نو بجے کے قریب بھاگنے والے پہاڑیوں سے اترے اور ایک جگہ جمع ہو کر انہوں نے اپنی صف بندی کی۔ ان کا لشکر لا تعداد تھا چنانچہ وہ بڑی توپوں سے گولے برساتے۔ پتھروں اور کیمپوں کی طرح جھنجھٹاتے اور شور کرتے آگے بڑھے۔

سلطان کے ساتھ اگرچہ بھاری توپ، خانہ قیامگر اس نے اسے خاموش رکھا اور مکی توپوں کے

دستہ کو حکم دیا کہ وہ گولے برساتیں اور ان توپوں کو نشانہ بنائیں جو نزدیک پہنچ رہے ہوں۔ سلطان کا مقصد یہ تھا کہ دشمن کو اسی غلط فہمی میں رکھا جائے کہ اس کے پاس بھاری توپ، خانہ نہیں ہے اور صرف چند چھوٹی توپیں ہیں جنہیں وہ استعمال کر رہا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ وہ دیر تک آگے بڑھنے کا اور اُس وقت اس پر بڑی توپوں کا فائر کھول کر نقصان پہنچایا جائے جو ناقابلِ یقین ہو گا۔

سلطان کی سوچ بالکل صحیح تھی۔

دشمن کو جسے اس بڑی توپوں کا جواب نہ ملا تو اسے گمان ہوا کہ سلطان کے ساتھ بڑا توپخانہ نہیں ہے اور وہ صرف چند چھوٹی توپوں کے ساتھ حملہ آور ہوا ہے۔ اس خیال کے واضح ہوتے ہی دشمن نے تیزی سے آگے بڑھنا شروع کیا۔ یہ منصوبہ سلطان نے حملہ سے پہلے بنایا تھا اور باقی لشکر وں کو اچھی طرح ذہن نشین کر دیا تھا۔ جب سلطان کے خیال کے مطابق دشمن پوری طرح اس کی بڑی توپوں کی زد میں آ گیا تو اس نے بھاری توپ خانے کو گولہ باری کا حکم دیا۔

اور اسے گولہ باری شروع ہوتے ہی سلطان کے مجوزہ منصوبے کی ہدایت کے مطابق اس کے باقی لشکروں نے بھی بڑی توپوں سے بیک وقت دشمن پر چاروں طرف سے فائر کھول دیا۔ اس وقت اس قدر گولہ باری ہوئی کہ دم کے دم میں ہزاروں مرٹے موت کے گھاٹ اُتہ گئے۔ لشکر بوں کے علاوہ اس جنگ میں دشمن کے دو ہزار گھوڑے اور تین ہاتھی بھی مارے گئے چند ہی گھنٹوں بعد دشمن میدان سے ہٹ کر رہ گیا۔

مرٹے یہاں سے پسا ہو کر چھ کوس پیچھے ہٹ گئے۔ سلطان بھی لشکر کو لے کر اپنے کیمپ میں آیا اور دو روز تک سلطانی لشکر آرام کرتا رہا۔

پھر سلطان کو خبر ملی کہ دشمن نے شاہنور کے قریب در کے دائیں کنارے پر بڑا دیکھا ہے جتنا بچہ سلطان بھی اپنے لشکر کو لے کر وہاں پہنچا اور دشمن کے مقابل اپنی لشکر گاہ قائم کی۔ چونکہ عید میں صرف تین چار دن باقی تھے اس لیے سلطان نے جنگ سے گریز کیا اور لشکر کو عید تک آرام کرنے دیا۔

عید کے دوسرے دن سلطان جنگ کے لیے نکلا۔ اس دفعہ اس نے بان داروں کو سواروں کے آگے رکھا اور لشکر کے پیسرہ کو شاہنور کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔

سلطانی لشکر کی اس نقل و حرکت کو دیکھ کر مرٹوں نے اپنی اس فوج کو واپس بلایا جو خاص شاہنور میں کیمپ لگائے ہوئے تھی۔

سلطانی لشکر کو یہیں ایک دلچسپ خبر ملی۔

پہلے بتایا گیا ہے کہ سلطان کے لشکر کی آمد کی خبر سن کر والی شاہنور عبدالعظیم خاں اپنے بیٹے خیر الدین عرف خیر کو قلعہ میں چھوڑ کر مع خزانہ اور میگات کے مرٹہ کیمپ میں چلا گیا تھا۔ وہ مرٹوں اور نظام سے عازباز کر کے سلطان کا مخالف ہو گیا تھا اس لیے اسے خیال تھا کہ مرٹے نہ صرف اس کی جان و مال کی اچھی طرح حفاظت کریں گے بلکہ اسے عزت بھی دیں گے۔

اس کے ان مرٹہ دوستوں نے اس کے ساتھ بالکل اٹنا سلوک کیا۔ انہوں نے عبدالعظیم سے پر خزانہ چھین لیا اور صرف پہننے کے چند کپڑوں اور چند سورتوں کے ساتھ اسے ایک دستہ کی حفاظت میں ریاست میراج کی طرف روانہ کر دیا۔

خود مرٹہ لشکر کی پہل کی طرف فرار ہو گیا۔

سلطان نے بھی اپنا کیمپ شاہنور سے اٹھا کر بنکا پور میں لگایا۔ شاہنور کی حفاظت کے لیے سلطان نے صرف ایک چھوٹا سا دستہ وں چھوڑا تھا۔

چھ بنگالوں میں سلطان کا قیام دو ہفتے سے بھی زیادہ رہا اس لیے کہ محرم کا عید نہ شروع ہو گیا تھا اور سلطان محرم کے پہلے عشرے میں جنگ سے پرہیز کرتا تھا۔

عشرہ محرم کے روز بعد سلطان کی خدمت میں سرداروں نے ایک ساتھ تین تین نذریں گزاریں۔ ایک نذر عید الفطر کی تھی جو جنگ کی وجہ سے پیش نہ کی جاسکی تھی۔

دوسری نذر فتح شاہنور کی تھی۔

اور تیسری نذر شہزادہ نظام الدین کی ولادت باسعادت کی تھی۔

سلطان نے بنگالہ پور کے قیام کے دوران ہی ایک خط مرٹہ سردار کو بھیج کر بلکے پاس صبحا جو دشمنوں میں سب سے زیادہ بہادر سمجھا جاتا تھا۔

خط کا مضمون کچھ اسی طرح تھا کہ

اگر نظام علی خاں یہاں ہوتا تو میں اسے غائب کرتا۔ اس کے نہ ہونے کی وجہ سے میں ہمیں محاطہ کر رہا ہوں۔



اس جنگ سے کیا حاصل جس میں ہزار ہا مخلوقِ خدا ماری جا چکی ہے  
اس کے فیصلے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ کا اور میرا لشکر آمنے  
سامنے کھڑا ہو۔ پھر سپاہی سے سپاہی اور سردار سے سردار جنگ  
کرنے یا پھر دونوں لشکروں کے درمیان صرف میں اور آپ جنگ کریں  
جو غالب رہے فتح اس کی سمجھی جائے۔

سلطان کے اس خط کا شکوہی ہلکے پر تو کوئی اثر نہ ہوا مگر جب اس خط کا مضمون عام ہوا اور لوگوں  
کو سلطان کے خیالات سے آگاہی ہوئی تو بہت سے پندارے اور پالیگا درہرہے لشکر کو چھوڑ کر سلطان  
سے آئے۔

سلطان کو اسی دورانِ باسوسوں نے اطلاع دی کہ دشمن کپل اور قلعہ بہادر بندے کے اس  
طرف قیم ہے اور یہ قلعہ بہت مضبوط ہے۔

سلطان نے اس اطلاع سے باخبر ہوتے ہی اپنا پڑاؤ یہاں سے اٹھا کر قلعہ بہادر بندے کا  
دُخ کیا اور وہاں پہنچ کر اپنی ایک ڈویژن فوج کو قلعے کا محاصرہ کرنے کا حکم دیدیا۔ تاکہ قلعہ والوں کو  
باہر سے کمک نہ مل سکے۔

سلطان نے قلعہ پر گولہ باری کا حکم دیا اور سلطانی توپ خانہ قلعہ پر آگ اگلنے لگا مگر قلعہ کی  
فصیل دراصل بہادر کاٹ کر بنائی گئی تھی اس لیے گولہ باری کا اس پر مطلق کوئی اثر نہ ہوا۔  
اب سلطان نے دھرمی ترکیب سوچی اور کچھ سپاہیوں کو فضیل قلعہ کے قریب چھپ جانے کا  
حکم دیا گیا۔

ان سپاہیوں سے کہا گیا کہ صبح اذان کے بعد جب حملہ کا اشارہ ہو تو وہ فضیل پر چڑھنے کی  
کوشش کریں۔

سلطان کے حکم پر صبح کو عمل شروع ہوا۔  
نمازِ فجر کے بعد بانِ داعِ حملہ کا اشارہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ ہی میدان میں نصب سلطانی  
توپ خانہ نے قلعہ پر گولوں کی بارش شروع کر دی۔  
یہ بڑی شدید گولہ باری تھی لیکن دشمن نے بھی گولوں کا جواب گولوں سے دیا اور جنگ میں  
انتہائی شدت پیدا ہو گئی۔

اس وقت فضیل کے قریب چھپے ہوئے سپاہیوں نے کندیں پھینک کر قلعہ پر چڑھنے کو

کوشش شروع کر دی لیکن قلعہ پر گولہ باری کے باوجود فضیل پر موجود دشمنوں نے اور چڑھنے والوں پر  
بڑے بڑے پتھر ٹھکانے شروع کر دیے۔ اس سے سلطانی لشکر کی کئی قیمتی جانیں ضائع ہو گئیں۔  
اس کے علاوہ فضیل پر ہر جیوں کی آڑ میں پرشیدہ سپاہی بندو قوں سے بھی ان اور چڑھنے والوں  
پر گولیاں برسا رہے تھے۔

کہتے ہیں کہ سپہ سالار وہی ہے جو عین وقت پر سوچے اور اس پر فوراً عمل کرے۔  
سلطان نے پھر ایک حکمتِ عملی آزمائی۔ اس نے دو توپچیوں کو حکم دیا کہ وہ قلعہ پر گولہ باری  
کرنے کے بجائے صرف اس آدمی کو نشانہ بنائیں جو انہیں فضیل پر نظر آئے۔

چنانچہ ان توپچیوں نے تاک تاک کر نشانہ لگانے شروع کیے اور کچھ ہی دیر بعد ان کا ایک  
گولہ قلعہ دار پر گر اچو ایک برج میں سے جہانک راہتا۔ گولہ لگنے ہی قلعہ دار کا خاتمہ ہو گیا اور فوج نے  
بہت قلد ڈال دیے۔

سلطان نے عام معافی کا اعلان کر دیا اور قلعہ سے دشمن فوج کو نکال کر اس پر قبضہ کر لیا۔ اس  
قبضے کے بعد دشمن ایک بار پھر اپنی پوری جمیعت کے ساتھ مقابلہ کو آیا مگر سلطانی توپ خانہ نے  
ایسی گولہ باری کی کہ وہ گھر گھر کے سپاہیوں کو اور چار میل دور جا کے ٹھہرا۔  
سلطان بھی لشکر لے کے بڑھا۔ مرہٹوں نے مقابلہ کیا مگر صرف چند گھنٹے اور پھر سامان چھوڑ  
کر جنگ نکلے۔

اب تو مرہٹہ لشکر کی یہ کیفیت ہو گئی کہ وہ شام کے وقت گھوڑوں اور گاڑیوں پر اپنا سامان  
لا لیتے اور رات بھراس انتظار میں رہتے کہ کب اُن پر حملہ ہو اور وہ بھاگیں۔ آئندہ دو مہینوں تک  
وہ اسی طرح اپنا سامان لیے پیچھے ہی پیچھے سپاہی ہوتے رہے۔

مرہٹوں پر سلطانی لشکر کا رعب بیٹھ گیا تھا۔ وہ اپنی جان تو بچھڑانا چاہتے تھے لیکن عزت کے  
ساتھ تاکہ انہیں شکست کا طعنہ نہ ملے۔  
پہلے کہا جا چکا ہے کہ مرہٹوں کا سپہ سالار شکوہی ہلکے تھا۔ اس نے اپنے دردمند سلطان کے  
حضور بھیجے۔ سلطان نے انہیں باریابی دی۔  
قاصدوں نے عرض کیا:

"اے سلطان۔ ہمارے سپہ سالار ٹکوجی ہلکے نے ہمیں آپ کے حضور بھیجا ہے۔"  
 سلطان نے انتظار کیا کہ قاصد کچھ آگے کیوں گے مگر وہ خاموش رہے۔ سلطان نے ذرا دیر  
 بعد دریافت کیا:  
 "تمہیں ٹکوجی ہلکے نے ہمارے پاس بھیجا ہے۔ ہمیں یقین آ گیا کہ تمہیں اسی نے بھیجا ہے۔  
 مگر کیوں؟"

"اے سلطان۔ ہمیں سپہ سالار نے آپ کے حضور اس لیے بھیجا ہے کہ آپ اپنے چند آدمی  
 ہمارے سپہ سالار کے پاس بھیجیں۔"  
 اتنا کہ کمرہ لوگ پھر چپ ہو گئے۔

سلطان سمجھ گیا کہ یہ لوگ باتوانتہائی بے وقوف ہیں یا پھر حد درجہ چالاک، ہوا ایک بات کہ  
 توڑ توڑ کے اور سوال کرنے پر ہنسا رہے ہیں۔ چنانچہ سلطان نے سخت لہجے میں کہا:  
 "ٹکوجی ہلکے کے قاصد۔ کان کھول کے سنو۔ قاصد یا ہر کارہ اپنے مالک یا بھیجنے والے کا  
 نام لے کر ہوتا ہے اس لیے ہم تمہیں معاف کرتے ہیں مگر تمہاری اس بے ہودہ گوئی پر ہم تمہیں ذیل کر کے  
 نکلوا سکتے ہیں۔ اپنے آنے کا مقصد واضح اور مختصر الفاظ میں بیان کر دو ورنہ واپس چلے جاؤ۔"  
 سلطان کی ڈانٹ پر ہی تو قاصدوں کا دماغ ٹھکانے آ گیا ان میں سے ایک بولا:  
 "اے میسرور کے سلطان۔ میں تو ایک ہی جگہ میں آنے کا مقصد بیان کر دیتا لیکن میرا یہ ساتھی  
 میرے ساتھ ہی بولنے لگتا ہے، اس لیے میں بات بھول جاتا ہوں۔ اب میں نے اسے سختی سے منع کر  
 دیا ہے کہ اب صرف میں بولوں گا اور یہ خاموش رہے گا۔"

تو اسے سلطان! ہمارے سپہ سالار نے آپ کو پیغام بھیجا ہے کہ آپ اپنے اعتماد کے چند  
 مردار بھیجے تاکہ وہ ہمارے سردار سے صلح کی شرائط طے کریں۔"

سلطان کی تاکید کے باوجود قاصد نے اتنی مختصر بات کو اس قدر طول دیا۔ سلطان نے فوراً  
 جواب دیا:

"اپنے سپہ سالار ٹکوجی ہلکے سے ہماری طرف سے کہنا کہ ہمیں ان کا پیغام مل گیا۔ ہمارے  
 سردار گفتگو کے لیے آج ہی ان کے پاس پہنچ جائیں گے۔"

قاصدوں کے جانے کے بعد سلطان نے بدرالزاں خاں اور علی رضا خاں کو حکم دیا کہ وہ چند  
 افراد کو ساتھ لے کر ٹکوجی ہلکے کے پاس جائیں اور ایک باعزت صلح کے معاہدے کے لیے

گفتگو کریں۔

حسب الحکم دونوں سردار کچھ افراد کو لے کر ٹکوجی ہلکے کے پاس پہنچے۔ اس وقت مرہٹہ شکر  
 سلطان شکر سے تقریباً دس میل دور پسپا ہو کر پہنچ چکا تھا۔

مرہٹہ سپہ سالار نے سلطان کے سرداروں کو خوش آمدید کہا اور گفتگو شروع ہوئی۔ گفتگو  
 میں بہت سے مدد جز آئے۔ آخر میں فریقین کچھ باتوں پر متفق ہو گئے۔

مرہٹہ سپہ سالار نے مندرجہ ذیل مضمون کا خط لکھ کے برہان الدین کو دیا کہ وہ اس کا سریری  
 جواب سلطان سے لکھوا کے بھجوائیں۔

مرہٹہ سردار کے خط کا مضمون یہ تھا:

"ہم نے جو کچھ غلطیاں کی ہیں وہ ہماری جانب سے ہوئی ہیں۔ ہمارا

آقا امیر، کا فرزند ہے اس لیے سلطان کو پتا ہے کہ ہمارے آقا کی

مختالی کے لیے کچھ رقم اور اکہ۔ دو لاکھ روپیہ۔

یہ کچھ بڑا مطالبہ نہیں ہے اور اس قدر قلیل ہے کہ ایک فرزند

اپنے باپ سے کر سکتا ہے۔

چونکہ یہ جنگ نظام کی فتنہ انگیزی کے باعث ہوئی ہے اس لیے

ہم نہایت عجز کے ساتھ معافی سے طلبہ کار ہیں۔

سلطان نے ہلکے کا خط پڑھ کر اسی وقت جواب بھجوا دیا۔ سلطان کا جواب مرہٹہ چند الفاظ  
 پر مشتمل تھا:

"ہم صرف بارہ لاکھ روپیہ دے سکتے ہیں۔"

مرہٹہ سردار تو کسی بھی طرح گلو خلاصی کرنا چاہتے تھے اس لیے انھوں نے یہ رقم لینا منظور کر  
 لیا۔ اس کے بعد صلح نامہ مرتب ہوا جس میں تین شرطیں تھیں:

۱۔ دریائے زہرا کے اس پار کے حکمران نظام علی خان، پنڈت مادھو

راؤ پر دھان اور مرکار خدا داد (سلطان یسوی) اس بات کا عہد کرتے

ہیں کہ یہ تینوں اپنے اپنے علاقوں پر یہی حکمرانی کریں گے اور بالکل

امن و اتحاد سے رہیں گے۔

۲۔ اگر کوئی چوتھی طاقت ان میں سے کسی ایک پر حملہ کرے تو تینوں متحد

ایک نظر بند رکھا۔



سلطان مرزا کا بیٹا آیت اللہ سے بتایا گیا کہ دیوان میر صادق نے دارالسلطنت میں اور محمد مجاہد کا بیٹا اس سے سخت ٹالنا ہے اور اس نے سرکاری خزانے میں سے لاکھوں کی رقم خورد و خیرہ دے کر لے لی ہے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ سلطان کے پاس میر صادق کے خلاف ایسی شکایات پہنچیں جن کے ساتھ مکمل شہادتیں اور تحریری ثبوت موجود تھے۔

پس سلطان نے ان الزامات کی سختی سے تحقیقات شروع کیں۔ ثبوت اور شمار اس قدر مکمل ہوئی تھیں کہ میر صادق کو فی بھی بہانہ نہ تراش سکا۔

سلطان جو میر صادق کو اب تک اپنا وفادار اور ایک قابل اعتماد ساتھی سمجھتا تھا، اس کے دل میں میر صادق کی طرف سے ایسا میل آیا کہ اس نے میر صادق کو فوراً دیوان (وزیر اعظم) کے عہدے سے معزول کر دیا اور اس کی جگہ ممد علی خاں ہنکری نائبہ کو دیوان بنا دیا۔

روایت ہے کہ جب منکرام میر صادق علی کے گھر کی تلاشی لی گئی تو وہاں سے دس لاکھ روپے سلطانی اور ایک لاکھ روپے محمد شاہی برآمد ہوئے۔ اسی سال سلطان نے مسجد علی کی تعمیر کو مکمل کرنے کا حکم دیا۔ اس کی تعمیر تین سال پہلے شروع ہوئی تھی۔

یہ وہی مسجد تھی جس کی تعمیر کا وعدہ سلطان نے بچپن میں اس فقیر سے کیا تھا جس نے بیٹو کو سلطان ہونے کی نوید دی تھی اور وعدہ لیا تھا کہ وہ سلطانی پر فائز ہونے کے بعد اسی جگہ ایک مسجد تعمیر کرے گا۔

اس مسجد علی کے سلسلے میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جس جگہ یہ مسجد بن رہی تھی وہاں پہلے ایک چھوٹا سا ہندوؤں کا مندر تھا۔ جب سلطان کو تعمیر مسجد کا خیال آیا تو اس نے وہاں ایک تعمیر شدہ مندر دی۔

سلطان اگر ذرا بھی متعصب ہوتا تو فوراً مسجد توڑ کے مسجد کی تعمیر کا حکم دے سکتا تھا مگر سلطان بڑا دوادار حکمران تھا۔ اس نے زبردستی جگہ حاصل کرنے کے بجائے شہر کے تمام متادارے پتہ توں

ہمو کر اس کا مقابلہ کریں گے، خواہ ان میں کتنے ہی اختلافات کیوں نہ ہوں وہ انہیں دور کر دیں گے۔

۳۔ شاہنور کی حکمرانی عبدالعظیم کے پاس ہی رہے گی اور ادھونی کا قلعہ جابت جنگ کو دیدیا جائے گا۔ زرگندہ، نوگندہ اور بانی کے قلعے بطور انعام پیشواؤں کو دے دیے جائیں گے۔

معادہ کے بعد سلطان نے رائے درگ اور سرینہلی کے پالیگاردوں کو (جو باغی ہو گئے تھے) تادیب اور تنبیہ کی اور انہیں گرفتار کر کے مرزا کا بیٹا بھجوا دیا۔ پھر فتح و نصرت کے نفاذ سے بھوانی دارالسلطنت پہنچا۔

سلطان نے جشن عام کا حکم دیا اور سرداروں کی دعوت کی مرداروں اور عہدے داروں میں سے قسم لے۔ مساکین کو ایک ماہ تک مسلسل کھانا کھلوا یا گیا اور ہر ایک کو ایک ایک لباس عطا ہوا۔

سلطان نے مرہٹوں سے ۷۷۰۰۰ روپے معاہدہ کیا تھا اس سے یہ امید بندھی تھی کہ سلطنت خداداد کو کچھ دنوں کے لیے انگریزوں، نظام دکن اور مرہٹوں کی شورشوں سے نجات مل جائے گی مگر یہ امید پوری نہ ہوئی اور سلطان کے لیے یہ معاہدہ ایک امن فضول کی کوشش ثابت ہوا۔ اور تاریخ میں اسے "امن فضول" ہی کا نام دیا گیا۔

شاہنور کے معرکے میں امیر قمر الدین، سلطان کے سرکاب نہ تھا۔ اس کا قصیدوں ہوا تھا کہ اس معرکے سے پہلے جب سلطان قلعہ ادھونی پر حملہ آور ہوا تو انہی دنوں مفتی ارکاٹ مرزا الدین محمد کا انتقال ہوا مگر یہ افواہ اڑی کہ "سلطان بیٹو" کا انتقال ہو گیا۔ یہ افواہ اس قدر تیزی اور ایسے دھوکے سے پھیلی کہ سب کو اس کا یقین ہو گیا۔

امیر قمر الدین ان دنوں کسی اور جگہ تھا۔ اس نے یہ خبر سنی تو اپنے ساتھ کے فوجی دستوں کو لے کر فوراً مرزا کا بیٹا کی طرف روانہ ہوا تاکہ میسور کے تخت و تاج پر قبضہ کر لے۔

مسیح کو قمر الدین کی اس حرکت کی اطلاع ملی تو اس نے یہ بغاوت فرد کو نہ کے بلکہ فوج روانہ کی۔ قمر الدین نے بہت اودھم مچایا مگر بالآخر گرفتار کر لیا گیا اور سلطان نے اسے دروا

کو دربار میں بلوایا اور انہیں خود مخاطب کیا:

”اے ہندو دھرم کے پرستو اور پیشواؤ! فلاں مقام پر تمہارا ایک چھوٹا سا مندر ہے۔ عبادت گاہ خواہ کسی بھی مذہب کی ہو اسلامی نقطہ نظر سے وہ قابل احترام ہے چنانچہ ہم اپنے دین کے اس حکم کے پابند ہیں۔

اب تم لوگوں سے سلطان کی یہ درخواست ہے کہ اس حقیر نے اپنے بچپن میں ایک درویش سے وعدہ کیا تھا کہ جب میں سلطان بن جاؤں گا تو اس جگہ ایک مسجد تعمیر کروں گا۔ میں نے درویش سے یہ وعدہ اسی جگہ کھڑے ہو کر کیا تھا جہاں اس وقت تمہارا مندر ہے۔ ان حالات میں اگر تم پسند کرو تو میں تمہارے لیے موجودہ مندر سے کہیں بڑا اور شاندار مندر تعمیر کرا کے دے سکتا ہوں۔ وہ جگہ تمہاری پسند اور تعمیر تمہارے نالے ہوئے نمونہ کے مطابق ہوگی۔ اس کے صلہ میں تم ہمیں اس مندر کی جگہ اپنی مسجد تعمیر کرنے کی اجازت دیدو۔“

پھر سلطان نے چند لمحے رک کر کہا:

”میں تم پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ یہ میرا ذاتی منصوبہ ہے اور مسجد کے لیے جگہ مانگنا میری درخواست ہے۔ یہ سلطانی حکم ہرگز نہیں ہے۔“

سلطان کے اس رویے سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ہندوؤں کے ساتھ کس قدر روادار و سلوک کرتا تھا۔

ہندوؤں نے سلطان کی درخواست خوشی خوشی منظور کر لی اور سلطان نے مسجد کی تعمیر شروع کر کے پہلے ہندوؤں کے مندر کی تعمیر شروع کرا دی۔ چنانچہ سلطان ٹیپو کی تعمیر کردہ مسجد اٹلی اور مندر بدلے میں تعمیر کیا گیا مندر مرنگا پٹم میں آج بھی موجود ہے۔

سلطان کے رواداری بھرے اس سلوک سے خود سلطان کو جس قدر نقصان پہنچا اس پر بیان پہلے ہی ہو چکا ہے اور ابھی مزید آگے بھی آئے گا۔

اگر سلطان میسور کی راج محل کی رانیوں اور وہاں کے مندروں کے پتہ توں کو پسلی ہی

منت مزاد سے دیتا تو پھر کسی اور کو سلطنت خداداد کے خلاف بغاوت کرنے کا موقع نہ ملتا اور انہیں جرأت نہ ہوتی۔ سلطان کے نرم رویہ ہی کے باعث راج محل کی رانیاں مسلسل فتنہ و فساد اور سازشوں کی مرتکب ہوتی رہیں۔

اس سال سلطان نے جامع الامور کے نام سے ایک یونیورسٹی قائم کی۔

صوبوں کے انتظامات ازمرنوتر تیب دیے گئے۔

نئے سکے ڈھالے گئے۔

فرانس اور قسطنطنیہ کو سفارتیں روانہ ہوئیں۔

اس سال سلطان نے ”تخت ہما“ تیار کرایا۔ یہ تخت شیر کی پشت پر رکھا ہوا دکھائی دیتا تھا۔ اس بات کا ذکر بارگاہ کیا جا چکا ہے کہ سلطان کو شیروں سے بہت دلچسپی تھی۔

ایک بار آغاز جوانی میں جب سلطان ابھی شہزادہ تھا تو نظام دکن کے خاندان میں اس کی شادی کی گفتگو شروع ہوئی۔ نظام دکن نے شہزادہ ٹیپو کا ایک فوٹو ملحقہ کے لیے منگا دیا۔ اس سلسلے میں نظام دکن نے اپنا ایک مصور مرنگا پٹم بھیجا تھا کہ وہ وہاں رہ کر شہزادہ ٹیپو کی تصویر تیار کرے۔

چنانچہ مصور کو شہزادے کے پاس تصویر بنانے کے لیے بھیجا گیا۔ شہزادہ مصور کو ان کٹھروں کے پاس لے گیا جس میں اس کے پالتو میٹھے بند تھے۔ حیدر آبادی مصور شیروں کے کٹھرے دیکھ کر گھبرا گیا۔

اس نے شہزادے سے دریافت کیا:

”شہزادہ بہادر۔ آپ کی تصویر کا ان شیروں سے کیا تعلق؟“

جواب میں شہزادے نے کہا:

”انسانی خوبصورتی کا سب سے اہم راز اس کھاقت میں پوشیدہ ہے۔ میں ان شیروں سے لڑوں گا اور تم میری تصویر بناؤ گے تاکہ دیکھنے والے کو معلوم ہو سکے کہ مجھ میں کس قدر طاقت ہے کیونکہ طاقت ہی جوانی کا حصہ ہے۔“

سلطان کے اس جواب سے اس کی شیروں سے کمال دلچسپی کا پتہ لگتا ہے۔ مشہور ہے کہ اس نے اپنے محل کے کمروں، دروازوں اور دیواروں پر شیر جیسارنگ کرا با تھا۔ اسے یہ رنگ اس قدر پسند تھا کہ اس نے اپنی فوج کے ایک حصے کی دریاں بھی اسی رنگ کی بنوائی تھیں۔

سلطان نے سرنگاٹم میں بیٹھ کے نظم و نسق کی جو نئی داغ بیل ڈالی تھی اور اس سے جو سکھ پیدا ہوا تھا وہ کسی بڑے طوفان کا پیش خیر تھا۔ چند نامہ منگول اور انگریزوں کے سینے پر سانپ بنکا لوٹ رہا تھا۔ اگر انگریز عورتیں اپنے بچوں کو بچوں کے نام سے ڈراتی تھیں تو انگریز جنرل اپنا سابقہ شکستوں پر منہ چھپائے پھرتے تھے۔

پھر اس ندامت کو مٹانے اور شکست کو بدلہ لینے کے لیے ۱۸۶۱ء میں لارڈ کارنوالس کو گورنر ہند بنا کر ہندوستان بھیجا گیا۔

یہ بڑا امکاں اور فتنہ پرداز انسان تھا۔ اسے امریکہ میں شکست اٹھانا پڑی تھی اور امریکی مقبوضات انگریزوں کے ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ لارڈ کارنوالس کو اپنی شرمندگی دور کرنے کے لیے ہندوستان کا محاذ دیا گیا۔ اسے ہندوستان میں ہر حربہ استعمال کرنے کا حق بھی دے دیا گیا یعنی جہاں جنگ طاقت سے نہ جیتی جاسکتی ہو وہاں مکاری، احسان فراموشی اور دھوکہ بازی سے کام لیا جاسکتا ہے اور کارنوالس نے یہ تمام حربے ہندوستان اور خصوصاً جنوبی ہند یعنی سلطان کے خلاف استعمال کیے۔

ادھر سلطان نظم و نسق کے انتظام سے فارغ ہوا تھا کہ ارشد بیگ حاکم مالابار کا قاصد سینگار ناٹروں نے ایک بار پھر بغاوت کا علم بلند کر دیا ہے اور ارشد بیگ اس بغاوت کو بغیر سلطان لشکر کے فرو نہیں کر سکتا۔

سلطان نے اطلاع پاتے ہی کوچ کا حکم دیا اور فوج اور توپ خانہ لے کر مالابار پہنچ گیا سلطان کے پہنچتے ہی ناٹروں کے دماغ ٹھکانے ہو گئے اور ان کی بغاوت ختم ہو گئی۔ سلطان کو وہیں اطلاع ملی کہ کوچین کے راجہ نے ترجناپلی کے اطراف میں لوٹ مار مچا رکھی چنانچہ اس نے ادھر کا رخ کیا۔

سلطان نے ساحلی ندیوں کے پاس پہنچ کر پڑاؤ ڈالا۔ وہاں کوچین کی فوج پہلے سے موریہ بند تھی۔ رات کو سلطان نے دشمن پر شب خون مارنے کا حکم دیا۔

سرداروں نے عرض کیا:

”ندیاں گہری ہیں اور رستہ خراب ہے اس لیے کامیابی کے امکانات بہت کم ہیں۔“

سلطان نے ان کا مندر قبول نہ کیا اور خود پاکی میں سوار ہو کے اس نے ایک مختصر لشکر کے ساتھ دشمن پر حملہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر باقی لشکر بھی دشمن پر ٹوٹ پڑا اور اسے پسپا کر کے اُن کے

مورچوں پر قبضہ کر لیا۔

دشمن دہل سے بھاگ کے قلعہ میں پناہ گزین ہو گیا۔

صبح کو دشمن نے دریا کے بند کھول دیے جس سے دریا چڑھ گیا اور سلطان کی واپسی کا رستہ بند ہو گیا۔

دشمن نے یہ دیکھ کر کہ سلطان کے پاس چار پانچ آدمیوں کے سوا اور کوئی لشکر نہیں، انہوں نے سلطان کو گھیرنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر سلطان کے جانا زدن نے واقعی جانا بازی دکھائی اور دشمن کے دھمکے کھٹے کر دیے۔

سلطان کے جوان کٹ کٹ کر گر رہے تھے مگر دشمن کو سلطان کے قریب نہ آنے دے رہے تھے۔ سلطان خود بھی پاکی سے اتر کر اپنے جانا زدن کے شانہ بشانہ جنگ کر رہا تھا۔ قمر الدین کی بہادری دیکھنے کے قابل تھی۔ اس نے کسی نہ کسی طرح سلطان کو دریا پار کر دیا لیکن اس کوشش میں سوائے قمر الدین کے اور کوئی زندہ نہ بچا اور سب نے اپنی جانیں سلطان پر نثار کر دیں سلطان کی کٹار دستار اور پاکی دشمن کے ہاتھ لگی۔

اب سلطان کے غضب و غضب کی انتہا نہ رہی۔ اس نے دشمن پر عام حملہ کا حکم دے دیا۔ سلطان لشکر بھی اپنے چار سو ساتھیوں کا بدلہ لینے کے لیے بے چین ہو رہا تھا۔ اس نے جنگل سے کٹڑیاں کاٹیں۔ ان سے ندیوں پر پل کھڑے کیے اور دوسری طرف میدان میں پہنچا جہاں دشمن لشکر موجود تھا۔

سلطانی لشکر نے دشمن پر اس قدر بھرپور حملہ کیا کہ وہ اس کی تاب نہ لاسکا اور تھوڑی دیر میں پسپا ہو کر لمبواری کی طرف ہٹ گیا۔ سلطان قلعہ کے اندر داخل ہوا اور وہاں کا تمام مال و اسباب ضبط کر لیا گیا۔

اب یہاں سے سلطنت خداداد میسور کا وہ باب شروع ہوتا ہے جس میں انگریزوں نے سلطان ٹیپو کے ساتھ معاہدہ منگولر کے باوجود اسے ذبردستی اپنے ساتھ جنگ میں کھینچ لیا۔

یہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ حکومت برطانیہ نے لارڈ کارنوالس کو ہندوستان بھیجا ہی اس وجہ سے تھا کہ وہ سلطنت میسور سے معاہدہ منگولر کی ذلت کا بدلہ لے اور سلطان کی طاقت کو اس قدر کمزور کر دے کہ وہ جنوبی ہند میں انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدم روکنے کے قابل نہ رہے۔ چنانچہ انگریزوں نے سلطان کے کوچین پر حملہ کر کے ہانہ بنا کر سلطنت خداداد میسور کے

خلاف اعلان جنگ کر دیا۔

اس جنگ کے حالات بیان کرنے سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس وقت جنوبی ہند میں جو طاقتیں متحرک تھیں ان پر ایک طاثرانہ نظر ڈالی جائے تاکہ قارئین سلطنت میسور اور انگریزوں کے درمیان ہونے والی تیسری اور آخری جنگ کے پس منظر کو پوری طرح سمجھ سکیں۔ سلطان کو اس جنگ کا ذمہ دار ہرگز نہیں ٹھہرایا جاسکتا اس لیے کہ سلطان اپنے مقبوضہ میں بغاوت اور سازشوں کو فرو کرنے کے لیے نکلتا تھا اور کوچین پر اس کا حملہ اسی سلسلے کی ایک بڑی تھی۔

کوچین پرتبضہ کے بعد سلطان ملیواری کی طرف بڑھا۔ کیونکہ دشمن کوچین میں شکست کھا کر ملیواری کی طرف ہسپا ہو گیا تھا۔

کوچین کی دو چوکیاں

۱۔ کرنگ نور اور

۲۔ اجے کوٹ

ایسی تھیں جنہیں راجہ ٹرانکور نے ولندیزیوں سے بعض تین لاکھ روپے خرید لیا تھا۔ یہ سودا دونوں طرف سے ناجائز تھا اس لیے کہ یہ چوکیاں کوچین کے علاقے میں اور سلطان پیو کے ماتحت تھیں۔ ان چوکیوں کو نہ ولندیزی فروخت کر سکتے تھے اور نہ راجہ ٹرانکور انہیں جانتے بوجھتے ہوئے خریدنے کا مجاز اور حقدار تھا۔

گمردہ جو کہا گیا ہے کہ "زبردست کا بھونا سر پر" تو یہی حال راجہ ٹرانکور نے کیا تھا اس کے اور انگریزوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوا تھا جس میں مدراس کے گورنر سر آچی بالڈن نے راجہ کو یقین دلایا تھا کہ انگریز ایک دوست کی حیثیت سے ٹرانکور کی مصیبت میں اس کی مدد کریں گے۔

لارڈ کارنوالس کو انگریزوں اور راجہ ٹرانکور کے مابین معاہدہ کا تذکرہ تھا لیکن اسے یہ معلوم نہ تھا کہ راجہ نے ناجائز طور پر سلطان کی دو چوکیاں ولندیزیوں سے خریدی ہیں۔ اسے یہ علم تھا کہ سلطان پیو کا ٹرانکور پر حملہ کا کوئی ارادہ نہیں اور یہ کہ سلطان کی یہ ہمیں اس کے داخلی معاملات سے تعلق رکھتی ہیں۔

لارڈ کارنوالس نے اپنی انہی خیالات کا اظہار اپنے ایک خط مؤرخہ ۵۔ دسمبر ۱۸۰۹ء میں کیا

جو اس نے ہنری ڈنڈاس کو لکھا تھا۔

اس خط کا معنوں اس طرح تھا:

"پیو کو مجبور سے بالا گھاٹ کی طرف روانہ ہو چکا ہے۔ میرا خیال ہے کہ وہ پچھلے سال کی طرح اپنی عام مہمات پر ہے البتہ راجہ ٹرانکور اور ہمارے ریڈیٹ کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ اگرچہ پیو ٹرانکور کے علاقہ میں بڑھ رہا ہے لیکن انہیں خوفزدہ ہونے کی ضرورت ہرگز نہیں۔ اس لیے کہ پیو ہمارے ساتھ کیے گئے معاہدے کو توڑنے کی کوشش نہیں کرے گا اور اگر اس نے ایسا کیا تو اس سے زیادہ احمق اور کوئی نہ ہو گا۔

اس صورت حال کا ذمہ دار راجہ ٹرانکور کو ٹھہرایا جاسکتا ہے۔

کیونکہ اس نے ہر میجسٹی کی اجازت کے بغیر مذکورہ چوکیوں کے

معاملات طے کیے ہیں۔"

ان تمام باتوں کے احوال کارنوالس کو یقین تھا کہ جلد یا بدیر سلطان اور انگریزوں کا سامنا ہونا ہے اس لیے اس نے سلطان کو آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیے رکھا اور خود سیاسی اور فوجی تیاریوں میں مصروف رہا۔

سلطان جب کوچین کے قریب یعنی ٹرانکور کی سرحد پر پہنچا تو اس نے راجہ دھرم راؤ کے پاس اپنا ایک وکیل روانہ کیا تاکہ وہ اسے کوٹہ اور کرنگور کی چوکیوں کی واپسی کا مطالبہ کرے۔ سلطان کا وکیل راجہ دھرم راؤ کے دربار میں پہنچا اور اس نے بڑے ادب سے سلطان کا مطالبہ پیش کیا:

"اے ٹرانکور کے راجہ۔ ہمارے سلطان چاہتے ہیں کہ آپ اسے کوٹہ اور کرنگور سے اپنی فوجیں نکال لیں۔"

سلطان کے وکیل نے اتنا کہہ کر راجہ کا منہ دیکھا۔ شاید وہ اس مطالبہ کا جواب چاہتا تھا۔ راجہ اس کا مطلب سمجھ گیا اور سپاٹ لے کر میں بولا:

"چپ کیوں ہو گئے اے سلطان کے قاصد - تمہارا یہی مطالبہ ہے یا کچھ اور بھی کہنا ہے  
دکیل نے جواب میں عرض کیا:  
"اے ٹراونکور کے راجہ - ہمارے سلطان کے کچھ اور بھی مطالبات ہیں لیکن میں چاہتا  
ہوں کہ ایک ایک مسئلہ پر گفتگو ہوتی چلے تو زیادہ بہتر ہوگا۔"  
"نہیں سلطانی دکیل - یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔"

راجہ بڑے کمرخت لہجے میں بولا:

"میں دربار کے اور کام بھی پٹانا ہیں - تم اپنی تمام باتیں ختم کر لو تا کہ ہم ایک ہی بار تمام  
باتوں کا جواب دیدیں۔"

"ٹھیک ہے راجہ بہادر۔"

دکیل نے کہا اور بات آگے بڑھائی:

"ہمارے سلطان نے آپ سے مطالبہ کیا ہے کہ ابے کوٹہ اور کرنگنور سے فوجیں نکال لی  
جائیں۔"

آپ کو چین کی سرحد سے دور ہٹ جائیں۔

اور - سلطنت خداداد میسور کے غداروں کو اپنی ریاست سے نکال دیں۔"

راجہ دھرم راڈ کا چہرہ متغیر ہو گیا۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ غصہ سے پیٹ پڑے گا اور  
ایسا ہی ہوا۔

سلطانی دکیل کے خاموش ہوتے ہی راجہ واقعی پھٹ پڑا:

"جاؤ اور اپنے سلطان سے کہہ دو کہ ہم نے کرنگنور اور ابے کوٹہ کی چوکیاں ولندیزیوں سے  
تین لاکھ روپے میں خریدی ہیں۔ اگر چوکیاں واپس لینا ہیں تو ہمیں پچیس تین لاکھ کی ادائیگی  
کی جائے۔"

سلطان کے دوسرے مطالبے کا جواب یہ ہے کہ کرنگنور اور ابے کوٹہ کی چوکیوں کے ہم ملک  
میں اور یہ چوکیاں کو چین کے علاقے میں واقع ہیں اس لیے ہم کو چین سے دور نہیں جاسکتے۔

اور تیسرے مطالبے کا جواب یہ ہے کہ کو چین والے ہماری پناہ میں ہیں اور ہم جنہیں پناہ  
دیتے ہیں انہیں دشمن کے حوالے نہیں کیا کرتے۔

ٹراونکور کے راجہ کا یہ تعدد و تنوع جواب جب سلطانی دکیل نے سلطان کے سامنے دہرایا تو سلطان

نے اسی وقت ٹراونکور پر حملے کا حکم دے دیا۔  
اس طرح سلطانی فوجیں ٹراونکور میں داخل ہوئیں اور اس کے تیسرے دن انگریز لشکر  
سلطنت خداداد کی سرحد پر پہنچ گیا۔

سلطان کو انگریزوں کے اس غیر متوقع اقدام کی خبر ملی تو اس نے اپنے لشکر کو آگے بڑھنے  
سے روک دیا اور جنرل میڈوز کو ایک مختصر خط لکھا جس میں تحریر تھا:

"ہم حیران ہیں کہ معاہدہ منگورہ کے باوجود انگریز قوم ہم سے لڑنے

پر کیوں آمادہ ہے۔ اگر دونوں حکومتوں میں کوئی رعش کی وجہ یہ ہو

گئی ہے تو باہمی مفاہمت سے معاملہ طے ہو سکتا ہے۔"

جنرل میڈوز نے سلطان کو ان الفاظ میں جواب دیا:

"ٹراونکور کی حکومت، مدراس کی حلیف ہے اور اس کی سرحد پر جو

واقعات ہو رہے ہیں ان سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی۔"

جنرل میڈوز کے اس جواب سے سلطان کو یقین ہو گیا کہ انگریز اس سے جنگ کرنے پر آمادہ  
ہیں۔ چنانچہ اس نے فوراً اپنی گھاٹ کا رخ کیا تاکہ انگریز فوج کو آگے بڑھنے سے روک دے۔  
کوئٹہ اور سستی منگل کے نواح میں سلطانی لشکر کا جنرل میڈوز کی افواج سے مقابلہ ہوا۔

اس ٹکراؤ میں سلطانی لشکر فتح یاب ہوا اور بہت سے مرد اور عورتیں گرفتار ہوئیں۔ ان عورتوں  
میں شہزادہ فاحشہ عورتیں تھیں جو خود کو مسلمان کہتی تھیں لیکن انگریزوں کے پہلو گم کرنے پر آمادہ  
تھیں۔

سلطان نے ایسی تمام نام نہاد مسلمان عورتوں کو قتل کر دیا۔

بنگال سے ایک فوج کرنل میکسول کی کمان میں جنوبی ہند پہنچی تھی اور اس نے آتے ہی تڑپاؤ  
اور دامن بازی پر قبضہ کر لیا تھا۔

سلطان کو اس کی اطلاع ملی تو اس نے سپہ سالار برہان الدین کو ایک فوج کے ساتھ مدافعت  
کے لیے دامن بازی بھیجا۔ ان کے ساتھ سپہ سالار سید غفار بھی تھا۔

برہان الدین نے کندی پہنچ کے انگریز فوج پر حملہ کیا اور ڈیڑھ سو سووار اور دوسو پیادوں  
کو گرفتار کر لیا۔

جنرل میڈوز جو شکست کھا کر سستی منگل کے قریب، پڑاؤ ڈالے پڑا تھا اسے برا

کے جلے کی خبر ملی تو وہ لشکر لے کر میکسویل کی مدد کو چلا۔ یہ دونوں فوجیں تپور گھاٹ پر آکر مل گئیں۔

اب انگریزوں کے دونوں لشکروں نے متبر ہو کر برہان الدین پر حملہ کر دیا۔ برہان الدین کا مقابلہ نہ کر سکا اور کافی نقصان اٹھا کر پسپا ہو گیا۔

اس کی اطلاع سلطان کو ملی تو وہ توب خانہ اور فید رسالے لے کر فوراً برہان الدین کی مدد کو پہنچا اور وہاں پہنچ کے ایسا سخت حملہ کیا کہ انگریزوں کے قدم اکھڑ گئے اور وہ تڑچاپلی کی طرف پسپا ہوئے۔

سلطان نے انہیں بھاگنے نہ دیا اور آگے بڑھ کر رستہ رد کیا۔ پھر ان لشکروں کو چاروں طرف سے گھیر کر اس قدر بھاری اور شبیعت کا مظاہرہ کیا کہ انگریز اس کا ٹولہ مان گئے۔ انہیں بس شکست ہونے ہی کو تھی کہ رات ہو گئی اور جنگ منقوت کرنا پڑی۔

انگریزوں نے رات کے اندھیرے سے فائدہ اٹھایا اور اپنا مال و اسباب دیں بھوڑے راتوں رات فرار ہو گئے۔

سلطان کو صبح اطلاع ہوئی تو اس نے ان کا تعاقب شروع کیا اور جلد ہی ان کے سر پر پہنچ گیا۔ وہاں پھر جنگ شروع ہو گئی۔

اس جنگ میں اپانک برہان الدین کے سینے میں ایک گولی لگی اور وہ موقع پر ہی شہید ہو گئے۔ ان کی لاش کو پالکی میں رکھ کے سلطان کے پاس روانہ کر دیا گیا۔

سلطنتِ خداداد کے یہ سب سے زیادہ وفادار اور عظیم جرنل کی موت تھی جس نے بساطِ سیاست کو تقریباً لٹ کے رکھ دیا۔

برہان الدین کی لاش دیکھ کے سلطان کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔ اس نے حکم دیا کہ انگریزوں کا تعاقب روک دیا جائے۔

ایک وفادار نے عرض کیا:

”مالِ باہ۔ عظیم جرنیل برہان الدین کی وفات کا جس قدر غم کیا جائے وہ کم ہے لیکن میری درخواست ہے کہ انگریزوں کے تعاقب کو نہ روکا جائے۔ دشمن کی بھاگنے والی فوج قیامت کے عذاب میں مبتلا ہے۔ اگر اس کا اسی طرح تعاقب جاری رکھا گیا تو ایک ہی انگریز لشکر کی جان بچا کے مدر اس شہ پہنچ سکے گا۔“

سلطان شاید برہان الدین کے شہید ہونے سے کچھ زیادہ ہی غمزدہ تھا۔ اس نے اس مشورہ کو رد تو نہیں کیا لیکن اس میں تاخیر ضرور ہو گئی۔

سلطان نے فرمایا:

”ہم پسپا ہونے والوں کا تعاقب ضرور جاری رکھیں گے لیکن پہلے ہمیں اس عظیم ہمتی کے غم کو بھول جانے کی کوشش کرنا پڑے گی۔“

سلطان نے چونکہ تعاقب کا کوئی واضح حکم نہیں دیا تھا اس لیے تعاقب رک گیا۔ اس طرح بدحواس جرنل میڈوز کو اپنے حواس درست کرنے اور اپنی جان بچا کر بھاگنے کی ایک بالکل غیر متوقع فرصت مل گئی اور وہ اس فرصت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنی بچی بچی فوج کو لے کر مدراس واپس پہنچ گیا۔

اس دوران سلطان افواج نے چنچنی، سستی منگل اور کوہ پر مول کو فتح کر لیا اور قیدیوں کو مرنگا بڑ بھجوا دیا۔

پورنگ نے اس جنگ کے بارے میں لکھا ہے:

”سلطان کے مقبوضات پر کامیاب حملہ کرنے کے لیے ضروری تھا کہ ضلع بارہ محل اور درہ گلی ہی پر قبضہ کر لیا جائے۔ اس جرنل میڈوز نے کرنل میکسول کو کوششناگری بھیجا جو ضلع کا صدر مقام تھا لیکن ابھی کرنل میکسول کوششناگری نہیں پہنچا تھا کہ سلطان نے بڑی سرعت سے آگے بڑھ کر میکسول سے جنگ شروع کر دی۔“

اس عرصہ میں معلوم ہوا کہ جرنل میڈوز کے ماتحت ایک انگریز فوج آ رہی ہے۔ پیپو جو ماہر فن اور بہترین جرنل تھا، سمجھ گیا کہ وہ دو فوجوں کے درمیان پھنسے والا ہے اس لیے وہ اپنی فوج لے کر پیچھے ہٹا اور درہ تبار سے نکل کر ملک کو آنے والی فوج پر حملہ کر دیا۔

انگریزی فوج نقصان اٹھا کر واپس ہوئی۔

یہاں سے سلطان دریائے کلرون کو عبور کر کے ترناٹے اور پراکول کی طرف بڑھا اور یہ مقامات اس کے قبضہ میں آ گئے۔ یہاں سے وہ پانڈیچری پہنچا اور فرانسیسی جرنل سے درخواست کی کہ اسے چھ ہزار



فرانسیسی سپاہی مدد کے طور پر دیے جائیں۔ جنرل نے یہ درخواست فرانس  
اپنے بادشاہ کے پاس حکم کے لیے روانہ کر دی لیکن شاہ فرانس کوئی  
شنازدہم انقلاب فرانس کے ڈر سے اس وقت اس درخواست پر  
کوئی توجہ نہ دے سکا۔

شاہ فرانس کی اس خاموشی پر ایک فرانسیسی مؤرخ بعد حسرت لکھتا ہے :  
"فرانس والوں نے اس زریں موقع کو ہاتھ سے کھودیا۔ اس وقت  
جب سلطان کل جنوبی ہند کے سیاہ و سفید کاماک تھا اور انگریز اس  
کے دم و دم پر تھے، اگر فرانس سلطان کی مدد کرتا تو ہندوستان کی  
تاریخ بھی کچھ اور ہوتی۔"

یہ خبریں جب گورنر جنرل لارڈ کارنوالس کو ملکتی ہیں پہنچیں، تو وہ ان واقعات کو پہلے جنگ  
قرار دے کر تیاری میں مصروف ہو گیا۔

سلطان نے جو کچھ کیا وہ اپنے ملک کی اندرونی بغاوتوں کو کچلنے کے لیے کیا تھا۔ انگریزوں  
نے بلاوجہ باغیوں کی حمایت کی اور جب انہیں اور باغیوں کو شکست ہوئی تو لارڈ کارنوالس نے ہاتھ  
جنگ کی بنیاد ڈالی اور ایسے منصوبے بنائے جن میں لگ گیا کہ جس سے سلطان کی بڑھتی ہوئی طاقت کو  
توڑا جلتا!

**جنوبی ہند** میں سلطنت خداداد کے قیام سے مسلمانان برصغیر کو  
یہ امید پیدا ہو گئی تھی کہ شمالی ہند میں سلطنت مغلیہ کے زوال کے بعد اللہ نے مسلمانوں کو  
جنوبی ہند میں ایک منبسط سلطنت عطا کی ہے جو مغلیہ سلطنت کا بدل ثابت ہوگی۔  
لیکن۔

یہ سلطنت خداداد اور مسلمانان ہند کی بدقسمتی تھی کہ اس سلطنت کی روزِ اول ہی سے  
مخالفت شروع ہو گئی تھی اور سب سے بڑی بدقسمتی یہ تھی کہ اس مخالفت میں مسلمان  
حکمران اور ریاستیں پیش پیش تھیں۔

آئیے۔ اس کا آغاز سے اب تک کا ایک سرسری جائزہ لیتے ہیں:

آپ جانتے ہیں کہ والا جاہ محمد علی، انگریزوں کی مدد سے ارکاٹ کا نواب بنا تھا اس کی  
خواہش تھی کہ وہ حیدر آباد کا بھی حکمران بن جائے۔ اس کے لیے ایک طرف اس نے انگریزوں  
کو اپنے ساتھ ملایا اور دوسری طرف حیدر آباد کے چند عہداروں اور مفاد پرستوں کو اپنا  
ہتھیار بنا کر سازش شروع کی۔

اسی زمانے میں جنوبی ہند میں یہ علی خاں اک دم ایک عظیم طاقت بن کے ابھرنے لگا  
تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ والا جاہ محمد علی نے اپنی نظر بن حیدر آباد سے ہٹا کر حیدر علی خاں  
پر لگا دیں۔

والاجاہ محمد علی اس وقت چونکا تھا جب حیدر آباد کے نواب بسالت جنگ نے حیدر علی کو صوبہ سرائے کا صوبیدار مقرر کیا۔

نواب بسالت جنگ سے پہلے صوبہ سرائے کا اصل ارکاٹ میں شامل تھا بلکہ ختم کر دیا گیا تھا والاجاہ ارکاٹ کا حکمران ہونے کی وجہ سے صوبہ سرائے پر بھی اپنا حق سمجھتا تھا اس لیے وہ صوبیدار سرائے نواب بہادر حیدر علی کا شدید مخالف ہو گیا۔

نواب بسالت جنگ کو معزول کرنے کے بعد جب نظام الملک حیدر آباد دکن کا حکمران ہوا تو وہ بھی حیدر علی کا مخالف ہو گیا۔ ایک نواس وجہ سے کہ حیدر علی کو نظام الملک کے بھائی بسالت جنگ نے صوبیدار بنایا تھا۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ نواب بہادر کی طاقت اس قدر تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ اسے یہ خطرہ پیدا ہوا کہ مرا کی سلطنت خدا داد کہیں پورے ہندوستان کی مالک نہ ہو جائے اور اس کے یعنی نظام الملک کے شہنشاہ ہند بننے کے خواب چکنا چور نہ ہو جائیں۔

جنوبی ہند میں تیسری طاقت ایسٹ انڈیا کمپنی کی تھی جو ارکاٹ اور حیدر آباد میں اپنا اقتدار بڑھا رہی تھی۔

ایسٹ انڈیا کمپنی نے والاجاہ سے کورومند کے علاقے حاصل کر لیے تھے اور ارکاٹ کے باقی علاقوں کی وہ ایجنٹ بن گئی تھی۔ گویا ارکاٹ پر والاجاہ محمد علی کے پردے میں انگریز ایسٹ انڈیا کمپنی قابض ہو چکی تھی۔

کمپنی، حیدر علی خاں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے اس لیے خائف تھی کہ اس کی موجودگی میں ہندوستان میں انگریزوں کے قدم جتنا مشکل تھے۔

جنوبی ہند میں جو تھی طاقت مرہٹوں کی تھی۔ انہیں جنوبی ہند میں ایک نئی اسلامی سلطنت کا قیام سخت ناگوار گزرتا تھا۔

پانچویں طاقت میسور کا قدیم ہندو خاندان تھا جو بڑا ہر کوئی مضبوط طاقت نہ تھی لیکن وہ اپنا کھویا ہوا اقتدار واپس لینا اور حیدر علی کے اقتدار سے آزاد ہونا چاہتا تھا۔ یہ خاندان دراصل میسور کی رانیوں کے ذریعے سازشیں کرتا رہتا تھا۔

سلطان کے والد نواب بہادر حیدر علی خاں جب میسور کے سپہ سالار تھے تو کھانڈے راڈ اور راجہ نے مل کر انہیں قتل کرنے کی سازش کی مگر حیدر علی خاں نے انہیں میدان جنگ میں

شکست دے کر سرنگا پٹم پر قبضہ کر لیا اور راجہ میسور کو علی حکومت سے معزول کر کے اس کی پینشن تین لاکھ سالانہ مقرر کر دی۔

یہ وہی کھانڈے راڈ ہے جسے نواب بہادر نے لوہے کے ایک بڑے پتھر سے قید کر دیا تھا اور اسے "حیدر علی کا طوطا" کا نام دیا تھا۔

کہا جاتا ہے کہ حیدر علی نے راجہ کو معزول کر کے تمام اختیارات خود سنبھال لیے تھے اور سرنگا پٹم ہی کو اپنا دارالسلطنت بنایا تھا۔

پتہ نہیں حیدر علی کی اس میں کیا مصلحت ہوگی مگر سرنگا پٹم ہندو راجاؤں کی زمانہ قدیم سے راجدھانی چلی آ رہی تھی۔ یہاں کی رعایا اور مذہبی پیشواؤں پر راجہ کا اثر تھا۔ ظاہر ہے راجہ اور دہل کی رعیت کو یہ دیکھ کر بہت کوفت ہوتی ہوگی کہ حیدر علی جو کل تک اسی رباست کا سپہ سالار تھا، اب وہ حکمران بن کر رعایا اور راجہ دونوں پر حکومت کر رہا ہے۔ آگے چل کر راجہ اور رعیت کا حیدر علی کے خلاف بڑا سخت رد عمل ہوا۔

پس —

حیدر علی کے خلاف پہلی سازش ۱۷۶۱ء میں ہوئی جب راج محل کی رانیوں نے اپنے نمائندے راڈے درگ سری نواس راڈے کے ذریعے مدراس کے گورنر کے پاس درخواست پیش کی کہ وہ حیدر علی خاں سے رباست میسور کو آزاد کرانے میں رانیوں کی مدد کرے۔ اس وقت مدراس کا گورنر لارڈ پیکاٹ تھا۔ اس نے درخواست کے جواب میں رانیوں کو اپنی تائید کا یقین دلایا۔

حیدر علی خاں کے خلاف دوسری سازش ۱۷۶۵ء میں ہوئی۔ رانیوں کو انگریزوں کی طرف سے زبانی جمع خرچ کے سوا، علی طور پر کوئی مدد حاصل نہ ہوئی تو انہوں نے اپنے نمائندہ کو پونہ روانہ کیا۔

پونہ اس وقت مرہٹوں کا صدر مقام تھا اور مرہٹوں کا پیشوا وہیں رہتا تھا۔ اس درخواست میں بھی رانیوں نے مرہٹوں کے پیشوا سے سرنگا پٹم کو حیدر علی خاں سے آزاد کرانے کے لیے مدد مانگی تھی۔

مرہٹے خود بھی جنوب میں ابھرتی ہوئی اس طاقت سے خائف تھے۔ اب جو ان سے رانیوں نے مدد مانگی تو وہ فوراً تیار ہو گئے اور مادھوراڈ پیشوا نے ایک بہت بڑے لشکر کے ساتھ حیدر علی کو

حیدر علی نے صوبہ مرا پر زبردستی قبضہ کیا ہے اور وہ غاصب ہے۔  
ان تینوں طاقتوں بلکہ سازش یوں نے اپنے طور پر سازش مکمل کرنے کے بعد متحدہ طور پر  
حیدر علی پر حملہ کر دیا جس میں نظام، والا جاہ اور انگریز تینوں ہی کی فوجیں شامل تھیں۔ اس جنگ  
کو "میسور کی پہلی جنگ" کا نام دیا گیا۔

حیدر آہار کی ایک عجیبہ تاریخ اسے اس طرح بیان کرتی ہے:

"حیدر علی خاں کی ہمسایہ ریاستوں میں ایک طرف مرہٹے۔  
دوسری طرف نظام سرکار اور تیسری طرف نواب کرناٹک تھے۔ نواب  
کرناٹک کے درپردہ کرناٹک۔ پرانگیز حکمرانی کر رہے تھے۔  
انگریزوں کو حیدر علی خاں سے سب سے زیادہ خطرہ تھا۔ خود حیدر  
علی خاں بھی اس بدسی طاقت کو ہند سے نکالنا چاہتے تھے لیکن نواب  
کرناٹک کی سادہ لوحی نے انگریزوں کے قدم ہند میں جمادیسے نہیں  
اور نواب کرناٹک ہی کے توسط سے انگریزوں نے نظام علی خاں  
کے پاس اچھا سوچ حاصل کر لیا تھا۔"

انخاد یوں کے لیے اس جنگ کا نتیجہ بہت مایوس کن نکلا۔ انگریزوں کو شکست فاش کا  
سامنا کرنا پڑا اور اس کے نتیجہ میں "سلطان ممدراں" لکھا گیا جو انگریزوں کی ذلت کا منہ بولتا  
ثبوت ہے۔

سلطنت خداداد کے خلاف تیسری سازش میں مرہٹوں، نظام، والا جاہ اور انگریزوں کے  
ساتھ راج محل کی رانیوں کا نام کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ممکن ہے کہ وہ نواب حیدر علی سے اس  
وقت بہت زیادہ خد ہوں۔

لیکن — میسور کی پہلی جنگ، اور معاہدہ ممدراں کے بعد رانیوں میں ایک بار پھر حرکت  
پیدا ہوئی اور انہوں نے ریاست کی بازیابی کے لیے مرہٹوں کا منہ دیکھنا شروع کیا۔

چنانچہ ۱۷۹۱ء میں رانیوں نے اپنے دیوان تمل راڈ کو پونا روانہ کیا۔ تمل راڈ نے گونا  
پہنچ کر مرہٹوں کے پیشوا مادھو راڈ کے سامنے رانیوں کی درخواست پیش کی۔ اس وقت مرہٹے  
بھی کچھ انہی خطوط پر سوچ رہے تھے۔

ان کے پیش نظر پہلے ہی سے دو امور تھے:

ختم کرنے کے لیے میسور کے علاقوں پر حملہ کر دیا۔  
لیکن —

اسے ایک کے بعد ایک مشکل کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ اپنی مشکلات پر قابو نہ پاسکا اور  
اسے خود حیدر علی سے صلح کر کے واپس ہونا پڑا۔  
سلطنت خداداد کے خلاف تیسری سازش ۱۷۹۷ء میں ہوئی۔ یہ سازش اکیلے نہیں ہوئی  
بلکہ اس میں جنوبی ہند کی تین طاقتوں:

۱۔ والا جاہ محمد علی نواب ارکاٹ

۲۔ نظام الملک حیدر آباد دکن اور

۳۔ ایسٹ انڈیا کمپنی

کی ملی جھگت، بنا رہی تھی۔

والا جاہ ارکاٹ کا حکمران تھا اور انگریز اس کے ایجنٹ تھے۔ ارکاٹ پر نظام دکن کی سیادت  
تھی اور والا جاہ خود مختار ہونے کے لیے حیدر آباد دکن میں سازشیں کر رہا تھا۔ حیدر آباد کا وزیر  
رکن الدولہ اور میر عالم ایسٹ انڈیا کمپنی کے جال میں پھنس چکے تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے حیدر آباد  
سے ایک معاہدہ کیا۔  
اس کی تین شرطیں تھیں:

۱۔ والا جاہ محمد علی کو ارکاٹ کا مستقل اور آزاد حکمران تسلیم کر لیا گیا اور اسے نذر نے  
اور پیش کش سے بھی معافی مل گئی۔

۲۔ نظام الملک دریائے کرشنا کے جنوب میں پورے علاقوں سے دست بردار ہو  
گیا۔

۳۔ انگریزوں کو والا جاہ کا نامزدہ (ایجنٹ) تسلیم کر لیا گیا۔

اس معاہدے میں نہ صرف والا جاہ محمد علی اور ارکاٹ کا مسئلہ طے ہوا بلکہ ایسٹ انڈیا کمپنی  
نے اس معاہدے میں صوبہ مرا کا معاملہ بھی شامل کر دیا۔ چنانچہ معاہدہ کی شق نمبر ۱ کے تحت  
صوبہ مرا کی دیوانی ساٹھ لاکھ روپے دینے کے عوض صوبہ کمپنی کو بخش دیا گیا۔  
مگر —

صوبہ مرا کا حکمران تو حیدر علی خاں تھا اس لیے معاہدے کی شق نمبر ۱ سے یہ ظاہر کیا گیا کہ

۱۔ میسور پر قبضہ کرنا

۲۔ سید علی سے انتقام لینا

میسور کی رانیوں اور مرہٹوں کے مفادات تقریباً مشترک تھے اس لیے مادھورائے پیشوا نے زلی راؤ کو تعاون کا یقین دلایا کہ واپس بھیج دیا اور مرہٹوں نے ۱۷۷۴ء میں میسور پر چڑھائی کر دی۔

مرہٹوں کی کامان خود مادھورائے پیشوا کو رہنما مگر اسے سید علی کے خلاف کوئی کامیابی حاصل نہ ہوئی اور وہ واپس چلا گیا۔

اس طرح دکن میں ہندو راج قائم کرنے کا خواب ایک بار پھر خواب ہی بن گیا اور شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا۔

حیدر علی خاں کو جاسوسوں نے بتایا کہ اس سائش کا سرغنہ راج محل کی رانیوں کا پردھان یعنی دیوان زلی راؤ ہے جو مرہٹے پیشوا کو میسور پر حملہ کی ترغیب دینے خود پونا گیا تھا۔ حیدر علی نے اسے گرفتار کر لیا مگر رانیوں کی خوشامد درآمد اور اپنے جذبہ ترقی سے مجبور ہو کر اسے معاف کر دیا اور اپنی طرف سے اسے کڑ پتہ میں نواب عبدالعلیم خاں کے دربار میں اپنا وکیل مقرر کر دیا۔

احسان فراموش زلی راؤ کڑ پتہ پہنچ کے خاموش نہیں بیٹھا بلکہ اس نے دہاں ایک اور سائش یعنی سلطنت خداداد کے خلاف پانچویں سائش کی ابتداء کی۔

اس سائش میں اس کا بھائی نارائن راؤ بھی شریک ہو گیا جو اس وقت اتفاق سے کڑ پتہ ہی میں موجود تھا۔

ان دونوں کو معلوم ہوا کہ مدراس کا گورنر لارڈ پیکاٹ ہو گیا ہے۔ یہ دہی گورنر تھا جس نے چار سال پہلے رانیوں کو مدد دینے کا وعدہ کیا تھا۔

دونوں بھائیوں نے کڑ پتہ سے فرار ہونے کا منصوبہ بنایا۔ انہیں یہ بھی علم ہو چکا تھا کہ لارڈ پیکاٹ نے ریاست تنجاور کے اندرونی معاملات میں دخل ہونا شروع کر دیا ہے اور اب حالات زیادہ سازگار ہیں۔

ان حالات اور خیالات کے تحت دونوں بھائی پہلے تنجاور پہنچے۔ اس وقت تنجاور میں انگریز

ریزیڈنٹ جان سیلیوان تھا۔

زلی راؤ اور نارائن راؤ نے جب اپنا منصوبہ جان سیلیوان کے ساتھ ساتھ راجہ تنجاور کے سامنے رکھا تو وہ دونوں ان کے ہمارا ہو گئے۔

ان دونوں بھائیوں نے انہیں یہ بھی بتا دیا تھا کہ لارڈ پیکاٹ نے کچھ عرصہ پہلے رانیوں کی مدد کا وعدہ کیا تھا۔

راجہ تنجاور کا تعاون حاصل کرنے کے بعد دونوں بھائی مدراس پہنچے اور پیکاٹ کو اس کا سالانہ وعدہ یا دلدیا۔ لارڈ پیکاٹ نے از سر نو رانیوں کو مدد دینے کا وعدہ کیا مگر اس کی سمجھ میں یہ نہیں آ رہا تھا کہ اس منصوبہ کا آغاز کس طرح کیا جائے۔ اس لیے کہ یہ سب کے سب سائشی اُس وقت کے میسور کے اندرونی حالات سے بالکل واقف نہیں تھے اور کوئی قدم اٹھانے سے پہلے یہ ضروری تھا کہ میسور کے حالات سے واقفیت حاصل کی جائے۔

لارڈ پیکاٹ کو گورنر ہونے کی حیثیت سے وسیع اختیارات حاصل تھے۔ چنانچہ اس نے ایک پادری کو اپنا قاصد بنا کر مرنگاپٹم روانہ کیا۔ اس پادری کا نام شوارٹز تھا۔ اسے ایک دستاورد خط لے کر نواب حیدر علی کے پاس بھیجا گیا تھا اور اس میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ پادری شوارٹز کو مذہبی تبلیغ کی اجازت دی جائے۔

حیدر علی خاں کو دو دستاورد خط بھیجنے کا تو ایک بہانہ تھا۔ دراصل پادری کو ایک جاسوس کے فرائض سونپے گئے تھے۔ اور اسے راج محل کی رانیوں سے ملاقات کا حکم دیا گیا تھا۔ اس مقصد میں یہ پادری بہت کامیاب رہا۔

نواب بہادر حیدر علی خاں نے پادری شوارٹز کی پذیرائی کی اور اسے مذہبی تبلیغ کی اجازت دے دیا۔

پادری نے تبلیغ کی اجازت سے ناجائز فائدہ اٹھایا اور میسور کی رانیوں تک جا پہنچا۔ وہاں اس نے زلی راؤ، نارائن راؤ اور انگریز ریزیڈنٹ سیلیوان اور گورنر مدراس کے درمیان ہونے والی تمام گفت و شنید سے رانیوں کو آگاہ کیا اور خود میسور کے اندرونی حالات سے آگاہ ہو کر تنجاور پہنچا۔

تنجاور میں پہنچ کر پادری نے گورنر مدراس کی اجازت سے میسور کی رانی کشنما اور ایلیٹ انڈیا کمپنی کے درمیان ایک معاہدہ ترتیب دیا جس کا خاکہ حسب ذیل ہے :

## میسور میں ہندو راج قائم کرنے کا معائدہ

مؤرخہ ۲۸ اکتوبر ۱۸۸۲ء

شرائط

ایسٹ انڈیا کمپنی کی جانب سے

رانی لکشما کی جانب سے

ایسٹ انڈیا کمپنی حیدر علی سے

ہمارا تمام ملک واپس ہم کو لے کر

دے تو:

۱۔ جس وقت انگریز فوج حیدر

علی کے خلاف نقل و حرکت

شروع کرے گی تو انگریزوں

کو تین لاکھ کتیا یا راپکوڈا

(جسے کاسکے تین روپے

کے برابر) دیے جائیں گے۔

۲۔ جس وقت انگریزی فوج

میدانی ملک چھوڑ کر بالاگھا

پر برہمنے گی اور اودیسلی

بادیسی برہمن کے مقامات پر

تنبضہ کر لے گی تو مزید

ایک لاکھ گکوڈا دیے

جائیں گے۔

۳۔ جس وقت انگریز فوج

میسور پر قبضہ کر کے اس

ملک کو ہمارے قبضے میں دے دے گا تو

ایک لاکھ گکوڈا اور دیے جائیں گے

۴۔ جس وقت سرنگاپٹم کو تسخیر کر لیا

جائے گا اس وقت مزید پانچ لاکھ

گکوڈا دیے جائیں گے۔

۵۔ سرنگاپٹم فتح کرنے کے بعد جس

وقت سے رانی لکشما کا منظور کردہ

راجہ تخت پر بیٹھے گا اس تاریخ سے

ایسٹ انڈیا کمپنی کو پانچ لاکھ گکوڈا

بطور خراج دیے جائیں گے۔

اس کے علاوہ سرکار میسور میں

ایک لاکھ کی جاگیر بھی کمپنی کو دی جائے

گی اور کمپنی کو اپنی فوج کا ایک حصہ

ہماری حفاظت کے لیے یہاں رکھنا

ضروری ہوگا۔

۶۔ کمپنی کو ملک کے اندر دفنی نظم و نسق

میں کوئی دخل نہ ہوگا۔

۷۔ حیدر علی کی تمام املاک، مال و ذراعت

اور گھوڑے اور قلعوں میں جس قدر

سامان ہو۔ وہ میسور کے حوالے

ایسٹ انڈیا کمپنی یہ چاروں شرائط  
منظور کرتی ہے۔

کمپنی اس بات کا ذمہ لیتی ہے کہ  
رانی کے منظور کردہ راجہ کو تخت نشین  
کرے لیکن رقم کے متعلق اس وقت  
تعیین نہیں کیا جاسکتا۔ معلوم نہیں ملک  
کی حفاظت کے لیے کس قدر فوج  
ضروری ہو۔

کمپنی ملک کے اندر دفنی نظم و نسق میں  
دخل نہیں دے گی لیکن وہ خراج جو  
میسور کی طرف سے مرہٹوں یا سلطنت  
مغلیہ کے صوبیداروں کو دیا جاتا ہے  
وہ کمپنی کے ذریعے ادا کیا جائے گا۔  
براہ راست ادا کرنے کا میسور کو اختیار  
نہ ہوگا۔

یورپی قاعدہ جنگ کے مطابق تمام  
مال غنیمت سپاہیوں کا حق ہوتا ہے۔  
اگر اس مال غنیمت کے عوض کوئی رقم

کر دینا ہو گا۔

مقرر کردی جائے تو کمپنی اپنے افسروں کو ہدایت کرے گی کہ رقم لے کر مال غنیمت چھوڑ دیں۔

کمپنی حیدر علی کے خلاف بطور حریف جنگ کر رہی ہے اس لیے یہ شرط منظور نہیں کی جاسکتی البتہ میسور کی راجدھانی کے قواعد مد نظر رکھے جائیں گے۔

دستخط :

جان سیلوان

ریڈیٹنٹ سیکرٹری (برائے ایٹنڈ یا کمپنی)

دستخط :

۱۔ سیٹی سنوارٹن

۲۔ ٹرل رائے (برائے راناٹے میسور)

اس معاہدہ کے سلسلے میں تاریخ کے اوراق میں تین خطوط بھی موجود ہیں۔

ایک خط ٹرل راؤ اور اس کے بھائی نارائن راؤ کا دستخط شدہ ہے جس میں ان دونوں بھائیوں نے راجہ تینجور اور ریڈیٹنٹ سیلوان کا شکریہ ادا کیا ہے کہ انہوں نے میسور کا معاملہ اپنے ہاتھ میں لیا۔

دوسرے اور تیسرے خط پر لارڈ میکارتھی کے دستخط ہیں۔

ان میں پہلے خط کے ذریعے لارڈ میکارتھی نے رانی کشتا کو انگریزوں کے تعاون کا یقین دلایا ہے اور دوسرے خط میں اس معاہدے کی تصدیق کی ہے۔

جس زمانے میں یہ معاہدہ طے پایا تھا اس وقت حیدر علی اور انگریزوں کے درمیان میسور کی دوسری جنگ جاری تھی۔

یہ سازش حیدر علی کے خلاف کی گئی تھی، لیکن اتفاقاً اس زمانہ میں نواب حیدر علی خاں ونا پٹنگے اس لیے یہ سازش سلطان شیو کے خلاف استعمال ہوئی۔

جس وقت حیدر علی خاں کا انتقال ہوا تو سلطان شیو انگریزوں سے جنگ میں مصروف تھا۔

میدر علی خاں کا انتقال بھی دارا سلطنت مرزگا پٹم سے باہر ہوا تھا۔ یہ بھی عجب اتفاق تھا کہ حیدر علی کے انتقال کی خبر پہلے مرزگا پٹم پہنچی، پھر شہزادہ شیو کو اس کی اطلاع ہوئی۔ اس لیے سلطنت نے اتحاد کے طور پر شہزادہ کو مرزگا پٹم میں سے تخت نشین کر دیا تھا تاہم دشمنوں کو سازش کرنے کا موقع نہ ملے۔

سازشی تو ایسے ہی مواقع کی تلاش میں رہتے ہیں۔ دارا سلطنت مرزگا پٹم میں سازشوں کا ایک مرکز تو راج محل تھا جہاں کی رانیاں مرثیوں اور انگریزوں سے ساز باز کرتی رہتی تھیں تاکہ انہیں سکانون سے ریاست واپس مل جائے لیکن رانینوں کے علاوہ بھی مرزگا پٹم میں کٹر ہندوؤں کا ایک ایسا گروہ تھا جو یہ چاہتا تھا کہ میسور میں خالص ہندو حکومت قائم ہو۔ اس گروہ کا سرغنہ اپنے شاہیا تھا۔

اس کا پورا نام شاہیا اینگا تھا اور اسے حیدر علی خاں مرحوم نے ڈاک کا افسر اعلیٰ بنایا تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی کا نام انگا اینگا تھا جسے رنگیا کے نام سے پکارتے تھے۔ اس گروہ کا تیسرا آدمی زسنگ راؤ تھا۔ یہ شخص بلدیہ کا صدر تھا اور اس کے ساتھ ہی خزانہ کا افسر بھی تھا۔ اس کے چھوٹے بھائی کا نام سنگیا تھا اور یہ شخص کوٹنٹور میں جج کے عہدہ پر مقرر تھا۔

ان مرنٹوں کے علاوہ اس سازش میں اور بھی بہت سے چھوٹے چھوٹے مکاری عہدیدار شریک تھے۔

ان سب نے باہم طے کیا کہ مرزگا پٹم پر قبضہ کر کے ہندو راج قائم کیا جائے۔ اس سازش کو کامیاب کرنے کے لیے انہوں نے دو تہذیب پر غور کیا اور ان پر عمل کے مندرجہ ذیل طریقے طے کیے :

۱۔ موقع ملنے پر سلطان شیو کو میدان جنگ میں قتل کر دیا جائے۔ یا پھر انگریزوں سے مدد حاصل کر کے ایسے ذرائع اختیار کیے جائیں جن سے سلطان کی میسور کو واپسی ناممکن ہو جائے۔

۲۔ ایک مقررہ دن مرزگا پٹم میں علم بغاوت بلند کر کے قلعہ پر قبضہ اور تمام مسلمان افسروں کو قید کر دیا جائے۔

پہلی خبر کو عمل میں لانے کے لیے تمل راؤ اور شوارٹز کے معاہدے نے راستہ ہٹا کر دیا تھا مگر مرزا کا پیٹم والوں کو یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ شہزادہ بیٹو نے منگلور میں اس فوج کا محاصرہ کر لیا تھا جو کرنل ہمبرٹن کے ماتحت تھی۔

اس خبر سے لاطینی کے باعث سازشیوں نے سازش کے دوسرے حصے پر عمل شروع کیا جس کے لیے مندرجہ ذیل تجاویز تھیں۔

۱۔ تنخواہ کے دن جب مسلمان سپاہی تنخواہ لینے نہیں تو انہیں ہندو سپاہیوں اور پرہے داروں کے ذریعے گرفتار کر کے قتل کر دیا جائے۔

یہ اس لیے ممکن سمجھا گیا کہ تنخواہ لیتے وقت فوجی سپاہی عام طور پر ہتھیار لگاتے تھے۔

۲۔ رسالدار اسد خاں کو اسی وقت قتل کر کے فوراً خزانہ کے علاوہ گولہ بارود اور تمام ہتھیاروں پر قبضہ کر لیا جائے۔

۳۔ ان تجاویز پر عمل کے لیے فوج کے ہندو سپاہیوں اور پرہے داروں کو اپنے ساتھ لایا جائے۔

۴۔ ضلع کو عبث طور (پانہیں گھاٹ) کے جج کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ انگریز فوج کی نقل و حرکت میں مدد دے۔

۵۔ شامیا کے بھائی رنگیا کو یہ کام سونپا گیا کہ قلعہ میں قید انگریز قیدیوں کو آزاد کر کے ان کی مدد سے قلعہ پر قبضہ کر لیا جائے۔

رنگیا نے اس مقصد کے لیے دس دن پہلے جرنل مینٹیووز اور دوسرے قیدیوں سے ملاقات کی تھی۔

۶۔ ان تجاویز کو عمل میں لانے کے لیے ۲۲۔ جولائی ۱۸۴۲ء کا دن مقرر کیا گیا تھا۔

فائنشورڈوں کا کہنا ہے کہ دو عادیات انسان کا پیچھا کبھی نہیں چھوڑتیں۔

۱۔ نیند کی عادت اور

۲۔ عشق و محبت کی عادت

اس کے لیے ایک مثل مشہور ہے کہ انسان کو تلوار کی نوک اور پھانسی کے تختے پر بھی لٹا دیا جاتا ہے۔

اسی طرح یہ مثل بھی مشہور ہے کہ عشق و محبت کی کرشمہ سازیاں میدان جنگ میں بھی اپنا ایک دکھا کے رہتی ہیں۔

میسور کے ہندو راجاؤں کے پاس سواری کے لیے کئی ہاتھی تھے۔ ان ہاتھیوں کو سنبھالنے کے لیے ایک مسلمان خاندان مامور تھا۔

مسلمانوں کا یہ خاندان صدیوں سے راجہ کے ہاتھیوں کی دیکھ بھال کا کام کر رہا تھا۔ اس زمانہ خاندان کی رہائش راج محل کے قریب ہی تھی۔

پھر جب راجاؤں سے ریاست نکل کر حیدر علی خاں کے پاس چلی گئی تو بھی رمضان خاں فیضان محل ہی میں مقیم رہا۔ دراصل اسے راج محل میں ایک فرد کی حیثیت حاصل ہو گئی تھی۔

رانی لکشمیا نے ریاست ہاتھ سے نکل جانے کے بعد رمضان خاں کو اجازت دے دی تھی کہ وہ راج محل کے پاس جا سکتا ہے مگر رمضان خاں نے اس خاندان کا نام لکھایا تھا اس نے راج محل سے نکلنے سے انکار کر دیا۔

رانی لکشمیا اس کے اس فیصلے سے بہت خوش ہوئی اور رمضان خاں مع اپنی اکلوتی بیٹی کے جو مانی کے نام سے مشہور تھی، راج محل میں بے خوف و خطر رہنے لگا۔

رمضان خاں کے خاندان کے دوسرے لوگ راج محل سے چلے گئے تھے اور انہوں نے راج محل کی ملازمت اختیار کر لی تھی۔

رمضان بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور اب اس سے کوئی کام نہ ہو سکتا تھا۔ رانی لکشمیا نے اسے کام کرنے سے روک دیا تھا اور اسے گھر بیٹھ گزارا کہ اسے تنخواہ مل رہی تھی۔

رمضان کی بیٹی رمضان تیرہویں چودھویں سال میں قدم رکھ رہی تھی رکھنے کو بھی اچھا لگتا تھا اس لیے خوب رنگ روپ نکالا تھا۔

وہ دن بھر راج محل میں گھسی رہتی تھی اور لکشمیا کی خدمت کی بجا آوری کے لیے ہمہ وقت ہار رہی تھی۔

رانی لکشمیا کا محل سازشوں کا مرکز تھا۔ وہاں ہندو سازشیوں کے مشورے ہوتے اور

منسوبے تیار کیے جاتے تھے۔

جب رمضان چھٹی تھی تو اس کی سچھ میں کچھ نہ آتا تھا لیکن جوں جوں شعور پیدا ہوا وہ ان باتوں کو سمجھنے لگی تھی۔

رمضان کی بات سن کے مٹی تو باپ سے کہتی:

"بابا یہ لوگ نواب بہادر کو مار ڈالنا چاہتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ نواب بہادر نے ریاست پر قبضہ کر لیا ہے۔ انہیں مار کر یہ ریاست کو آزاد کرائیں گے۔"

اور رمضان اسے زور سے ڈالتا:

"چپ رہو جازمضان۔ اسم باتیں نہیں کیا کرتے۔"

"میں کب باتیں کرتی ہوں بابا۔"

رمضان جواب دیتی:

"یہ باتیں تو وہ لوگ کرتے ہیں۔ جو رانی لکشمیا کے پاس آتے ہیں۔"

پھر رمضان اسے محبت سے سمجھاتا:

"دیکھ رمضان۔ تیرا رانی لکشمیا کی خدمت پر لگی ہے۔ کوئی باتیں کیا کرے تو تو اپنے کان بند کر لیا کر۔ کچھ سننے کی ضرورت نہیں۔ یہ لوگ نواب بہادر کو ماریں یا نواب بہادر انہیں ماریں ہمیں کسی بات میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ سن یا تو نے!"

مگر رمضان ہند کیڑہ جاتی:

"مگر بابا! کتنو کہتا ہے کہ نواب بہادر فرشتہ ہیں فرشتہ۔ انہوں نے تو کبھی رانی لکشمیا کو مارنے کی بات نہیں کی!"

کتنو اس کے چچا کا بیٹا تھا۔ اس کا چچا خاندان کے دوسرے لوگوں کے ساتھ قلعہ میں چلے جانے کے بعد قلعہ دار کی نوکری میں تھا۔

رمضان ہفتہ میں ایک دن چچا کے گھر ضرور جاتی تھی۔ کتنو سے اس کی کچی دوستی تھی یا یوں کہنا چاہیے کہ دونوں میں محبت تھی۔

پتہ نہیں کتنو کا نام کتنو کیوں رکھا گیا تھا۔ اس کا رنگ گورا تھا اور آنکھیں بھوری بھوری۔ ہاتھ پیر بھی اچھے تھے۔

کتنو کے باپ نے رمضان سے کہہ دیا تھا کہ لگی عید پر وہ رمضان کو اپنی بہونا کر لے

ہلے گا مگر رمضان، بیٹی کو اپنی زندگی میں اپنے سے جدا نہیں کرنا چاہتا تھا اس نے صاف کہہ دیا تھا کہ:

"رمضان میری جان کے ساتھ ہے کتنو کے باپ۔ جب تک میں زندہ ہوں اسے میرے ہی ساتھ رہنے دو۔ میرے بعد پھر یہ بتا رہے ہی گھر رہے گی اور کہاں جائے گی۔"

کتنو کے باپ کا مطالبہ بھی درست تھا۔ اس کا بیٹا ہند کر رہا تھا کہ رمضان کو راج محل سے لڈائے آیا جائے۔

کتنو نے اس کی کوئی خاص وجہ نہیں بتائی تھی لیکن رمضان جانتا تھا کہ راج محل میں رمضان کا لیزر بن کے رہنا کچھ مناسب نہیں۔ وہاں کا ماحول بالکل ہندوانہ تھا۔ رات دن پوجا پاٹ کا چرچا ہوتا تھا۔ شہر کے بڑے بڑے پنڈت رانیوں کے پاس آتے رہتے تھے۔ ایسے ماحول میں رمضان اسے سے بیٹھ بھی سکتی تھی۔ ماں اس کی پہلے ہی مر گئی تھی اور رمضان کو تو یوں ہی آنکھوں سے دکھتا تھا۔

کتنو کے باپ کے مطالبے میں اس قدر شدت پیدا ہوئی کہ رمضان بیٹی کو لگی عید پر گھر رخصت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔

رمضان تو دل ہی سے یہ چاہتی تھی اور اب تو یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ رمضان کی رخصتی کے اتنے ہی رمضان بھی راج محل سے قلعہ میں آجائے گا۔

کتنو بھی قلعہ دار سید محمد خان کی نوکری پر لگ گیا تھا اور اس نے قلعہ دار سے اپنی رانیوں کے الگ کو اڑھائی مانگ لیا تھا۔

لیکن۔

رانیوں بھری رمضان کی رخصتی عید سے پہلے ہی ہو گئی۔

اس کی وجہ شہزادہ شیپو (جو اب سلطان بن چکا تھا) کے خلاف وہ سازش تھی جس کا سرغنہ ملہ ڈاک کا انیسر علی اپنے شا میا تھا۔

یہ وہی سازش تھی جس کا ذکر سابقہ صفحات میں کیا گیا ہے۔ اس سازش پر ۲۴ جولائی ۱۸۵۷ء کو عمل ہونا تھا۔

مقررہ تاریخ سے ایک دن پہلے یعنی ۲۳۔ اور ۲۴ جولائی ۱۸۵۷ء کی درمیانی رات کو تمام رانی لکشمیا کے محل میں جمع ہوئے۔



رانی کشمانے اگرچہ اس سازش میں براہ راست حصہ نہیں لیا تھا لیکن وہ اس میں شریک ضرور تھی اور تمام کاروائی اسی کے عمل میں ہو رہی تھی۔

اس تاریخ یعنی ۲۳ جولائی ۱۹۸۴ء کو منصوبہ کے مطابق ہندو پیر برداروں اور سپاہیوں میں ہتھیار تقسیم کر دیے گئے تاکہ ۲۴ جولائی کو مسلمان سپاہیوں میں تختہ آہ تقسیم ہونے کا موقع پر انہیں قتل کر دیا جائے۔

رمضانی اگرچہ رات دن رانی کشما کی خدمت میں رہتی تھی مگر اسے اس سازش کا پتہ بالکل نہ چل سکا۔ ہوسکتا ہے کچھ مہاشوں کی ناکامی کے بعد رانی کشما زیادہ محتاط ہو گئی ہو اور سازشیوں کے اجلاس وغیرہ میں زیادہ رازداری سے کام لیا گیا ہو۔ اس لیے رمضانی کو کچھ نہ معلوم ہو سکا۔

رمضانی دراصل ایسی باتوں کی گریہ نہ کرتی تھی بلکہ جو کچھ اس کے کانوں تک پہنچ جا تھا اسے وہ باپ اور کاتو تک پہنچا دیتی تھی۔

مگر۔

۲۳ اور ۲۴ جولائی ۱۹۸۴ء کو اتفاقاً طور پر رمضانی پر اس سازش کا انکشاف ہو گیا ہوا یوں کہ رمضانی معمول کے مطابق رانی کشما کی خدمت میں موجود تھی کہ ایک لوٹری نے دھاڑیں مارتی کہ رانی کو اطلاع دی:

”بڑی ڈبوڑھی کا جوکیدار کچھ عرض کرنے حاضر ہوا ہے۔“

رانی کو جوکیدار کا اس وقت آنا شاید ناگوار گزرا۔ اگرچہ ابھی رات کچھ زیادہ نہ ہوئی اور رانی خاصی دیر سے سویا کرتی تھی مگر رانی نے بڑے سخت لہجے میں جواب دیا:

”کیوں آیا ہے۔ کیا کھانا چاہتا ہے اس وقت؟“

لوٹری گھر گیا۔

رانی نے کچھ نہیں بتایا۔ ابھی پوچھ کے آتی ہوں۔

رانی کشمانے منہ بنا کر اس کی طرف سے رخ پھیر لیا۔ قریب سیڑھی ہوئی رمضانی نے لوٹرا کو اس طرح اشارہ کیا جیسے کہہ رہی ہو کہ ”جا اور پوچھ کے آ۔“

لوٹری اسے پیروں واپس ہو گئی اور چند ہی منٹ بعد لوٹ آئی۔

رانی کشما کا مزاج پہلے ہی گہر چکا تھا۔ اس نے اور زیادہ سختی سے پوچھا:

”کیا کھتا ہے جوکیدار۔ کیوں آیا ہے؟“

لوٹری کوڑکی دھڑ سے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ اس نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا:

”ہمارا رانی جوکیدار نے بتایا ہے کہ اچھے شامیا اور دوسرے لوگ آئے ہیں اور آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔“

اب رمضانی کی باری تھی۔

اس نے رانی کے بولنے سے پہلے ہی جواب دیا اور جواب بھی بالکل رانیوں کے سے ملازمین دیا:

”جا۔ اور ان سے کہہ دے کہ ہمارا رانی اس وقت نہیں مل سکتیں۔ اچھے شامیا صبح سے دوبار ملنے آچکا ہے۔ اب کیا ایسا ضروری کام پڑ گیا ہے کہ پھر پریشان کرنے آ گیا ہے۔ ہمارا رانی آرام نہ کر رہی کیا؟“

لوٹری شاید واپس جانے لگی تھی کہ رانی نے اسے رد کیا:

”گھر جا۔ اچھے کو بٹھا۔ میں آتی ہوں ابھی۔“

پھر ہلٹ کر رمضانی سے کہا:

”تو گھر جانا چاہے تو چلی جا۔ اگر بیٹھنا ہو تو انتظار کر۔ میں ابھی آتی ہوں ان سے دو بات کر کے۔“

”اچھی کہاں جاؤں گی ہمارا رانی۔“

منہ چڑھی رمضانی نے تڑپ سے جواب دیا:

”مجھے اتنی جلدی پیند کہاں آئے گی۔“

رمضانی کی بات ختم ہونے سے پہلے رانی اپنے کمرے سے نکل چکی تھی۔

رمضانی کا ہاتھ ٹھنکا۔ اچھے شامیا رمضانی کو پسند بھی نہ تھا۔ وہ بے دھڑک راج محل

آنا تھا۔ رمضانی بھی سمجھتی رہی کہ وہ رانی کا کوئی عزیز ہزار ہے۔ جبھی روز آتا ہے اور کبھی تو کے دن میں کئی کئی چکر لگ جاتے تھے۔

اچھے شامیا کا رمضانی سے آنا سامنا ہو جاتا تو وہ اسے بھڑکتا۔

”رمضانی۔ تو کتنی اچھی ہے۔ چلے گی میرے گھر؟“

رمضانی فوراً انکار کرتی:

”واہ جی۔ میں کیوں جانے لگی کسی کے گھر۔ ہمارا بیٹا کب چھوڑی، میں۔ وہ مجھے کھانا گھر نہیں جانے دیتیں۔“

”میں تجھے ہمارا بیٹا سے مانگ لوں۔ تب تو چلے گی۔“

رمضانی نے ہمارا بیٹا سے شکایت کیا کہ کھانا:

”ہمارا بیٹا یہ جو اپنے شامیا ہمارا ج میں، کہتے تھے کہ رمضان میں تجھے ہمارا بیٹا سے مانگ لوں گا۔ آپ انکار کر دیجیے گا۔ میں ان کے گھر نہیں جاؤں گی۔“

ہمارا بیٹا نے ہنس کے کہا تھا:

”وہ تجھے چھوڑنا ہے۔ محول کرتا ہے گھر ہے اچھا آدمی۔ بڑا امیر ہے۔ اس کے پاس چہلے گی تو عیش کرے گی عیش۔“

”واہ ہمارا بیٹا۔ میں کیوں جانے لگی۔“

رمضانی نے صاف انکار کر دیا تھا:

”مجھے آپ کے پاس کیا کمی ہے جو میں کسی اور کے گھر جاؤں؟“

”تو تو کسی کے گھر نہیں جائے گی؟“ رانی نے پوچھا تھا۔

اور رمضانی نے بے دھڑک کہا تھا:

”نہیں۔ بالکل نہیں۔ آپ کو چھوڑ کے کسی کے گھر نہیں جاؤں گی۔“

”کلو کے گھر بھی نہیں جائے گی کیا؟“

اور رمضانی شرمائی تھی۔

وہ انہی خیالوں میں کھوئی ہوئی تھی کہ لوڈی پھر آگئی۔

”اب کیوں آئی۔ کیا کوئی اور آ گیا ہے ملنے ہمارا بیٹا سے؟“

رمضانی کے خیالات کا سلسلہ ٹوٹ گیا تھا اس لیے وہ چڑچڑی ہو رہی تھی۔

”ہاں رمضانی جی۔“

لوڈی نے جواب دیا:

”مگر دہشت آئے ہیں۔“

رمضانی اور چڑچڑی:

”انہیں بھی اسی وقت آنا تھا۔ جا کے کہہ دے کہ ہمارا بیٹا اس وقت مصروف ہیں۔ کسی

لوڈی مل سکتیں۔“

لوڈی چپ چاپ واپس ہو گئی۔

وہ جانتی تھی کہ اگر اس نے رمضان سے بحث کی تو وہ ہمارا بیٹا سے شکایت کر دے گی اور پھر اس کی مصیبت آجائے گی۔

لوڈی کے جانے کے بعد رمضان کو اک دم خیال آیا کہ ہمارا بیٹا کو گئے ہوئے تو ایک گھنٹہ سے زیادہ ہو چکا ہے۔ اسی کی باتیں ہو رہی ہیں جو ہمارا بیٹا نے اتنی دیر کر دی!

اس شخص نے رمضان کے دل میں ایسی کھلبلی مچائی کہ وہ دریافت حال کے لیے اس کے پاس کی طرف چلی جاں ہمارا بیٹا والوں سے ملاقات کیا کرتی تھیں۔

اس سے پہلے اس نے کبھی چھپ کے باتیں سننے کی کوشش نہ کی تھی۔ ہاں اس کے کان میں چلتے پھرتے اگر کوئی بات پڑ جاتی تو وہ اپنے باپ اور گلوٹنگ ضرور پہنچاتی تھی۔

رمضانی کمرے کے پاس پہنچی تو اسے زور زور سے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ کمرے کے اندر شخصوں کی تیز روشنی ہو رہی تھی اور یہ روشنی پردوں سے چھن چھن کر باہر آ رہی تھی۔ رمضان کو کمرے کی کھڑکیوں تک پہنچنے کی ضرورت نہ پڑی۔ باہر کی راہداری میں اندر ہونے والی باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔

رمضانی نے راہداری کے ایک ستون کے پاس رک کر پہلے تو کمرے کے اندر نظر دوڑائی۔ کمرے کے اندر موجود لوگ اس کے لیے اجنبی نہ تھے۔ ان میں دو تو اس کے خاص واقف کار تھے۔ ایک اپنے شامیا۔ دوسرا رنگیا۔

بدو دونوں سگے بھائی تھے اور دونوں ہی رمضان کو چھوڑتے رہتے تھے۔ رنگیلے تو ایک دن آہستہ سے اس سے کہہ بھی دیا تھا:

”رمضانی میرا دل تجھ پر آ گیا ہے۔ میں تجھے اپنی رانی بناؤں گا۔“

رمضانی کو ہنسی آگئی۔ اس نے جواب دیا تھا:

”ہمارا ج۔ یہی بات تمہارے بھائی شامیا نے بھی کہی تھی۔“

وہ تو صرف تجھے چھوڑتا ہے۔ رنگیلے نے اسے ہلکا دیا تھا۔

”تم بھی تو مجھے چھوڑتے ہو۔“ رمضان نے ہنس کے کہا تھا۔

”نہیں رمضانی۔ مجھے تجھ سے محبت ہے۔ میں بھوٹ نہیں ہوں۔ میں تجھے اپنی رانی

بنائے رکھوں گا۔

”اچھا تو جب تم راجہ ہو جاؤ تو مجھے رانی بنالینا۔“  
رمضانی نے رنگی کا منہ بند کر دیا تھا۔

مگر۔

اس وقت تو بچے شامیا اور رنگی کمرے کے اندر شیر کی طرح دھاڑ رہے تھے۔ ان کے  
چہرے لال تھے اور منہ سے کف اڑ رہا تھا۔

رمضانی نے ادھر کان لگا دیے۔ اب جو اس نے ان لوگوں کی باتیں سنیں تو اس کے  
پیروں تلے سے زمین نکل گئی:

”ہائے کیا میرا کلو بھی مار ڈالا جائے گا“

اس کے ساتھ ہی رمضانی کے دل میں ایک ٹپس اٹھی اور ہوک بن گئی۔ اس کا سر جھک رہا  
رنگ اور ہاتھ پاؤں پھول گئے۔

دہ تیزی سے رانی کے کمرے کی طرف پلٹی۔ اس میں اب اور کوئی بات سننے کی طاقت نہ  
گئی تھی۔ غداروں اور باغیوں کا پورا منصوبہ اس کے دل و دماغ پر ہتھوڑے کی طرح چھوٹ  
رہا تھا۔

کمرے میں پہنچ کے دہ فرش پر جیسے گر پڑی۔ اس کا سر بھاری ہو گیا اور سارا جسم ٹوٹ  
رہا تھا۔

اس نے سب باتیں سن لی تھیں اور آنے والے کل کے طوفان کی شدت وہ ابھی سے محسوس  
کرنے لگی تھی مگر۔ اس طوفان میں اسے صرف اپنا کلو قبضہ کرے کھانا دکھائی دے رہا تھا۔  
رمضانی کو آتے ہوئے چند ہی منٹ گزرے تھے کہ رانی کشمکش کمرے میں داخل ہوئی۔  
”اے رمضانی۔ تو اب تک گھر نہیں گئی؟“ رانی نے تعجب کا اظہار کیا۔

رمضانی، رانی کے ایک دم آجانے سے گھر اچھی تھی مگر اس نے فوراً خود کو سنبھالا

ادب سے بولی:

”ہمارا رانی میں کیسے جاتی ہے آپ کی اجازت کے بغیر؟“

اور کشمکش نے اسے اجازت دیدی:

”اگر میں مصروف ہو جاؤں تو تو بغیر اجازت چلی جایا کر۔ باجلی جا۔ بہت رات ہو گئی!“

رمضانی بھاگ بھاگ گھر پہنچی۔ باپ بڑ بڑایا:  
”اتنی رات کر دی۔ میرا بھی کچھ خیال کیا کر۔“  
رمضانی نے ٹالا:

”رانی نے اب اجازت دی ہے تو آئی ہوں۔“

باپ نے اور کوئی سوال نہیں کیا۔

رمضانی تو بے چین ہو رہی تھی۔ اس نے کہا:

”بابا۔ میں قلعہ جا رہی ہوں۔“

”کیوں؟“ بابا چونک پڑا۔

”تمہیں پتہ نہیں کلو بہت بیمار ہے۔“ رمضانی نے صاف جھوٹ بولا۔

”کب سے بیمار ہے کلو۔ مجھے تو نے بتایا نہیں۔“

”بتایا تھا۔ تمہیں یاد کب رہتا ہے؟“

پھر ذرا ٹھہر کے بولی:

”پہلی جاؤں پھر؟“

”مجھے بھی ساتھ لے چل۔“

”کل لے چلوں گی۔“

اور رمضانی کو ٹھٹھکی کے دروازے پر پہنچ گئی۔

باپ نے نصیحت کی:

”دیکھ بھال کس جانا۔ رات میں آنے کی ضرورت نہیں۔ کیا پتہ کیا ہو جائے؟“

رمضانی کو پوری چھوٹ ل گئی۔

راجہ کے محلات کے گرد ایک اونچی دیوار تھی جو تفصیل کا بھی کام کرتی تھی۔ تفصیل کے گیٹ پر  
پہرے دار نے رمضانی کو گھور کے دیکھا مگر اسے روکنے کی ہمت نہ ہوئی۔ رانی کشمکش کی غصہ  
کھینچ کر کو کون روک سکتا تھا۔

راج محل سے قلعہ دارا در اس کے مکان کا فاصلہ کچھ زیادہ نہ تھا۔ ایک روشن لمبی شہر ان

دونوں حصوں کو ملائی تھی۔

سڑک کے دونوں طرف بڑی بڑی شعیبیں اشع دانوں میں جل رہی تھیں اور رمضان تیز تیز قدموں سے قلعہ دار کے مکان کی طرف بھاگی جا رہی تھی۔

اس وقت سرنگا پٹم کا حاکم قلعہ (قلعہ دار) سید محمد خاں تھا۔

وہ بڑا معنی اور وفادار افسر تھا۔ صبح سویرے نکلے ہی دفتر میں پہنچ جاتا اور شام غروب آفتاب کے وقت گھر واپس جاتا۔ دفتر سے اس کا گھر قریب سی گزیرا۔ وہ دفتری اوقات میں گھر نہیں جاتا تھا۔

قدرت کے کام نزلے ہوتے ہیں۔

وہ جو کام بگاڑنا چاہے تو اس کے اسباب پیدا کرتی ہے اور اگر کسی کام کو سنوارنا منظور تو اس کے اسباب بھی غیب سے پیدا کرتی ہے۔

قلعہ دار سید محمد خاں غروب آفتاب کے وقت گھر واپس آ جایا کرتا تھا۔ اس کا پر سے دار کلو بھی اسے گھر تک پہنچانے کے گھر چلا جایا کرتا تھا۔

مگر اس شام —

قلعہ دار کو ایک ضروری کام کی وجہ سے دفتر میں ہی رکنا پڑا اور جب وہ دفتر سے اٹھا تو رات بھیگ رہی تھی۔

قلعہ دار سید محمد خاں اور کلو آگے پیچھے دفتر سے قلعہ دار کے گھر کی طرف آ رہے تھے کہ انہیں کسی کے بھاگنے کی آواز محسوس ہوئی۔

کلو نے فوراً ہندو سیدھی کر لی۔ قلعہ دار نے کہا:

"کوئی ہمارے دفتری طرف بھاگتا ہوا جا رہا ہے۔ تم آگے بڑھ کے دیکھو۔ میں تمہارا ہمیں پرانتظار کر رہا ہوں۔"

کلو حکم پا کے بندوق چھپتا ہوا ہوئے تیز قدموں سے آگے بڑھا۔

قلعہ دار سید محمد خاں کے دماغ میں طرح طرح کے خیالات آ رہے تھے۔ بظاہر تو قلعہ دار کی فضا پر سکون تھی لیکن اسے معلوم تھا کہ یہاں کسی وقت بھی کوئی بڑا حادثہ ہو سکتا ہے۔ جب تک

نواب بہادر جات تھے، ماضی ڈرڈ کے کام کرتے تھے مگر ان کے بعد یہ شیر ہو گئے تھے۔ مخالفین کا خیال تھا کہ جو ان عمر سلطان پٹو اتنی بڑی سلطنت کو سنبھال نہ سکے گا اسی لیے جگہ جگہ

چھوٹی چھوٹی بغاوتیں اور سازشیں سر اٹھانے لگی تھیں۔

قلعہ دار سید محمد خاں ایسے ہی خیالات میں الجھا کھڑا تھا کہ کلو واپس آیا مگر وہ تنہا نہ تھا۔ کوئی عورت اس کے ساتھ تھی۔

"یہ کون ہے کلو؟" قلعہ دار نے دریافت کیا۔

"آقا یہ — یہ رمضان ہے۔" کلو نے رک رک کے بتایا۔

"یہ اتنی رات گئے یہاں کیوں آئی ہے؟" قلعہ دار کا لہجہ کھٹکتا ہو گیا۔

قلعہ دار کی ڈانٹ پر کلو ڈر گیا:

"آقا۔ یہ کہتی ہے کہ کل قلعہ میں قیامت آئے گی۔ سب مسلمان مار دیے جائیں گے اور

— اور —

"کیا بکواس ہے یہ؟"

قلعہ دار کو غصہ آ گیا:

"ادھر آ رمضان۔ کیا کہہ رہی ہے تو؟"

رمضان کلو کے پیچھے چھپی کھڑی تھی۔ اس کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔ قلعہ دار کی آواز سن کے

ڈرتے ڈرتے آگے آئی۔

"صاحب....." رمضان کی آواز گلے میں پھنسے لگی۔

"گہر امت رمضان!"

قلعہ دار نے اسے تسلی دی:

"بتا کیا بات ہے۔ آج تک رات میں تو ادھر کبھی نہیں آئی۔ اب کیا مصیبت پڑی کہ

بھاگی چلی آئی ہے؟"

"صاحب جی۔ میں جھوٹ نہیں بولتی۔"

رمضان ذرا سنبھلی:

"جھوٹ ثابت ہو تو گر دن اڑا دیجیے گا۔"

کیا جھوٹ ثابت ہو جائے۔ کچھ بتا تو؟" قلعہ دار نے نرمی سے پوچھا۔

رمضان ذرا اور سنبھلی:

"صاحب جی۔ وہ اپنے شامیا، اس کا بھائی رنگیا اور — اور سب راج محل میں رانی

لکشمیا کے پاس کہہ رہے ہیں کہ کل سب مسلمانوں کو مار ڈالو۔ قلعہ۔

”چپ ہو جا۔ ٹھہر جا۔“

قلعدار نے رمضان کو روک دیا۔ پھر کلو کو حکم دیا:

”تو جا اور ایک سو بندو قیدیوں کو ساتھ لے کے دم میں واپس آ جا۔ رتی بھر دیر نہ ہو۔ بھاگتا ہوا جا۔“

قلعدار سید محمد خاں نے کلو کو ادھر بھیجا اور خود رمضان کو لے کے اپنے گھر آیا۔ اس کے گھر والے رمضان کو پہچانتے تھے اس لیے اُسے دیکھ کر انہیں کچھ زیادہ حیرت نہ ہوئی مگر قلعدار کے حکم پر انہیں بہت جراتی ہوئی۔

قلعدار کا حکم تھا:

”پانچ منٹ میں تیار ہو جاؤ۔ شاید یہی یہاں سے نکلنا پڑے۔“

پھر قلعدار، رمضان کو اپنے کمرے میں لے گیا اور اس سے پوچھا:

”ہاں رمضان اب بتا۔ راج محل میں کیا ہو رہا ہے؟“

”صاحب جی!“

رمضان کا خوف دُور ہو چکا تھا۔ اس نے اطمینان سے بنانا شروع کیا:

”شامیا۔ رنگیا اور سب ہندوؤں نے طے کیا ہے کہ کل جب سپاہی تختہ اٹھائیں تو

ہندو سب مسلمان سپاہیوں کو قتل کر ڈالیں۔ صاحب جی۔ آپ کل کلو کو تختہ اٹھانے نہ بھیجے گا۔“

قلعدار کو رمضان کی بات پر غصے کی بجائے اس کی معصومیت پر رحم آ گیا۔ سچ ہے کہ گھٹنے

پیٹ ہی کی طرف مڑتے ہیں۔ رمضان کو صرف کلو کی نکر تھی اور یہی فکر اسے راج محل سے یہاں

بکھینچ لائی تھی۔

قلعدار نے آہستہ سے کہا:

”گجرات رمضان۔ تیرا کلو نہیں مارا جائے گا۔ اب بنا اور کیا باتیں ہو رہی تھیں دماغ؟“

”صاحب جی۔ اب تو وہ سب لوگ چلے گئے ہیں۔ ہمارا فی بھی اپنے کمرے میں واپس آ گئی

تھی۔ جی تو میں موقع پا کر کلو کو خبر دینے آ گئی۔“

رمضان کی معصومیت بدستور برقرار تھی۔ اس کی ہر بات کی تان کلو پر آ کر ٹوٹتی تھی۔

”کوئی اور بات بھی ہوئی تھی ان میں؟“ قلعدار نے نرمی سے پوچھا۔

”ہاں صاحب جی۔“

رمضان نے بتایا:

”شامیا کہہ رہا تھا کہ فوج کے ہندو سپاہیوں کو انہوں نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے۔“

”ہوں۔“

قلعدار نے ایک لمبی سانس کھینچی:

”اور کچھ بھی سنائے تو نے؟ یاد کر کے بتا رمضان۔ تیرے بتانے سے سنیکڑوں مسلمانوں کی

جانیں بچ جائیں گی۔“

”صاحب جی۔ میں کیوں نہیں بتاؤں گی۔ جیسے کلو کی جان دیے دوسروں کی جان۔ میں سوچ سوچ

کے بتاتی ہوں۔۔۔۔۔“

رمضان ایک لمحہ ٹھہری۔ پھر بولی:

”دو آپ کے قلعہ میں انگریز قیدی ہیں ناں۔ ان میں ایک بڑا افسر بھی ہے۔ یہ لوگ اس افسر

سے ملے ہیں اور طے کیا ہے کہ اس کی مدد سے قلعہ پر قبضہ کر لیں گے۔“

اتنا کہہ کے رمضان پھر خاموش ہو گئی۔

قلعدار سید محمد خاں بہت بے چین تھا۔ اس نے پھر پوچھا:

”کچھ اور یاد کر رمضان۔ شاید یاد آ جائے!“

رمضان سوچتے ہوئے بولی:

”صاحب جی۔ وہ باہر سے فوج بلانے کی بات بھی کر رہے تھے اور۔ اور ہاں جی۔ وہ کہنے

کہہ رہے تھے۔ ہائے۔ میری زبان کٹ جائے۔ کہہ رہے تھے کہ سلطان کو وہیں قتل کر

دیں گے۔ اور ہاں کوئی نرسنگ راؤ ہے وہ انگریزی فوج لائے گا۔“

اتنے میں اطلاع ملی کہ کلو واپس آ گیا ہے۔ قلعدار سید محمد خاں باہر آ گیا۔ ایک سو بندو قیدی

باہر موجود تھے۔

قلعدار سید محمد خاں تیس بیستیس سال کا ایک تیز منہ سردار تھا۔ اس نے اسی وقت مندرجہ

ذیل احکام جاری کیے:

۱۔ دس بندو قیدی برادر نرسنگ راؤ کو گرفتار کر کے لے آئیں۔

۲۔ دس بندو قیدی برادر اپنے شامیا اور رنگیا کو گرفتار کر کے لائیں۔

۳۔ پانچ ہندوق بردار شتاب رائے کو گرفتار کر کے لائیں۔

۴۔ دو تیز رفتار سوار فوراً سلطان معظم کی طرف روانہ ہوں جو انہیں اس سازش سے آگاہ کرنے کے علاوہ ان سے اپنی ذاتی حفاظت کی درخواست کریں۔

۵۔ ۲۵ ہندوق بردار اپنے ساتھ مزید سپاہیوں کو لے جائیں اور قلعہ میں موجود تمام ہندو سپاہیوں کو گرفتار کر لیں۔

۶۔ دس سوار قلعہ کے جیل خانہ پر جائیں اور پہرے پر جس قدر ہندو سپاہی ہوں، ان کو گرفتار کر کے ان کی جگہ مسلمان پہرے دار مقرر کر دیے جائیں۔

باقی ہندو قیدیوں کو لے کر قلعہ دار سید محمد خاں صدر دروازے پر پہنچا اور وہاں سخت پہ لگا دیا۔

قلعہ کے باقی دروازوں پر بھی پہرے دار زیادہ کر دیے گئے۔ تمام راج محلوں کے گرد زبردست پہرہ لگا دیا گیا۔

ان انتظامات میں آدھی سے زیادہ رات گزر گئی۔ قلعہ دار سید محمد خاں گھوڑے پر سوار پورے قلعہ میں چکر لگاتا پھر رہا تھا اور حسب ضرورت جگہ جگہ چوکی پر سو سخت کر رہا تھا۔

اس نے اب تک رات کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ اُسی پر کیا موقف گھر کے تمام لوگوں نے بھی کچھ کھایا یا پیا نہیں تھا اور وہ سب مختصر سامان کے ساتھ آمادہ سفر تھے مگر خدا کا شکر تھا کہ سازش انہیں کے مراحل سے گزرنے سے پہلے ہی کھل گئی تھی اور قلعہ دار کو اپنے گھروالوں کو قلعہ سے باہر نہیں بھیجنا پڑا تھا۔

پھر بھی سب پر ایک خوف و دہشت سا طاری تھا۔

ایک بار جب سید محمد خاں کسی طرف سے گھوم کے گھر پہنچا تو رمضان نے گلو گھیرا اور اس سے درخواست کی:

”صاحب جی۔ مجھے گھر بھجوا دیجیے یا میرے بابا کو وہاں سے بلوالیجیے۔ وہ میرے بہت گھبرا رہا ہو گا۔“

”رمضان۔ ہم تمہارے احسان مند ہیں۔“

قلعہ دار نے متشکر ہو کر کہا:

”میں بھی تمہارے بابا کی اسی قدر فکر ہے جتنی تمہیں ہے مگر تمہیں کچھ دیر اور انتظار کرنا پڑے

گاہائیوں کے گرفتار ہوتے ہی ہم تمہارے بابا کو یہاں بلوالیں گے۔ تمہارا یا تمہارے بابا کا اب راج محل میں یا اس کے قریب رہنا ٹھیک نہیں۔ ہم تمہیں اور تمہارے بابا کو یہاں سرکاری مہمان کے طور پر رکھیں گے۔ تم نے ہمیں ایک بڑی مصیبت سے پہنچا ہے۔“

قلعہ دار کی بات ختم ہوئی تھی کہ دس ہندو قیدیوں کے پہرے میں زسنگھ راؤ گرفتار کر کے لایا گیا۔

زسنگھ راؤ، سرزنگا پٹم کی بلدیہ کا صدر اور خزانہ کا افسر تھا۔ وہ سر جھکائے ہوئے آیا اور قلعہ دار سید محمد خاں کو دیکھتے ہی اس کے پیروں پر گر پڑا۔

”خان صاحب۔ تمہیں اپنے اللہ کی قسم۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے اپنے شامیانے بھکایا تھا۔ وہی دونوں بھائی سازش کے سرغنہ ہیں۔ انہوں نے مجھ سے زبردستی روپیہ نکلوا کر سپاہیوں میں بانٹا تھا۔ مجھے معاف کر دو خان صاحب۔ سید صاحب۔ میں عمر بھر تمہارے گھروالوں کو دعاؤں دیتا رہوں گا۔“

زسنگھ راؤ نے بغیر پچھے سازش کا اعتراف کر لیا۔

قلعہ دار سید محمد خاں کو رمضان کی بات کا یقین تھا، پھر بھی اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا کہ شاید رمضان کی کہ سننے میں کچھ فرق ہو۔ مگر زسنگھ راؤ کے اقبالِ جرم کے بعد رمضان کی تمام باتوں کی تصدیق ہو گئی تھی۔

قلعہ دار نے اسے جواب دیا:

”زسنگھ راؤ۔ چیخ و پکار کی ضرورت نہیں۔ تو بغاوت میں شریک ہے خواہ اس کے سرغنہ کوئی بھی ہوں۔ تیرا مقدمہ سلطان معظم کے حضور پیش ہو گا اور وہی فیصلہ کریں گے۔ راجو شس کھڑا رہ۔ جو بویا ہے وہی کاٹے گا۔“

زسنگھ راؤ کی آدھی جان نکل گئی۔

اسی وقت، قلعہ کے صدر دروازے کے دو پیریدار ایک ہندو کو لے کر حاضر ہوئے۔ قلعہ دار نے قلعہ کے تمام دروازے سیل کر دیے تھے اور حکم دیا تھا کہ اگر کوئی شخص باہر جانے کی فکر کرے تو پہلے اس کی تلاشی لی جائے پھر اسے پیش کیا جائے۔

پیریداروں میں سے ایک نے بتایا:

”قلعہ دار صاحب۔ یہ آدمی خود کو ہمارا فی گشت کا خاص ملازم بتاتا ہے اور کہتا ہے کہ ہمارا

نے اسے منگوا اپنے ایک عزیز کے پاس بھیجا ہے اس لیے اس کا اسی وقت قلعہ سے باہر چلا  
ضروری ہے۔“

قلعدار نے دریافت کیا:

”تم نے اس کی تلاشی لی۔ کچھ نکلا اس کے پاس سے؟“

”نہیں قلعدار صاحب۔“

پھر سے دار نے جواب دیا:

”یہ کہنا ہے کہ وہ زبانی پیغام لے کر ہمارا ہے۔ اس نے تلاشی دینے سے بھی انکار کر دیا  
ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارا فی کے محل کے آدمیوں کی گیٹ پر تلاشی لینے کا حکم نہیں ہے۔“

قلعدار کو طیش آ گیا:

”حکم ہے کہ نہیں، یہ تو بعد میں دیکھیں گے۔ پہلے تم اس کی تلاشی لو۔“

پھر دہاروں نے اس کی تلاشی لی تو اس کی اندر کی جیب سے ایک بند لٹافہ نکلا۔ لٹافہ قلعدار  
سید محمد خاں کو دیا گیا۔

اس نے لٹافہ چاک کر کے خط نکالا اور روشنی میں لے جا کر پڑھا۔

لٹافہ سے جو خط نکلا وہ جنرل مینٹیکوز کا لکھا ہوا تھا۔ یہ جنرل دوسرے انگریزوں کے ساتھ  
قلعہ سرنگا پٹم میں قید تھا۔

جنرل مینٹیکوز نے خط میں، منگور میں قید کرنل ہمرٹن سے درخواست کی تھی کہ وہ فوراً  
سرنگا پٹم روانہ ہو جائے کیونکہ بغاوت ہو چکی ہے اور سرنگا پٹم اور قرب وجوار کی پوری ہندو  
آبادی اس بغاوت میں شریک ہے۔ سلطان سرنگا پٹم سے دور ہے اور قلعہ پر قبضہ کر کے  
کوشش جاری ہے۔

خط پڑھنے کے بعد قلعدار نے ہندو قاصد سے پوچھا:

”سچ سچ بتا۔ یہ خط تجھے کس نے دیا ہے؟“

قاصد نے کوئی جواب نہ دیا اور خاموش کھڑا رہا۔

قلعدار نے کلمہ کو حکم دیا:

”کلو خاں۔ اس سے تین بار پوچھو کہ یہ خط اسے کس نے دیا ہے۔ اگر یہ تیسری بار بھی

جواب نہ دے تو اس کے دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں قلم کر دو۔ اگر پھر بھی نہ بتائے تو بائیں

ہاتھ کی انگلیاں کاٹ دو۔ پھر دایاں ہاتھ، بایاں ہاتھ۔ دایاں پیر، بایاں پیر۔ اور  
آخر میں خنجر.....“

قاصد کے ہاتھ پیر لرز رہے تھے۔ جب بات خنجر پر پہنچی جو اس کی مکمل موت کی خبر تھی  
تو وہ رو پڑا اور ہاتھ جوڑ کے بولا:

”میری جان بخش دو قلعدار صاحب۔ میں سب کچھ بتاتا ہوں۔“

وہ اس قدر خوفزدہ تھا کہ دھوئی ہی میں اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔

قلعدار سید محمد خاں چچنگ کے بولا:

”بتا چاہے نہ بتا۔ میں کہہ چکا ہوں کہ میں تم لوگوں کو قتل تو کر سکتا ہوں مگر کسی کو معاف  
نہیں کر سکتا۔ تم لوگ سلطان معظم کے مجرم ہو۔ تمہارا فیصلہ وہی کریں گے۔“

قاصد نے ہاتھ جوڑ کے کہا:

”قلعدار صاحب۔ مجھے خط اپنے شامیانے دیا تھا مگر وہاں اس کا بھائی رنگیا بھی موجود تھا۔“

قلعدار نے دوسرا سوال کیا:

”یہ خط تجھے راج محل میں دیا گیا یا کسی اور جگہ؟ اور کیا تجھے معلوم ہے کہ اس مازش میں  
رانی لکشمیا شامل ہے؟“

”نہ۔ نہ قلعدار صاحب۔ تجھے ہمارا فی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم۔“

قاصد گڑ گڑاتے ہوئے بولا:

”یہ خط مجھے اپنے شامیانے اپنے گھر ملا کر دیا تھا۔ راج محل میں تو میں آج تک گیا ہی نہیں۔  
اسی شب۔“

اپنے شامیانے۔ رنگیا اور دوسرے سرغنوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ نائب قلعدار شتاب رائے کو

بھی حراست میں لے لیا گیا۔ یہ سرنگا پٹم کا سابق قلعدار تھا۔

قلعدار سید محمد خاں نے قلعہ میں موجود تمام افراد کو طلب کر لیا تھا۔ بعض لوگوں نے یہ بھی

بتایا کہ ہندو سپاہیوں میں کچھ اسلحہ بھی تقسیم کیا گیا ہے۔

چنانچہ۔ رسالدار اسد خاں کو حکم دیا گیا کہ تقسیم شدہ اسلحہ ہندو سپاہیوں سے واپس لے

کر سپاہیوں کو جیل میں بند کر دیا جائے۔

یہ تمام کام نہایت خاموشی سے کیا گیا۔ راج محل یا قلعہ والوں کو اس وقت تک کوئی خبر نہ

تھی کہ وہاں تیار ہونے والی سازش کا کیا انجام ہوا؟  
انہیں اس وقت کچھ شبہ ہوا جب قلعہ دار سید محمد خاں کے حکم سے رمضان کے باب رمضان  
کو راج محل کی غلام گردش سے بلوایا گیا۔ اسے پانچ سواری لینے آئے تھے۔ وہ سیدھے رمضان کی  
کوٹھڑی پہنچے اور اسے ایک گھوڑے پر بٹھا کر ساتھ لے گئے۔  
یہ خبر فوراً عمارانی لکشا کو پہنچائی گئی۔

اس نے رمضان کے بارے میں پوچھا مگر کوئی کچھ نہ بتا سکا۔ جب سوار رمضان کو لے کر  
بارہے تھے تو راج محل کے پہرے دار اور دو مراعلہ دور ہی کھڑا تماشہ دیکھتا رہا کسی کو قریب  
آنے کی جرات نہ ہوئی۔

عمارانی کو اگرچہ شبہ ہو گیا تھا کہ شاید سازش ناکام ہو گئی ہے لیکن وہ اپنے شاہیا کسی اڈ  
کے گھر اپنا آدمی بھیج کر خود کو اس سازش میں لوٹ نہ کرنا چاہتی تھی۔

صبح ہونے پر جب یہ خبر عاں ہوئی تو ہر شخص حیران رہ گیا۔ مسلمانوں کو اس بات کا انہوں سے تھا  
کہ حیدر علی خاں مرحوم اور ان کے پوتے سلطان ٹیپو نے صرف چند گاؤں پر مشتمل ریاست  
میسور کو ایک عظیم الشان سلطنت میں تبدیل کر دیا ہے لیکن راج محل کی رانیوں نے اب تک نواب  
کو نواب اور سلطان کو دل سے سلطان تسلیم نہیں کیا اور وہ اٹھ دن حکومت کے خلاف سازشیں  
کر رہی ہیں۔

ادھر قلعہ دار سید محمد خاں نے تمام باغیوں کو سخت پہرے میں سلطان کے پاس منگوا کر  
روانہ کر دیا۔

وہاں پہنچنے پر سلطان نے باغیوں سے پوچھ گچھ کی تو سب نے مدافیاں مانگنا شروع کر دیں۔  
باغیوں کے ساتھ قلعہ دار نے رسالہ دار احمد خاں کو بھیجا تھا تاکہ وہ سلطان کو سازش کی پوری تفصیل  
سے آگاہ کرے۔

سلطان نے پوری تحقیق کے بعد تمام باغیوں کو 'مولے شتاب رائے' کے قتل کر دینے کا  
حکم دیا۔ شتاب رائے کے خلاف کوئی مضبوط ثبوت نہیں تھا اس لیے اسے رہا کر دیا گیا۔  
اس طرح سلطنت، خداداد کے خلاف یہ سازش بھی ناکام ہو گئی۔

انگریزوں نے اسی سال سلطان سے معاہدہ کر لیا۔ یہ عہد نامہ الیٹ انڈیا کمپنی نے مجبوراً  
کیا تھا کیونکہ اس معاہدہ سے جنوبی ہند میں ان کے اقتدار کو سخت دھچکا پہنچتا تھا اور جب اس کی

برائے انگلستان پہنچی تو وہاں کھلم کھچ گیا۔

مزد نام کا ایک انگریز جو اس جنگ میں خود شامل تھا، لکھتا ہے:  
"مجھے یقین ہے کہ ٹیپو سے جو معاہدہ ہوا ہے وہ عارضی ثابت ہوگا  
کوئی انگریز ان ذلتوں کو برداشت نہیں کر سکتا جو اس جنگ میں  
اٹھانا پڑیں۔"

اس سازش کے فوراً بعد سلطنت خداداد کے خلاف ساتویں سازش کی گئی۔

یہ سازش دراصل نظام دکن اور مرہٹوں کے درمیان ایک معاہدہ تھا۔ ان دونوں کا خیال  
تھا کہ سلطنت میسور انگریزوں کے ساتھ چار سالہ جنگ میں اس قدر کمزور ہو گئی ہے کہ اسے  
آسانی سے ختم کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ انھوں نے آپس میں معاہدہ کر کے سلطان سے جنگ  
چھیڑ دی۔

یہ جنگ تین سال تک جاری رہی اور آخر نظام اور مرہٹوں کو اس میں شکست اٹھانی پڑی  
سلطان کو یہ فتح ۱۷۸۸ء میں حاصل ہوئی۔

انگریز اس عرصہ میں بظاہر خاموش تھے لیکن ان کا رابطہ رانی کے ایجنٹ تمل راڈ سے  
قائم تھا۔

انگریز، ہندوستان اور انگلستان میں سلطان کو نہایت گندے الفاظ میں بدنام کرنے کی  
کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ اُس وقت انگلستان کا وزیر اعظم مسٹر پٹ تھا۔ اسی نے لارڈ کارنوالس  
کو ہندوستان کا گورنر جنرل اور جنرل میڈوز کو مدراس کا گورنر بنا کر بھیجا تھا۔

لارڈ کارنوالس کو امید تھی کہ جنرل میڈوز اپنی جنگی قابلیت کے ذریعہ سلطان کو  
شکست دیدے گا مگر خلاف توقع جنرل میڈوز کو پہلے درپے شکستیں اٹھانی پڑیں۔  
شکستوں سے کارنوالس اس نتیجے پہ پہنچا کہ جنوبی ہند کی کوئی انفرادی طاقت سلطان کو شکست  
دینے میں کامیاب نہیں ہو سکتی اس لیے ضروری ہے کہ سلطان کے خلاف ایک متحدہ محاذ قائم  
کیا جائے جس میں جنوبی ہند کی تمام طاقتیں شامل ہوں۔

ظاہر ہے کہ لارڈ کارنوالس یہ چاہتا تھا کہ نظام دکن، مرہٹوں کا پیشوا اور وہ خود بھی



انگوینہ ایک پلیٹ خام پر جمع ہوں۔ پھر سلطان پر ایک بھر پور حملہ کر کے اس کے کس بل نکال دیے جائیں۔ پس۔

اس نے اسی منصوبہ کے تحت کام شروع کیا۔

مرحوم نواب بہادر جید علی خاں اور سلطان شیو کے خلاف ہم نے والی سازشوں پر اگر کیا جاسے تو ان میں بعض باتیں مشترک نظر آتی ہیں:

پہلی بات تو یہ کہ ان تمام سازشوں میں راج علی کی رائیاں بالواسطہ یا بلاواسطہ شریک دکھائی دیتی ہیں۔

دوسری بات جو مشترک ہونے کے ساتھ ساتھ دلچسپ بھی ہے وہ یہ کہ ان سازشوں کی ناکامی یا انکشاف میں عام طور پر حسن و عشق کی دیدہ دلیریاں اور کار فرمایاں نظر آتی ہیں۔

انچے شامیہ والی سازش اس قدر زبردست تھی اور اس کا تانا بانا اس انداز سے بنا گیا کہ اس کے ناکام ہونے کی ایک فیصد بھی امید نہ تھی مگر اس میں ایک معمولی فیضان کی بیٹی رضفا کے عشق نے ایسی لگ رگائی کہ بہترین سازشی دماغوں کا بتا ہوا یہ تانا بانا ایک دم جل کر بھس ہو گیا۔

تمام باغی اپنے کبیر کردار کو پہنچے اور رضفا کا عشق کامیاب ہوا۔ سلطان نے رضفا کو کٹو کے ساتھ نہ صرف شادی کرائی بلکہ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے شاہی اخراجات سے ہوئی اور سلطان بہ نفس نفیس اس بارات میں شامل ہوا۔

رضفا اور کٹو کو اس قدر سدا مل جو ان کی آئندہ کئی پشتوں کے لیے کافی تھی۔ کٹو ترقی بھی دی گئی۔

لارڈ کارنوالس نے متحدہ محاذ یا اتحاد ثلاثہ کی کوششیں شروع کر دی تھیں۔ دوسری طرف اس نے اپنے گورنروں کو حکم دیا کہ سلطنتِ خداداد کے اندر سازشوں کا جال پھیلا دیا جائے اور سلطان کے افسروں کو مال و دولت یا دوسرے لالچ اور وعدوں سے خرید لیا جائے۔ اس کا

کے لیے کرنل ریڈ کو مقرر کیا گیا۔

کرنل ریڈ نے ان لوگوں، امیروں، پالیگاردوں اور حکمرانوں کو ڈھونڈ نکالا جو سلطان شیو کے ایک یا کسی دوسری وجہ سے خلاف ہو گئے تھے۔

ایسے لوگوں میں کنگدی نالہ کے پالیگار بھاری کورہ کے لڑکے، چک بالاپور، گر بکوٹہ، کلکومیر، بدن ہلی، آئینکل اور انکوس گری کے پالیگاروں کے علاوہ نیگندہ کاراجہ اور جیل نائیک کا پالیگار بھی شامل تھا۔

ان لوگوں کو یقین دلایا گیا کہ اگر میسور پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو ان کے علاقے اور ریاستیں انہیں واپس دیدی جائیں گی۔

سلطان کے ان مخالفوں کو حکم دیا گیا کہ وہ سلطنتِ خداداد میں داخل ہو کر اپنی اپنی جگہ پہنچیں ورنہ ان کے حالات سے انگریزوں کو مطلع کریں۔ نیز جنگ کے وقت انگریزی فوج کو رستہ دیو میا کریں۔ اس کے لیے ان میں سے ہر ایک کو کافی رقم دی گئی کہ وہ جس طرح چاہیں اس رقم کو استعمال کریں۔

سلطان نے فرمان جاری کر دیا تھا کہ مخالفین کو سلطنتِ خداداد میں ہرگز داخل نہ ہونے دیا جائے۔ چنانچہ ان لوگوں نے تاجروں کا بھیس بدلا اور مختلف راستوں سے سلطنتِ خداداد میں داخل ہو کر ملک بھر میں سازشوں کا جال پھیلا دیا۔

کرنل ریڈ جو ان سازشیوں کا انچارج تھا، اس نے میسور کے ایک اہم کارکن (افسر) کو چھ ماہ میں چھانسی لیا اور یہ کرنل ریڈ کا سب سے بڑا کارندہ بن گیا۔ اس کا نام سید امام تھا۔

سید امام نے سلطان کی ملازمت کر لی تھی اور سرنگا پٹم سے انگریزوں کو خبریں بھی کرتا تھا۔ بے کرنل ریڈ نے بہت کافی رقم بھجوائی تھی کہ وہ اپنے ساتھ اور لوگوں کو بھی شامل کرے۔ چنانچہ مندر ملک و ملت نے اپنے ساتھ پندرہ بیس سرکاری افسروں کو شامل کر لیا تھا۔ یہ لوگ دن میں سرکاری کام کرتے نظر آتے مگر ان کی راتیں شبستانوں میں گزرتی تھیں۔

سید امام کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اس نے نئے اد پر چار شادیاں کی تھیں مگر کوئی اولاد نہ پیدا ہوئی۔ چنانچہ اس نے ایک لڑکے کو مقبض کر کے اپنا بیٹا بنالیا تھا۔

سید امام کا یہ بیٹا سن سنوڑ میں داخل ہو چکا تھا۔ وہ ہر وقت باپ کے ساتھ رہتا تھا اور

ہلے جاتے رک گیا۔

اس نے زربینہ کی سہیلی سے کہا:

"میں نے زربینہ سے ایک بات پوچھی ہے۔ وہ مجھے جواب دیتے ہوئے ہچکچا رہی ہے۔ تم اس کی سہیلی ہو۔ اس کا جواب لے کے مجھے بتا دو۔ میں مہمان خانے میں بیٹھا ہوں۔"

وہ یہ کہہ کے مہمان خانے میں چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی زربینہ تیزی سے اٹھی اور دوڑ کے سہیلی سے لپٹ گئی۔ وہ اس زور سے لپٹی کہ اس کی سہیلی بانو کی پسلیاں چڑچڑانے لگیں۔

"چھوڑ۔ چھوڑ زربینہ۔ کیا مجھے مارنے کا ارادہ ہے؟" بانو نے کسماتے ہوئے کہا اور زربینہ نے اسے چھوڑ دیا۔

پھر خود ہی زربینہ نے بات پھر لی:

"آج باپ نے مجھ سے ایک بڑی اچھی بات کہی ہے زربینہ!"

"اور تو نے باپ کو اس کا جواب نہیں دیا۔" بانو نے ہنسی کر کہا۔

"اے اللہ۔ مجھے کیسے معلوم ہوا؟"

"بس۔ خرتقوں نے بتایا ہے۔"

"سچ سچ بتا۔ تجھے کس نے بتایا؟"

زربینہ ذرا سنجیدہ ہوئی تو بانو نے کہا:

"پہلے تو یہ بتا کہ باپ نے آج تجھ سے کیا بات کہی تھی تب میں بتاؤں گی۔"

"باپ نے کہا تھا۔"

اور زربینہ کا چہرہ جیسے گلزار ہو گیا۔ وہ مزید کچھ کہنے کے بجائے ایک بار پھر بانو سے لپٹ کر رہ گئی۔

"اچھا تو یہ بات ہے۔ میں سمجھ گئی۔"

بانو نے اسے الگ کرتے ہوئے کہا:

"شادی کی بات کی ہوگی باپ نے۔"

"ہاں۔ یہی بات تھی۔" زربینہ ہنسی پڑی:

"مگر تو نے کیسے جانا؟"

اس کے کارناموں سے پوری طرح واقف تھا۔

یہ لڑکا جس کا نام غفرام تھا، اپنے باپ کی حرکتوں سے سخت نالاں تھا مگر کچھ کہ بھی نہ سکتا تھا اس لیے کہ اس کا اور کوئی ذریعہ معاش نہ تھا اور اس کا باپ اسے اس خیال سے کہیں ملازم نہ کرنا تھا کہ کہیں اس کے کرتوتوں کا بھانڈا نہ پھوٹ جائے۔

خدا معلوم کہ غداروں کا یہ کردہ اور کیا غضب ڈھاتا کہ آخر اس کا بھانڈا اُپھوٹ گیا۔ یہ روایت اس طرح بیان کی گئی ہے:

جس صوبے میں سید امام اور غفرام رہتے تھے اس کے سامنے سرنگاپٹم کے ایک مسلمان تاجر کا مکان تھا۔ اس کی اکیلی بیٹی زربینہ آتے جلتے غفرام کو دیکھتی اور غفرام اسے دیکھا کرتا۔ یہ دیکھا دیکھی اور ناک جھانک آنحضرت میں بدل گئی۔ یہ بات جب زربینہ کے باپ کے کانوں تک پہنچی تو اس نے بیٹی سے پوچھ گچھ کی:

"زربینہ بیٹی۔ میں نے سنا ہے کہ سید امام کا لے پاک بیٹا تجھے آتے جاتے تاکتا ہے؟ کیا یہ سچ ہے؟"

زربینہ سناٹے میں آ گئی۔

اکیلی اولاد ہونے کی وجہ سے وہ باپ کی بہت منہ چڑھی بلکہ بیباک تھی مگر باپ کی زبان سے یہ الفاظ سن کر وہ پسینے میں نہ آئی۔

باپ نے کافی جواب نہ پایا تو پھر کہا:

"زربینہ! تو میری اکیلی اولاد ہے۔ تیری ماں کے مرنے کے بعد میں نے تیری ماں اور باپ دونوں کے فرائض ادا کیے ہیں۔ تیری کوئی بات سمجھی نہیں ٹالی۔ اگر غفرام کو تو اچھا سمجھتی ہے تو مجھے بتا دے میں اس سے تیری شادی کر دوں گا؟"

باپ نے بڑی معقول پیش کش کی تھی۔ زربینہ کو مان لینا چاہیے تھی مگر۔ بڑا ہوا اس نسواں حیا کا۔ زربینہ کی زبان باپ کے سامنے پھر بھی نہ کھل سکی اور وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہا حالانکہ اس کے دل میں لڑو پھوٹ رہے تھے۔

پھر

اس کی یہ مشکل اس کی ایک سہیلی نے حل کر دی۔

زربینہ کا باپ واپس جانے کو تھا کہ زربینہ کی رازدار ایک سہیلی گھر میں داخل ہوئی۔ زربینہ

"میری شادی سے پہلے میرے بابا نے بھی مجھ سے پوچھا تھا۔" بانو نے کہا۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ بانو کی ماں بھی بچپن ہی میں سرگئی تھی اور اس کے باپ نے بھی زربینہ کے باپ کی طرح دوسری شادی نہ کی تھی۔ اس طرح یہ دونوں بے ان کی پچھل آپس میں کھلتے کودتے جوان ہوئی تھیں۔

مگر اب زربینہ اکیلی ہو گئی تھی۔ ایک سال پہلے بانو رخصت ہو کے دوسرے شہر چلی گئی تھی۔ پھر وہ جب کبھی میکے آتی تو دونوں سہیلیاں مل بیٹھتیں پھر بچپن کے دن یاد کیے جاتے اور وہ گھنٹوں باتیں کیا کرتیں۔

زربینہ نے جواب دیا:

"تم نے ٹھیک اندازہ لگایا۔ بابا پوچھ رہے تھے کہ کیا مجھے خرا ما پسند ہے۔ میں شرم کے مارے انہیں کوئی جواب نہ دے سکی۔"

"اور وہ تیرے جواب کے لیے اب تک صبر کرنے میں انتظار کر رہے ہیں۔" بانو نے مسکرا کر

اسے چھیڑا۔

"بابا انتظار کر رہے ہیں؟"

زربینہ نے تعجب سے اس کی بات دہرائی:

"مگر وہ تو تمہارے آنے سے پہلے ہی چلے گئے تھے۔"

"وہ جا رہے تھے کہ میں آ گئی۔"

بانو نے اسے بتایا:

"انوں نے مجھ سے کہا کہ میں نے زربینہ سے ایک بات پوچھی ہے تم اس سے جواب لے کر

مجھے بتاؤ اور یہ کہ وہ صبر کرنے میں جواب کا انتظار کریں گے۔"

"ہائے بابا اب تک یہاں بیٹھے ہیں۔" زربینہ گھبرا گئی۔

"گھبرانے کی کیا بات ہے۔ جواب دو۔ تمہیں خرا ما پسند ہے کہ نہیں؟" بانو نے زربینہ کے

چنگی لے کر پوچھا۔

"پسند تو ہے مگر میں اپنے منہ سے کیسے کہوں؟" زربینہ کے ماتھے پر پسینے کے قطرے

چھک اٹھے تھے۔

"بس اب تمہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔" بانو نے ایک اور چنگی لی:

"میں تمہاری پسند بابا کو پہنچا دوں گی۔"

بانو اٹھ کے کھڑی ہو گئی۔

"کہاں چلیں۔ بیٹھنا؟" زربینہ نے اسے روکا۔

"تمہارے بابا انتظار کر رہے ہیں۔ میں انہیں جواب دینے جا رہی ہوں۔" اور بانو پیک

چھک کر تکی کمرے سے نکل گئی۔

زربینہ کا خیال تھا کہ بانو، بابا سے گفتگو کرنے کے بعد اس کے پاس واپس آئے گی لیکن

جب وہ دیر تک نہ آئی تو اس نے ملازم سے پوچھا۔

ملازم نے بتایا کہ:

"وہ تو ایک منٹ صاحب جی سے بات کر کے اپنے گھر چلی گئیں۔ صاحب جی بھی ان کے

بعد ہی چلے گئے تھے۔"

زربینہ اسی الجھن میں گرفتار تھی کہ بانو ہنستی ہوئی پھر داخل ہوئی۔

"لے مبارک ہو زربینہ۔ میں نے تمہاری پسند تمہارے بابا تک پہنچا دی ہے۔" اس نے

مسکراتے ہوئے بتایا۔

"اچھا۔" زربینہ نے دلچسپی سے پوچھا:

"بابا نے کچھ کہا تھا؟"

بانو منہ بنا کے بولی:

"تیرا تو دماغ خراب ہو گیا ہے سہیلی۔ وہ مجھ سے کیا کہتے۔ ہاں یہ ضرور کہا تھا کہ مشکل یہ ہے

کہ دونوں گھروں میں کوئی عورت نہیں ہے۔ شادی کی بات کس طرح چلائی جائے؟"

زربینہ فکر مند ہو گئی:

"اب کیا ہو گا۔ سید اما سے بات کون کرے گا؟"

"تو فکر کیوں کرتی ہے؟" بانو نے اسے تسلی دی:

"اس کا علی بھی میں نے سوچ لیا ہے۔"

"مجھے بھی بتاؤ۔ تم نے کیا سوچا ہے؟" زربینہ اس کے سر ہو گئی۔

بانو نے اسے بتایا:

"میں نے سوچا ہے کہ جس دن سید اما گھر آئیں تم مجھے بلو لینا۔ میں خود ان سے بات

کردی گی:

"تم نے میری شادی کی بات سیدام سے کر دی؟"

زرینہ نے جبران ہو کر پوچھا:

"تمیں شرم نہیں آئے گی؟"

"تم بالکل احمق ہو زرینہ۔ میں آخر شادی شدہ ہوں۔ تجھے بات کرنے کا سلیقہ ہے۔" بانو نے

جواب میں کہا:

"تم بس مجھے خبر بھیج دینا۔ پھر میں جانوں۔"

سیدام اور خزام دونوں دن بھر گھری پر رہتے تھے مگر ادھر کچھ دنوں سے شاید سیدام پر کام کچھ زیادہ پڑ گیا تھا اس لیے وہ دونوں صبح کو آپس میں ملتے۔ پھر سیدام سویرے ہی گھر سے نکل جاتا اور رات بھی بہت دیر سے واپس آتا۔

زرینہ اور پکی منزل میں چلی جاتی اور خزام کی طرف کھلنے والی کڑی میں بیٹھ جاتی ادھر خزام جیسا کامنہ بولا باب اب کم ہی اپنے ماتھے لے جاتا تھا۔ بھی پہلی منزل کے کمرے میں چلا جاتا۔ بس پھر دونوں کی نظریں ٹکراتیں اور اشاروں میں دل کی باتیں کرتی رہتیں۔

کہتے ہیں دو محبت کرنے والے اگر زبان سے بات نہ بھی کریں تو ایک دوسرے کا مطلب بخوبی سمجھ لیتے ہیں۔

یہ سلسلہ ایک ہفتے تک چلتا رہا۔

پھر ایک صبح ایسا ہوا کہ خزام کہیں جانے کے لیے گھر سے نکلا۔ اسی وقت سیدام باہر سے آ گیا۔ دونوں میں دروازے ہی پر گفتگو ہوئی۔ پھر خزام کہیں باہر چلا گیا اور سیدام گھر میں داخل ہوا۔

زرینہ کسی ایسے ہی موقع کی تلاش میں تھی۔ اس نے ملازمہ کو بھیج کے فوراً ہی بانو کو گھر بلوایا۔

"آج سیدام گھر میں ہیں؟" اس نے بانو کے داخل ہوتے ہی اسے اطلاع دی۔

بانو مسکرا دی اور بولی:

"تو اس قدر گھبراٹی ہوئی کیوں ہے۔ اپنی حالت تو سنبھال۔"

"تم جاؤ گی نہیں ان کے پاس؟ زرینہ بوکھلا کر بولی۔

بانو کو ہنسی آگئی:

"تو ایسے پریشان ہو رہی ہے جیسے کل ہی تیری شادی ہو جائے گی۔ ذرا سوچنے دے۔

سیدام سے کس ڈھنگ سے بات کر دی گی۔ میں ڈرتی نہیں لیکن یہ سلا موقع ہے غیر مرد سے

ات کر کے کا۔ پتہ نہیں کس دماغ کے ہیں بزرگ محترم۔"

بزرگ محترم نہیں۔ وہ تو اپنے آپ کو اب تک جوان ہی سمجھتے ہیں۔ زرینہ کے چہرے

پر مسکراہٹ بکھر گئی:

"گھر سے نکلتے ہیں تو دروازے پر رک کر اچھی طرح گپڑی کو سنبھال کے مر رہ جاتے ہیں

در اگر کوئی عورت آتے جاتے مل جاتے تو اسے کنکھوں سے دیکھتے ضرور ہیں۔"

"بہت تجزیہ کار معلوم ہوتے ہیں۔" بانو ہنسی۔

"بڑے لگاؤ ہیں۔ چار بیویاں کھلا چکے ہیں۔"

زرینہ جھک رہی تھی:

"اگر پانچویں مل جاتے تو اس سے بھی کم ہیں۔"

"ایسے تجزیہ کار تو بڑے اچھے جیون ساتھی ثابت ہوتے ہیں۔" بانو نے شرارت مسی

نظروں سے زرینہ کو دیکھا۔

زرینہ باتیں تو خوب بناتی تھی مگر تھی سیدھی سادی۔ وہ بانو کی بات کی تہ تک نہ پہنچ سکی اور

فوراً بولی:

"یہ بات تو تم نے سچ کہی۔ بوڑھے شوہر اپنی بیویوں سے پیار کر جتے بہت ہیں۔"

بانو اسی موقع کی تلاش میں تھی اس نے فوراً جملہ کہا:

"تو پھر کیا خیال ہے۔ تیرا پیغام خزام کے جلتے سیدام کے لیے نہ دے دے۔

بڑے عیش کرے گی بوڑھے کے ماتھے۔ جو بیاں بھر بھر محبت ملے گی تجھے اور۔"

"خدا کی مار تجھ پر۔"

زرینہ نے اسے دو ہتھکڑیاں سید کر کے کہا:

"تو یہ سوچ رہی ہے میرے لیے۔ سبیل ہے کہ میری دشمن۔ میں اس کھوسٹ کی داڑھی میں

آگ نہ لگا دوں۔ خدا غارت کرے اُسے۔

”ارے رے رے۔“ بانو نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا:

”اپنے ہونے والے خضر کو ایسا نہیں کہتے اس غریب نے تیرا کیا بگاڑا ہے!“

پھر بانو نے ایک ہلکا سا قہقہہ بلند کیا اور اس میں زرینہ کی آواز بھی شامل ہو گئی۔

بانو چلنے کے لیے تیار ہوئی تو زرینہ اسے ورداز سے ٹمک پہنچانے لگی۔

”خزنام بھی ہے گھر میں؟“ بانو نے ورداز سے سے نکلتے ہوئے پوچھا۔

”ہو نہ ہو۔ تمہیں کیا؟“ زرینہ چڑھ گئی:

”بات تو سید اماں سے کرنا ہے۔“

بانو مسکراتی ہوئی چل پڑی۔

مکان دُور ہی کتنا تھا۔ مرٹک کے ادھر زرینہ کا گھر اور اُدھر بالکل سامنے سید اماں کا رہا

تھا۔ گھر کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔

بانو بے دھڑک داخل ہو گئی۔

”کون ہے؟“ ورداز کے برابر ولے کرے سے آواز آئی۔ یہ کمرہ مہمان خانے کے

طور پر استعمال ہوتا تھا۔

”میں ہوں۔ سامنے کے مکان سے آئی ہوں۔“ بانو نے بھاری آواز سے اندازہ لگایا

یہ سید اماں ہی ہو سکتا ہے۔

وہ سید اماں ہی تھا۔ اس نے بھانک کے دیکھا:

”کس سے ملنا ہے تم کو؟“

”آپ سید اماں ہیں نا؟“

”اُہ۔ میں ہی سید اماں ہوں۔“

”بس آپ ہی سے ملنا ہے۔“

”مجھ سے۔“

اور پھر سید اماں نے دروازہ کھول دیا: ”آجاؤ اندر۔“

بانو بلا ٹمکے اندر چلی گئی۔

”بیٹھ جاؤ۔“

بانو ایک گدے دار کوچ پر بیٹھ گئی۔

”اب کو۔ کس لیے آئی ہو؟“ سید اماں حیران نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”آپ کے مکان کے بالکل سامنے میری ایک سینی رہتی ہے۔“

”رہتی ہوگی۔ پھر۔“ سید اماں نے الجھتے ہوئے کہا۔

”زرینہ نام ہے اس کا۔ بڑی سلیقہ شعار اور خوبصورت لڑکی ہے۔ دیکھا ہوگا آپ نے

میں اُسے۔“

بانو بہت سنبھل سنبھل کے بات کر رہی تھی مگر اصل مطلب زبان پر نہ آ رہا تھا۔ اس کے

یہ پہلا موقع تھا ایسی بات کا۔

سید اماں نے ایک انگلی سے سر کھمایا۔ پھر سوچتے ہوئے کہا:

”شاید دیکھا ہے۔ مگر پھر؟“

”دیکھا ہے آپ نے۔ یہ تو بہت اچھا ہوا۔ کیسی لگی آپ کو؟“ بانو کو یوں محسوس ہوا جیسے

وہ منزل کے قریب پہنچ گئی ہو۔

”اچھی ہے۔ خوبصورت ہے۔ مگر پھر؟“ سید اماں کا سوال اپنی جگہ برقرار تھا۔

”دیکھیے نا۔ آپ کا گھر کیسا سٹونا سٹونا ہے۔“

بانو نے کھٹنا شروع کیا:

”آپ نے چار شادیاں کیں۔ اللہ کی مرضی کسی سے اولاد نہ ہوئی۔ گھر کی دیرانی سے تو

آپ مزدور الجھتے ہوں گے؟“

”کیوں نہیں۔ بہت الجھتا ہوں۔ مگر پھر؟“

”پھر یہ کہ۔“

بانو ایک لمحے کے لیے رکی۔ پھر ہمت کر کے کہا:

”پھر یہ کہ اس گھر میں عورت آجائے تو کیا ہی اچھا ہو۔ گھر میں کسی نہ کسی عورت کا ہونا

بہت ضروری ہے۔ آپ چاہیں تو یہ گھر آباد ہو سکتا ہے۔“

”مگر کیسے۔ کوئی لڑکی ہے آپ کی نظر میں؟“

سید اماں کے دل میں لڈ پھوٹنے لگی:

”کیا تم اب تک کنواری ہو؟“

"میری بات چھوڑے۔ میری شادی ہو چکی ہے۔"  
بانو کھل کے بات کرنے لگی۔

"میں — میں جانتی ہوں زربینہ اس گھر میں آجائے۔ آپ نے تو دیکھا ہے اُسے؟  
"اچھا۔ تم اجنبی کی بات کر رہی ہو۔ وہ بھی ٹھیک ہے۔ خوبصورت ہے۔" سید امام  
مرثاری سر ہلایا۔  
"تو آپ زربینہ کو بیاہ کے لانے پر آمادہ ہیں؟" بانو نے اسے پکا کرنا چاہا۔  
"میں بالکل تیار ہوں مگر تم نے زربینہ سے بھی پوچھ لیا ہے؟" سید امام کا دل خوشی کے آ  
پٹیوں اچھل رہا تھا۔

"زربینہ کا میرا ذمہ۔"

بانو نے فوراً کہا:

"مگر آپ فخر امام کی مرضی معلوم کر لیجیے۔ دیکھیے نا۔ وہ آپ کا سکا بیٹا تو ہے نہیں۔ لے پا  
ہے۔ کیا بتیو وہ اس رشتے کو پسند نہ کرے۔ پوچھ لیجئے میں تو کوئی حرج نہیں۔"  
فخر امام کے نام پر سید امام جیسے ہتھ سے اکھڑ گیا۔ سخت الجھے میں بولا:  
"اس کی کیا مجال جو میری مرضی میں دخل دے۔ میرے ٹکڑ پر پڑا ہے۔ جب چاہوں!۔  
نکال باہر کروں۔ کیا پہلی شادیاں میں نے اس سے پوچھ کے کی تھیں جو آپ پوچھوں؟"  
"جی —" اور بانو گھبرا کے اٹھ کھڑی ہوئی۔  
"ہاں ہاں۔ اس کی کیا مجال کہ چوں بھی کر سکے۔"  
سید امام بڑے جوش سے بول رہا تھا:

"میں عزت داد آدمی ہوں۔ اللہ نے دولت سے مالا مال کیا ہے۔ دربار میں میری بات  
ہمیشہ اونچی رہتی ہے۔ مجھے اختیار ہے میں جس سے چاہوں شادی کروں۔ زربینہ کو اطمینان  
دلانا کہ گھر میرا ہے۔ فخر امام کو اس سے کوئی مطلب نہیں کہ میں کس سے شادی کرتا ہوں اور  
کسے گھر میں بساتا ہوں۔ میں آج ہی فخر امام کو یہاں سے چٹا کر دوں گا۔ نہ رہے گا بانس  
نہ بجے گی بانسری۔"  
"میں جاری ہوں۔" یہ کہتی ہوئی بانو کمرے کے دروازے پر پہنچ گئی۔ اس کے چہرے  
ہوٹیاں اڑ رہی تھیں۔

"ارے۔ ابھی بات تو پوری نہیں ہوئی؟"

سید امام بھی کھڑا ہو گیا:

"نکاح کب ہو گا۔ سو تو میں آج ہی قاضی کو بلا کر دو بول پڑھوا لوں۔ مجھے کسی چیز کی بھی  
مردت نہیں۔ ہاں یہ تو بتاتی حادثہ ہر گنا ہو گا۔ اگر زربینہ چاہے تو ہر کی رقم نقد بھی ادا  
کا جاسکتی ہے۔"

"ادب دے۔ تیرا دامغ تو نہیں چل گیا؟"

بانو دروازے سے نکلتے ہوئے بولی:

"چار بیویوں کو کھا چکا ہے۔ اب تک تیری نیت نہیں بھری۔ تو زربینہ کے باپ سے  
بھی بڑا ہے۔"

"یہ کیا بد تمیزی ہے۔"

سید امام اس کے پیچھے دروازے پر پہنچ گیا:

"خود ہی رشتہ لائی ہو اور خود ہی ناراض ہو رہی ہو؟"

"ہاں۔ میں رشتہ لاتی تھی۔"

بانو ٹرک پر پہنچی اور پلٹ کر کہا:

"مگر تیرے لیے نہیں۔ یہ پیغام تیرے بیٹے فخر امام کے لیے تھا بڑے۔ تو بیچ میں کہاں  
سے کو دڑا؟"

بانو تو ٹرک پار کر کے نکل گئی۔

مگر — سید امام جس کے سر کے آدھے سے زیادہ بال سفید ہو گئے تھے، وہ اس انکشاف  
سے ایسا پریشان ہوا کہ اس کا سر جھکایا اور وہ دھڑام سے دروازے پر گر پڑا۔ راگمروں  
نے اسے اٹھا کر اندر پہنچایا۔

زربینہ نے جب بانو سے بڑے میاں کی باتیں سنیں تو ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو گئی۔  
فخر امام اسی شام گھر سے نکال دیا گیا۔

اس کے پاس سامان ہی کیا تھا۔ ایک قبیلے میں دو جوڑے کپڑے۔ یہی اس کی کُل کائنات  
تھی اور بس!

فخر امام جب گھر سے نکل کر جا رہا تھا تو بانو نے اپنے شوہر کے ذریعے اسے اپنے گھر بلوایا

اور اسے تمام قصے آگاہ کر دیا۔

فخر امام کو کچھ باتیں تو منہ بولے باپ سے معلوم ہو گئی تھیں باقی باتیں اب معلوم ہوئیں۔ اسے اپنے منہ بولے باپ پر افسوس بھی ہوا اور غصہ بھی آیا۔ اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سید امام ایسی پست طبیعت کا مالک ہے کہ وہ دنیا کا ذلیل سے ذلیل کام کر سکتا ہے۔

پھر

اس کے دل میں سید امام کی محنت کی جگہ وطن کی محنت پیدا ہو گئی سلطان کا چہرہ اس کی نظروں میں گھوم گیا۔

دوسرے ہی لمحے وہ سلطان سے ملاقات کے لیے منگوار جا رہا تھا۔

فخر امام نے سلطان کے حضور پیش ہو کے بڑی رقت سے عرض کیا:

اے شاہ! تجھ پر خدا کی مار پڑی ہے کہ میں یہ نہیں جانتا کہ تجھے کس ماں نے پیدا کیا اور میرا باپ کون ہے۔

جب میں نے ہوش سنبھالا تو مجھے بتایا گیا کہ سرنگا پٹم کے سید امام نے مجھے تنہائی کیلئے اور میں اس کی لے پاگ اولاد ہوں۔

میں نے سنا تھا کہ لے پاگ اولاد کی بہت قدر ہوتی ہے کیونکہ وہ اصلی اولاد کا بدل ہوتی ہے لیکن سید امام نے مجھے دو وقت کی روٹی اور پرانے کپڑوں کے علاوہ کچھ نہیں دیا۔ یہ بات نہیں کہ وہ غریب ہے یا اس کا ناقص تنگ ہے۔ وہ سلطنت خداداد کا ایک بڑا خیر ہے مگر اس کی عیاشیاں حد سے بڑھی ہوئی ہیں۔ وہ گھر میں اور گھر کے باہر شراب و شباب کی محفلیں جاتا ہے اور ہمہ وقت بدکار عورتوں میں گھرا رہتا ہے۔

میں اس کی بدکاریاں اور ڈانٹ پھٹکار تو اب تک برداشت کرتا رہا مگر پچھلے سال میں نے سید امام کو ایک ہندو خیر سے گفتگو کرتے ہوئے سنا تو مجھے اپنے کانوں پر اعتبار نہ آیا۔ پھر میں اس کی ٹوہ میں لگ گیا۔

مجھے معلوم ہوا کہ یہ شخص ایک طرف تو سرکار سے تنخواہ لیتا ہے اور دوسری طرف ملک اور قوم سے غداری کے صلے میں اسے ہر ماہ ایک بڑی رقم حاصل ہوتی ہے۔

سید امام کا کام یہ ہے کہ دارا سلطنت میں ہونے والی سرکاری اور غیر سرکاری باتوں کی اطلاع انگریزوں کو بھیجتا رہے۔

ان لوگوں کا ایک باقاعدہ گروہ ہے جس میں لال خان بخشنی چکنور میر نظیر علی موکب داراؤ اس کا بھائی اسماعیل خان رسالدار وغیرہ شامل ہیں۔

چونکہ میں نے خاموشی اختیار کر رکھی ہے اس لیے یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ یا تو میں بے دھن ہوں یا بالکل پاگل ہوں۔ اسی لیے ان لوگوں نے مجھے بالکل نظر انداز کر رکھا ہے۔

مجھے یہ سب باتیں سلطان معظم کو بہت پہلے بتا دینا چاہیں تھیں لیکن میں سوچتا تھا کہ میرے پاس ان کا کوئی ثبوت نہیں پھر پتہ نہیں میری باتوں کا یقین کیا جائے یا نہیں۔

اب میں آپ کے سامنے حاضر ہوں۔ آپ مجھے جھوٹا سمجھیں یا سچا۔ مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے عرض کر دیا۔

جس وقت فخر امام نے سلطان کے سامنے یہ بیان دیا، سلطان کے پاس صرف چند سردار موجود تھے۔ سلطان نہایت توجہ سے فخر امام کا ایک ایک لفظ سن رہا تھا۔ پھر اس نے فوراً "نظر علی" اسماعیل اور لال خان کو گرفتار کرنے کا حکم دیدیا۔

سلطان پیشو کا کچھ ایسا رعب تھا کہ جب یہ لوگ گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیے گئے تو انہوں نے فوراً اقبال جرم کر لیا۔

سید امام کچھ مال منوں گروہ تھا لیکن جب اس کے سامنے فخر امام کو لایا گیا تو اس نے بھی فوراً جرم کا اقبال ہی نہیں کیا بلکہ اپنے گروہ میں شامل پندرہ مزید لوگوں کے نام بتا دیے۔ وہ تمام افراد بھی گرفتار کر لیے گئے۔

ان سب کو موت کی سزا دے دی گئی۔

ان میں سے ایک ہا سوس جس کا نام امام الدین تھا وہ کلار اور نندی گڑھ کے علاقہ میں تعینات تھا۔ اسے کہیں سے خبر مل گئی۔ وہ راتوں رات بھاگ نکلا اور ساگھر پہنچ کے دم لیا۔

اس سازش کے ختم ہونے پر سلطان نے فخر امام کو اپنا مقبضی بناتے ہوئے کہا: "خدا کی ذات سے ناامید نہ ہونا چاہیے فخر امام۔ خدا انسان کو آزاد پیدا کرتا ہے اور

اپنے اپنی زندگی کا راستہ چننے کا پورا اختیار دیتا ہے۔ اگر تم پہلے ہی ہمت کر کے ہیں اس سازش سے آگاہ کر دیتے تو تمہیں اتنے دن تکلیف نہ اٹھانا پڑتی۔"

اس کے بعد سلطان نے فخر امام اور زرینہ کی شادی کرادی اور فخر امام کو اپنے جاسوسی کے حکم میں ملازم رکھ لیا۔



پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ملیوار پر سلطان نے فوری میں حملہ کیا تھا۔ یہ حملہ اپریل ۱۷۹۰ء تک جاری رہا۔

اس میدان میں سلطان کے چھ ہزار سواروں کے سامنے راجہ دھرم راجہ کی ایک لاکھ فوج جنگ کر رہی تھی۔ پھر بھی راجہ کو پسپا ہونا پڑا۔

سلطان کے ساتھ فرانسسیسی سالار موسیو لال تھا۔ اسے سلطان نے گنگوڑی کی طرف بھیجا تاکہ وہ انگریزوں کی اس فوج کو رد کے جو بمبئی سے مدد گت کے لیے آئی تھی۔

راجہ دھرم راجہ ہر جگہ شکست کھانے کے بعد جنوب میں پسپا ہو گیا۔ مٹی کے آخر تک سلطان ٹراونکور کے محاذ پر پوری طرح حاوی ہو چکا تھا۔

اس زمانہ میں انگریزوں، مرہٹوں اور نظام ادکن میں سہ فریقی معاہدہ ہوا تھا جس کا مقصد سلطان کی طاقت کو ختم کر کے اس کی سلطنت کے حصے بخرے کرنا تھا۔ سلطان نے پسپا ہوتے ہوئے راجہ دھرم راجہ کا تعاقب نہ کیا اور نہ وہ اس سے آگے بڑھنا چاہتا تھا۔

انگریزوں نے سلطان کے ٹراونکور پر حملہ کے خلاف اسے ایک خط بھیجا تھا جس میں اس سے شکایت کی گئی تھی کہ ٹراونکور انگریزوں کا حلیف ہے اور سلطان اور انگریزوں میں بھی جنگ نہ کرنے کا ایک معاہدہ موجود ہے اس لیے سلطان نے ٹراونکور پر حملہ کر کے اس معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔

سلطان نے اس کے جواب میں جنرل انگلینڈ کو لکھا کہ :

ٹراونکور کے سپاہیوں کی نازیبا حرکات سے مشتعل ہو کر

سلطانی فوج نے ٹراونکور پر حملہ کیا تھا۔ اس سے اس معاہدے کو

توڑنا مقصود نہ تھا جو اس کے اور انگریزوں کے درمیان موجود ہے۔

جنرل انگلینڈ نے سلطان کے پاس تجویز بھیجی کہ سلطان اپنے دربار میں انگریز کشمروں کو

تعیینات کرنے کی اجازت دے۔ سلطان نے انگریزوں کی یہ تجویز بھی منظور کر لی تھی۔

مگر دوسری طرف۔

لارڈ کارنالس تو جنگ پر تلا بیٹھا تھا اور اب تو سہ فریقی معاہدہ بھی ہو گیا تھا اس لیے اس نے مدراس کے گورنر کو خط لکھا کہ :

"ٹیپو کے ان تمام خطوط کے جواب میں اُسے لکھا جائے کہ گنگوڑی

اور راجہ کوٹ، ولندیزیوں کے آزادانہ مقبوضات تھے۔ انہوں نے

راجہ کو جین کو کبھی خراج ادا نہیں کیا۔ انہیں یہ حق حاصل تھا کہ وہ ان

مقبوضات کو راجہ ٹراونکور یا کسی اور کو جسے وہ مناسب سمجھیں اس کے

ہاتھ فروخت کر دیتے۔

ٹیپو نے ٹراونکور کی سرحد پر خود حملہ کیا ہے اور اس حملہ اور فوج کا

وہ خود سپہ سالار ہے۔ راجہ کا بیس سال سے اس پر قبضہ تھا اور اسے

تسلیم کر لیا گیا تھا۔

ٹیپو کا یہ حملہ ایک مخاصمانہ قدم ہے جس نے ہمارے درمیان موجود

معاہدے کی خلاف ورزی کی ہے۔"

یہ خط موصول ہونے ہی جنرل میڈوز، مدراس سے ترچناپلی کی طرف روانہ ہو گیا جہاں اس کی فوج ڈیرے ڈالے پڑی تھی۔

جنرل میڈوز نے اپنے ترچناپلی آنے کی اطلاع سلطان کو پہلے ہی بھجوا دی تھی۔ جب وہ

ترچناپلی پہنچا تو اسے سلطان کا ایک خط ملا جس میں سلطان نے سلطنت خدا داد کی سرحد پر انگریزوں

کی فوج کے اجتماع کے خلاف سخت احتجاج کیا تھا اور اس بات کی خواہش کی تھی کہ وہ اپنے ایک

معتد کو ترچناپلی بھیجنا چاہتا ہے تاکہ وہ وہاں پر اپنی صفائی پیش کرے اور غلط فہمی کا

ہمو سکے۔

سلطان نے اس بات کی بھی خواہش کی تھی کہ دونوں حکومتوں کے درمیان خلوص و اعتماد

کی فضا پیدا ہوئی چاہیے۔

سلطان کے اس خط کے جواب میں جنرل میڈوز نے جو کچھ لکھا اس کے لفظ لفظ سے

غور و درنظر کیا گیا ہے۔ اس معزدر نے سلطان کو لکھا :



"آپ کا خط ملا۔ اس میں جو کچھ درج ہے میں اسے خوب سمجھتا ہوں  
آپ ایک عظیم الشان حکمران ہیں۔ آپ نے اپنے قیدیوں کے ساتھ  
جو سلوک روا رکھا ہے اگر اسے نظر انداز کر دیا جائے تو میں سمجھتا  
ہوں کہ آپ کا شمار روشن خیال فرمانرواؤں میں ہوتا ہے۔  
انگریز نہ کبھی برداشت کرتے ہیں اور نہ خود دوسروں کی  
توہین کرتے ہیں۔ ہماری آپ سے اسی دقت جنگ چھڑ گئی تھی جب  
آپ نے ہمارے حلیف راجہ پر حملہ کیا تھا۔ خدا تعالیٰ ہمیشہ زبردست  
ہی کو فتح عطا نہیں کرتا اور نہ ہی تیز رو ہمیشہ ددڑ میں جیتے ہیں بلکہ  
فتح و کامرانی کا انحصار عام طور پر عدل و انصاف پر ہوتا ہے اور اسی پر  
ہمارا اعتقاد ہے۔"

جنرل میڈوز مئی ۱۸۵۰ء کے آخری ہفتے میں تہ چٹاپلی پہنچا تھا۔ وہ فوج کی کمان سنبھالتے ہی  
سلطانی حدود میں داخل ہو گیا۔  
سلطان کو جب جنرل میڈوز کے حملہ کی اطلاع ملی تو وہ بھی اپنے لشکر کے ساتھ آگے بڑھا۔  
سنی منگل اور ہروڑ کے نواح میں دونوں لشکروں کا سامنا ہوا۔ ہر لشکر نے دوسرے پر بڑے چڑھ  
کے حملے کیے مگر فریقین میں سے کسی کو کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ سولے اس کے کہ انگریزوں نے  
پسپا ہوتے ہوئے بڑی چالاکي سے سنی منگل پر قبضہ کر لیا۔  
یہ تھا میسور کی تیسری جنگ کا آغاز۔

انگریزوں نے سلطان ٹیپو کے خلاف میسور کی تیسری جنگ کا آغاز کر دیا۔  
وہ اپنے اس اقدام میں کس قدر حق بجانب تھے، تاریخ اس کا جواب اس طرح دیتی ہے۔  
سرجان مالکم جو کارنوالس کا بڑا مداح تھا، لکھتا ہے:

کارنوالس نے اس عہد نامے کو منسوخ کر دیا جو ۱۷۸۲ء میں  
انگریزوں اور سلطان کے درمیان ہوا تھا۔ یہ معاہدہ بنگلور کے نام  
سے مشہور تھا۔

اس معاہدہ کی بجائے کارنوالس نے اس معاہدہ کو مستند قرار  
دیا جو ۱۷۸۸ء میں یعنی سولہ سال پہلے ہوا تھا۔ اس معاہدے میں  
نظام الملک، مرہٹے، سردار اور نوابین اودھ وادکاٹ اور راجگان  
تاجور اور ٹراونکور ایک دوسرے کے حلیف قرار دیے گئے تھے۔  
کارنوالس، سلطان کا نام نظر انداز کرنے میں حق بجانب نہیں تھا۔  
کیونکہ عہد نامہ بنگلور کے مطابق، سلطان کو انگریزوں کا حلیف مانا  
گیا تھا۔

یہ تو کارنوالس کے ایک مداح کا بیان ہے۔ اب کرنل وکس کا بیان "تاریخ میسور"

میں ملاحظہ ہو:

کارنوالس جیسے سیاست دان اور انصاف پسند انسان سے یہ امید نہ تھی کہ وہ منگلوں کے عہد نامے کی خلاف ورزی کرے گا۔ اس وقت مدراس کا گورنر مسٹر ہلینڈ تھا۔ کارنوالس نے اسے حکم دیا کہ وہ سلطان کے خلاف جنگی تیاریاں کرے اور سلطنتِ خدا داد کے خلاف صف آرا ہو جائے۔

مسٹر ہلینڈ نے اس حکم کے جواب میں کارنوالس کو تحریر کیا کہ سلطان ٹیپو کا ہماری قوم کے خلاف جنگ کرنے یا عہد نامہ منگلوں کو توڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔

کارنوالس نے ہلینڈ کے اس جواب سے اندازہ لگایا کہ ہلینڈ اس کے ڈھب کا آدمی نہیں ہے۔ اس لیے اس نے مسٹر ہلینڈ کو مجبور کر کے اس سے استعفیٰ لے لیا اور اس کی جگہ جنرل میڈوز کو مدراس کا گورنر مقرر کیا۔

خود سلطان ٹیپو نے بھی انگریزوں کو یقین دلایا تھا کہ وہ ان سے جنگ نہیں کرنا چاہتا اور نہ ٹراونکور پر حملہ کا اسے کوئی خیال ہے لیکن کارنوالس نے ٹراونکور کا بہانہ بنا کر جنگ شروع کر دی۔

کارنوالس کے دل میں سلطان ٹیپو کے خلاف جو بد ارادے تھے وہ اس کے اس خط سے بالکل بے نقاب ہو جاتے ہیں جو اس نے اپنے نئے گورنر مدراس، میڈوز کو لکھا تھا۔ جیسے مل کے مطابق اس خط کا مضمون اس طرح تھا:

”ہندوستان میں انگریز قوم کی عزت اور شہرت کو برقرار رکھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ہم سلطان ٹیپو سے بزدل رہا ہوں۔ نہ صرف بزدل رہا ہوں بلکہ اس کی طاقت کو موقع پا کر ختم کر دیں ورنہ اگر اسے فرانسیسیوں کی کمک حاصل ہو گئی تو پھر ہمیں ہندوستان کو خیر باد کہنا پڑے گا۔“

اس سلسلے میں صاحبِ نشانِ بیدری لکھتے ہیں:

۱۷۹۰ء میں جب سلطان نے پورے پاٹھ گھاٹ کو مسخر کر لیا

اور انگریز فوج جہازوں پر پناہ لینے پر مجبور ہو گئی۔ اس کے علاوہ ٹراونکور کے پورے علاقے پر سلطان کا قبضہ ہوتا دکھائی دینے لگا تو اس وقت دکن کے وزیر اعظم مشیر الملک نے ابو قاسم عرف میر عالم کو لکھتے بھیجا کہ گورنر جنرل کو سلطان کے خلاف جنگ پر آمادہ کرے۔

کارنوالس نے سازش شروع کی اور نظام دکن کو اپنے ساتھ لایا۔ دوسری طرف اسے بھونسلہ راجہ ناگپور سے خطرہ تھا کہ وہ کہیں روڑے نہ اٹھائے اس لیے اس نے جان فاسٹر کو بھونسلے اور مرہٹوں کا ارادہ معلوم کرنے کے لیے ناگپور بھیجا۔

اس وقت مرہٹے بلاوجہ سلطان سے جنگ کرنے پر آمادہ نہ تھے اس اطلاع پر کارنوالس نے جان فاسٹر کو دوسرا خط لکھا جس میں کہا گیا کہ کوئی ایسی صورت پیدا کی جائے کہ مرہٹے انگریزوں کے ساتھ مل جائیں۔

چنانچہ جان فاسٹر نے پھر کوشش کی اور مرہٹوں کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیاب ہو گیا۔ پھر اتحادِ تلاثہ (انگریز، نظام، مرہٹے) کا ایک باقاعدہ معاہدہ ہوا جس میں یہ طے پایا کہ سلطان کی روز افزوں بڑھتی طاقت کو ختم کر دیا جائے اور اس کے ملک کو تینوں طاقتوں میں مساوی طور پر تقسیم کیا جائے۔

اس معاہدے کے ہوتے ہی جنوری ۱۷۹۱ء میں کارنوالس لکھتے سے مدراس پہنچ گیا اور ایک ہی مہینہ کے اندر اس کی فوجیں بغیر اعلانِ جنگ کے سلطنتِ خدا داد کی حدود میں داخل ہو گئیں۔

نظام علی خان ۴۰ ہزار سوار اور ۲۰ ہزار پیدل، امراء و وزراء اور اپنے دونوں بیٹوں عالی جاہ اور سکندر جاہ کے ساتھ حیدرآباد سے چل کر آنگل میں خیمہ زن ہوا اور اپنے امیروں کو فوجیں دے کر سلطانی علاقوں پر قبضہ کے لیے روانہ کیا۔

دوسری طرف کارنوالس نے اپنی انگریزی فوج کے ساتھ موگلی گھٹا اور وٹکٹ گری عبور کر کے مبارکلی، کولار اور ہوسکوٹہ میں چوکیاں قائم کیں۔ وہاں سے وہ کرشنا راچپور پہنچا جو بنگلور سے صرف ۳ میل دور تھا۔

سلطان کچھ حلف سازشوں کے زبردست جال پھیلانے لگے تھے جن میں سلطان کے تقریباً تمام بڑے بڑے امیر اور وزیر شامل تھے۔ سلطان کو دشمنوں کی پیش قدمی کی کوئی خبر نہ دی جا رہی تھی۔ اسے حملہ کی خبر اس وقت ہوئی جب انگریز فوج بنگلور پر حملہ کے لیے پرتول رہی تھی۔ کرنل فلائیڈ کی تجویز نہ تھی کہ سواروں کو کو بھتور میں رہنے دیا جائے اور باقی فوج کو مستی ملگ کے محاذ پر لگادیا جائے۔

لیکن ایک دوسرا انگریز انفر کیپٹن آر جی بالڈ براؤن اس تجویز کا مخالف تھا۔ اس نے دلیل دی کہ ایک ایسے قلعے کی چھار دیواری میں خود کو مقید کرنا جو صرف بارہ پونڈ کے ایک گولے سے تباہ ہو سکتی ہے یہ زیادہ بہتر ہے کہ کھلے میدان میں ٹھہرا جائے۔ چنانچہ کیپٹن کی برائے قبول کی گئی اور تمام فوج کو بھتور میں ٹھہری رہی۔ پھر کرنل اسٹوارٹ بھی ان سے آگلا اور جنرل میڈوز نے بنگلور پر حملہ کا منصوبہ تیار کرنا شروع کر دیا۔

سلطان انگریزوں کی پیش قدمی کی خبر سن کر سرنگاپٹم سے نکلا اور ننگی پیچ کے قیام کیا۔ اس وقت انگریز فوج بنگلور سے صرف ۳ میل دور تھی۔

سلطان نے سید حمید سپہ سالار کو قلعہ بنگلور کی حفاظت کے لیے روانہ کیا۔ شیخ انصاری، بخشی محمد خاں اور بہادر خاں قندھاری کو قلعہ داری کی خدمت سونپی۔

ابھی نیچے اچھی طرح نصب نہ ہوئے تھے اور سلطان کی سواری کو ۳ ہزار سوار اور چار ہٹسے اسدالہی گھیرے ہوئے تھے کہ کرنل فلائیڈ نے ایک دستہ فوج کے ساتھ سلطان پر حملہ کر دیا۔ سلطان نے توپ خانے کو گولہ باری کا حکم دیا اور انگریز دستے پر اس قدر گولے برسے کہ وہ حواس باختہ ہو کر میدان چھوڑ بھاگا۔

اس جھڑپ میں کرنل فلائیڈ بھی زخمی ہوا۔ سلطانی سپاہ نے ۴۰۰ انگریز سپاہیوں کو گرفتار کر لیا۔ ان سپاہیوں کے پاس گھوڑے بھی تھے۔ اس جھڑپ کے نتیجے میں جنرل میڈوز ہاپس مدراس طلب کر لیا گیا۔

سفر بقی معاہدہ میں اگرچہ مرہٹے برابر کے فزین تھے لیکن اس جنگ میں انہوں نے کوئی خاص مرگرمی نہ دکھائی۔ شاید ان کی افرادی قوت کم ہو گئی تھی۔ مرہٹوں کی طرف سے صرف ایک سردار پرورام بھاؤ انگریزوں کی حمایت میں سلطنت خداداد پر حملہ آور ہوا۔

مرہٹوں کی اصل کمان کیپٹن رسل کے ہاتھ میں تھی۔ وہ پندرہ ہزار مرہٹہ فوجیوں کے ساتھ دریائے کرشنا پارکر کے قلعہ دھاروار پر قابض ہو گیا۔

انگریز فوج پہلی مرتبہ مشرقی گھاٹ میں آئی تھی۔ اس وقت سلطان پاٹن پجری کے علاقہ میں فرانسیسیوں کے ساتھ گفتگو کر رہا تھا لیکن فرانسیسی کمانڈر نے کارنوالس کو یقین دلایا تھا کہ اس کے اور سلطان کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہے اس لیے وہ سلطان کو ملگ مہیا نہیں کرے گا۔ اس مقام پر سلطان کو اطلاع ملی کہ کارنوالس ویلور پہنچ گیا ہے سلطان نے بھی ویلور کا رخ کیا مگر کارنوالس وہاں سے بنگلور کی طرف نکل گیا۔

کارنوالس کے پاس اس وقت بے تحاشہ فوج تھی اس کی فوج میں پہلی بار ۲۰۰ ہاتھی بھی شامل ہوئے تھے جو اوودھ سے اسی مقصد کے لیے بلائے گئے تھے۔ اس کے علاوہ کثیر تعداد میں ساز و سامان اور ۲۰ ہزار سامان لے جانے والے چھکڑے اور تل بھی اس کے پاس پہنچ گئے۔ پھر وہ اس تمام لاڈ لشکر کو لے کر بنگلور پہنچا۔

انگریزوں نے اپنی ہر منزل پر دہشت گردی اور لوٹ مار کا بڑے پیمانے پر مظاہرہ کیا کارنوالس نے لشکر کو حکم دیا کہ وہ خوف و دہشت پھیلانے تاکہ لوگ اس قدر ہراساں ہو جائیں کہ سلطان کی مدد نہ آئیں۔

پھر وہاں سے کارنوالس کو لار پہنچا۔ اس جگہ حیدر علی خاں کا پرانا مقبرہ تھا۔ تیسرے دن انگریزی فوجیں بنگلور سے دس میل پر آ کر خیمہ زن ہوئیں۔ اس جگہ سے بالکل قریب سلطان کا لشکر موجود تھا۔ اگلے دو دنوں میں انگریز بنگلور کی تفصیل تک پہنچ گئے۔

اب قلعہ پر حملہ شروع ہوا۔ کرنل مورس اور جنرل میڈوز نے تفصیل پر سخت حملہ کیا۔ محصورین نے پوری طاقت سے

مدافعت کی۔ ہزاروں آدمی مارے گئے۔ ان مرنے والوں میں کرنل مورس بھی تھا۔  
دو ہفتہ تک انگریزی فوجیں قلعہ پر شدید گولہ باری کرتی رہیں۔ اس کے سبب شہر کی  
نقصیں ٹوٹ گئی۔

سلطان نے قمر الدین کو حکم دیا کہ وہ اپنے لشکر کے ساتھ قلعہ والوں کی مدد کرتا رہے لیکن  
جب دشمن کی گولہ باری سے قلعہ کا حصار بھی گر گیا تو سلطان نے قلعہ خالی کرنے کا حکم دیا۔ اس وقت  
کشن راؤ قلعہ کے اندر گیا اور تمام مال و اسباب اٹھا کر دارالسلطنت مرزا کا پٹم بھجوا دیا۔ صرف  
تھوڑی سی فوج قلعہ کے انتظام کے لیے چھوڑ دی گئی۔

کشن راؤ سلطان پٹو کا وزیر خزانہ (میر بخش) اور ایک قابل اعتماد وزیر تھا مگر اس  
کم بخت نے انگریزوں کو ایک خفیہ پیغام بھیجا کہ قلعہ پر قبضہ کرنے کا یہ بہترین موقع ہے۔  
قارئین!

اس کشن راؤ کو یاد رکھیے۔ اس لیے کہ یہ ایک بڑی زبردست سازش کا مرکز تھا جسکے  
اداریہ دل سے سلطان کے آگے پیچھے بھرتا تھا۔ اس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آئے گا۔

مارچ کے آخری عشرے میں انگریزوں نے رات کے وقت قلعہ پر آخری کاری ضرب لگائی۔  
خندق پار کر کے قلعہ کے دروازے پر شدید حملہ ہوا۔

یہاں سید حمید سیدہ دار اور دوسرے بہادروں نے وہ جو ہر شجاعت دکھائے کہ انگریزوں  
کے دانت کھٹے ہو گئے۔ مگر انگریز دوسری سمت سے نقصان پہ چڑھ گئے۔ اب دست بدست  
جنگ شروع ہو گئی۔

قلعہ والے ایک جگہ جم کے کھڑے ہو گئے اور جب تک ان کی تمام کی لاشیں نہ لگ گئیں  
وہ وہیں کھڑے رہے۔

جب لاشوں کا شمار کیا گیا تو وہ ایک ہزار سے زیادہ تھیں جو صرف ایک مقام پر پائی  
گئی تھیں۔

محصورین کے بیوی بچوں کو گرفتار کر لیا گیا اور ایک بیان کے مطابق انگریزوں نے ان کے  
ناموس کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا۔

یہ وقت ایسا تھا بلکہ غداروں اور سازشیوں نے سلطان کے لیے ایسے حالات پیدا کر دیے  
تھے کہ وہ قلعہ سے صرف چند میل دور ہونے کے باوجود محصورین کی مدد نہ کر سکا۔

انگریز لشکر قلعہ پر قبضہ کے بعد ماگڑی کے جنگل میں خیمہ زن ہو گیا تھا۔ اب انگریزوں  
اور سلطان میں آنکھ پھولی قسم کی جنگ شروع ہو گئی۔ یہ جنگ سے زیادہ جھڑپھاڑ تھی مگر کونوالس  
کو جلد ہی محسوس ہو گیا کہ سلطان اس کے لشکر کا دم ختم کرنا چاہتا ہے تاکہ پھر پلٹ کر ایک  
بھر پور حملہ کرے اور انہیں عبرت ناک شکست سے دوچار کر دے۔

انگریزوں نے سلطان کو اپنے سامنے لانے کے لیے مرزا کا پٹم پر حملہ کا پروگرام بنایا اور  
وہ لشکر لے کر منگلور سے شمال مشرق کی سمت روانہ ہوا۔ کونوالس چاہتا تھا کہ وہ نظام کے  
لشکر سے مل جائے۔ پھر رسد حاصل کرے اور تازہ دم آنے والی فوج کو ساتھ لے لے۔

بنگلور پر انگریزی قبضہ کے سلسلے میں محمود بنگلوری کا بیان بھی قابل توجہ ہے۔ اس لیے  
کہ اس مؤرخ کا تعلق اسی شہر سے تھا۔ اس نے بنگلور پر انگریزی فوج کے قبضہ کو اس طرح  
بیان کیا ہے:

دوسرے دن کرنل مورس اور جنرل میڈوز نے بنگلور پر حملہ کر  
دیا۔ اس معرکہ میں طرفین کے کئی ہزار آدمی کام آئے۔ کرنل مورس  
بھی اسی جنگ میں مارا گیا۔

انگریزی فوج دو ہفتہ تک حصار قلعہ توڑنے میں مصروف  
رہی۔ آخر دیوار ٹوٹ گئی اور نیک حرام کشن راؤ کی سازش سے انگریزوں  
کو قلعہ میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔

کشن راؤ بنگلور میں سلطانی معتمد کے ہندہ پر مامور تھا اور قلعہ کے اندر کی رقی رقی خبریں  
انگریزوں کو پہنچاتا تھا اور انگریز ان کے مطابق تدابیر کر لیا کرتے تھے۔

سید حمید سیدہ دار اور قلعہ دار دروازے کے سامنے مدافعت کرتے ہوئے شہید ہو گئے۔  
اور شیخ انور سیدہ دار امیر ہو گیا۔ قلعہ کے تمام رہنے والے گرفتار کر لیے گئے۔ شہر لوٹا گیا اور  
بے شمار جواہر و زیورات انگریزوں کے ہاتھ آئے۔

یہ خبر جب سلطان کے حضور پہنچی تو میر قمر الدین اور سید صاحب نے دست بستہ  
ایک ساتھ عرض کیا:

سلطان معظم۔ ہمیں انگریزوں پر حملہ کرنے کی اجازت عطا فرمائی جائے تاکہ ہم سپہ دار اور قلعہ دار کے خون کا انتقام لے سکیں۔

سلطان نے جواب میں فرمایا:

جب وقت ہاتھ سے نکل چکا، تو تیرہ سپاہ کی طاقت کو منتشر کرنا ٹھیک نہیں ہوتا۔ سلطان کو ابھی تک یہ معلوم نہ ہوا تھا کہ اس شکست کی وجہ ایک گھری سازش ہے ورنہ ممکن تھا کہ سلطان اسی وقت بنگلہ پور پر حملہ کر دیتا۔

سلطان نے نواح ماگڑی میں قیام کیا۔

اس کے چوتھے روز انگریزوں نے تین ہزار ہندوستانی سپاہی اور چھ سو گورے قلعہ کی حفاظت کے لیے پھوڑے اور دیوں ہلی کے قریب کیمپ لگایا۔

دیوں ہلی کا قلعہ دار بھی اس سازش میں شریک تھا اس لیے بغیر کسی جنگ کے قلعہ دیوں ہلی انگریزوں کے قبضہ میں آ گیا۔

انگریز ہاں سے چک بالا پور پہنچے اور اس پر قبضہ کر لیا۔

چک بالا کوٹ قدیم وقتوں میں رام سوامی گوڈھ کے پاس تھا۔ کارنوالس نے ایک لاکھ روپے کے عوض چک بالا کوٹ اس کے آئین مالک کو دے دیا۔

کارنوالس نے یہ قدم اس لیے اٹھایا تاکہ میسور کے پرانے حاکموں میں یہ خبر پھیل جائے کہ انگریز سلطان سے علاقے واپس لے لے کر ان کے داروں کے حوالے کر دے رہے ہیں۔

کارنوالس کے اس اقدام سے واقعی پرانے دارشین پر بہت اثر ہوا۔ انہوں نے سلطان کے خلاف پورے ملک میں بغاوت کی آگ کو اور زیادہ بھڑکانا شروع کر دیا۔

سلطان انگریزوں کے تعاقب میں بالا پور کی طرف روانہ ہوا۔ بالا پور کے لوگوں کو مارتیوں نے پہلے ہی بھڑکا دیا تھا۔ چنانچہ جب سلطان کا ہراول دستہ بالا پور کے قریب پہنچا تو وہاں کے باشندوں نے سلطان کو بھڑانے کے لیے کتوں کی طرح بھونکنا شروع کر دیا اور بعض لوگوں نے جنگلی بگل بجانا شروع کر دیے۔

سلطان کو ان لوگوں کے اس ناشائستہ رویے پر سخت غصہ آیا اور اس نے لشکر کو حملہ کا حکم دے دیا۔

اس لڑائی میں دو ہزار آدمی مارے گئے اور ۳۰۰ پیادوں کو گرفتار کر کے سلطان کے

سامنے پیش کیا گیا۔ سلطان نے لوگوں کو عبرت دلانے کے لیے ان سب کے ہاتھ پیر کاٹنے کا فرمان جاری کر دیا۔

سلطان اب تک کشن راؤ کی غداری سے بے خبر تھا اس لیے اس نے کشن راؤ کو مرنگا پٹم کے انتظام کے لیے بھیج دیا اور خود بالا پور کی فوج کے بعد منگڑ سے ہوتا ہوا ویکٹ گری کوٹ کے مقام پر پہنچا اور انگریز لشکر کے سامنے خیمہ زن ہوا۔

صبح کو سلطان حملہ کی تیاری کر رہا تھا کہ مرنگا پٹم سے ایک تیز رفتار قاصد اس کے پاس پہنچا اور سلطان کی والدہ ماجدہ کا ایک خط ان کے حوالے کیا۔ اس خط میں ایک نئی سازش کا انکشاف کیا گیا تھا۔

اس مختصر مگر اہم خط میں درج تھا:

کشن راؤ نے کھانڈے راؤ مردود کی طرح فتنہ اور بغاوت کا جال بچھایا ہے اور ہمیشی سے ایک لشکر کثیر آنے والا ہے۔ قلعہ کے اندر ہم سب موت کے منہ میں بیٹھے ہیں۔ تم سب سے پہلے دار السلطنت کی خبر لو ورنہ پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔

سلطان نے خط کے مندرجات سے آگاہ ہونے کے بعد انگریزوں پر حملہ کرنے کا منصوبہ معطل کر دیا اور اسی روز سید صاحب کو ایک لشکر کثیر کے ساتھ دار السلطنت کے انتظام اور کشن راؤ کو اس کے انجام تک پہنچانے کے لیے مرنگا پٹم روانہ کر دیا۔ اگر سلطنت خدا داد کے ظلع ہونے والی سازشوں کو شمار کیا جائے تو نمبر کے اعتبار سے یہ آٹھویں یا نویں سازش ہوتی ہے۔

اس سازش میں بھی ہندوؤں کے علاوہ راج محل کی رانیوں، خصوصاً رانی لکشا کا پورا ہاتھ تھا۔ مگر ان کے خلاف کوئی ثبوت نہ مل سکا۔

اس سازش کی تفصیل پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام سازشوں میں ایک ہی منصوبہ بنایا جاتا رہا تھا کہ مرنگا پٹم میں موجود مسلمان افسروں کو قتل کر کے قلعہ پر قبضہ کر لیا جائے۔ ان سازشوں میں ایک بات کی اور یکساںیت پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ ہر منصوبے کو کسی نہ کسی

زمینداروں یعنی پالیگاروں کو ان کی خود مری کی وجہ سے سلطان نے معزول کر دیا تھا۔ ہر سازش کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ مرنگا پٹم پر قبضہ کر کے راجہ اوڈیر کی حاکمیت بحال کی جائے اور میسور پہلے کی طرح پھر ایک ہندو ریاست بن جائے۔ مرنگا پٹم دارالسلطنت تھا۔ سلطان اور اس کا پورا شاہی خاندان یہیں رہتا تھا۔ مرنگا پٹم کی حفاظت کے لیے قلعہ کو مضبوط کیا گیا تھا اور قلعہ دار اور سپہ سالار عام طور پر مسلمان مقرر کیے جاتے تھے۔ سپہ دار یعنی قلعہ کے دروازوں کے محافظوں کا سردار بھی عام طور پر مسلمان ہی ہوتا تھا۔

کشن راؤ جب تک معتمد سلطانی رہا اسے سلطان کے ساتھ ساتھ رہنا پڑتا تھا اور وہ سوائے سلطان کے دشمنوں یعنی انگریزوں کو خبریں پہنچانے کے اور کوئی عملی قدم نہیں اٹھا سکتا تھا۔ دشمن کو خبریں بھیجنا بھی بڑی اہمیت رکھتا تھا اور اس بنا پر انگریز اپنے لشکر کو ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کرتے وقت احتیاط برتتے اور ان راستوں کو استعمال نہ کرتے جن کے بارے میں ان کو اطلاع دی جاتی کہ ادھر سلطانی فوجیں گھات لگائے بیٹھی ہیں۔

مگر اب —

جبکہ کشن راؤ مرنگا پٹم پہنچ چکا تھا اور اسے دارالسلطنت کی دیکھ بھال کا کام سونپا گیا تھا تو اس کے اختیارات میں پہلے سے کہیں زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ پس اس نے مرنگا پٹم پہنچنے ہی اپنے مذموم ارادوں کو عملی جامہ پہنانے کی کوششیں شروع کر دیں۔ کشن راؤ اگرچہ قلعہ دار نہ تھا لیکن اب اس کے اختیارات گورنر جیسے تھے اور وہ شہر اور قلعہ کے تمام سول محکموں کا سربراہ تھا۔

کشن راؤ نے اپنا دفتر اپنے محل ہی میں بنایا تھا۔ یہ دراصل ایک پرانی حویلی تھی جیسے اس نے معتمد سلطانی ہونے کے بعد ایک محل میں تبدیل کر دیا تھا۔

اب اس کے اختیارات لا محدود تھے۔ مرنگا پٹم کے تمام مسلمان افسر ایک طرح سے اس کے ماتحت تھے اور اس کی کسی صورت مخالفت لینے پر آمادہ نہ ہوتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ اگر کشن راؤ نے کسی کی شکایت سلطان تک پہنچا دی تو اس کی ملازمت فی الفور ختم ہو سکتی ہے۔

کشن راؤ ایک عیاش طبع اور شرابی افسر تھا۔ عیاش طبع اس لیے کہ مرنگا پٹم کی سرزمین پر

عورت نے افشا کیا تھا۔ اس سازش کا انکشاف بظاہر سلطان کی والدہ کی طرف سے ہوا لیکن انہیں اس سازش کی خبر بخشاؤر نامی ایک کینز زادی نے دی تھی۔ تمام تواریخ میں بخشاؤر نامی کینز کی زادی کا ذکر موجود ہے اس لیے اس کے نام میں کسی شبہ کی گنجائش نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ بخشاؤر کے گرد جو کہانیاں بچی گئی ہیں ان میں کچھ سناہ اختلاف ہے مگر یہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ بخشاؤر نے جان پر کھیل کے جو قدم اٹھایا اس کے پس منظر میں بھی عشق خانہ خراب کی سرشاریاں موجود تھیں۔

کشن راؤ معتمد سلطانی کی بغاوت اور بغت اور کی دلیری یہ کہانی اس طرح بیان کی گئی ہے کہ جب سلطان نے قلعہ سنگپور کے قبضہ کے دوران اپنے معتمد اور وفادار وزیر کشن راؤ کو مرنگا پٹم کے انتظام کے لیے دارالسلطنت بھیجا تو کشن راؤ کو کھل کھیلنے کا موقع مل گیا۔ کشن راؤ ان سازشوں میں شامل تھا جنہیں انگریزوں نے لاپچھے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ یہ تمام لوگ بظاہر سلطان کے بہادر اور وفادار تھے مگر دراصل انگریزوں کو تمام خبریں پہنچاتے اور درپردہ ان کے لیے رسد وغیرہ کا انتظام کیا کرتے تھے۔

کشن راؤ جسے کشن راؤ بھی لکھا گیا ہے، کے گروہ میں سوامی گورڈ، وینکٹ ناٹر، جوگی پنڈت ناٹ صوبے دار ارکاٹ، ہرپن ہلی اور رائے درگ کے پالیگار پیش پیش تھے۔ انگریزوں نے بالا پور خورد فتح کر کے ایک لاکھ سالانہ کے عوض رام سوامی گورڈ کے حوالے کر دیا تھا کہ یہ شخص اس علاقے کے اولین وارثوں میں سے تھا۔

یہ علاقہ حاصل ہوتے ہی اس نے اپنے خرچ پر اور اپنے آدمیوں کے ذریعے سلطان کے خلاف دوروز دیک بغاوت کا زہر پھیلا نا شروع کر دیا۔

جوگی پنڈت ریاست میسور کے تمام مندروں کے بڑے پنڈتوں کا نمائندہ تھا۔ یہ پنڈت رائی کشما کے اشارے پر میسور کو مسلمانوں سے واپس لے کر وہاں پرانی ہندو ریاست قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ جوگی پنڈت مذہب کی آڑ میں سلطان کے خلاف پروپیگنڈہ کرتا تھا۔ وینکٹ ناٹر، ناٹراؤم کا ایک بڑا سردار تھا اور ناٹروں کی حکومت بنانے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

ہرپن ہلی اور رائے درگ کے علاقے چھوٹی چھوٹی زمینداروں پر مشتمل تھے اور ان کے

ایک ہندو ریاست قائم ہونے کی وجہ سے دہلی عہد قدیم ہی سے عیاشی کا دور دورہ رہا تھا۔ ہندو  
پیٹت اور پروہت، مذہب کی آڑ میں بکشتو عورتوں کے ساتھ، مندروں کی اندھیری کو ٹھٹھیلیں  
کو اپنی عیاشیوں سے روشنی اور رونق بخنتے تھے۔ شراب ان کے مذہب میں عام تھی۔ اسلامی  
حکومت قائم ہونے کے بعد بھی حیدر علی خاں یا سلطان ٹیپو نے ہندوؤں کے لیے شراب نوشی  
کو منع قرار نہیں دیا تھا۔

شراب کو اتم انجائٹ کہا گیا ہے یعنی شراب تمام برائیوں کی ماں ہے۔

کشن راؤ کی بیوی اگرچہ کم عمر اور بہت زیادہ حسین اور وفادار تھی لیکن جسے عیش و عشرت کا  
چمکے پڑ گیا ہو وہ فرشتہ صفت بیوی کی کب پروا کرتا ہے۔

کشن راؤ کو کشش کرتا تھا کہ اس کی سیاہ کاریوں پر پردہ پڑا رہے اس لیے وہ کسی نوٹ  
کو گھر نہ بلاتا تھا لیکن جب اس کے یہاں دوستوں کی دعوت ہوتی اور اس میں سرنگا پٹم اور دوسرے  
مقامات کے بڑے بڑے ہندو امرا مدعو ہوتے تو اسے ان کی خاطر داری کے لیے شراب و  
شباب کا انتظام کرنا پڑتا تھا۔

کشن راؤ کی شادی کو چار سال گزر چکے تھے مگر ابھی تک وہ اولاد کی نعمت سے محروم  
تھا۔ ادھر کچھ دنوں سے امید ہو چلی تھی کہ شاید وہ باپ بن جائے۔

یوں تو آئے دن اس کی بیوی کو دیکھنے ایک نہ ایک دائی آیا ہی کرتی تھی لیکن اس کے  
خاندان والوں نے اسے مجبور کیا تھا کہ مادر ملکہ یعنی سلطان کی والدہ محترمہ سے درخواست کرے  
کہ وہ شاہی دائی کو اجازت دیں کہ وہ کشن راؤ کی بیوی کو دیکھنے آئے۔

چنانچہ کشن راؤ نے ایک دن مادر ملکہ کے حضور پیش ہو کر عرض کیا:

"عالی مقام مادر ملکہ۔ میں اپنی اور اپنی بیوی کی طرف سے درخواست کرتا ہوں کہ بختاؤر کی  
ماں کو ایک بار میری بیوی کو دیکھنے کی اجازت دی جائے!"

شاہی دائی کا اصل نام گلاب تھا لیکن وہ پورے سرنگا پٹم میں بختاؤر کی ماں کے نام سے  
مشہور تھی۔ بختاؤر، گلاب کی اکلوتی بیٹی تھی اور ماں کے ساتھ امیروں اور وزیروں کے عیالات  
اور حویلیوں میں بچہ کی پیدائش کے وقت جایا کرتی تھی۔

مادر ملکہ کو معلوم تھا کہ کشن راؤ کی بیوی ان دنوں امید سے ہے۔ کشن راؤ نے اپنی  
بیوی کو دار السلطنت کی ہر دائی کو دکھایا تھا اور سب نے اسے یقین دلایا تھا کہ وہ واقعی باپ

بننے والا ہے لیکن کشن راؤ کو کسی طرح یقین ہی نہ آ رہا تھا اور آخر خاندان والوں کے کہنے سے  
ہر راج وہ بختاؤر کی ماں کو لینے آیا تھا۔

اسے یقین تھا کہ اگر گلاب نے بھی وہی کہا جو سب دایاں کہہ رہی ہیں تو پھر اس بات  
میں واقعی کوئی شک نہیں ہے کہ وہ باپ بننے والا ہے۔

بختاؤر کی ماں ایک نہایت پختہ کار دائی تھی۔ خاندانی دائی ہونے کی وجہ سے اس کا  
تقریباً ہر عمل اور بڑی حویلی میں جانے کا اتفاق ہوتا تھا اور تمام بیگمات اسے بڑی قدر و منزلت  
کی نظر سے دیکھتی تھیں۔ یہاں تک کہ ہندو رانیاں بھی ایسے موقعوں پر اسی کی خدمات حاصل  
کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔

مادر ملکہ، بختاؤر کی ماں کو مسلمان امیروں کے گھر تو بھیج دیا کرتی تھیں مگر راج محل یا دوسرے  
ہندو افسروں کے گھروں میں بھیجنے پر وہ ناک بھوں چڑھاتی تھیں۔

کشن راؤ بھی ہندو تھا مگر اس کی حیثیت مستند سلائی کی تھی اور اب وہ سرنگا پٹم کا گورنر  
ہو کے آیا تھا۔

مادر ملکہ انکار نہ کر سکیں۔ انہوں نے مصنوعی مسکراہٹ کے ساتھ کہا:

"کشن راؤ! گورنر نہیں۔ میں معلوم ہے سلطان ٹیپو تمہارا کس قدر خیال رکھتا ہے۔ تمہیں  
جب ضرورت پڑے بختاؤر کی ماں کو بلو لینا۔ میں کوئی اعتراض نہیں!"

مادر ہریان! "

کشن راؤ نے جلدی سے کہا:

"میں تو شاہی دائی کو لینے آیا تھا۔ میری بیوی کو اس وقت اس کی ضرورت ہے۔ آپ  
اجازت مرحمت فرمائیے۔ عین نوازش ہوگی!"

مادر ملکہ کو کشن راؤ کا بختاؤر کی ماں کو دائی "کنا کچھ ناگوار گذرا۔ انہوں نے تنبیہ کے  
لہجے میں کہا:

"کشن راؤ! ہم بختاؤر کی ماں کو تمہارے ساتھ بھیج رہے ہیں لیکن خیال رہے کہ تم اسے  
بختاؤر کی ماں ہی کہنا۔ دائی مت کہنا۔ شاید اسے برا لگے!"

کشن راؤ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا۔ وہ بولا:

"مادر ملکہ۔ مجھے اپنی غلطی پر افسوس ہے۔ اب ایسی غلطی ہرگز نہ ہوگی!"

مادر ملکہ نے کینز بھیج کے بختاورد کی ماں کو بلوایا۔  
"کشن راڈ۔ تم تو جنگ کے علاقے سے آئے ہو"

مادر ملکہ نے اس دوران اس سے پوچھا:  
"وہاں کا کچھ حال سناؤ۔ سنا ہے کہ بدلیسی قوم بڑی مکار ہے۔ وہ ہمارے سپاہیوں کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھاتی ہے۔"

"مادر ملکہ!"

کشن راڈ بڑے پرجوش لہجے میں بولا:  
"سلطان معظم کے اقتدار کی قسم۔ انگریز قوم واقعی بہت دھوکے باز ہے مگر سلطان اس کی ایک نہیں چلنے دیتے اور سلطان شکر کا تو کوئی مقابلہ کر ہی نہیں سکتا۔"  
"ہوں۔ ہوں۔"

ضعیف العمر مادر ملکہ نے سر ہلایا:

"خدا سلطان کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔"  
اسی وقت بختاورد کی ماں آگئی۔ اس کے آگے آگے بارہ تیرہ سال کی ایک چھوڑی چلتی کودتی چلی آ رہی تھی۔

"سلام بڑی ملکہ!" بختاورد نے قریب پہنچ کے ماں سے پہلے مادر ملکہ کو سلام کیا۔ بختاورد کی ماں، مادر ملکہ کو سلام کر کے خاموش کھڑی ہو گئی۔  
"بختاورد کی ماں!"

مادر ملکہ نے متین لہجے میں کہا:

"یہ ہیں کشن راڈ۔ سلطان نے انہیں سرنگا پٹم کا گورنر بنا کے بھیجا ہے۔ تمہیں ان کی بیوی کو دیکھنا ہے۔"

پھر وہ ذرا رک کے بولیں:

"یہ خیال رکھنا کہ کشن راڈ کو باپ بننے کی بہت آزدہ ہے۔ شادی کو برسوں ہو گئے ہیں مگر اب تک اولاد کو ترس رہے ہیں۔"  
"ٹھیک ہے مادر ملکہ۔ میں سمجھ گئی!" بختاورد کی ماں نے ملکہ مادر کی بات کے جواب میں ادب سے کہا۔

"میں بھی جاؤں گی ماں!" بختاورد نے اچانک دخل دیا۔

"چپ ہو جا بختاورد۔" ماں نے اسے ہلکے سے ڈانٹا:

"بیچ میں نہیں بولا کرتے۔"

"ڈانٹ کیوں رہی ہوں۔ میں نے کوئی بُری بات کی ہے۔"

اور — بختاورد نے منہ پھلایا۔

مادر ملکہ نے کشن راڈ سے دریافت کیا:

"تم سواری لے کے آئے ہو کیا؟"

"جی مادر ملکہ۔" کشن راڈ نے جواب دیا:

"سواری میرے ساتھ ہے۔"

"بختاورد کی ماں۔ تم ان کے ساتھ اسی وقت چلی جاؤ۔" مادر ملکہ نے حکم دیا۔

بختاورد کی ماں اٹھ کر کھڑی ہو گئی:

"جو حکم مادر ملکہ!"

بختاورد نے پھر مندی:

"میں بھی ساتھ چلوں گی ماں۔"

"لیتی جاؤ اسے بھی۔" مادر ملکہ نے سفارش کر دی۔

اس طرح بختاورد اور اس کی ماں کا کشن راڈ کی حویلی میں جانا آنا ہوا۔

بختاورد روز ماں کے ساتھ کشن راڈ کے ہاں جاتی اور اپنی میٹھی میٹھی معصوم باتوں سے

کشن راڈ کی بیوی کا دل بہلاتی۔

کشن راڈ کی بیوی بختاورد سے اس قدر مانوس ہو گئی کہ وہ بغیر کام کے بھی اسے اپنے پاس

بلائے رکھتی تھی۔

یہ وہی ایام تھے جب سلطان کے خلاف کشن راڈ ایک زبردست سازش کرنے

میں لگا ہوا تھا۔

سرنگا پٹم میں وہ گورنر تھا اور گورنر پورے علاقہ کا مالک ہوتا تھا۔ چنانچہ اب اس کی

حویلی میں بانیوں، غلاموں اور سازشچیوں کے روز اجلاس ہوتے تھے جن میں سرنگا پٹم سے

باہر کے لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔



کشن راڈ کی بیوی بہت نیک اور شریف عورت تھی۔ اسے شوہر سے بھی بہت محبت تھی۔ اس کے ساتھ ہی وہ سلطان اور شاہی خاندان کو بھی دعائیں دیتی تھی کہ اس کے شوہر کو ہونے کے باوجود گورنر جیسا اہم عہدہ دیا گیا تھا۔

اسے کوئی کام کاج تو تھا نہیں۔ طبیعت بھاری رہنے کی وجہ سے وہ بہت کم اپنے گھر سے باہر نکلتی تھی۔ پھر ایک دن اس نے محسوس کیا کہ حویلی میں باہر کے لوگوں کا آنا جانا ہی شروع ہو گیا ہے۔ اب تو رات کو بھی لوگ آنے جانے لگے تھے۔

عورتوں کی فطرت ہوتی ہے کہ اگر انہیں کسی بات پر شبہ ہو جائے تو وہ اس کی ٹوہ نگ جاتی ہیں۔ اور جب تک حقیقت معلوم نہ کر لیں انہیں چین نہیں آتا۔ یہی حال کشن کی بیوی کا ہوا۔

وہ اپنی جگہ سخت پریشان تھی کہ آخر حویلی میں لوگ رات رات بھر کیوں ٹھہرے ہیں۔ بعض لوگوں کو تو کشن راڈ نے مستقل طور پر ہی ٹھہرایا تھا۔

پھر یہ راز اس پر جلد ہی کھل گیا! ایک شب وہ کچھ بے چین تھی اور اسے نیند نہ آرہی تھی۔ وہ اٹھ کر کمرے میں گئی۔ حویلی کی بیٹھک صحن کے دوسری طرف تھی۔ پھر بھی وہاں بیٹھے بائیں کرنے والوں کی آواز اس تک آرہی تھیں۔

آخر تجسس اور شک، کشن راڈ کی بیوی کو کشتاں کشتاں مہمان خانے کے برابر دے گیا۔

اس کمرے میں بیٹھ کے وہ مہمان خانے میں ہونے والی گفتگو اچھی طرح سن سکتی تھی۔ ابھی اس نے چند ہی باتیں سنی تھیں کہ گھبرا کے کھڑی ہو گئی:

”ہائے رام۔ یہ کیا؟ کشن راڈ اپنے سلطان کے خلاف باتیں کر رہا ہے۔“

یہ خیال اس کے دماغ میں پیدا ہوا اور جم کے رہ گیا۔

اب وہ کھڑکی سے لگ کے کھڑی ہو گئی اور صبح تک کشن راڈ اور اس کے ساتھیوں کو بات غور سے سنتی رہی۔

پھر جب وہ اپنے کمرے میں واپس آئی تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے اس کا شوہر ایک نیک حرام اور غدار آدمی ہے۔ سلطان نے اسے سب کچھ دے رکھا ہے۔ وہ پھر

مہمان کا تختہ الٹنے کے منصوبے بنا رہا ہے۔

اب تو کشن راڈ کی بیوی رات ہوتے ہی مہمان خانے کے برابر والے کمرے میں چھپ کے پڑ جاتی اور غداروں، بائیسوں اور احسان فراموشوں کی باتیں اور منصوبے سنتی رہتی۔

آخر اسے اس سازش میں شریک تقریباً تمام لوگوں کے نام معلوم ہو گئے۔ ان لوگوں میں مرزا کا بیٹم کے علاوہ باہر کے افراد زیادہ تھے۔

کشن راڈ کی بیوی تمام حالات سے واقف ہو چکی تھی۔ وہ ایک عجب وطن عورت تھی لیکن ہر طرف اس کا جیون سا تھی تھا جس سے وہ بے پناہ محبت کرتی تھی۔

اس کے دل میں یہ کش مکش کئی دن جاری رہی جس کے نتیجے میں اس کی طبیعت سخت اب ہو گئی اور وہ کئی دن بے ہوش پڑی رہی۔

اپنی بیماری اور بے ہوشی کے عالم میں کشن راڈ کی بیوی نے یہ محسوس کیا کہ اس کا شوہر مرنے کی طرف سے بالکل لاپرواہ ہو گیا ہے بلکہ وہ اب انسان سے شیطان بن چکا ہے۔ اگر اس کی نگاہیں جلد نہ کھینچی گئیں تو شاہی محلات اور ان کے مکین جل کر راکھ ہو جائیں گے۔

پس جس طرح اس کا شوہر اپنے آقا کی وفاداری سے باغی ہو گیا تھا بالکل اسی طرح کشن راڈ کی بیوی اپنے شوہر سے باغی ہو گئی۔

اس نے فیصلہ کیا کہ وہ سلطان کے خلاف اس سازش کو ناکام بنائے گی خواہ اس کے لیے اپنی جان ہی کیوں نہ دینی پڑے۔

ایک دن جب بختا در اس کے پاس آئی تو کشن راڈ کی بیوی نے باتوں باتوں میں اسے پوچھا:

”کیوں بختا در تو اپنی ماں کو کتنا چاہتی ہے؟“

”بہت چاہتی ہوں۔ سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔“ بختا در نے پٹ سے جواب دیا۔

کشن راڈ کی بیوی نے دوسرا سوال کیا:

”اچھا اب یہ بتا کہ تو اپنی ماں کو کتنا چاہتی ہے؟“

”ماکن یعنی مادر ملکہ کو پوچھ رہی ہیں آپ؟“

”ہاں ہاں۔ وہی تو تیری ماکن ہیں۔“

”انہیں بھی بہت چاہتی ہوں۔“

”کیوں چاہتی ہو آخر؟“

”وہ تو مادر ملکہ ہیں۔“

”بخنادر کے لیے میں ادب آگیا۔“

”سب کی ماں ہیں۔ محل والوں کی بھی امد محل سے باہر والوں کی بھی۔“

”اور سلطان کو تو کتنا چاہتی ہے؟“

”انہیں تو سب سے زیادہ چاہتی ہوں۔“

”بخنادر کے چہرے پر قوس و قزح بکھر گئی۔“

”وہ تو پوری دنیا کے مالک ہیں۔ بس خدا ان سے بڑا ہے اور سب ان سے چھوٹے۔“

”ہیں بی بی!“

”اچھا یہ بتا۔“ اس نے ذرا سنبھل کے کہا:

”اگر کوئی سلطان کو مارنے کی کوشش کرے تو تو کیا کرے گی؟“

”میں — میں — میں اس کی دانتوں سے بوٹیاں نیچ لوں گی۔“

بخنادر لال بھبھو کا ہو گئی:

”کس کی مجال ہے جو سلطان بہادر کو مارنے کی کوشش کرے۔“

کشن راڈ کی بیوی نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور خود سے کہا:

”یہ معصوم بچی سلطان کو کس قدر چاہتی ہے۔ سلطان نے کچھ نہیں دیا اسے۔ پھر یہ سلطان کو چاہتی ہے۔ اس لیے چاہتی ہے کہ سلطان، سلطان ہے۔ سب کا سلطان۔ ہمارا سلطان۔ اس کا سلطان مگر۔ مگر ایک وہ ہے کہ سلطان نے اسے سب کچھ دیا۔“

وہ پھر بھی سلطان کو ختم کرنا چاہتا ہے۔“

بخنادر بڑی خاموشی مگر بہت غور سے کشن راڈ کی بیوی کی خود کلامی سن رہی تھی۔

اس نے کہا کہ ”وہ پھر بھی سلطان کو ختم کرنا چاہتا ہے۔“ تو وہ خاموش نہ رہ سکی۔

زور سے چیخ پڑی:

”کون — کون سلطان کو ختم کرنا چاہتا ہے۔ مجھے بتاؤ میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دوں گی۔ کون ہے وہ۔ بتاؤ تو مجھے۔“

”بخنادر۔“

کشن راڈ کی بیوی بڑی افسردگی سے بولی:

”یہ بات میں تجھے کبھی نہ بتاتی مگر کیا کروں، تجھے بتائے بغیر اور کوئی چارہ نہیں۔“

اس وقت مادر ملکہ اور شاہی محلات کے تمام لوگ بڑے خطرے میں ہیں۔ ان سب کو ختم کر دینے کا منصوبہ بنا یا گیا ہے۔ اگر ان غداروں کو نہیں روکا گیا تو پورا سرنگا پٹم آگ میں بھسم ہو جائے گا۔“

کشن راڈ کی بیوی نے رک کر بخنادر کو دیکھا۔

بخنادر منہ کھولے حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کی سمجھ میں پوری بات تو نہ آئی تھی لیکن جتنا سمجھی تھی اس نے اسے بدحواس کر دیا تھا۔

”تیری سمجھ میں کچھ آیا بخنادر؟“

کشن راڈ کی بیوی نے اس سے پوچھا:

”میں نے کیا کہا ہے ابھی؟“

”سردار فی!“

بخنادر نے مر جھکتے ہوئے کہا:

”کچھ کچھ سمجھ میں آیا ہے میرے۔ مگر یہ سب کون کر رہا ہے۔ آپ اپنے آدمی (میاں) سے کہہ کر اسے پکڑوا کیوں نہیں دیتیں؟“

کشن راڈ کی بیوی نے پھر ایک گہری سانس لی:

”تم ٹھیک کہہ رہی ہو بخنادر۔ ہمارے سلطان نے کشن راڈ کو سرنگا پٹم کا گورنر بنا کر اسی لیے بھیجا تھا کہ یہاں اگر کچھ گڑ بڑ ہو تو کشن راڈ گڑ بڑ کرنے والوں کو پکڑے اور ان کو سزا دے۔“

”پھر آپ کتنی کیوں نہیں ان سے؟“

بخنادر نے اپنی عقل کے مطابق بات کی:

”لوگ پکڑے جائیں گے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

کشن راؤ کی بیوی نے دور خلاؤں میں گھورتے ہوئے کہا:  
”تم ٹھیک کہہ رہی ہو بخت اور اب تجھے کہنا ہی پڑے گا۔ مگر کس سے کہوں؟“  
کشن راؤ سے؟

وہ پھیکے سے انداز میں مسکرائی:  
”میری بھولی بخت اور۔ میں کشن راؤ سے کچھ نہیں کہہ سکتی۔ کشن راؤ۔ میرا شوہر  
یعنی سرنگاپٹم کا گورنر۔ وہ۔ وہ سلطان سے باغی ہو گیا ہے۔ اس نے غداری پر کمر  
باندھ لی ہے۔ کشن راؤ ہی تو سب کچھ کر رہا ہے۔  
رات رات بھر میرے گھر میں منصوبے بنائے جاتے ہیں۔ کشن راؤ، سلطان کو تباہ  
کر کے سرنگاپٹم کا وزیر اعظم بننا چاہتا ہے۔ وہ انگریزوں سے مل گیا ہے۔ وہ ہمک حرام  
ہو گیا ہے۔“

اور۔

کشن راؤ کی بیوی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی!  
بخت اور گھرائی۔ اس کی ننھی سی سمجھ میں یہ تو آ گیا تھا کہ گورنر کشن راؤ، سلطان سے  
غداری کر رہا ہے مگر اب اس کی سمجھ میں یہ نہ آ رہا تھا کہ وہ کشن راؤ کی بیوی کی اس حالت کو  
کدہ سنبھالے؟  
کشن راؤ کی بیوی اس طرح رو رہی تھی جیسے اس کا کوئی رشتے دار مر گیا ہو۔ چنانچہ بھنڈا  
چپ بیٹھی اُسے روتے ہوئے دیکھتی رہی۔

اچھی طرح آسٹو بہا لینے سے کشن راؤ کی بیوی کا دل کچھ ہلکا ہوا۔ تب اس نے بخت اور کو  
اپنے اعتماد میں لیا اور اُسے اچھی طرح سمجھا بجا کر مادر ملکہ کے پاس ایک خاص پیغام دے  
کر بھیجا۔

اس پیغام کے نتیجے میں پہلا کام یہ ہوا کہ ایک گھنٹہ بعد مادر ملکہ کی خاص سواری کشن راؤ  
کی حویلی پر آ کے رکی۔

سواری میں سے مادر ملکہ کی خاص کینزائری اور اندر پہنچ کے اس نے کشن راؤ سے  
گفتگو کی جس کے نتیجے میں کشن راؤ نے اپنی بیوی کو شہی سواری میں بٹھا کے مادر ملکہ  
کے پاس بھیج دیا۔

سلطان نے ٹیپو کشن راؤ کی غداری سے بے خبر تھا۔ وہ کشن راؤ کو دار السلطنت  
کے انتظام کے لیے بھیج کے ہلاک ہوتا ہوا سلطنت پہنچا۔ پھر وہاں انگریزوں سے مقابلے  
کے لیے وینکٹ گری کوٹ کے مقام پر ڈیرے لگا دیے۔ انگریزی فوج اس کے مقابل  
ٹھہری ہوئی تھی۔

صبح کو انگریزوں پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی تھیں کہ سلطان کے پاس دار السلطنت سے  
ایک تیز رفتار قاصد پہنچا۔ اس نے سلطان کو مادر ملکہ کی طرف سے لکھا ہوا ایک خط پیش کیا  
جس میں درج تھا:

کشن راؤ نے کھانڈ سے راؤ مردود کی طرح بغاوت کا جال  
پھیلایا ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بمبئی سے انگریزی فوج کثیر  
سرنگاپٹم آ رہی ہے۔

ہم لوگ موت کے منہ میں بیٹھے ہیں۔ تم سب سے پہلے دار السلطنت  
کی خبر لو۔ ورنہ پھر کچھ نہ ہو سکے گا۔“

سلطان خط پڑھ کر سناٹے میں آ گیا۔  
وہ کشن راؤ کی غداری کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا۔ اس نے اسی وقت سید صاحب  
کے زیرِ کمان ایک لشکر کثیر سرنگاپٹم روانہ کر دیا۔

سلطان نے سید صاحب کو تاکید کی:  
 "خبردار۔ راستے میں ذرا بھی دیر نہ ہو۔ کشن راؤ کو بے جبری میں جا پکڑو اور تمام  
 خداریوں کو کھینچ کر دار تک پہنچاؤ۔"  
 سید صاحب کو سرنگا پٹم روانہ کرنے کے بعد سلطان نے میر قمر الدین کو سپہ سالار  
 مقرر کیا اور انہیں حکم دیا کہ:  
 "آپ انگریزوں پر حملہ کریں۔"

پھر بدوہ خود بھی تھوڑی سی فوج ساتھ لے کر دار السلطنت سرنگا پٹم کی طرف روانہ  
 ہو گیا۔  
 میر قمر الدین نے فوراً اپنے لشکر کو حیدر آبادی لباس پہننے کا حکم دیا تاکہ اس کی شناخت  
 نہ ہو سکے۔

سب کو معلوم تھا کہ سلطان سے لڑنے کے لیے حیدر آبادی لشکر بھی میسور میں داخل ہو  
 چکا ہے اسی لیے اس لشکر پر کسی کو شبہ نہ ہوا اور قمر الدین بیت منگل اور مالور کے راستے  
 بنگلور کی طرف روانہ ہوا۔

راستے میں سامانِ رسد کا ایک بڑا کارواں دکھائی دیا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا  
 کہ یہ سامان انگریز لشکر کے لیے جارہا ہے۔

قمر الدین نے تھوڑی سوچ بچار کے بعد قافلے پر حملہ کر کے تمام سامان پر قبضہ کر لیا۔  
 اس لوٹ میں پانچ ہزار بیل قمر الدین کے ہاتھ لگے اور ۲۰ آدمی گرفتار کیے گئے۔ قمر الدین اسی  
 طرح لوٹ مار کرتا ہوا بنگلور کی طرف چلتا گیا۔

اس قافلے کے علاوہ اور کچھ قافلے بھی اسے راستے میں ملے جو انگریزوں کے لیے  
 رسد لے کر جارہے تھے۔ قمر الدین نے ان سب پر قبضہ کر لیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز  
 لشکر کو رسد ملنا بند ہو گئی اور وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گیا کہ شاید نواب حیدر آباد ان سے  
 انجی ہو کہ سلطان سے مل گیا ہے چنانچہ لشکریوں نے باہر نکلنا بھی چھوڑ دیا۔

دوسری طرف سید صاحب مانگڑی کے جنگل اور اتری واگ کے راستے جہاں جھاگ معر لشکر

کے سرنگا پٹم پہنچے۔  
 اس وقت نصف شب گزر چکی تھی۔ انہوں نے کچھ وقت دریا کے کنارے گزارا۔ پھر صبح  
 سے کچھ پہلے ۵۰ جاں نثاروں اور اپنے خاص آدمیوں کو لے کر قلعہ کی طرف روانہ ہوئے اور  
 لشکر کو تیار رہنے کا حکم دیتے گئے۔

قلعہ کا دروازہ اس وقت بند تھا۔ سید صاحب نے دروازہ کھولنے کے لیے دربان کو  
 آواز دی۔ دروازے پر رسالدار اسد خاں متعین تھا۔ اس نے فوراً دروازہ کھلوا دیا۔

سید صاحب نے قلعہ کے اندر داخل ہوتے ہی اپنے آدمیوں کو خاص خاص مقامات پر  
 پرے پر لگا دیا۔ پھر سیدھے مادرِ ملکہ کے محل پر پہنچے۔

مادرِ ملکہ کو پریشانی کی وجہ سے نیند نہ آتی تھی۔ وہ اس وقت بھی جاگ رہی تھیں۔ سید صاحب  
 کی اطلاع پا کر گھبراتی ہوئی آئیں اور آتے ہی پہلا سوال کیا:

"سلطان خیریت سے ہے نا؟"

"الحمد للہ۔ سلطان معظّم بخیریت ہیں؛"

"تہنا آئے ہو کہ لشکر ساتھ ہے؟"

"بے فکر رہیے۔ بہت بڑا لشکر ساتھ ہے۔"

"کشن راؤ کو اطلاع ہوئی کہ نہیں؟"

"بالکل نہیں۔"

مادرِ ملکہ نے اطمینان کا سانس لیا:

"پہلے کشن راؤ کو گرفتار کر دو۔"

انہوں نے حکم دیا:

"پھر کچھ اور گفتگو ہوگی۔"

سید صاحب نے تعین حکم میں سر جھکا دیا اور وہیں کھڑے کھڑے ساتھ آئے ہوئے دستے  
 کو حکم دیا:

"کشن راؤ کی جوتی کو گھیرے میں لے کر اسے گرفتار کر دو۔ خبردار وہ بھاگنے نہ پاتے۔"

ادھر فوجی دستہ کشن راؤ کو گرفتار کرنے روانہ ہوا، ادھر سید صاحب نے مادرِ ملکہ

سے اجازت لے کر ان کے محل میں کچری لگائی اور قلعہ دار، رسالدار، پرے دار اور تمام

چھوٹے بڑے افسروں کو طلب کر لیا۔

سید سالار کا نام سن کر کشن راڈ کی سٹی گم ہو گئی گھبرائے ہوئے لہجہ میں بولا:

"سید صاحب۔ وہ تو سالار کا معتمد کے ساتھ ہیں۔ ان کا حکم یہاں کیسے پہنچا؟"

دستہ سردار نے بحث کرنے کے بجائے وضاحت کی:

"سید صاحب خود یہاں تشریف لائے ہیں۔ اس وقت مادر ملکہ کے محل میں کچہری لگائے بیٹھے ہیں۔ تمہیں طلب کیا ہے۔"

کشن راڈ کا رنگ فنی ہو گیا۔ گھگھیا کے بولا:

"میں سید صاحب کے حضور ابھی پیش ہوتا ہوں۔ آپ لوگ چلیے میں کپڑے بدل کر آ رہا ہوں۔"

ملکہ مادر کے محل پر۔

"مکار۔ بھاگنا چاہتا ہے۔"

سردار نے ڈپٹ کر کہا:

"سپاہیو۔ کپڑا سے اور گھٹیتے ہوئے لے چلو۔"

"نہیں نہیں۔ میں چل رہا ہوں۔"

اور وہ جلدی سے دو قدم آگے آ گیا۔

فوجی دستہ نے کشن راڈ کو مہلت دی نہ موقع۔ اور اسے اپنے گھر سے میں لے کر ملکہ مادر کے محل کا رخ کیا۔

دوسری طرف مادر ملکہ کے محل میں سید صاحب نے کچہری لگا رکھی تھی اور قلعدار اور سالار پر بگڑ رہے تھے:

"تم لوگوں کے کان میں تیل پڑا ہے۔ غضب خدا کا راتنی بڑی سازش ہوئی اور تم لوگ بے خبر رہے۔ ہیں میدان جنگ میں خبر مل گئی۔"

قلعدار صفائی پیش کر رہا تھا:

"سید سالار بہادر۔ مجھے کشن راڈ پر شبہ تو تھا مگر کوئی ثبوت نہ مل رہا تھا اس لیے کوئی خبر نہ بھیج سکا۔ پھر وہ گورنر ہے۔ ہم کچا قدم کیسے اٹھاتے؟"

"قلعدار! یہ بہت بڑی غفلت اور غیر ذمہ داری ہے۔ تمہیں شبہ تھا تو اس بارے سے

کشن راڈ کی حویلی پر فوجی دستہ پہنچا۔ اس کی حویلی پر پانچ مسلح ہندو سپاہی پہرہ دے رہے تھے۔ سید صاحب کے بیٹھے ہوئے دستہ کے سردار نے سپریداردوں کی طرف دیکھ کے سردی میں کہا:

"کشن راڈ کو باہر بلاؤ؟"

گورنر ہمارا رات بہت دیر سے سوئے ہیں۔ ایک پہرے دار نے بڑی دعوت سے اکوڑ کر کہا۔

سردار دستہ کو غصہ آ گیا۔ پیچھے کے بولا:

"یہ ہمارے سوال کا جواب نہیں ہے۔ اندر جاؤ اور اسے باہر بھیجو۔"

"ہمیں جگانے کا حکم نہیں ہے۔" پہرے دار نے اس تلخی کی کوئی پرواہ نہ کی۔

سردار نے حکم دیا:

"اندر گھس جاؤ اور کشن راڈ کو پکڑ کر لے آؤ۔"

اس وقت تک گورنر کشن راڈ کو اطلاع پہنچ گئی تھی کہ کچھ سپاہی حویلی کے سپریداردوں سے الجھ رہے ہیں۔ وہ بڑے بڑا ہوا باہر آیا۔

"کیا بات ہے؟"

کشن راڈ سپاہیوں کو دیکھ کے بڑے غصے سے بولا:

"کیوں اودھم مچایا ہے۔ کہن ہو تم لوگ؟"

"تمہیں ہمارے ساتھ چلنا ہے کشن راڈ۔" سردار دستہ نے کہا۔

کشن راڈ بپھر گیا:

"کون ہے تو۔ معلوم ہے کہ تو کسی سے بات کر رہا ہے؟"

"کشن راڈ بک بک نہ کر اور میرے ساتھ چپ چاپ چل۔"

سردار بھی لال پیلا ہو گیا:

"یہ حکم سید سالار دولت خدا داد میسور، سید صاحب کا ہے!"

ہیں مطلع کیا ہوتا۔

اتنے میں فوجی دستہ کشن راؤ کو اپنے گھر سے میں لیے ہوئے آگیا۔  
”تشریف لے آئے گورنر بہادر۔“

سید صاحب نے زہر خند کیا:

”کس قدر نمک حرام ہے تو۔ سلطان نے تجھے کیا نہیں دیا اور مادرملکہ نے تجھ پر کون سی مہربانی نہیں کی۔ تو نے اپنی بیوی کے لیے بخت اور کی ماں کی خدمات مانگیں اور انہوں نے اسے فوراً تیرے ساتھ بھیج دیا۔ تو گنناؤں اور کینہ ہے۔“  
کشن راؤ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ وہ خاموش کھڑا رہا۔ اسے پتہ چل گیا کہ سازش بے نقاب ہو گئی ہے۔ اب کوئی عذر کرنا بیکار ہے۔

سید صاحب نے ذرا رک کر کہا:

”تجھ سے سوال جواب کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی میں تجھے صفائی پیش کرنے کا موقع دیتا ہوں۔ کہہ تو اپنی صفائی میں کیا کتنا چاہتا ہے۔“  
کشن راؤ نے ذرا دیر بعد کہا:

”مجھے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہنا کہ میں ہندو ہوں اور میں نے میسور میں ایک ہندو ریاست قائم کرنے کی کوشش کی تھی اور۔“  
وہ ذرا رک کے بولا:

”اور مجھے اس پر کوئی افسوس نہیں۔“

”اچھا ہوا کہ تم نے خود اپنے جرم کا اقبال کر لیا۔“

سید صاحب نے ایک سانس لے کر کہا:

”کوئی خواہش ہو تو مرنے سے پہلے بتا دو۔“

”ہاں۔ ایک خواہش ہے۔“

اس نے بلا توقف کہا:

”میرے اس کام میں میری بیوی کا کوئی ہاتھ نہیں۔ اسے سزا دی جائے۔“ کشن راؤ نے اپنی خواہش کا اظہار کر دیا۔

”تمہاری بیوی مادرملکہ کے پاس ہے۔ اس کی طرف سے اطمینان رکھو۔“ سید صاحب نے

جواب دیا۔

”ایک اور خواہش ہے اگر وہ پوری کر دی جائے تو۔“

”بیان کرو۔“ سید صاحب نے کہا۔

”مجھے یہ بتا دیا جائے کہ میری اس کوشش اور منصوبے کا راز کس نے افشا کیا؟“  
کشن راؤ نے دوسری خواہش بتائی۔

سید صاحب کو مادرملکہ نے سب کچھ بتا دیا تھا اور کشن راؤ کی بیوی اس وقت عمل میں موجود تھی اس لیے سید صاحب نے یہ راز کھولنے سے گریز کیا۔

”مجھے افسوس ہے کشن راؤ۔“

سید صاحب نے جواب میں کہا:

”میں تمہاری یہ خواہش پوری نہیں کر سکتا۔ اس لیے کہ یہ ایک سلطانی راز ہے جسے کسی صورت کھولا نہیں جاسکتا۔“

اس کے ساتھ ہی سید صاحب نے اعلان کیا:

”مجھے سلطان معظم نے حکم دیا کہ میں سرنگا پٹم پینچ کے کشن راؤ کی غداری کی تحقیق کروں اور اگر جرم ثابت ہو جائے تو مجرم کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔“

کشن راؤ نے اپنا جرم خود تسلیم کر لیا ہے اس لیے میں کشن راؤ کے قتل کا فوری اعلان کرتا ہوں۔ اس طرح کہ پہلے اس کے دونوں بازو قطع کیے جائیں۔ پھر اس کی گردن تن سے الگ کر کے اس کی لاشیں بڑے بازار کے چوک پر لٹکا دی جائے تاکہ دوسروں کو عبرت ہو اور کوئی بغاوت یا غداری کی جرأت نہ کر سکے۔“

سید صاحب خاموش ہوئے تو کشن راؤ نے کہا:

”سنو سید۔ تم میرے جسم کے جتنے ٹکڑے چاہو کرڈالو مگر یہ یاد رکھنا کہ میں نے جو آگ بھڑکائی ہے وہ تمہارے سلطان کے بجائے نہ بکھے گی۔“

کشن راؤ کے بازو قطع کر کے اس کی گردن بدن سے الگ کر کے بے سر کے دھڑ کو چوراہے پر لٹکا دیا گیا۔

کشن راؤ نے جو آخری بات کہی تھی وہ پوری ہو کے رہی!

کشن راؤ کی غداری کے اس واقعہ پر "میسور گزیٹ" کے ہندو مصنف بیرون راؤ نے خوب حاشیہ آرائی کی ہے۔

وہ گزیٹ کے صفحہ ۲۶۲۵ پر لکھتا ہے :

"کشن راؤ کی بیوی جو خوبصورت، دفلار اور باصمیت تھی اپنے شوہر کی موت کے بعد ایک روایت کے مطابق سلطان کے خاص حرم میں بجر (جوالہ کر تانی) داخل کر لی گئی۔"

بد ذات مصنف کی شرات دیکھیے کہ اس نے اپنی تحریر میں کربانی کا حوالہ دیا ہے جبکہ کربانی کی تحریر میں "بجر اور کر تانی" کے الفاظ موجود ہیں۔ کربانی کی تحریر اس طرح ہے :

"اس کی بیوی نے جو حسین بھی، چادار بھی اور باوفا بھی تھی، ملکہ معظمہ کی خدمت میں حاضر ہونے کی درخواست کی اور انھیں کے ذریعے حرم مراٹے سلطانی میں داخل ہوئی۔"

ملاحظہ ہو کہ کربانی اور ہندو مصنف کی تحریر میں کس درجہ فرق ہے۔ ہندو مصنف کی تحریر سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشن راؤ کی بیوی کو اس کے گھر سے پکڑا کے لایا گیا اور اسے زبردستی حرم میں داخل کر دیا گیا جبکہ کربانی کی تحریر بتاتی ہے کہ کشن راؤ کی بیوی نے خود درخواست کی اور مادر ملکہ کی سفارش سے حرم سلطانی میں رہنے کی اجازت دی گئی۔

مصنف نے ایک طرف تو "کربانی" پر تہمت لگائی ہے اور دوسری طرف سلطان عالی مقام پر ایک نازیبا الزام عاید کیا ہے۔

مصنف نے گزیٹ کے دوسرے اور تیسرے حصہ میں جو میسور کی تاریخ پر مشتمل ہے جہاں بھی موقع ملا ہے، مسلم سلاطین کو زہریلے الفاظ سے یاد کیا ہے مگر وہ جو فارسی کا ایک مقولہ ہے کہ :

"دروغ گو را حافظ نہ باشد"

یعنی جھوٹے آدمی کا حافظہ کمزور ہوتا ہے اور وہ اپنی کئی ہونی بات کو بعد میں بھول جاتا ہے تو اس ہندو مصنف نے اس کا خود ہی ثبوت فراہم کر دیا۔

اس نے گزیٹ کے صفحہ ۲۶۲۵ پر تو سلطان عالی مقام پر ایک نازیبا الزام لگایا ہے

صفحہ ۲۶۸۷ پر یہی مصنف سلطان عالی مقام کے بارے میں کہتا ہے :

"اس (سلطان) کو عورتوں سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ وہ ایک تاکید خط میں برہان الدین کو عورتوں سے دور رہنے کے لیے کہتا ہے۔ اگرچہ اس (سلطان) کے تیرہ بیٹے اور بیٹیاں تھیں لیکن بقول بورنگ "اسے عورتوں سے شیفٹگی نہیں تھی۔"

اس کی جفاکش، اعتدال پسند زندگی، پاکیزگی کی اس حد تک پہنچی ہوئی تھی جو ایک مذہب کے دلدادہ مسلمان کی زندگی خیال کی جاتی ہے۔ اس کے ہاتھ میں ہمیشہ تسبیح رہتی جس سے نا لکیر کی یاد تازہ ہو جاتی تھی۔"

مصنف نے دراصل سلطان اور حرم سلطانی کو بدنام کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس لیے کہ ایک تحریر میں سلطان پر الزام لگاتا اور دوسری جگہ اس کی تعریف کرتا ہے۔ اس کے علاوہ ایک بات اور قابل ذکر ہے۔ وہ یہ کہ مصنف نے اپنی پہلی تحریر میں لکھا ہے کہ "ایک روایت کے مطابق"۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مصنف کو یہ معلوم تھا کہ اس سلسلے میں "دوسری روایت" بھی موجود ہے جسے اس نے جان بوجھ کے بیان نہیں کیا۔

وہ دوسری روایت اس طرح ہے :

"کشن راؤ کی بیوی کے متعلق دوسری روایت جو مشہور ہے وہ یہ ہے کہ بیوی کو جب اپنے حرام خور شوہر کے باغیانہ خیالات معلوم ہوئے تو اس کو سخت نفرت ہوئی اور بخدا وراثی کی زبانی بیٹو سلطان کی والدہ کو اپنے شوہر کی نامعقول حرکتوں کی اطلاع کرائی۔"

دراصل ہندو مصنف نے اس دوسری روایت کو اس لیے نہیں لکھا کہ اس سے سلطان کا دامن بالکل پاک ہو جاتا ہے۔ اگر خدا نخواستہ اس واقعہ میں کچھ بھی صداقت ہوتی تو مغرب کی حکمرانین قوم، جسے انگریز کہا جاتا ہے، وہ سلطان کو کیسے بخش دیتی؟ وہ تو اس بات کو اس قدر شہرت دیتے کہ ان کے حکم پر لکھی جانے والی ہزار تاریخ میں اسے جلی حروف میں لکھا جاتا۔

میسور پر حملہ کرنے والی جیدر آبادی فوج دو حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک حصہ کاماندار فرید الدین مؤید الدولہ تھا اور دوسری کی کمان عیسیٰ خان کے ہاتھ میں تھی اور یہ دونوں وہیں سلطنت خداداد کے مختلف علاقوں کو تاخت و تاراج کرتی پھر رہی تھیں۔ عیسیٰ خان نے کبھی گوٹہ، ٹاٹ پتری اور تارٹری پر قبضہ کر لیا تھا جبکہ مؤید الدولہ نے فہ گئی کا محاصرہ کیا تھا لیکن قطب الدین خاں دولت زئی نے اس کی سخت مزاحمت کی۔ اب مؤید الدولہ نے دیکھا کہ قلعہ پر قبضہ ممکن نہیں تو وہ محاصرہ اٹھا کر مضامات کو تباہ کرنا ہوا کر پتہ لافٹ چلا گیا۔

مؤید الدولہ نے کر پتہ پر قبضہ کیا۔ پھر قلعہ سدوٹ بھی بلا مزاحمت اس کے ہاتھ آ گیا۔ اب اس نے آگے بڑھ کر ترم کٹہہ کا محاصرہ کر لیا۔

اُدھر مرہٹہ فوج جو پرشورام کی کمان میں تھی، نے دھاڑاڑا، انگولا، مرجان اور شانور پر قبضہ کر لیا اور وہاں سے پرشورام چنلا رگ کے قلعہ پر پہنچا۔

سلطان کے قلعہ دار دولت خاں نے قلعہ بند ہو کر مرہٹوں کا دفاع کیا۔ مقابلہ طویل کھینچ گیا اور پرشورام نے دولت خاں کو دولت کا لالچ دیتے ہوئے چار لاکھ کے عوض قلعہ خالی کرنے کو کہا۔

یہ پیش کش پرشورام کے اس قاصد نے کی تھی جو مرہٹوں کی طرف سے صلح کی گفتگو کے لیے

یہاں پر اگر لفظ "حرم" کی تشریح نہ کی گئی تو قاری کا دماغ پھر بھی الجھا رہے گا۔ بد قسمتی سے آج کل "حرم" سے شاہی محل کی عورتیں جن میں کنیزیں بھی شامل ہوتی ہیں مراد لی جاتی ہے درنہ "حرم" تو اس جگہ کو کہا جاتا ہے جو مقدس ہو اور جہاں گناہ کرنا ممنوع ہو۔ اسی لیے مکہ معظمہ، مدینہ منورہ اور بیت المقدس کو "حرمین" کہا جاتا ہے اور عرب کے بادشاہ شاہ حرمین شریفین کے لقب سے پکارے جاتے ہیں۔

یہ لفظ بعد میں گھروں کے "زنانہ حصوں" کے لیے بھی استعمال ہونے لگا جس سے مقصود یہ تھا کہ اس جگہ عفت مآب عورتیں رہتی ہیں۔

پھر جب عیاشی سلطان اور نوابین نے جائز کے ساتھ ناجائز طریقے سے حاصل کی ہوئی عورتوں کو بھی وہاں رکھنا شروع کر دیا تو "حرم" کا مفہم کچھ اور ہو گیا اب ہندو اور مغربی مصنف حرم کو اسی معنی میں سمجھتے اور لکھتے ہیں۔

اس سلسلے میں مقامی طور پر جو بات مشہور ہے وہ یہ ہے کہ کشن راؤ کی بیوی نے اپنے شوہر کے کڑوتوں سے سلطان کی والدہ ملکہ زمان کو مطلع کیا تھا۔ اس لیے کشن راؤ کے رشتہ دار کشن راؤ کی بیوی کے خلاف ہو گئے تھے اور اسے بے جا تنگ کرتے رہتے تھے جس سے بیچور ہو کر اس نے مادر ملکہ سے پناہ کی درخواست کی اور مادر ملکہ نے اسے پناہ دینے کے خیال سے محل کے اندر رہنے کی اجازت دے دی۔

سلطان کی والدہ چونکہ محل کے زنانہ حصے یعنی "حرم" میں رہتی تھیں اس لیے کرمانی نے بجا طور پر "حرم" کا لفظ استعمال کیا لیکن میسور گزیٹر کے مصنف کو تعصب نے اس درجہ بہا کر دیا کہ اس نے "حرم" کو کچھ اور ہی معنوں میں سمجھنے کی کوشش کی اور اپنی تحریر میں "خاص" اور "بجبر" کے الفاظ کرمانی کا نام لے کر شامل کر دیے۔



قلعہ کے اندر بھیجا گیا تھا۔

دولت خاں، سلطان کے انتہائی وفادار سرداروں میں سے تھا لیکن اسے معلوم تھا کہ نہ وہ میدان میں نکل کر مرہٹوں کا مقابلہ کر سکتا ہے اور نہ زیادہ دنوں تک قلعہ کو دشمن سے محاصرہ رکھ سکتا ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ یہ بھی نہیں چاہتا تھا کہ مرہٹوں سے جنگ کیے بغیر وہ قلعہ الہا حوالے کر دے۔

وہ دیر تک قاصد سے ٹوٹی پھوٹی مرہٹی زبان میں گفتگو کرتا رہا۔ پھر خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔

آخر کار اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا:

”ہاں بھئی۔ اب تم بتاؤ تمہارے سپہ سالار پر سورام نے قلعہ حوالے کرنے کے عوض کتنا رقم کی پیشکش کی ہے؟“

قاصد نے جواب دیا:

”میں بتا تو چکا ہوں کہ اگر آپ اسے بھڑے بغیر قلعہ ہمارے حوالے کر دیں تو ہم آپ چار لاکھ کی نقد رقم پیش کریں گے۔“

دولت خاں نے چونک کے قاصد کو دیکھا:

”کیا کہا تم نے۔ چار لاکھ۔ صرف چار لاکھ۔“

دولت خاں کے بچے میں حیرت در آئی:

”مگر پہلے تو تم نے چالیس لاکھ کہے تھے!“

”نہیں قلعدار۔“ قاصد بولا:

”آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں نے پہلے بھی چار لاکھ کہے تھے اور اب بھی چار لاکھ پیش کش آپ کے سامنے رکھتا ہوں۔“

دولت خاں نے اسے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ پھر سوچ میں گم ہو گیا۔ پھر مدت دیر قاصد نے اسے چوڑھایا:

”قلعدار۔ آپ کس خیال میں گم ہیں۔ مجھے کچھ جواب دیجیے۔“

قلعدار دولت خاں نے ایک بار پھر ایک لمبی سانس لی اور اپنی آنکھیں پٹ پٹا

ہٹے کہا:

”دیکھو قاصد۔ بات تو سوچنے والی ہی ہے۔ میرے کانوں نے تو یہ سنا تھا کہ سالار پر سورام چالیس لاکھ دینے پر آمادہ ہیں مگر اب تم چار لاکھ کہہ رہے ہو۔ میں نے تو چالیس لاکھ کو سامنے رکھ کر کچھ فیصلہ کر لیا تھا۔ پر وہ سب تو گر بڑ ہو گیا۔ چار لاکھ اور چالیس لاکھ میں ایک اور دس کا فرق ہے۔ میں یہ

میں یہ نہیں کہتا کہ تم غلط کہہ رہے ہو۔ میں تمہیں کوئی الزام نہیں دیتا۔ میں مرہٹی زبان کم کم جانتا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ میرے سننے میں غلطی ہوئی ہو۔“

”تو پھر اب کیا فیصلہ کیا آپ نے؟“ قاصد نے تنگ آ کے کہا۔

”میں نے فیصلہ تو کر لیا ہے لیکن وہ فیصلہ میں تمہیں نہیں بتاؤں گا۔“

دولت خاں نے بڑے اعتماد سے کہا:

”ابھی ایک گھنٹے کے اندر چالیس لاکھ کے چار لاکھ ہو گئے۔ اس سے میں کیا بھجوں؟“

قاصد چڑ کر غصہ سے بولا:

”آپ کچھ بھی سمجھے مگر مجھے جواب دیجیے۔ میں واپس جانا چاہتا ہوں۔“

”بسم اللہ۔“

دولت خاں نے فوراً کہا:

”آپ جاسکتے ہیں۔ آپ کو کوئی نہیں روک سکتا۔ رہا چار اور چالیس کا معاملہ تو میں خود سالار پر سورام کی خدمت میں حاضر ہوں گا اور ان سے منہ در منہ بات کر کے معاملہ نپٹاؤں گا تاکہ بعد میں جھگڑا نہ اٹھ کھڑا ہو۔“

”آپ کب آئیں گے ہمارے لشکر میں؟“ قاصد کا لہجہ گھڑا اور سخت ہو گیا۔

”میں آج ہی جواب دینے حاضر ہوں گا۔“

دولت خاں نے جواب دیا:

”بس ذرا اجاب سے بات کر لوں۔ پھر پہنچتا ہوں آپ کے پاس۔ سالار پر سورام کی خدمت میں مسیحا سلام پیش کیجیے گا اور میری طرف سے کہیے گا کہ میں آج رات ان کی خدمت میں حاضر ہو کر بالمشافہ گفتگو کر دوں گا۔ آپ مطمئن رہیے۔ اس میں کوئی فرق نہ ہو گا۔“

لہجہ ان کی پیشیں برآمد ہوئیں۔  
دور سے دیکھنے والوں کو یہی دکھائی دے رہا تھا کہ پانچ چھ سوار گھوڑے بڑھائے چلے آ رہے ہیں۔

ایک توران انڈھیری تھا۔ دوسرے یہ کہ دولت خاں نے نوجوانوں کی پلٹن کو سیاہ لباس پہنا دیے تھے اس لیے وہ دُور سے نظر نہ آتے تھے۔

جب دولت خاں اپنے پانچ سواروں کے ساتھ مرہٹہ لشکر کے قریب پہنچا تو پرسورام کے منصوبے کے مطابق چند آدمی دولت خاں کے استقبال کے لیے آگے بڑھے۔

ان کے آگے بڑھتے ہی دولت خاں نے راسیں کھینچ لیں اور وہ اور اس کے ساتھ کے پانچ سوار رک گئے۔

استقبال کو آنے والے ان کے بالکل قریب پہنچ گئے۔

اسی لمحے دولت خاں کے ساتھی سواروں نے چیخ چیخ کے ایک نئی زبان میں کچھ کمنا شروع کیا۔ یہ نئی زبان اور نئے الفاظ دراصل وہ اشارے تھے جو دولت خاں نے اپنے سواروں کے دستوں اور نوجوانوں کی پیشوں کو سمجھا دیے تھے اور ان اشاروں کا مطلب تھا کہ مرہٹہ لشکر گاہ پر عام حملہ کر دیا جائے۔

پھر—  
دیکھتے ہی دیکھتے میدان میں ہزاروں شعلے بھڑک اٹھے۔ دولت خاں کے سوار دستوں اور پیادوں کے پاس شب خون مارنے کا سامان تھا۔ انہوں نے فوراً لکڑیوں میں لپٹے ہوئے کپڑوں میں آگ لگا کر شعلے بھڑکائے اور آگ واحد میں مرہٹہ لشکر یوں پر کوندے پکارتے ٹوٹ پڑے۔

مرہٹے یہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ جس دولت خاں کو گرفتار کرنے کے لیے انہوں نے ہال بچھایا تھا وہ ان کو یوں مات دے گا۔

دولت خاں نے مرہٹوں کو سنبھلنے کا موقع ہی نہیں دیا اور اس کے سواروں اور پیادوں نے ایک طرف تو مرہٹہ جیوں میں شعلے بھڑکائے اور دوسری طرف جگمگنے والوں کو گاجرمولی کی طرح کاٹنا شروع کر دیا۔

پوری خیمہ گاہ میں قیامت کا سماں تھا۔ مرہٹہ لشکر کی جو خوشی خوشی گھوم پھر رہے تھے

پرسورام کے قاصد نے واپس جا کے اسے تمام گفتگو سے آگاہ کیا۔ پرسورام نے قاصد سے کہا:

”یہ مسئلہ ہر قیمت پر طے کرنا ہے۔ مصیحت تو یہ تھی کہ دولت خاں نے چارہ کے بدلے چالیس کئے تھے تو تم نے اسی وقت ”ہاں“ کہہ دی ہوتی ر رقم مجھے دینا ہے اور دولت خاں کو لینا ہے اور یہاں آ کے میرے لشکر کے اندر۔ سمجھے کہ نہیں!“

قاصد مسکرا دیا:

”اب تو غلطی ہو گئی۔ حکم ہو تو پھر جاؤں اور چالیس لاکھ پر معاملہ طے کر آؤں!“

”نہیں۔“ پرسورام نے کہا:

”اس کی ضرورت نہیں۔ اب اسے آنے دو۔“

پرسورام کو اطمینان ہو گیا کہ اب قلعہ چیتلارگ پر اس کا قبضہ ہو جائے گا۔ چنانچہ اس حکم دیا کہ رات کو جب قلعہ دار دولت خاں آئے تو اس کا شاندار استقبال کیا جائے۔ بظاہر اس نے یہ اعلان کیا۔ لیکن — اپنے خاص دستے کو حکم دیا کہ جب دولت خاں اس وقت گفتگو کو آئے تو اس کے خیمے کو گھیر لیا جائے اور جب وہ اشارہ کرے تو دولت خاں کو گرفتار کر لیا جائے۔

شاید اس وجہ سے مثل مشہور ہے کہ محبت اور جنگ میں ہر بات جائز ہے۔

پرسورام نے یہ انتظام تو کر لیا کہ وہ دولت خاں کو واپس نہیں جانے دے گا مگر اس پر غور نہیں کیا کہ دولت خاں بھی آخر ایک پرانا اور گھاگ قلعہ دار ہے۔ جب وہ دشمن کی خیمہ گاہ میں جا رہا ہے تو اس نے اپنی حفاظت کا بھی کوئی انتظام کیا ہو گا۔

چنانچہ—

رات ہوتے ہی پرسورام کی خیمہ گاہ میں دولت خاں کے استقبال کی تیاریاں ہونے لگیں دوسری طرف دولت خاں انڈھیرے میں قلعے کا دروازہ کھول کے باہر نکلا۔

دولت خاں قلعے سے نکلا تو اس کے ساتھ صرف پانچ سوار تھے لیکن جب وہ قلعہ سے دُور آگے چلا گیا تو قلعہ سے سواروں کے دو رسالے اور ان کے پیچھے ایک ہزار جدیدہ جیہ

تباہ و برباد کر ڈالتے۔  
 کمری گٹھ تک پہنچتے پہنچتے انگریزی فوج پر دس بارہ حملے اور شب خون مارے جا چکے تھے  
 سپہ سالار قمر الدین نے اس سلسلہ میں ایک بڑی دلچسپ حرکت کی تھی۔  
 اس نے اپنے لشکر میں اعلان کر دیا تھا کہ:  
 جو لشکر کسی انگریزی ناک اور کان کاٹ کے لائے گا اسے ایک طلائی ہون  
 انعام میں دیا جائے گا۔  
 انعام سے لدا ہوا بیل پکڑ کے لائے گا تو پانچ طلائی ہون انعام میں دیے  
 جائیں گے۔

اور اگر گھوڑا لائے گا تو اسے دس طلائی ہون انعام میں ملیں گے!  
 قمر الدین کے اس اعلان کا یہ اثر ہوا کہ انگریزوں کے کٹے ہوئے کانوں اور ناکوں  
 کا روزانہ ایک ڈھیر لگ جاتا تھا اور انگریزی فوج اس قدر دہشت زدہ ہو گئی تھی کہ ان کا  
 کوئی سپاہی لشکر سے پانچ گز دور جانے کی بھی ہمت نہ کرتا تھا۔  
 چنانچہ جب انگریزی فوج کمری گٹھ پہنچی تو ناک کان کٹے سینکڑوں انگریزوں کا الگ  
 ایک دستہ بن چکا تھا اور فوج کے پاس سامان رسد تقریباً ختم ہو گیا تھا۔  
 ۱۴ مئی ۱۷۹۱ء کو نصف شب کے قریب انگریزوں نے سرنگا پٹم پر حملہ کیا۔ حملہ میں  
 حصہ لینے والے لشکر میں انگریزوں کی چھ ہتالیں فوج، ہندوستانیوں کی بارہ ہتالیں اور ایک  
 ہزار سوار اور ۲۶ توپیں شامل تھیں۔  
 کارنوالس کی بدقسمتی یا سلطان کی خوش نصیبی تھی کہ اس رات شدید قسم کا طوفان باد و مارا  
 آیا۔ طوفان اس قدر شدید تھا کہ انگریز کا نڈر کو حملہ کا حکم واپس لینا پڑا۔ اور ان کے لشکر کو صبح  
 تک تاریکی اور بارش دیکھ کر میں ٹانگ ٹوٹیاں مارتے رہے۔

صبح کو جب مطلع صاف ہوا تو انگریزوں نے دیکھا کہ کمری گٹھ کی پہاڑیوں پر سلطان کا سپہ سالار  
 سید حمید قابض ہے۔ ان پہاڑیوں پر سید حمید نے رات کے طوفان باد و مارا کے دوران قبضہ  
 کیا تھا۔

بیٹھے آپس میں خوش گپیں کر رہے تھے۔ ان پر حملہ ہوا تو وہ بدحواس ہو گئے اور جس کا جھرمٹا  
 وہ جاگ اٹھا کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔  
 چشم زدن میں لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔  
 پر شورام ایسا گھبراہٹ سے سر پر رکھ کر صوبہ مرا کی طرف بھاگا۔ کچھ لشکر اس کے ساتھ  
 ہو رہے۔ باقی کوئی ادھر گیا کوئی اُدھر گیا۔  
 پر سورام کا پورا لشکر تباہ ہو گیا۔ وہ صوبہ مرا میں بھی نہیں ٹھہرا اور جتنے لشکر اس تک  
 پہنچ سکے انہیں ساتھ لے کے انگریزوں سے جاملے۔

لارڈ کارنوالس نے دو ہفتے تیار یوں میں صرف کیے پھر مئی کے پہلے ہفتہ (۱۷۹۱ء) میں  
 پینا پٹن کے راستے سرنگا پٹم روانہ ہوا۔  
 دریا نے کاویری میں ان دونوں پانی خشک تھا اس لیے انگریزی فوج کو دریا پار کرنے میں  
 کوئی پریشانی نہ ہوئی اور وہ اگلے ہفتے سرنگا پٹم سے ۹ میل دور کمری گٹھ پہنچ گئی لیکن اس ہفتہ  
 میں سفر کے دوران اس انگریزی فوج نے جو آدمی چایا اسے سوچ کے ای روٹے نکلے کھڑے  
 ہو جاتے ہیں۔  
 انگریز۔ جو خود کو مذہب قوم کہتے ہیں، ان کی فوج نے کارنوالس کے حکم کے تحت راستے  
 میں پڑنے والی ہر بستی اور آبادی کو لوٹ لیا۔ پھر اس میں آگ لگا کر خاکستر کر دیا۔  
 تہذیب کے ان ٹھیکیداروں نے انسان تو انسان آبادی کے جانوروں تک کو مار ڈالا اور  
 جو کام کے تھے انہیں اپنے ساتھ لے گئے۔  
 قدرت ظالم کو ڈھیل ہمت دیتی ہے لیکن عبرت کے لیے کبھی کبھی اس کو خوفناک سزا  
 بھی دیتی ہے۔

ہم بتا چکے ہیں کہ سلطان نے سید صاحب کو سرنگا پٹم بھیجا تھا اور قمر الدین کو سپہ سالار  
 بنا کر اسے انگریزوں پر حملے اور شب خون مارنے کا حکم دیا تھا۔  
 چنانچہ جب انگریزی لشکر کسی بستی کو تباہ کر کے دم لینا تو قمر الدین کے چھاپہ مار  
 دینے اس پر بلائے گئے ان کو ٹوٹ پڑنے اور قتل و غارت کے ساتھ ساتھ سامان رسد کو

وہ کارنوالس کے پاس آیا۔

کارنوالس اس سے بہت خوش ہوا اور اس کے فوجیوں نے ایک عرصہ کے بعد پیٹ بھر کھانا کھایا۔

اسی اثنا میں کرنل ریڈ نے بنگلہ سے اڈہ، پھلی، شراب، روٹیوں، پنچوں، بکریوں، گایوں اور بیلوں کے ریوڑ کے ریوڑ انگریزی لشکر کو بھجوا دیے۔

کارنوالس اس سے اس قدر خوش ہوا کہ اس نے کرنل ریڈ کو بنگلہ، بھنگور، کولار اور ہسور کی تحصیلداری کے ساتھ ساتھ اس کے علاقہ کے پالیگادوں کی وکالت کا عہدہ بھی بخش دیا۔ پھر جب فوج کا پیٹ بھر تو اس کے دل میں سرنگاپٹم کی تسخیر کا خیال پھر سے کھلنے لگا۔

اس وقت نظام دکن کی فوجیں کڑپہ اور گرم کٹھ کے عوام پر ظلم دھاڑ رہی تھیں اور گھاٹنی قسم کی لوٹ مار میں مصروف تھیں۔

نظام کی فوجوں کا اب تک سلطانی فوجوں سے کوئی معرکہ نہیں ہوا تھا۔ شاید وہ براہ راست سلطان سے ٹکرانا نہیں چاہتا تھا یا پھر وہ یہ سب کچھ کسی خاص منصوبے کے تحت کر رہا تھا۔

جنوبی ہند میں ستمبر کا مہینہ، برسات کا مہینہ کہا جاتا ہے۔ اس لیے کارنوالس نے موسمِ برسات بنگلہ میں گزارنے کا فیصلہ کیا اور فوجوں کی تنظیم نو میں لگ گیا۔

گوشہ زندوں اسے سامانِ رسد کے مسئلے میں جو دشواریاں پیش آئی تھیں ان کے پیش نظر کارنوالس نے فوجی رسد پر خاص توجہ دی تاکہ سرنگاپٹم پر دوبارہ حملہ کے دوران اسے کوئی دقت نہ ہو۔

پھر اسی ستمبر کے مہینہ میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے انگریزوں کو نندی درگ کے قلعہ پر حملہ کے لیے جانا پڑا۔

ندی درگ کا قلعہ سلطان شیو نے اپنے ایک بہادر سردار اٹل علی بیگ کو بطور جاگیر عطا کیا تھا۔ مگر یہ سردار جاگیر پاتے ہی ششیر و سناں کے بجائے چنگ و درباب اور مجبورواؤں کی زلفوں کا اسیر ہو کر رہ گیا۔

اس نے قلعہ داری کے فرائض تو اپنے ایک ہم مشرب اور ہم بیالہ و ہم نوالہ سلطان خاں کو سونپ دیے اور خود حسن و جمال کے افسانوں کا مہر بن کر رہ گیا۔

جاگیردار اٹل علی خاں کے عیش و عشرت کے افسانے جب عام ہوئے اور لوگوں کو یہ

سپہ دار سپید حمید کو پاڑیوں سے ہٹانے کے لیے جبریل میڈوز نے زبردست جدوجہد کیا مگر اس نے زبردست شکست کھائی اور ہزاروں سپاہیوں کی جانیں تلف کرانے کے بعد اسے واپس ہونا پڑا۔

کرنل میکسٹون اور فلائیڈ بھی حملے کے لیے نکلے مگر سپہ سالار قمر الدین کے ہاتھوں شکست کھا کر پسپا ہو گئے۔

لارڈ کارنوالس ۲۸ گھنٹے بھی وہاں نہ ٹھہر سکا اور اس نے واپسی کا ارادہ کر لیا مگر اس دوران لشکر میں سامانِ رسد بالکل ختم ہو چکا تھا اور ہر طرف بھوک، بھوک کی آوازیں بلند ہونے لگی تھیں۔ چیزوں کی قیمت آسمان تک پہنچ گئی تھی۔ چاول، گھی، خشک میوے کا آٹا یا تو ناپید ہو گئے تھے یا اس قدر تنگ ہو گئے تھے کہ انہیں خریدنا ممکن نہ رہا تھا۔

جب فوج بھوکوں مرنے لگی تو اس نے تدبیریں کھینچنے والے بیلوں کو کاٹ کاٹ کر کھانا شروع کر دیا۔

جب رسد کا کوئی انتظام نہ ہو سکا اور حالات بد سے بدتر ہو گئے تو کارنوالس نے واپسی کا اعلان کر دیا۔

اس نے بڑی بڑی زمین میں دفن کر دیں اور کھڑی کے تمام بھاری سامان میں آگ لگا دی۔

سلطان نے جب انگریزی لشکر کی بد حالی کے بارے میں سنا تو اس نے خفاک دتر میووں کے تحائف بھیجے اور ساتھ میں کارنوالس کو دوستی کا ایک خط لکھا۔

مگر کارنوالس نے شرافت کا ثبوت نہ دیا۔ اس نے میوے سے واپس بھجوا دیے اور سلطان کے خط کا کوئی جواب نہ دیا۔

کارنوالس وہاں سے پسپا ہو کر اتری درگ پہنچ گیا۔ سلطانی لشکر کی طرف سے اس کی مزاحمت نہ ہو رہی تھی اس لیے اس نے آسانی سے اتری درگ پر قبضہ کر لیا۔

کارنوالس کو وہاں کثیر تعداد میں سامانِ رسد حاصل ہوا۔ بھوک فوج کو کچا پکا جو کچھ ملادہ کھا گئی اور اسے بدھنھی ہو گئی۔

پرمورام کی نصف سے زیادہ فوج دولت خاں کے ہاتھوں ماری گئی تھی۔ وہ اپنی بچی بچی فوج کے ساتھ انگریزوں کے لیے سامانِ رسد اکٹھا کرتا پھرا۔ پھر بہت سا سامانِ رسد لے کر

معلوم ہوا کہ قلعہ نندی درگ کی حرم سرا سے عفت ماب خواتین نور خضت ہو چکی ہیں اور اب وہ حرم لہا ایک بہت بڑے عشرت کدے میں تبدیل ہو چکی ہے تو غنچہ دوں، بد معاشوں اور پلے لٹنگے اٹھائی گیسروں کی بن آئی۔ انہوں نے ناچنے گانے والی دلرباؤں کے ذریعے جاگیردار لطف علی بیگ تک رسائی حاصل کر لی اور اسے ناچ گانے کے ساتھ ساتھ عیش و عشرت اور شراب و شہاب کا ایسا چسکہ لگا دیا کہ اس نے محل سے نکلنا ہی چھوڑ دیا۔

سلطان خاں اگرچہ لطف علی بیگ کا پرانا ساتھی اور گہرا دوست تھا۔ اسے چاہیے تھا کہ وہ لطف علی بیگ کو سمجھاتا کہ وہ قلعہ داری ہو کہ جاگیر داری، ان دونوں عہدوں پر صرف وہ لوگ قابض رہ سکتے ہیں جو اپنی آنکھیں اور کان کھلے رکھتے ہیں اور جن کا ہاتھ ہر وقت قبضہ شمشیر پر رہتا ہو۔ مگر اسے کیا پڑی تھی کہ وہ بیگ کو اس خوابِ خوشگوشتی سے جگانا۔ اس نے جان بوجھ کے بیگ کو گناہوں کی دلدل میں دھکیل دیا اور خود قلعہ داری کے ساتھ ساتھ اس نے جاگیر داری بھی سنبھال لی۔

سلطان خاں نے جاگیردار لطف علی بیگ کو ہمہ وقت عیش و عشرت میں غرق رکھنے کے لیے کچھ ایسے لوگوں کی خدمات حاصل کر لی تھیں جو، نوجوان عورتوں کی خرید و فروخت کا کام کرتے تھے۔

سلطان خاں ان کے ذریعے ہر ماہ نندی درگ اور اس کے ارد گرد کے علاقوں سے جوان اور نوجوان عورتوں کو منگواتا اور انہیں بھاری رقم دے کر جاگیر داری کی خدمت کے لیے خرید لیتا۔ اس طرح ہر ماہ شاہی حرم سرا (جاگیردار کے محل) میں دس پندرہ نئی عورتوں کا اضافہ ہو جاتا۔ اور اب تو یہ حال ہو چکا تھا کہ عورتوں کی کثرت کی وجہ سے سلطان خاں کو ان کی راکش کے لیے ایک اور محل مخصوص کرنا پڑا تھا۔

اس طرح کا ایک قافلہ اور درگ سے گزرا جہاں کارنوالس کا لشکر ڈیرے ڈالے پڑا تھا۔ اس قافلے میں بیس مرد اور بیس خوبصورت عورتیں تھیں۔

کارنوالس کے لشکر میں جو ہندوستانی پلٹنیں تھیں انہوں نے جوان عورتوں کو دیکھا تو رال ٹیک پڑی اور انہوں نے ان سے پھر پھر شہار شروع کر دی۔ عورتوں کے ساتھ جو مرد تھے وہ سب مسلح تھے۔ انہوں نے عورتوں کی حفاظت کے لیے تلواریں کھینچ لیں۔ دوسری طرف انگریزی فوج کے لشکر بھی تھے۔ انہیں بھلا بیس آدمیوں کی کیا فکر ہوتی۔

وہ بھی تلواریں سونت کر سامنے آ گئے اور ایک چھوٹا سا معرکہ ہو گیا مگر کہاں آزمودہ کار شکاری اور کہاں عورتوں کے تاجر۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دس تاجر اس معرکے میں کام آئے اور باقیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔

لشکریوں نے انہیں پکڑ لیا اور انہیں عورتوں کے ساتھ لے کر اپنی خیمہ گاہ میں پہنچے۔

دوسرے لشکریوں نے عورتوں کو دیکھا تو انہوں نے بھی ان سے پھر پھر شہار شروع کر دی۔ اس بات پر لشکریوں میں آپس میں ٹھن گئی اور وہ گتھم گتھا ہو گئے۔

اس ہنگامے کی خبر اسی وقت کارنوالس کو پہنچائی گئی۔ اس نے چند انگریز سوار بھیج کے سب کو پکڑ لیا۔

جب کارنوالس نے ان سے پوچھ گچھ کی تو اسے معلوم ہوا کہ ان خوبصورت عورتوں کو نندی درگ کے جاگیردار لطف علی بیگ کے لیے لے جایا جا رہا ہے۔

اس انکشاف پر اس شخصے ذہن میں فوراً ایک جنگی چال آئی۔ اس نے عورتوں کے محافظوں کو آڑا کر دیا جنہیں اس کے لشکر کی پکڑ لائے تھے۔ اس کے ساتھ ہی اس نے حکم دیا:

"ان سب کو اچھے سے اچھا کھانا دیا جائے اور انہیں آرام سے رکھا جائے۔"

دوسرے دن کارنوالس نے پانچ مردوں اور پانچ عورتوں کو اپنے پاس بلا کر ان کے سامنے ایک خوبصورت پیش کش رکھی۔

کارنوالس نے ان سے کہا:

"تمہارے دس آدمی اس لڑائی میں مارے گئے ہیں۔ اگر تم اس بات پر تیار ہو جاؤ کہ اپنے ان دس آدمیوں کے بدلے تم اپنے ساتھ ہمارے دس آدمی قلعہ نندی درگ میں لے جاؤ گے تو ہم تمہاری زندگیوں کی حفاظت دینے کو تیار ہیں۔"

ان کی سمجھ میں کارنوالس کی بات نہ آئی کیونکہ وہ ٹوٹی چھوٹی اردو بول رہا تھا اور یہ مرد اور عورتیں اس انگریز کو دیکھ کر ڈر گئے تھے۔

ان میں سے ایک آدمی نے ڈرتے ڈرتے کہا:

"مگر سے صاحب۔ ہماری سمجھ میں آپ کی بات نہیں آتی۔ کسی ہندوستانی کو حکم دیکھیے کہ

آپ کی بات سمجھائے۔

چنانچہ کارنوالس نے ایک ہندوستانی کے ذریعے ان کو اپنی بات سمجھائی اور اس میں یہ اضافہ کر دیا کہ :

"اگر قلعے پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تو تمہیں بہت انعام دیا جائے گا۔"

سورتوں کو انگو کر کے یا بھلا بھلا کے لانے والے ایک ایسے گروہ سے تعلق رکھنے میں جنہیں کوئی بھی شریف آدمی ابھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ ایسے لوگ جب گلی کوچوں سے گزرتے ہیں تو ان کو دتے، شہدے اور بروکر کے ناموں سے پکارا جاتا ہے مگر ایک بات ہم سب مانتے ہیں۔ وہ یہ کہ "مجت" کا جذبہ اللہ کی دین ہے۔ وہ جسے چاہے عطا کر دے رنجت کہہ معنی ہرگز نہیں کہ مرد، خوبصورت عورت اور عورت، وجہ و شکیل مرد سے محبت کرے۔ محبت کسی کو کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کسی کو تعلیم سے محبت ہوتی ہے تو وہ عالم فاضل ہو جاتا، کسی کو دین سے محبت ہوتی ہے تو وہ دین کے لیے شہادت بھی قبول کر لیتا ہے۔

ایسی ہی ایک محبت وہ ہے جو ایک انسان کو اپنی قوم اور ملک سے ہوتی ہے۔ پچھلے صفحات میں ہم لکھ چکے ہیں کہ انگریزوں کے لشکر میں اناج کی اس قدر قلت ہو چکی تھی ان کے لشکر کی بھوکوں مرنے لگے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انگریز فوج جس طرف سے گزرتی تھی وہاں بھی اناج کی کمی تھی حقیقت یہ تھی کہ انگریز راستے میں پڑنے والی تمام آبادیوں کو خاکستر کر دیتے تھے اور یہ خبر جنگ کی آگ کی طرح پوری سلطنتِ خدا داد میں پھیل چکی تھی۔ اس لیے ایسی آبادیوں کے باشندے انگریزوں کے دہاں پہنچنے سے پہلے اپنے اناج کے ذخیرے اس طرح چھپا دیتے تھے کہ انگریزوں کی کوششیں بے سود باوجود انہیں ایک دانہ، تل پاتا جب گاؤں والوں سے اناج کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو وہ منہ بسورنے ہوئے جواب دیتے:

"صاحب۔ ہم تو مہینوں سے فاقے کر رہے ہیں۔"

ان کے اس جواب پر کوئی کیا کر سکتا تھا۔ سوائے اس کے کہ آبادی میں آگ لگا دے اور سب کچھ بھونک دے۔

گاؤں والوں کے اس انکار میں دراصل ان کے دلوں میں اپنے وطن اور ملک کی چھپی ہوئی محبت تھی۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ خواہ انگریز انہیں قتل کر دیں یا ان کے

گھروں کو آگ لگا دیں مگر وہ انہیں اناج کا ایک دانہ نہیں دیں گے۔

گاؤں والوں کی اس محبت اور خلوص کے مقابلہ میں جوان عورتوں کی تجارت کرنے والے ان لوگوں کے دل بھی اپنے وطن اور اپنی قوم کی محبت سے سرشار تھے۔

جب انہیں معلوم ہوا کہ انگریز بندی درگ کے قلعہ پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے آدمی اندر بھیج کر جنگی چال چلانا چاہتا ہے تو ان کے کان فوراً کھڑے ہوئے۔

وہ طبیعت کے کتنے ہی کینے اور ذلیل سہی مگر ان کے دل ملک اور قوم کے خلاف انگریزوں کی کوئی مدد کرنے پر آمادہ نہ تھے مگر وہ کھلے الفاظ میں انکار کی جرأت نہ کر سکتے تھے۔

ان میں سے ایک نے لاوڈ کارنوالس سے سوال کیا:

"صاحب۔ آپ قلعہ پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں مگر یہ دس بارہ آدمی قلعہ کی فوج کو کس طرح مار سکتے ہیں۔ دہاں تو بے انتہا فوج ہے۔"

مکار کارنوالس کا ماتھا ٹھنکا۔

اس نے سوال کرنے والے کو گھور کر دیکھا:

"مجھے اس سے کیا مطلب کہ ہمارے آدمی دہاں کیا کر سکتے ہیں۔ تجھے تو بس ہمارے آدمیوں کو اپنے ساتھ اندر لے جانا ہے۔ تو اس کا جواب دے۔ اگر تو ہمارے کام کو دے تو ہم تجھے مالاً مال کر دیں گے۔"

"ٹھیک ہے صاحب جی۔"

وہ فوراً رضامند ہو گیا مگر منہ بنا کر بولا:

"صاحب۔ میں تو راضی ہوں مگر میرے پانچ ساتھی اور عورتیں جو باہر ہیں۔ اگر وہ نہ لے کر تو کیا ہو گا؟"

کارنوالس اس کے سوال پر چکر اگیا اور سوچ میں پڑ گیا۔ تھوڑی دیر بعد عورتوں کا وہ دلائل خود ہی بول پڑا:

"صاحب۔ آپ مجھے ایک گھنٹے کا وقت دیں۔ اس دوران میں سب کو راضی کر لوں گا۔ پھر آپ کو بتاؤں گا۔"

کارنوالس جیسے مشکل حل ہو گئی۔ اس نے جھٹ سے کہا:

"اگر آپ ٹھیک ہے۔ تم سب کو جا کے راضی کر دو۔"

کارنوالس سے اجازت ملنے پر وہ شخص اپنے ساتھیوں کے ساتھ دہاں سے اڑکے باہر آگیا۔

جب وہ کارنوالس کے پاس اندر گیا تھا تو اسے اپنی جان کی فکر نہ تھی اور اپنے منہ کا خیال تھا مگر جب وہ مکار کارنوالس سے مل کر باہر آیا تو اس کا ذہن اچانک روشن ہو گیا اور یہ ملک و قوم سے محبت کی روشنی تھی۔

اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ کارنوالس اپنے آدمیوں کو قلعے کے اندر اس لیے بھیجا چاہتا ہے تاکہ وہ دہاں پہنچنے کے جاگیردار کو قتل کر دیں اور پھر انگریز فوج قلعہ پر قبضہ کر لے۔ پس —

جب وہ اپنے باقی ساتھیوں اور مظلوم عورتوں کے پاس واپس آیا تو اس کا انداز بدلا بدلا سا تھا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا:

”بھائیو۔ ہماری ذات دنیا کے بدترین لوگوں میں شمار ہوتی ہے لیکن آج ہمیں خدا نے ایک ایسا موقع دیا ہے کہ اگر ہم چاہیں تو اپنے گناہوں سے توبہ کر کے بھلے لوگوں میں شامل ہو سکتے ہیں۔

سب سے پہلے تو میں خود توبہ کرنا ہوں اور اعلان کرنا ہوں کہ انگریزی فوج کو قلعہ بندی درگ پر قبضہ نہیں کرنے دوں گا خواہ اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے۔ اس کے ساتھیوں نے حیرت بھری نظروں سے اسے دیکھا۔ پھر ایک نے پوچھا: ”تیری بات کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ انگریز اور انگریزی فوج سے تو ہم سب کو نفرت ہے مگر تو قلعہ کیسے چھو سکتا ہے۔ انگریزوں کے پاس لشکر ہے۔ قلعہ بندی درگ میں بھی فوج موجود ہے۔ وہ ایک دوسرے سے جنگ کریں گے۔ تو باہم انگریزوں کو قلعہ پر قبضہ کرنے سے کیسے روک سکتے ہیں؟“

”روک سکتے ہیں۔ ضرور روک سکتے ہیں۔“

اس نے زور دے کے کہا:

”انگریز لارڈ ہمارے ساتھ اپنے دس پندرہ آدمی قلعہ کے اندر بھیجا چاہتا ہے اور وہی دس پندرہ آدمی قلعہ میں کوئی گڑبڑ کر کے انگریزوں کا قبضہ کر ادیں گے۔“

”مگر تم کہہ دو گے کیا؟“ پہلے نے پوچھا۔

”میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔“ اس نے کہا:

”اے۔ اگر تم سب میرا ساتھ دو تو میں ان آدمیوں کو جو انگریز لارڈ میرے ساتھ بھیجا رہتا ہے، قلعہ کے اندر پہنچنے ہی ختم کر دوں گا اور قلعہ والوں کو بتاؤں گا کہ یہ لوگ انگریزوں کے جاسوس تھے اور قلعہ کو تباہ کرنے آئے تھے۔“

پہلا فوراً جواب میں بولا:

”جہاں تک ان گورے بندروں کا سوال ہے تو ہم سب ان سے نفرت کرتے ہیں اور یہ بھی نہیں چاہتے کہ وہ قلعہ پر قبضہ کر لیں۔ بہر حال ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ جیسا تم کہو گے ہم ایسا ہی کریں گے۔“

اپنے ساتھیوں کی طرف سے جن میں جوان عورتیں بھی شامل تھیں، اطمینان کرنے کے بعد وہ آدمی پھر کارنوالس کے پاس پہنچا اور اسے اطلاع دی:

”صاحب ہادر۔ ہم تیار ہیں۔ آپ جتنے آدمی چاہیں ہمارے ساتھ بھیج سکتے ہیں۔“

کارنوالس خوش ہو گیا۔ اس نے پہلے صرف دس آدمیوں کی بات کی تھی مگر اب اس کے برخلاف ان لوگوں کے ساتھ اپنے پندرہ آدمی روانہ کر دیے۔

انگریزی فوج قلعہ بندی درگ پہنچ گئی تھی۔ قلعہ والوں کو اس کے آگے پہلے ہی خبر مل چکی تھی اس لیے انہوں نے قلعہ کے تمام دروازے بند کر دیے تھے اور قلعہ کے بڑوں پر چار توپیں چڑھا کر مکمل مدافعتی تدابیر اختیار کر لی تھیں۔

جاگیردار لطف علی بیگ کو بھی شاید کچھ خوف خدا پیدا ہو گیا تھا اس لیے وہ شراب و شباب سے الگ ہو کر قلعہ دار سلطان خاں کے ساتھ دفاعی تیاریوں میں حصہ لے رہا تھا۔

انگریزوں کے مشہور کے مطابق ایک صبح خوبصورت عورتوں اور ان کے محافظوں کا ایک قافلہ جس میں پندرہ آدمی کارنوالس کے بھی شامل تھے، قلعہ بندی درگ کے صدر دروازے کی طرف چلا۔

قلعہ والوں کو ہر وقت انگریزوں کے حملہ کا ارکان رہتا تھا اس لیے انہوں نے چوکی پر ہر صحت کر دیا تھا۔ انہوں نے جو تیس چالیس افراد کا گروہ قلعہ کی طرف آتے دیکھا تو سب تیار

لوگ پچاس گز دور ہو جائیں۔  
 جھنڈے والے نے اپنے ساتھیوں کو جلدی جلدی کچھ ہدایات دیں۔ سب لوگ پیچھے ہٹ کر  
 کھڑے ہو گئے اور جھنڈے والا صدر دروازے کی کھڑکی کے سامنے جا کر کھڑا ہو گیا۔  
 قلعہ کے دروازوں میں فوری ضرورت کے لیے اس قسم کی کھڑکیاں بنائی جاتی تھیں۔ یہ  
 دراصل چھوٹے دروازے ہی ہوتے تھے جن میں جھک کے داخل ہوا جاتا تھا۔  
 جھنڈے والے کے لیے کھڑکی کھل گئی اور جونہی وہ اندر داخل ہوا کھڑکی پھر بند ہو گئی۔  
 اسے پریداروں کے سردار کے سامنے پیش کیا گیا۔

یہ بھی ایک اتفاق تھا کہ قلعہ دار سلطان خاں اس وقت گشت کرتا ہوا صدر دروازے پر  
 پہنچ گیا۔ اسے پریداروں نے سب کچھ بتا دیا تھا اور اسی کے حکم پر صرف جھنڈے والے  
 کو اندر بلا یا گیا تھا۔

جھنڈے والے کو جیسے ہی قلعہ دار سلطان خاں کے سامنے پیش کیا گیا اس نے فوراً اسے  
 پہچن لیا۔ سلطان خاں کو بھی اس دلال کو پہچاننے میں ذرا بھی دقت نہ ہوئی۔  
 ”اوبد بخت تارا۔ کیا تجھے معلوم نہیں کہ انگریزی فوج نے قلعہ کو گھیر رکھا ہے اور تو پھر بھی  
 عورتوں کو لے کے آیا ہے؟“

اس جھنڈے والے (دلال) کا نام تارا تھا۔ وہ ہندی درگ لانے والی عورتوں کا سودا سلاطین  
 خاں ہی سے کرتا تھا۔ اس طرح وہ دونوں ایک دوسرے کے رازدار تھے۔  
 تارا کو تعجب ہو رہا تھا کہ خود قلعہ دار نے ہی اس سے عورتیں منگوائی ہیں اور اب خود  
 ہی اسے ڈانٹ رہا ہے۔

”تارا کے دل میں جب الوطنی کی جوت جاگ پڑی تھی اس لیے اس نے تمام خیالوں کو ذہن  
 سے جھٹک دیا اور بولا:

”قلعہ دار بہادر۔ میں جانتا ہوں کہ اس وقت قلعہ والوں کو خود بصورت عورتوں کی ضرورت نہیں۔  
 اور نہ میں عورتوں کا سودا گرہن کہ آیا ہوں۔ میں اس وقت کسی اور جذبہ کے تحت اپنی جان  
 جھٹیل رہا ہوں۔ یہاں تک پہنچا ہوں۔“

سلطان خاں چونکہ ثابت ہو چکا تھا اس لیے وہ تارا کے جواب پر چڑ گیا:  
 ”تیرا اور کون سا جذبہ ہو سکتا ہے۔ عورتوں کی خرید و فروخت کرنے والے سے تارے

ہو گئے۔

پھر جب ان کی نظر ایک سفید جھنڈے پر پڑی تو انہیں کچھ اطمینان ہوا کہ یہ ”صلح کا دھندہ“  
 آرہا ہے۔ پھر بھی وہ چوکس رہے۔

یہ مختصر قافلہ جس کے آگے آگے سفید جھنڈا لے کر چلنے والا دی عورتوں کا سودا گر تھا  
 جس نے کارنوالس سے گفتگو کی تھی صدر دروازے کے قریب پہنچا تو دروازے کے ادھر  
 کی ایک برجی سے کسی شخص نے گردن نکال کر سوال کیا:

”کون ہو تم لوگ اور کیا چاہتے ہو؟“

جھنڈے والے آدمی نے پوری آواز سے جپتے ہوئے کہا:

”ہم سودا گر ہیں اور سلطان خاں قلعہ دار نے جو سامان منگایا تھا وہ لے کر آئے ہیں۔“

”کیا سامان منگایا تھا قلعہ دار نے؟“

جھنڈے والا گھبرا گیا۔

اب وہ کیسے کہتا کہ سلطان خاں نے جاگیردار لطف علی بیگ کے لیے خوبصورت اور جوان  
 عورتیں منگوائی تھیں۔

اس خراس نے گردہ میں سے عورتوں کو الگ کھڑا کر دیا۔ پھر عورتوں کی طرف ہاتھ سے اشارہ  
 کرتے ہوئے بولا:

”یہ سامان منگایا تھا سلطان خاں نے۔ وہ جاگیردار صاحب کو تحفہ دینا چاہتے ہیں۔ میں  
 انہیں لے کے آیا ہوں۔“

قلعہ کی برجی میں کچھ دیر خاموشی رہی۔

دراصل صدر دروازے کے محافظ عورتوں کو دیکھ کر پریشان ہو گئے تھے۔ انہیں یہ تو  
 معلوم تھا کہ جاگیردار لطف علی بیگ کے لیے روز ہی کسی نہ کسی دلال کے ذریعے خوبصورت  
 عورتیں آیا کرتی ہیں لیکن جب سے ہندی درگ میں یہ افواہ پھیلی تھی کہ انگریزی فوج ادھر آ رہی  
 ہے، تب سے قلعہ کے دروازے نہ صرف بند رہتے تھے بلکہ باہر سے اندر آنے والے کے  
 بارے میں بڑی سخت تحقیقات ہوتی۔ پھر اسے اندر آنے کی اجازت ملتی۔

آخر برجی سے پھر آواز ابھری:

”جس آدمی کے ہاتھ میں جھنڈا ہے صرف وہ دروازے کی کھڑکی کے پاس آئے باقی تمام



برائی اور گناہ کے کسی نیکی کی توقع تو نہیں کی جاسکتی۔  
 تارا کو بھی غصہ آگیا۔ اس کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔  
 ”قلعدار بہادر۔ میں آپ سے انعام لینے یا عورتوں کی قیمت وصول کرنے نہیں آیا بلکہ یہ  
 بنانے آیا ہوں کہ میرے ساتھ انگریزی فوج کے پندرہ جاسوس آئے ہیں اور انگریز کمانڈر  
 نے اس سلسلے میں مجھے بھاری رشوت کی پیشکش کی ہے۔“  
 قلعدار سلطان خاں کا سارا غصہ کا فور ہو گیا۔ وہ اٹھ کے جلدی سے تارا کے پاس آیا اور  
 بڑی محنت سے بولا:  
 ”تارا۔ کیا تو سچ کہہ رہا ہے۔ تیرے ساتھ دشمن کے جاسوس آئے ہیں؟“  
 ”ہاں ہاں۔“ تارا نے زور دے کر کہا:  
 ”اور اگر ان جاسوسوں کو گرفتار نہ کیا گیا تو یہ پندرہ آدمی قلعہ کے اندر آ کر خدا معلوم  
 کیا نصب ڈھائیں گے۔“  
 قلعدار اور گھبرا گیا:  
 ”کہاں ہیں وہ جاسوس۔ مجھے بتا۔ مجھے دکھاتا۔“  
 قلعدار صاحب۔ ”تارا نے کہا:  
 ”آپ آرام سے بیٹھ کر میری بات سنیے۔ اس طرح گھبرانے سے کچھ نہیں بنے گا۔“  
 قلعدار واپس جا کر اپنی جگہ پر بیٹھ گیا:  
 ”ہاں تارا۔ اب بتا۔“  
 ”تارا نے دوسرے آدمیوں کو ہٹوا کے اپنی پوری کہانی قلعدار کو سنادی۔ قلعدار کی عقل  
 دنگ رہ گئی۔ اس نے تارا سے پوچھا:  
 ”اب بتا۔ تیری کیا رائے ہے ان جاسوسوں کے بارے میں؟“  
 ”میری رائے تو یہ ہے قلعدار صاحب۔“  
 ”تارا کے لیے میں نفرت در آئی:  
 ”ان تمام جاسوسوں کو قلعہ میں داخل ہوتے ہی قتل کر دیا جائے۔ نہ رہے گا بانس۔ نہ  
 بچے گی بانسری۔“  
 ”ٹھیک ہے۔“ قلعدار نے اس کی رائے کی تائید کی۔

”مگر تم کہتے ہو کہ ان جاسوسوں کے ساتھ تمہارے اپنے آدمی بھی ہیں۔ انہیں کس طرح  
 پہچانا جائے گا۔“  
 تارا نے قلعدار کو اطمینان دلایا:  
 ”ان کی آپ فکر نہ کریں۔ میں نے اپنے آدمیوں کو سمجھا دیا ہے کہ وہ قلعہ میں داخل ہوتے  
 وقت اپنے سرخ رومال اپنے ہاتھ میں پکڑ لیں۔ پس جن لوگوں کے ہاتھوں میں سرخ رومال ہوں  
 انہیں چھوڑ کے باقی سب کو فوراً قتل کر دیا جائے۔“  
 قلعدار سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے کہا:  
 ”تمہارا کتا میں ماننا ہوں مگر اس سلسلے میں مجھے جاگیردار لطف علی بیگ سے گفتگو  
 کرنا ہوگی۔“  
 تارا کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔ وہ خاموش رہا۔  
 قلعدار اسے ساتھ لے کے باہر آیا۔ اس نے حکم دیا کہ صدر دروازے کے سامنے  
 اندر کی طرف ننگی تلواریں لے کر لشکری دو قطاروں میں کھڑے ہو کر ایک راستہ بنالیں۔ اس  
 راستے سے باہر سے آنے والے مرد اور عورتوں کو گزرا جائے گا۔ عورتوں سے کوئی تعزین نہ  
 کیا جائے اور جن مردوں کے ہاتھ میں لال رومال ہوں ان کو بھی نہ روکا جائے البتہ جن افراد  
 کے ہاتھ میں لال رومال نہ ہوں انہیں گرفتار کر لیا جائے اور اگر وہ مزاحمت کریں تو انہیں فوراً  
 قتل کر دیا جائے۔  
 چنانچہ اس حکم پر عمل کیا گیا۔  
 قلعدار نے تارا کو قلعہ سے باہر بھیج دیا تاکہ وہ اپنے ساتھیوں کو اندر لے آئے۔ تارا نے  
 سب عورتوں کو قلعہ کی کھڑکی سے اندر بھیجا۔ ان کے بعد آدمیوں کو اندر بھیجنا شروع کیا۔ وہ اپنے  
 آدمیوں اور انگریزوں کے جاسوسوں کو الگ الگ نہ کر سکا۔ اگر وہ ایسا کرنے کی کوشش  
 کرتا تو جاسوسوں کو شبہ ہو سکتا تھا۔  
 جب تمام آدمی قلعہ کے اندر جا چکے تو آخر میں تارا خود اندر گیا۔  
 اس نے دیکھا کہ اس کے سب ساتھی ہاتھوں میں لال رومال پکڑے کھڑے تھے اور  
 جاسوسوں کو گرفتار کر کے پایہ زنجیر کر دیا گیا تھا۔  
 روایت ہے کہ اندر آنے والے جاسوسوں سے جب سختی سے پوچھا گیا اور ان سے کہا گیا

کہ اگر وہ اقبالِ جرم کر لیں تو ان کی جان بخشی کر دی جائے گی تو اس پیش کش کا بہت اچھا اثر ہوا۔

جاسوسوں نے بتایا کہ ان میں سات آدمیوں کو قلعہ دار کے قتل اور آٹھ آدمیوں کو جاگیر دار کے قتل پر مامور کیا گیا تھا اور انہیں حکم تھا کہ وہ ایک ہی وقت میں دونوں کو قتل کریں۔ پھر تفصیل پر چڑھ کے سیاہ رومال ہلائیں تاکہ محاصرہ کرنے والا لشکر فوراً قلعہ پر حملہ کر دے۔

ملف علی بیگ نے جاسوسوں کی جان بخشی کر دی اور قسم کھائی کہ وہ آخری وقت تک قلعہ کو بچانے کی کوشش کرے گا اور انگریزوں کے ساتھ کسی قسم کی صلح کی بات چیت نہ ہوگی۔ اس نے اُن تمام عورتوں کو آزاد کر دیا جو اُس کے لیے خرید کے لائی گئی تھیں۔ اس نے تمام لڑکیوں اور عورتوں سے وعدہ کیا کہ جنگ کے بعد وہ انہیں ان کے گھروں تک پہنچائے گا۔ وہ پوری طرح تائب ہو گیا تھا۔

لیکن۔

ملف علی بیگ کو اپنی بات پوری کرنے کا موقع نہ مل سکا۔ انگریزوں نے ایک ہفتہ انتظار کرنے کے بعد قلعہ نندی درگ پر زبردست حملہ کر دیا۔ اس حملہ کی مدافعت بھی زبردست طریقے سے کی گئی۔ دو ہفتوں تک قلعہ پر حملے ہوتے رہے مگر قلعہ و دہ نے حملہ آوروں کو قلعہ سے دور ہی رکھا۔ پھر اٹھارہویں دن مسلسل گولہ باری سے قلعہ کی تفصیل میں سوراخ ہو گیا اور انگریزی فوج کو قلعہ میں داخل ہونے کا موقع مل گیا۔

مندے درگے پر قبضہ کے سلسلے میں ایک مورخ کا بیان اس طرح

ہے کہ:

"میجر گوڈی نے آگے بڑھ کر قلعہ پر حملہ کیا اور مسلسل اٹھارہ روز کی جدوجہد کے بعد قلعہ کی دیوار منہدم کر دینے میں کامیاب ہو گیا۔

اس کے بعد ایک رات جہل بیدوز نے آکر مورچوں میں قیام کیا اور سپاہیوں کو لالچ دیا کہ وہ قلعہ پر قبضہ کر کے ہر قسم کی لوٹ مار اور جو چاہے وہ کر سکتے ہیں۔

اس لالچ میں آکر فوجیوں نے نہایت بے باکانہ قلعہ پر حملہ کیا اور جلد ہی قلعہ پر قبضہ کر کے بڑی بے دردی سے بلا تخصیص لوگوں کا قتل عام کیا۔ انہوں نے بچوں کو بخشانہ بوڑھوں کو۔ خواتین کے ساتھ انہوں نے جو سلوک کیا، اس کے تصور ہی سے گردن جھک جاتی ہے۔ لوٹ مار کا وہ بازار گرم کیا کہ پورے قلعہ میں ایک دمڑی اور ایک چھلہ بجھنے لگا۔

یہ سلوک ہے اس قوم کا جو خود کو یورپ کی مذہب ترین قوم سمجھتی ہے۔ سامی مؤرخ

نے لطف علی بیگ کو قلعہ دار در سلطان خاں کو بخش دیا۔

قلعہ پر قبضہ کے بعد لطف علی بیگ اور سلطان خاں دست بدست جنگ کرتے ہوئے شدید زخمی ہو گئے تھے۔ ان دونوں کو زخمی حالت میں بیڑیاں پہنا کر جہز میڈوز کے سامنے پیش کیا گیا۔ دونوں زخموں سے پُور ہو رہے تھے۔ جہز میڈوز نے دریافت کیا:

”تم دونوں میں لطف علی بیگ قلعہ دار کون ہے؟“

لطف علی بیگ کے جواب دینے سے پہلے سلطان خاں بول پڑا:

”قلعہ دار میں ہوں۔“

لطف علی بیگ جو زیادہ خون بہ جانے کی وجہ سے نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔ اس نے سر کو تھکادے کر آنکھیں کھولیں اور بولا:

”اس کی بات کا اعتبار نہ کرنا یہ میرا ملازم ہے اور مجھے پچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے لطف علی بیگ میرا نام ہے اور میں قلعہ بندی درگ کا حکمران ہوں۔“

جہز میڈوز نے حیران نظروں سے دونوں کو دیکھا:

”بلاشبہ تم دونوں بہادر ہو۔“

”اور بلاشبہ تم اور تمہارا لشکر بزدل ہے جس نے بچوں اور بوڑھوں کو بھی نہیں بخشا اور خواہین کی وہ بے حرمتی کی ہے کہ تاریخ میں جب بھی اس کا ذکر آئے گا تمہاری قوم شرم سے سر نہ اٹھا سکے گی۔“

جہز میڈوز کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

وہ دیر تک خاموش رہا پھر اس نے سر اٹھا کر کہا:

”تم نے ہمارا مقابلہ بہادری سے کیا۔ ہم تم سے خوش ہوئے۔ اچھا یہ بتاؤ کہ اگر ہم تمہیں آزاد کر دیں تو تم کیا کر دو گے؟“

لطف علی بیگ نے سلطان خاں کی طرف دیکھا مگر اس کا سر زمین سے جا لگا تھا۔ شاید وہ بے ہوش ہو گیا تھا۔

تب — لطف علی بیگ نے کہا:

”پہلے یہ بتاؤ تم میں کارنوالس کون ہے؟“

”وہ یہاں نہیں ہیں۔“ جہز میڈوز نے جواب دیا:

”اپنے نیچے میں ہیں۔“

لطف علی بیگ کا چہرہ کچھ اور چمکا پڑ گیا۔ اس نے سر جھکایا۔

جہز میڈوز نے اسے پھر بھیڑا:

”تم نے ہمارے سوال کا جواب نہیں دیا۔“

”کارنوالس نہیں ہے۔ اب کیا جواب دوں میں؟“

”اگر کارنوالس موجود ہوتے تو تمہارا جواب کیا ہوتا؟“

پھر میرا جواب کچھ اس طرح ہوتا۔“

لطف علی بیگ زخموں سے زیادہ خون بہ جانے کی وجہ سے مضطرب ہو کر زمین پر بیٹھ گیا اس نے زور لگا کر اپنی قوت جمع کی اور کہا:

”اگر میں آزاد ہوتا اور کارنوالس بھی یہیں ہوتا تو میں تم سے تلوار چھین کر اُس پر حملہ کرتا اور اس وقت تک اس سے لڑتا رہتا جب تک دونوں میں سے ایک کا خاتمہ نہ ہو جاتا۔“

لطف علی بیگ کے اس جواب پر جہز میڈوز کا نل میکسٹون اور دیگر انگریز افسروں کی آنکھیں حیرت و استعجاب سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔

مرنگا پٹم پر پہلے حملہ میں ناکامی کے بعد کارنوالس پسپا ہو کر بنگلور پہنچا تھا۔ بنگلور میں سستانے اور دوبارہ تیاری کرنے کے بعد اب پھر وہ مرنگا پٹم پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

یہ بات قابل غور تھی کہ سلطان اس وقت تک براہ راست کارنوالس کے مقابلے پر نہیں آیا تھا۔ یہ دراصل سلطان کی ایک اعلیٰ جنگی چال تھی اور اس کی تہ تک آخر کارنوالس پہنچ گیا تھا۔

کارنوالس کو یقین ہو گیا تھا کہ سلطان اسے چھوٹی چھوٹی لڑائیوں میں الجھا کر اس کی طاقت کو کمزور کرنا چاہتا ہے تاکہ جب وہ پلٹ کر جوابی حملہ کرے تو کارنوالس کی کمزور طاقت اس کی تاب نہ لا سکے۔ انگریز جرنیل، سلطان کی اس چال کا بہر صورت جواب دینا چاہتے تھے۔

کو فتح کرنے کے لیے روانہ کر دیا۔ پالا گھاٹ کے قریب ہونے کی وجہ سے کوئٹہ کے قلعہ کا بہت اہمیت تھی۔

کوئٹہ میں انگریز لیفٹیننٹ چارلس اور فرانسیسی کمانڈر ٹی لاکو بیسے موجود تھے۔ لاکو بیسے کے زیرِ کمان ٹراونکور کے آصف جاہ کی فوج تھی۔

میر قمر الدین نے دہاں پہنچتے ہی قلعہ کا محاصرہ کر لیا اور قاصد کے ذریعے انگریزوں اور فرانسیسیوں کو پیغام دیا کہ وہ قلعہ خالی کر کے جدھر جانا چاہیں جاسکتے ہیں مگر چارلس اور لاکو بیسے نے جواب دینے کے بجائے قاصد کو گرفتار کر کے قید کر دیا۔

میر قمر الدین نے تمام دن اور پوری رات قاصد کی واپسی کا انتظار کیا۔ پھر قمر الدین خود قاصد بن کے اور سفید جھنڈا لپیٹ کر قلعہ کے صدر دروازے پر جا پہنچا۔

اس نے اوپر نظر اٹھا کر دیکھا تو فصیل اور برجیوں پر لشکر کی دکھائی دیے۔ میر نے منہ اوپر کر کے زور سے کہا:

”میں سلطانِ لشکر کے سالار میر قمر الدین کا قاصد ہوں۔ مجھے اس لیے بھیجا گیا ہے کہ میں یہ معلوم کروں کہ کلا جو ہمارا قاصد بھیجا تھا اس پر کیا گزری؟ وہ واپس کیوں نہیں گیا؟ کیا اسے گرفتار کر لیا گیا ہے؟“

انگو الباسے تو یہ بین الاقوامی قانون کی خلاف ورزی ہے اور قاصد کو گرفتار کرنا اپنی کمزوری کو چھپانے کے مترادف ہوتا ہے۔

اوپر سے کوئی جواب نہ آیا۔

تھوڑی دیر انتظار کے بعد قمر الدین نے پھر کہا:

”میں دیکھ رہا ہوں کہ فصیل اور دروازے کے اوپر لشکر کی موجودگی مگر کسی کے منہ میں زبان نہیں کہ میرے سوال کا جواب دے۔ کیا اوپر موجود تھا لوگ گونجے اور ہرے میں؟“

اس وقت کسی نے اوپر سے ہرنگال کر جواب دیا:

”ہمارے پاس کوئی قاصد نہیں آیا۔ اگر تم ہم سے گفتگو کرنا چاہتے ہو تو ہم تمہیں اندر آنے کی اجازت دے سکتے ہیں!“

جب انگریزی فوج سرنگاپٹم پر ناکام ہو کر واپس چلی گئی تو سلطان نے اپنے بڑے بیٹے فتح حیدر کو ایک بڑے لشکر کے ساتھ گرم کٹھہ کی طرف روانہ کیا۔

گرم کٹھہ کو دشمن فوجیں محاصرے میں لیے ہوئے تھیں۔ فتح حیدر کے ساتھ جانے والی فوجوں کے حوصلے بلند رکھنے کے لیے سلطان نے فوجیوں کو سال بھر کی تنخواہ پیشگی ادا کر دی تھی۔

ظاہر ہے کہ اس سے فوج میں اپنے سردار اور سلطان کے لیے کسی قدر اچھے جذبات پیدا ہوئے ہوں گے اور انہوں نے ان سرکوں میں جوش و خروش سے حصہ لیا ہو گا۔

شہزادہ فتح حیدر تہ کیر کے راستے صوبہ سدا کی طرف روانہ ہوا اور عین اس وقت جب کارنوالس بنگلور میں دم لے رہا تھا، شہزادہ فتح حیدر ماگل داڑی (ماگڑی) کے جنگل میں پہنچا۔ اس نے اپنے لشکر کو تو ماگل داڑی میں بھجوا دیا اور چیدہ چیدہ سواروں کے چند دستوں کے ساتھ گرم کٹھہ پہنچا اور حملہ آوروں پر قہر خاندی بن کے ٹوٹ پڑا۔

گرم کٹھہ کا محاصرہ کرنے والی حیدر آبادی فوج کا سردار حافظ مؤید الدولہ تھا۔ شہزادہ فتح کے اس طوفانی حملے میں مؤید الدولہ مارا گیا اور شہزادے نے اس کا سر نیزے پر چڑھا کر بلند کر دیا۔

حیدر آبادی لشکر نے جب اپنے سردار کا یہ حال دیکھا تو وہ منتشر اور پرانگندہ ہو کر میدان چھ کر کٹیر کی طرف جاگ نکلا۔

شہزادہ فتح حیدر گرم کٹھہ میں کامیاب ہونے کے بعد لشکر لے کر موہن پٹی اور انبارہ طائف روانہ ہوا۔ دہاں نواب دکن کے بیٹے سکندر جاہ اور مشیر الملک کی فوجیں پڑاؤ ڈالے پڑی تھیں۔ انہیں مؤید الدولہ کے مارے جلنے کی خبر مل چکی تھی راب جو انہیں معلوم ہوا کہ شہزادہ ان کی طرف آ رہا ہے تو وہ اپنی فوجیں لے کر سنگل پالیہ کی طرف جاگ نکلا۔ شہزادہ دہاں پہنچا تو میدان صاف تھا۔ پھر وہ مدگیری ہوتا ہوا سرنگاپٹم واپس چلا گیا۔

سلطان ٹیٹو کی اب بھی کوئٹہ میں کوشش اور پالیسی تھی کہ انگریزوں کے ساتھ براہِ راست مقابلہ کرنے کے بجائے ان کی فوجوں کو ادھر ادھر لٹھاکے ان کی طاقت کو توڑ جائے اور وہ اس کوشش میں کامیاب بھی نہ ہو۔ چنانچہ اس نے انگریزوں کو ہراساں کرنے اور ان کی فوج دوسری طرف مبذول کرانے کے لیے میر قمر الدین کو آٹھ ہزار باقاعدہ فوج کے ساتھ کوئٹہ

اس جنگ کے دوران سلطان، انگریزوں سے صلح کی مسلسل کوشش کرتا رہا۔ اس کی سب سے بڑی وجہ اس کے اپنے قریبی امرا اور دزرا کی مفاد پرستی اور ملک و قوم اور سلطان سے غداری تھی۔

یوں معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے ان غداروں کی صورتیں پہچان لی تھیں مگر وہ اس قدر زور آور ہو چکے تھے کہ ان پر ہاتھ ڈالنا، سلطنت خداداد کے جلد زوال پذیر ہونے کا سبب بن سکتا تھا۔ اس لیے سلطان، انگریزوں سے جس صورت جلد زوال صلح کر لینا چاہتا تھا۔ سلطان نے صلح اور دوستی کے سلسلے میں جرنل میڈوز کو دو سال پہلے ایک خط لکھا تھا جس میں اس نے یہ پیش کش کی تھی کہ دونوں طرف کے وکیل باہم مل کر مسائل کو حل کریں مگر اس کا جواب میڈوز نے جس حقارت سے دیا اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے۔

اُس وقت کارنوالس کو یہ چاہیے تھا کہ وہ معاملہ کو طول دینے کے بجائے گفت و شنید کا آغاز کرنا مگر اس کے سر پر تو سرنگا پٹم کی فوج کا بھوت سوار تھا۔

چنانچہ — انگریزوں کے اس صاحب اقتدار لارڈ کارنوالس نے جرنل میڈوز کو سلطان کے بارے میں جو زہر آلود خط لکھا اس سے ظاہر ہو گیا کہ کارنوالس، سلطان جیسے ذہین، جرات مند اور حریت پسند حکمران کو سلطنت خداداد کے تحت و تاج سے محروم کر کے میسور کے سابق راجہ کو تخت پر بٹھانا چاہتا ہے۔ اس نے جرنل میڈوز کو یہ اختیار دیدیا کہ اگر سلطان اس کی خواہش کے ثبوت پر مندرجہ ذیل شرائط کو تسلیم کر لے تو اس سے گفتگو کی جاسکتی ہے:

۱۔ ہذا ذات خود ہتھیار ڈال دے۔

۲۔ سرنگا پٹم حوالے کر دے۔

۳۔ یا اپنے بڑے بیٹے کو بنگلور کے قلعہ کے ساتھ تھاری تحویل میں

بطور رغال دیدے۔

اس کے علاوہ:

۱۔ انگریز قیدیوں کو رہا کرے۔

۲۔ تدارک جنگ ادا کرے جس میں سے انہوں اور انہما کو برابر حصہ

ملے گا۔

یہ سن کے میر قمر الدین نے ایک قلعہ لگایا اور جواب دیا: "تم کہتے ہو کہ اندر آ کر تم سے گفتگو کروں تاکہ تم مجھے بھی گرفتار کر کے اسی جگہ بھیجو جہاں میر سے پہلے ساتھی کو بھیجا ہے۔ یاد رکھو کہ:

آزمودہ را آزمودن جہل است  
(آزمائے ہونے کو آزمائے دقتی ہے)

اور یہ بھی یاد رکھو کہ قاصد کو گرفتار کرنے والے کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔ تم لوگ انتقام سے نہ بچ سکو گے۔

اس کے ساتھ ہی میر قمر الدین نے اپنا گھوڑا تیزی سے موڑا۔ ادھر اُس نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگائی اُدھر فصیل اور برجوں سے اس پر تیردوں اور گولیوں کی بارش شروع ہو گئی۔ مگر قمر الدین کا گھوڑا، ہوا کے گھوڑے پر سوار ہو چکا تھا۔ تیر اور گولیاں اس کی گرد کو بھی نہ پہنچ سکیں۔

میر قمر الدین واپس پہنچا تو اس کا چہرہ غصے سے سُرخ ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ آٹھ ہزار فوجی اور توپخانہ بھی تھا۔

اس نے فوراً حکم دیا:

"قلعہ پر بغیر کسی دقت کے مسل گولہ باری کی جائے۔"

حکم کی دیر تھی کہ توپخانہ نے چاروں طرف سے قلعہ پر آگ برسنا شروع کر دی۔ ایک بیان کے مطابق قلعہ کو بمبوتور پر تین ہفتے تک گولہ باری ہوئی تو اس کی فصیلیں تو الگ رہیں، پورا قلعہ پیوند خاک ہو گیا۔

انگریز بیفٹینٹ چارمس اور فرانسیسی کمانڈر ڈی لاکو بیس نے معہ اپنی فوج کے ہتھیار ڈال دیے اور ان سب کو گرفتار کر کے سرنگا پٹم بھیج دیا گیا۔

قمر الدین اس معرکے سے فارغ ہونے کے بعد کو بمبوتور کے فوجی اور انتظامی امور دست کرنے میں لگ گیا اور فروری ۱۷۹۲ء تک وہاں موجود رہا۔ پھر اسے سلطان کا ایک فرمان موصول ہوا جس میں اسے بدو فرجانے کا حکم دیا گیا تھا تاکہ وہ بدو فر سے مرہٹوں کو نکال باہر کرے۔ ایک عجیب بات یہ نظر آتی ہے کہ میر قمر الدین اس جوانمردی سے انگریزوں کے خلاف جبراً زار مگر اس کے بعد وہ انگریزوں کے خلاف کسی جنگ میں نظر نہیں آتا۔

۲۔ مکلی طور پر معاہدہ ہونے تک ہر ماہ خراج ادا کرنا رہے۔

قیدیوں کے بتا دے کے سلسلے میں سلطان نے ایک اور خط کارنوالس کو بھیجا جس میں پیش کش کی کہ وہ اپنا ایک معتمد امن کی گفت و شنید کے لیے بھیجنے کا خواہش مند ہے مگر مکار کارنوالس نے اس کے جواب میں کڑی شرطیں لگا دیں اور شہزادے کو یہ گال بنانے پر زور دیا۔

پھر جب کارنوالس سرنگاپٹم پر حملہ میں ناکام ہوا اور محاصرہ اٹھا کر بنگلور واپس چلا گیا تو اس کے ردیے میں کچھ چمک پیدا ہو گئی کہ اس کی فوج بھوکوں مر رہی تھی اور اسے کسی طرف سے رسد نہ مل رہی تھی۔ یہاں تک کہ فوجی، توپ خانہ کھینچنے والے گھوڑوں کو بھی ذبح کر کے کھا گئے تھے۔

ان مصائب میں اس نے صلح کا ارادہ کیا مگر بنگلور میں مرہٹہ فوج پہنچ گئی۔ اس کے پاس سامان رسد وافر مقدار میں موجود تھا۔ چنانچہ جب اس کو اور اس کے فوجیوں کو پیٹ بھر کھانا ملا تو اس کا دماغ پھر الٹ گیا۔

اس نے پیو سلطان کے خط کے جواب میں لکھا کہ:  
”صلح کی گفت گو صرف مرہٹوں اور نظام کی موجودگی ہی میں ہو سکتی ہے۔“

حالانکہ سلطان امن کا اتنا خواہش مند تھا کہ اس نے جنرل میڈوز کے پاس خط کے ساتھ خٹک اور تڑے بیود کی پیٹیوں کی پیشیاں بھیج دی تھیں۔

بنگلور سے مرہٹہ فوج پر سورام کی سپہ سالاری میں صوبہ سرکاری طرف روانہ ہوئی تاکہ اس پر قبضہ کر سکے مگر صوبہ سرکار پہنچنے سے پہلے ہی مرہٹہ فوج کا بنگی نواب کی فوج سے مقابلہ ہو گیا۔ بنگی نواب کا اصل نام محمد رضا تھا اور یہ سلطان کے ایک مشہور جنرل تھے۔

محمد رضا مالابار کے جنگلوں میں آگ لگانے کی وجہ سے بنگی نواب کے نام سے مشہور ہو گئے تھے اور ان دنوں قبضہ سمو گا میں اپنے آٹھ ہزار سپاہیوں سمیت موجود تھے۔ بنگی نواب کو مرہٹہ نڈکر کے آنے کی خبر ملی تو وہ آٹھ ہزار پیادوں کے ساتھ مرہٹوں کے سامنے خم ہونے لگا کہ کھڑے ہو گئے۔

پر سورام کے ساتھ بیس ہزار مرہٹہ لڑکے تھا جس میں سچی ہزار سوار بھی تھے۔ ایک طرف

آٹھ ہزار پیادے اور دوسری طرف بیس ہزار کامرہٹہ لشکر۔

ایسا دن پڑا کہ زمین و آسمان کانپ اٹھے۔ بنگی نواب چھلا دے کی طرح میدان کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک گھوڑا بھگاتے اگلے کرتے اور اپنے سپاہیوں کے وصلے بڑھاتے اڑتے پھر رہے تھے۔

مرہٹوں نے بہت دباؤ ڈالا کہ بنگی نواب اور ان کے پیارے میدان چھوڑ جائیں یا پسپا ہو جائیں مگر وہ سب تو آہنی دیوار بن گئے تھے۔ جو سپاہی جاں کھڑا تھا دلوں سے ایک دم پیچھے نہیں ہٹا اور اس نے وہی لڑتے لڑتے شہادت پائی۔

صبح سے دوپہر اور دوپہر سے شام ہو گئی مگر بنگی نواب نے میدان نہیں چھوڑا۔ پھر وہ شدید زخمی ہو کر گرنے لگے تو ایک دفا دار اچک کر ان کے پیچھے گھوٹے پر بیٹھا اور انہیں میدان سے نکال لے گیا۔

مردار کے میدان سے جانے کے بعد سپاہیوں کے وصلے ٹوٹ گئے اور وہ بھی مردار کے پیچھے سموگا سے نکل گئے۔ اور مرہٹوں کا سموگا پر قبضہ ہو گیا۔

پر سورام سموگا پر قبضہ کے بعد بد نور کی طرف چلا۔ بنگی نواب کو شکست دے کر اس کی فوج کے وصلے بہت بلند ہو گئے تھے۔ وہ اس خیال سے بد نور کی طرف گیا تھا کہ وہاں انگریز کمانڈر ایبر کرومبی بھی پڑاؤ ڈالے ہوئے تھا۔ پر سورام چاہتا تھا کہ ایبر کرومبی کے ساتھ ملی کر وہ بد نور پر حملہ کرے اور اس پر قبضہ کر لے۔

مگر جب وہ ایبر کرومبی کے پڑاؤ کے قریب پہنچا تو اسے ایک تیز رفتار سوار آنا دکھائی دیا۔

پر سورام نے حکم دیا:

”اس ہوار کو روکا جائے۔“

پس دس مرہٹہ سوار آنے والے کا راستہ روک کے کھڑے ہو گئے۔ سوار کو مجبوراً

رکنا پڑا۔ مرہٹے اسے پکڑ کر پر سورام کے سامنے لے گئے۔

پر سورام نے سوار سے پوچھا:

”تم کہاں سے آ رہے ہو؟“

موت کی وادی سے۔ سوار نے جواب دیا۔

وہیں جس طرف سے آئی تھیں اسی طرف واپس ہو گئیں۔

انگریزی فوج لارڈ کارنوالس کی کاکردگی میں جنوری ۱۷۹۲ء کے آخری ہفتہ میں ایک اور  
پھر مرزا کا پٹم پر حملہ کے لیے روانہ ہوئیں۔

کارنوالس 'سادن درگ' سے ہوتا ہوا دوسرے دن ہلی درگ کے قریب پہنچ گیا۔ یہاں  
پراس نے اپنی فوج کی تنظیم نو کی۔

میکسویل کو میسرہ پر مقرر کیا۔

اسٹوارٹ کو سیمینہ پر لگایا۔

کرئی ڈن کو توپ خانہ کا سربراہ بنایا۔

ادر کرئی فلائیڈ کو ریزرو فوج کی کمان سونپی۔

کتاب "ملٹری بائیوگرافی" میں شریعین جنگ کی مندرجہ ذیل تعداد بتائی گئی ہے:

انگریز فوج (ماتحت کارنوالس) ۲۲ ہزار

حیدر آبادی فوج ۱۸ "

مرہٹی فوج (ماتحت ہری پنتھ) ۱۲ "

" " " " " " ۲۰ " (پرسورام)

انگریزی فوج (ماتحت ایبرکراہی) ۹ "

جملہ تعداد ۸۱ ہزار

اس حملہ آور فوج کے متعلق ایڈورڈ مسوہ اپنی کتاب "کینپین ٹل کی یادداشتیں" میں یوں  
لکھتا ہے:

"اس قدر کثیر حملہ آور فوج کے ساتھ بار بار برائی کے لیے جس قدر

لوگ تھے ان میں مردوں سے زیادہ عورتیں تھیں۔ ہری پنتھ کی فوج

باہر ہزار اور پرسورام کے ماتحت بیس ہزار سپاہی تھے لیکن اس

فوج کی بار برداری کے لیے جو لوگ تھے ان کی تعداد فی سپاہی

"اس سے کیا مطلب ہے تمہارا؟"

پرسورام نے ڈپٹ کر کہا:

"ٹھیک ٹھیک بناؤ۔ ورنہ قتل کر دیے جاؤ گے۔"

سوار نے جزبہ ہونے ہوئے ہوئے کہا:

"میری توقع تیر ہی خراب ہے۔ موت سے بھاگ کے ادھر آیا تو یہاں بھی موت موجود ہے

ٹھیک ہے۔ تم مجھے قتل کر دو لیکن تم بھی زندہ نہیں بچو گے۔ تمہاری موت بھی میرے پیچھے پیچھے

آ رہی ہے۔"

پرسورام کچھ نہ سمجھ سکا۔ اس نے زری سے کہا:

"اے بد بخت سوار۔ اپنی جوانی پر رحم کھا۔ کیوں نہیں بتاتا کہ تو کہاں سے آ رہا ہے اور یہ

فضول باتیں کیوں کر رہا ہے۔"

"ٹھیک بات سننا ہے تو یکدم مضبوط کر لو۔"

سوار نے اب اطمینان سے کہا:

"میں نے کہا ہے کہ میں موت کی وادی سے آ رہا ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ میرے

پیچھے سلطان شکر آ رہا ہے اور اس لشکر کا سردار قرال دین ہے۔"

میر قمر الدین کا نام سن کر پرسورام کے ماتھوں کے طوطے اڑ گئے اور اس کا چہرہ پسینے

سے تر ہو گیا۔

اس نے کوئٹور کے قلعہ کے حالات سنے تھے جہاں قمر الدین نے انگریز لیفٹیننٹ چامرس

اور فرانسیسی کمانڈر ڈی لاکو بیسے، جو قلعہ کو بمبوتور پر قابض تھے، شکست فاش سے ہٹا کر لیا تھا۔

اس نے تین ہفتے مسلسل قلعہ پر گولہ باری کر کے اسے کھنڈر میں تبدیل کر دیا تھا اور ان بدیسی

کمانڈروں کو مع ان کی فوج کے گرفتار کر کے مرزا کا پٹم بھیج دیا تھا۔

پرسورام پر اس خبر سے ایسی بجلی گئی کہ اس نے ایک لحضائع کیے بغیر حکم دیدیا:

"فوجیں اپنا رخ سمو گا شہر کی طرف کریں اور چل پڑیں۔"

اس کے ایک سردار نے کچھ پوچھنے کی کوشش کی تو پرسورام نے اسے بری طرح

ڈانٹ کر بھگا دیا۔

پتہ نہیں یہ خبر سچ تھی یا افواہ مگر اس کا اثر یہ ہوا کہ بد نواری طرف جانے والی سرہٹ

بارہ آدمی کے حساب سے تھی اور جانور جن میں ہانسی، گھوڑے، بیل، اونٹ اور گدھے شامل تھے وہ سپاہیوں سے پندرہ گنا زیادہ تھے۔

ایک اندازے کے مطابق یکپ میں تین لاکھ بیس ہزار ہتھیاروں اور باروداری کے لیے اور چار لاکھ اسی ہزار جانوروں کے لیے موجود تھے۔ انگریزوں اور نظام کی فوج ان کے علاوہ تھی۔

انخادیوں کی یہ فوج جب کوچ کرتی تو یوں معلوم ہوتا تھا جیسے "ناحدنظر انسانوں اور جانوروں کا سیلاب آیا ہوا ہے۔"

اسی کتاب میں سلطانی فوج کے بارے میں لکھا ہے:

"سلطانی فوج کی تعداد قلعہ میں چالیس ہزار سپاہی اور پانچ ہزار سوار ہوں گے۔"

انخادیوں کی ساری فوج نئی خوردیوں میں ملبوس تھی۔ جھوں پر چمکدار ہتھیار سجے تھے اور بیڑیاں بجا فوجیوں رواں دواں تھی جیسے امیروں رئیسوں کی بارات چڑھتی ہے۔ نظام دکن کا بیٹا سکندر جاہ، مرہٹہ سردار ہری پنہتہ باقیوں پر سوار اپنے اپنے رسالوں کے آگے چل رہے تھے مگر روانگی کے دوسرے دن ان کی تمام شان و شوکت دھری رہ گئی۔ دوسرا دن چڑھتے ہی انگریزی لشکر کے ہراول دستے کا ایک سوار گھوڑا اٹا کا رنوالس کے پاس پہنچا۔

وہ گھوڑے سے اترا اور گھبرائے ہوئے اپنے میں عرض کیا:

"سلطان کا لشکر اس طرف بڑھتا چلا آ رہا ہے صاحب بہادر۔"

کارنوالس بھی گھبرا گیا۔ اس نے پوچھا:

"لشکر کی تعداد کتنی ہے؟"

سوار نے جواب دیا:

"صاحب بہادر! اگر واقعی اٹھ رہی ہے کہ تعداد کا صحیح اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ بہت بڑا لشکر ہے۔"

"تم نے لشکر آج آنکھوں سے دیکھا تھا؟"

"جی صاحب بہادر۔"

ہراول دستے کے سوار نے جواب دیا:

"میں نے خود دیکھا تھا۔ پورے ہراول دستے نے دیکھا تھا۔ جی تو سردار نے مجھے آپ کی جانب سے کہہ دیا ہے کہ ہشیا رہ جائیں۔"

اس سے زیادہ نہ سوار بتا سکا اور نہ کارنوالس معلوم کر سکا۔ یہ تو ٹھیک تھا کہ ہراول دستہ، دود پر گر ڈاڑھی ہوئی دیکھی تھی۔ پھر انہیں کچھ سوار بھی آتے دکھائی دیے تھے۔ پس ہراول دستہ سردار نے ایک سوار کارنوالس کو اطلاع دینے کے لیے دوڑا دیا تھا۔

کارنوالس نے فوراً الرٹ ہونے کا حکم دیا اور دوسرے ہی لمحے ساری فوج حالت جنگ میں آئی۔ بیڈیا بجا بند کر دیے گئے۔ سپاہیوں نے زرعی برقی نئے لباس اتار کر عام وردیاں لائیں۔ صفیں ترتیب دی گئیں اور مینہ میسرہ درست کیا گیا۔ اس عالم میں چار گھنٹے گزر گئے۔

مگر — سلطانی لشکر کو نہ آتا تھا نہ آیا۔

یہ اور اس طرح کی دوسری کئی باتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ سلطان اور سلطانی لشکر کی لمبوں پر کس قدر دہشت طاری تھی مگر غداروں اور ایمان فروشوں کی آنکھیں نہ کھل رہی تھیں۔ وہ خود اپنی اور اپنے وطن کی آزادی کی راہ میں کانٹے بڑھتے چلے جا رہے تھے۔ سلطان عالی خان مرہٹہ پرستوں نے اس طرح گھبرکھا تھا کہ انہیں قلعہ مرنگا پٹم سے باہر کی قطعی کوئی خبر نہ تھی اور واقعی تو صرف اس طرح کی:

"عالی جاہ۔ انگریزوں کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ وہ اب مرنگا پٹم کا رخ نہیں کر سکتے۔"

طرح کی باتیں ملک فردش کرتے اور سلطان کو حقیقت سے بے خبر رکھتے تھے۔

یہ کس قدر غضب کی بات تھی کہ انخادی فوجیں سرنگا پٹم کی فصیل کے باہر پہنچ گئیں اور وہیں کسی کو خبر تک نہ ہو سکی۔ یہاں تک کہ دشمن کی فوجوں نے اس فصیل سے صرف چار میل کے اعلیٰ پر اپنا کیمپ قائم کر لیا مگر قلعہ میں موجود ایک سو بھاری توپوں اور تین سو ہلکی توپوں میں سے ایک بھی گولہ نہ چلا۔ جس سے یہ معلوم ہوتا کہ دریا کے کاہری کے اس ٹاپو میں جسے مرنگا پٹم کہا جاتا ہے اسی میں سلطان بیٹھا اپنے چالیس ہزار پیادوں اور پانچزار آہن پوش سواروں کی ہمت موجود ہے۔



سلطنت خداداد کا دار السلطنت مرزا کا پیم دریا سے کاویری میں ایک ٹاپو پر واقع تھا کی شرقاً غرباً لمبائی ساڑھے تین میل اور شمالاً جنوباً چوڑائی ڈیڑھ میل تھی۔ یہ مزید تین سو لاکھ تقسیم تھا:

۱۔ مغربی حصہ میں پرانا شہر تھا اور اسے قلعہ میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔

۲۔ درمیان میں سلطان کا آباد کردہ شہر گنجام تھا

۳۔ مشرق میں لال باغ تھا۔

قلعہ اور گنجام کے درمیان دولت باغ تھا شہر کے باہر کی طرف ایک گہری خندق تھی جس دریا سے کاویری کا پانی آتا تھا۔

مرزا کا پیم میں سات گڑھیاں (پھوٹے قلعے) بھی تعمیر کی گئی تھیں۔ ان میں ایک اہم گڑھ عید گاہ کے نام سے مشہور تھی۔ یہ شہر کے شمالی کونے پر تھی۔ شہر کے اندر تین گڑھیاں تھیں جن کے نام یہ تھے:

۱۔ لالی

۲۔ محمد

۳۔ سلطان

سلطان ٹیپو کا خیمہ آخری گڑھ تھا جس کا نام بھی "سلطان" تھا اس کے قریب تھا۔ اس ٹاپو کے چاروں طرف ۲۵۰ گنز (۵۰ فیٹ) چوڑا دریا گئے کاویری کا آب زبردست حفاظتی بند خندق کے مانند بنتا تھا۔

مرزا کا پیم میں داخل ہونے کے لیے صرف ایک پل تھا جسے اس وقت توڑ دیا گیا۔ کارنوالس گڑھوں پر سے گزر کر جزیرے میں داخل ہونا چاہتا تھا مگر جس کے لیے وہ ٹوٹا ہوا تھا۔

یہ بات ۶ فروری ۱۸۴۲ء کی ہے۔

کارنوالس نے جنرل میڈوز، کرنل میکسویل اور کرنل آر تھرسٹون کے ساتھ مل کر کھڑا جائزہ لیا اور اسی شام فوجوں کو حکم دیا گیا کہ شہر پر تین اطراف سے حملہ آور ہوں۔

نئے جزیرہ

جنرل میڈوز کو حکم ہوا کہ وہ دو ہزار تین سو سپاہیوں کے ساتھ عید گاہ اور گڑھ لالی پر مارے۔

دستی حصہ میں خود کارنوالس، اسٹوارٹ کے ساتھ سلطان ٹیپو کے کیمپ پر حملہ کرے اور اس طرف سے ۱۷۰۰ سپاہیوں کو لے کر کرنل میکسویل کی گڑھ کی پہاڑیوں پر چڑھے۔ پھر تینوں مل کر دشمن کو پسپا کرتی ہوئی جزیرے پر پہنچنے کی کوشش کریں۔

اُس رات آٹھ بجے جنرل میڈوز نے حرکت کی۔ وہ اپنے دستے کے ساتھ چلتا ہوا بغیر کسی اجازت کے (یہ کس قدر جرات انگیز بات ہے) عید گاہ کے قریب پہنچ گیا۔ اس وقت بھی لال باغ متعلق نہ ہوئی اور ایک گولی تک نہ چلی۔

کارنوالس کے منصوبے کے مطابق جنرل میڈوز کو عید گاہ پر حملہ کیے بغیر وہاں سے مشرقی جانب مڑ جانا تھا۔ اس کا مطلب ہے کہ کارنوالس کو یقین دلایا گیا تھا کہ عید گاہ میں موجود سلطان سے بغیر کسی مزاحمت کے جنرل میڈوز کے دستوں کو مشرق کی سمت چلا جانے دیں گے۔

مگر۔

اس منصوبہ کا علم شاید جنرل میڈوز کے ساتھ آنے والے لیفٹیننٹ کرنل ہلٹ کو نہیں تھا۔ ان نے موقع گنونا پسند نہ کیا اور گڑھ پر حملہ کر دیا۔

اور یہ بھی شاید اتفاق ہی تھا کہ اس اہم گڑھ کے اندر سید حمید سپہ دار، موسیو لال اور کانڈر دگی کو صرف ۳۶۰ سپاہیوں کے ساتھ تعینات کیا گیا تھا۔

سید حمید سپہ دار سلطان کا انتہائی دفا دار تھا۔ اس غریب کو بھی دھوکے میں رکھا گیا اور ۲۶۰ سپاہیوں کے ساتھ اس اہم موقع پر بٹھا دیا گیا۔

سید حمید کے سان و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس پر اس وقت اچانک حملہ ہو جائے گا۔ حملہ ہوتے ہی وہ تلوار تھینچ کے سینہ سپر ہو گیا۔

ایک طرف سید حمید کے ۳۶۰ اور دوسری طرف جنرل میڈوز کے تیس سو۔ یعنی سپہ دار سید حمید کے ایک سپاہی کے مقابلہ میں جنرل میڈوز کے دس سے زیادہ سپاہی آتے تھے مگر وہ جوانمرد اور اسی نئے سپاہی جان بازی سے لڑتے رہے اور کٹ کٹ کے گرتے رہے۔ بیارنگ کر سید حمید نے لڑتے لڑتے جان جاں آفری کے سپرد کر دی۔

اس کے مرتے ہی گڑھ پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

کے نہیں بلکہ تو پختانہ کے پہرے دار ہوں۔  
انگریزی فوج کا تیسرا گروہ جس کا سردار کیپٹن ہنٹر تھا، وہ دریا پار کر کے یابیوں سمجھ لیں  
کہ دریا میں پلنگ مناتے دریا پار اترا اور دولت باغ کی طرف بڑھا۔ اس کے راستے میں  
بھی کوئی رکاوٹ نہ تھی لیکن دروازہ کھلا پانے کے باوجود یہ گروہ دولت باغ میں داخل  
نہیں ہوا بلکہ خوف کھا کے اٹھ پیروں واپس چلا گیا۔

اس گروہ والوں کو یہ خطرہ محسوس ہوا کہ کہیں وہ دولت باغ میں پھنس کے نہ رہ جائیں  
اور دشمنی پھیلنے پر سلطانی توپ خانہ ان کے پرچے نہ اڑا دے۔

جنرل اسٹوارٹ کا دستہ جو کارنوالس کے ساتھ تھا، وہ الگ ہو کر سیدھا گڑھی سلطان  
کی طرف بڑھا مگر اسے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ پس وہ گڑھی کے اوپر سے چکر لگا  
کر مشرق میں پہنچا جہاں وہ میکسویل سے جاملے۔

کارنوالس ابھی تک اپنے دستوں کے ساتھ گڑھی سلطان کے قریب ٹھہرا ہوا تھا۔ رات  
کا ایک پر باقی تھا کہ سلطانی دستوں کو اس کی موجودگی کا علم ہو گیا اور انہوں نے کارنوالس پر  
شدید حملہ کر دیا۔

انگریزی فوج جم کے لڑی۔ کارنوالس کو جنرل میڈوز کی ملک کی امید تھی مگر سامنے سے  
ہنٹر واپس آتا دکھائی دیا۔

سلطانی دستوں کا حملہ اس قدر سخت تھا کہ کارنوالس، ہنٹر کی مدد کے باوجود حملہ کی تاب  
نہ لاسکا اور مشرق کی طرف پسپا ہو گیا جہاں اسے جنرل میڈوز اور اس کا ناکام دستہ ملا۔ اس  
معرکہ میں کارنوالس کا ہاتھ زخمی ہو گیا تھا۔

اس وقت میکسویل کمری گٹھ کی پہاڑیوں پر قبضہ کر چکا تھا اور سلطانی کیمپ پر حملہ کے لیے  
منزب کی طرف بڑھ رہا تھا۔

راستے میں اسے اسٹوارٹ مل گیا جو شکست کھا کر واپس آ رہا تھا۔ ان دونوں نے وہیں  
سے دریا پار کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اسٹوارٹ کا نائب جو ۸۰، ۱۰۰ میں سرنگاٹیم میں قید رہ چکا تھا، وہ سب سے پہلے دریا پار  
پہنچا۔ اس کے بعد اسٹوارٹ اور میکسویل چلے۔

اس وقت سلطانی توپ خانہ آگ برسانے لگا۔ یہ دونوں بچتے بچتے اور بہترین سپاہیوں

گڑھی عید گاہ پر قبضہ کے بعد اب جنرل میڈوز کو یہ فیصلہ کرنا تھا کہ آیا وہ جزیرے کی  
طرف بڑھے یا مشرق کی سمت کارنوالس کے پاس پہنچے۔ آخر اس نے مشرق کا راستہ اختیار  
کیا اور کمری گٹھ کی پہاڑیوں پر پہنچ گیا۔

دوسری طرف کارنوالس نے سب سے آگے کرنل نوکس کو چلنے کا حکم دیا۔ اس کے پیچھے  
اسٹوارٹ اور خود سب سے پیچھے رہا۔

ان سب نے آگے پیچھے چلتے ہوئے سلطانی فوج کے طلب میں پہنچنے کی کوشش کی۔ یہاں  
تھوڑی سی مزاحمت ہوئی مگر انہوں نے سلطانی پہرے داروں کو مار بھگا دیا۔ یہ پہرے دار ہاک  
کے سلطان کے حضور پہنچے اور انگریزوں کے شب خون مارنے کی خبر دی۔

چونکہ یہاں پر ایک معمولی سی جھڑپ ہوئی تھی۔ کچھ آدمی مارے گئے اور کچھ بھاگ کھڑے  
ہوئے تھے اس لیے کارنوالس کو سلطانی توپ خانے کا خطرہ محسوس ہوا مگر وہ خود یہ دیکھ کر حیران  
رہ گیا کہ دریا کے اوپری تنگ اس کی راہ کسی نے نہ روکی۔

اس وقت انگریزی فوج کے رجمنٹ ۵۲، ۱۱ اور ۴ کے کچھ سپاہی دریا پار کر کے  
پرانے شہر کے قریب پہنچ گئے اور وہاں دشمن فوج کے ان سپاہیوں نے ملک حرامی اغداری  
ایمان فروشی اور ملک فروشی کا ایک ایسا منظر دیکھا کہ وہ حیران رہ گئے۔

ان کے سامنے شہر کا مشرقی دروازہ ان کے استقبال کے لیے کھلا ہوا تھا۔  
یہ ملک فروشی اور اغداری کا ایک ایسا بھیانک لمحہ تھا جس کے تصور سے بھی رد گئے کھٹے  
ہو جاتے ہیں۔

اس غلط منصوبہ میں سرنگاٹیم کے صرف ہندو ہی شریک نہ تھے بلکہ سلطانی فوج اور سلطنت  
کے اہم امیروں اور وزیروں نے بھی اس میں بھرپور حصہ لیا تھا۔

رجمنٹ کے سپاہیوں نے شہر کا دروازہ کھلا دیکھا تو پہلے وہ مسکرائے پھر اپنے پیچھے  
لے والوں کو "سب ٹھیک ہے" یعنی "اوکے" کا سگنل دیدیا۔

کرنل نوکس اپنی رجمنٹ نمبر ۱ اور ۴ کے ساتھ گننام شہر کی طرف بڑھا۔ اسے کوئی  
روکنے والا نہ تھا۔ دروازے کے پہرے دار نہ معلوم کہاں جا ہوئے تھے یا انہیں ابدی قید  
سلا دیا گیا تھا۔

سلطان کا محافظ دستہ شمالی ساحل کی طرف تو پختانہ کے قریب پہنچا ہوا تھا جیسے وہ سلا

اور کینٹن اسبائلڈ مارا گیا۔

اب سلطان کا یورپی رسالہ آگے بڑھا۔ اس کی کمان دگی کر رہا تھا۔ شام چار بجے کے قریب انگریزوں کا آخری زبردست حملہ ہوا۔

اس دن بھر کی لڑائی میں سلطان کے ایک سوجوان شہید ہوئے اور انگریزوں کے ۵۲۵ سپاہی مارے گئے اور ۳۲۲ زخمی ہوئے۔

کارنوالس کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہو سکا لیکن یہ ضرور ہوا کہ اس کا یہ حملہ مرنگا پٹم کے محاصرے کی صورت اختیار کر گیا تاہم یہ محاصرہ چاروں طرف سے مکمل نہ ہو سکا۔

قلعہ مرنگا پٹم میں اگر ایک طرف مہدی علی خاں ناٹھ جیسے غدار موجود تھے تو دوسری طرف سید غفار اور سید حمید جیسے وفادار بھی تھے جنہوں نے اپنی بہادری سے مرنگا پٹم کی جنگ کی انت تاریخ لکھی۔

وفادار فوجی افسروں نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ سلطان کو غداروں اور ایمان فروشوں نے گھیر رکھا ہے اور غلط مشورے دے رہے ہیں اس لیے چھوٹے سردار اور بعض قلعہ داروں نے اپنے طور پر حملہ آوروں کے خلاف کارروائیاں شروع کر دیں۔

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ مرنگا پٹم ایک نامکمل محاصرے میں آچکا تھا۔ اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطانی وفادار سواروں کا ایک دستہ محاصرہ توڑ کر جنوب کی طرف نکل گیا اور دو دن کا طویل چکر لگانے کے بعد یہ دستہ کارنوالس کے عقب میں پہنچا اور کمری گٹھ پر اتنا اچانک اور زبردست حملہ کیا کہ انگریزی فوج بوکھلا گئی۔ اس میں ایسا انتشار پیدا ہوا کہ سپاہیوں کو افسروں اور افسروں کو سپاہیوں کی کوئی خبر نہ رہی۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انگریزی فوج افزائیزی اور نفسا نفسی کے عالم میں محاصرہ اٹھا کر پسا ہو گئی۔

یہ صرف ایک سوار دستہ کا کارنامہ تھا۔

اس کے دو دن بعد کرنل ایبرکرومبی مغربی گھاٹ سے چھ ہزار تازہ دم فوج کی کمک لے کر آگیا اور انگریزوں کے اکھڑے ہوئے قدم پھر جم گئے۔

اگلے دن کرنل کرمبی اور سلطان کے بڑے بیٹے فتح حیدر کے سوار دستوں میں زبردست معرکہ ہوا اور دن بھر جنگ ہوتی رہی۔

کو گنوانے آخر لال بلاغ کے قریب آ پہنچے۔

یہ سب کچھ کیوں ہوا؟

اگر اسے ہونا تھا تو بھی اس قدر آسانی سے کیوں ہوا؟

انگریزوں کو جزیرے تک پہنچنے سے کیوں نہ روکا گیا؟

بیزیرہ کہ سلطان کو ان باتوں کی خبر کیوں نہ ہوئی؟

ان باتوں سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ سلطان کے گرد سازشوں کا زبردست جال پھیل دیا گیا تھا جس وقت کارنوالس کی فوج سرنگا پٹم پر تین اطراف سے حملہ آور ہوئی، سلطان اس وقت اپنے کیمپ میں دسترخوان پر بیٹھا تھا اور تمام سازشی امرا اس کے گرد جمع تھے۔

سلطان کو انگریزوں کے حملہ کی خبر اس وقت ہوئی جب دشمن دیرپا پارک کے جزیرے پر پہنچ چکا تھا۔

اس وقت سلطان کیا کرتا؟ سوال اے اس کے کہ وہ جزیرے میں سمٹ کر قلعہ بند ہو گیا۔ اسے شبہ تو ہو گیا تھا کہ اس کے خلاف بہت بڑی سازش چھٹی ہے مگر وہ مجبور تھا۔ کچھ بھی تو نہیں کر سکتا تھا۔ وہ اب تک دوست اور دشمن کی شناخت بھی نہ کر سکتا تھا۔

سلطان نے بڑی بے چینی کے عالم میں رات کاٹی۔ صبح ہوئی تو اسے معلوم ہوا کہ اس کے احمدی رسالے کے دس ہزار جوان سرنگا پٹم سے کورگ کی طرف فرار ہو گئے ہیں۔ یہی نہیں بلکہ اس کی فوج مختلف اطراف میں کبھر چکی ہے اور اس کے کئی یورپین ماہرین انگریزوں سے مل گئے ہیں۔ ان حالات میں سلطان کو بہت سوچ سمجھ کے قدم اٹھانا تھا۔

پس۔

اس نے قلعہ کے ہر مورچے، برج اور فصیل پر متحفظین اور توپیں نصب کرادیں۔

انگریزوں کی طرف سے سب سے پہلا حملہ کینٹن اسبائلڈ نے کیا مگر شکست کھا کر اسے پسپا ہونا پڑا۔

پھر اسبائلڈ کو کمک کے طور پر دو ہزار کا ایک دستہ بھیجا گیا مگر سلطانی ہمدردوں نے ان کا جو انفرادی سے مقابلہ کیا اور سوار اپنے گھوڑوں سے اتر کر دست بدست جنگ میں شریک ہو گئے۔

قلعہ بینی کا قلعہ سید غفار تھا۔

جنرل میڈوز نے اپنے طور پر قلعہ پر زبردست حملہ کیا اور وہ اپنی فتح کے لیے بہت پرامید تھا لیکن سید غفار نے اس کے حملہ کا جس جرات اور پامردی سے مقابلہ کیا اس سے اس معزور جنرل کو غورٹی ہی دیر بعد بھاگنا پڑا۔  
دو گھنٹے بعد جنرل میڈوز نے دوسرا حملہ کیا۔ یہ حملہ اس قدر شدید تھا کہ سید غفار کو پسپا ہونا پڑا۔ مگر اس حملے کی اطلاع فاضل خاں اور سید حمید جیسے بہادروں کو پہنچ گئی۔ وہ فوراً لگ لگے پیچھے اور جس مقام سے سید غفار پسپا ہوا تھا اس پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ پھر ایسا جوابی حملہ کیا کہ جنرل میڈوز دو ہزار سپاہی کٹوانے کے بعد منہ پٹیتا ہوا واپس چلا گیا۔

کارنوالس نے جنگ کا رنگ دیکھ کر اندازہ لگایا تھا کہ اس موقع پر جنگ جیتنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے اس لیے سلطان سے بہتر سے بہتر شرائط پر صلح کر لی جائے۔  
جنرل میڈوز بھی منہ کی کھاکے خاموش ہو گیا تھا۔ لہذا کارنوالس نے سلطان کے خط کا جواب بھجوا دیا جس میں اس نے تجویز پیش کی کہ دونوں طرف کے دیبل گفتگو کے ذریعے صلح کی شرائط طے کریں۔  
دیکھو کی ملاقات کے لیے کارنوالس نے اپنے خیمے کے قریب ہی ایک مقام خود ہی تجویز کیا۔

وسط جنوری ۱۸۹۲ء میں دیبل مقررہ مقام پر جمع ہوئے۔ سلطانی سفارت غلام علی سنگڑے اور علی رضا خاں پر مشتمل تھی جبکہ انگریزوں کی طرف سے سر جان کینو نے وفالت کی۔  
حیدر آباد کی طرف سے میر عالم اور مرہٹوں کی وفالت گووند راؤ کال اور باچا جی حسدال نے کی۔

مگر اصل گفتگو کینو سے ہی کرتا رہا۔ صلح کی گفتگو ایک ماہ سے زیادہ دنوں تک ہوتی رہی۔ گفتگو کے دو دور ہوئے اور درمیان میں کچھ وقفہ رہا۔  
سلطان تک متحدہ دشمنوں کی شرائط پسپائی تھیں۔ یہ شرائط انتہائی سخت اور تحقیر آمیز تھیں لیکن سلطان نے سمجھ لیا تھا کہ سازشوں اور غداروں کے اس جال سے بچنے کے لیے اور

فتح حیدر کے سواروں سے ناکام ہونے کے بعد کہ نہ کہ وہی نے قلعہ کی تفصیل پر حملہ کیا مگر اسے اس میں بھی ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔

غرض کہ انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کا یہ متحدہ لشکر بار بار ناکام ہوتا رہا۔ سلطانی لشکر بڑی بے جگری سے مدافعت میں مصروف تھا اور دشمن کے حملوں کو ناکام بناتا رہا مگر وہ ناکام ہونے کے بعد بھی سرنگا پٹم کے گرد دیوار بنے کھڑے تھے اور خطرہ ہر دم بڑھتا ہی جا رہا تھا۔  
اور یہ خطرہ متحدہ لشکر سے زیادہ غداروں کی طرف سے تھا۔

متحدہ فوج کے تینوں سربراہ بھی یہ جانتے تھے کہ سلطان کی ذاتی شجاعت و جرات اور وفادار فوجوں کی کوشش سرنگا پٹم کی دیواروں کو آسانی سے ٹوٹنے نہ دے گی۔

ان کا یہ بھی خیال تھا اور ٹھیک خیال تھا کہ یہ محاصرہ کافی طویل کھینچے گا اور یہ بھرپور ہر مصرعہ جاری رہیں گی۔ اس عرصہ کے لیے کثیر تعداد میں رسد کی ضرورت ہوگی اور کافی جانوں کی قربانی دینا ہوگی۔ اس لیے بہتر یہ ہے کہ کوئی ایسی ترکیب نکالی جائے کہ مقصد بھی حل ہو جائے اور سلطان کا سر بھی بچکا دیا جائے۔

جہاں تک سلطان کا تعلق تھا تو اس نے بھی یہ اندازہ لگایا تھا کہ اندرونی سازشیں اس قدر بڑھ چکی ہیں کہ ان کی موجودگی میں تین متحدہ طاقتوں سے جنگ کرنا کوئی عقلمندی نہیں ہے اس لیے مصلحت، وقت اور حالات کا تقاضہ ہے کہ دشمن سے صلح کر لی جائے۔ چنانچہ سلطان نے ایک بار پھر کارنوالس کو صلح کے لیے خط لکھا۔

سلطان کے گزشتہ خطوط کا جواب انگریزوں کی طرف سے یا تو انتہائی تحقیر آمیز اور گستاخانہ دیا جاتا تھا یا پھر انگریز جنرل جواب دینے کی ضرورت ہی محسوس نہ کرتے تھے مگر سلطان کے اس خط نے جیسے کارنوالس کو خوشی کا پیغام دیا اور وہ فوراً صلح پر آمادہ ہو گیا مگر پیچ میں جنرل میڈوز آگیا۔

اس نے صلح کی سخت مخالفت کی۔ کارنوالس نے اسے اونچ نیچ سمجھائی۔ وہ راضی تو ہوا مگر ایک شرط پر۔

جنرل میڈوز نے کارنوالس سے کہا: مجھے قلعہ بینی پر حملہ کی اجازت دی جائے۔ اگر میں اس قلعہ پر قبضہ کر لوں تو صلح نہ کی جائے اور اگر ناکام رہوں تو پھر صلح ہو سکتی ہے۔

ملک کو تباہی سے بچانے کا یہی ایک طریقہ ہے کہ جو شرائط پیش کی گئی ہیں انہیں خاموشی سے تسلیم کر لیا جائے۔

کارنوالس کی شرائط یہ تھیں:

۱۔ سلطان اپنے اتنے علاقے سے دستبردار ہو جائے جو تین کروڑ روپیہ سالانہ حاصل ادا کرتا ہو۔

۲۔ آٹھ کروڑ روپیہ نقد بطور تادان ادا کیا جائے۔

۳۔ اس رقم کی ادائیگی تک سلطان اپنے دو بیٹے بطور ریغال انگریزوں کے قبضے میں دیدے۔

سلطان کی طرف سے ایک وکیل غلام علی خاں لنگڑے تھا جو ہمیشہ سے مفاد پرست، لالچی و غدار تھا۔ سلطان نے جو وفود مصر اور ترکی بھیجے تھے ان میں بھی یہ شخص شامل تھا اور اس نے انگریز سفیروں سے رقم لے کر انہیں اپنی سفارت کے مقاصد سے آگاہ کر دیا تھا۔

دوسرے یہ کہ وہاں جو تحائف سلطان کو بھیجے گئے تھے ان میں سے آدھے سے بھی زیادہ یہ بد بخت اپنے گھر لے گیا تھا مگر سلطان نے اسے پھر بھی معاف کر دیا تھا۔ اس سفارت میں بھی اس نے اپنی غدارانہ ذہنیت کا اظہار کیا اور جیسے ہی اس کے سامنے شرائط پیش کی گئیں اس نے فوراً تسلیم کر لیں۔

سلطان کے دوسرے وکیل علی رضا خاں نے ان شرائط کی مخالفت کی اور یہ دلیل پیش کی کہ سلطان خزانہ میں اس قدر رقم موجود نہیں کہ آٹھ کروڑ نقد ادا کیے جاسکیں۔

علی رضا خاں نے اس سلسلے میں پیش کش کی کہ انگریز وکیل یا کوئی اور آدمی خود جا کر خزانہ کی جانچ پڑتال کر سکتا ہے۔

چنانچہ کارنوالس نے ایک معقول وجہ اور پیش کش کے پیش نظر نقد رقم آٹھ کروڑ کے بجائے چھ کروڑ کر دی اور یہ رعایت بھی دی کہ تین کروڑ نقد ادا کیا جائے اور تین کروڑ سالانہ کا علاقہ دے دیا جائے۔

اس موقع پر مرہٹہ وکیلوں نے کینو سے پر زور دیا کہ سلطان سے مصافحہ دربار کے لیے ساٹھ لاکھ روپے لازم یہ مطالبہ کیا جائے۔

ہری پنتھ نے اس مطالبے کا یہ جواز پیش کیا کہ ایسے موقعوں پر اس نام سے اُن سول

عہدیداروں کے لیے کچھ رقم وصول کی جاتی ہے جو جنگ میں شریک ہوتے ہیں۔ آخر علی رضا خاں کے اعتراض پر یہ رقم ۶۰ لاکھ سے گھٹا کر ۳۰ لاکھ کر دی گئی۔

سلطان کو ہر امیر اور وزیر کے دل کا حال، بخوبی معلوم تھا۔ پھر بھی اس نے رسماً تمام امرا اور وزرا کو مرکز کا پیٹم کی مسجد میں جمع کیا اور ان کے سامنے اتحاد دلوں کی پیش کردہ شرائط بیان کیں۔

سلطان نے یہ قدم اس احتیاط کے تحت اٹھایا کہ امرا اور وزراء بعد میں یہ شکوہ نہ کریں کہ صلح نامہ سے قبل انہیں اعتماد میں نہیں لیا گیا۔ پھر یہ کہ شرائط کے مطابق ایک کروڑ ۶ لاکھ فوری طور پر ادا کرنا تھا جبکہ باقی رقم تین تین ماہ کی قسطوں میں ادا کرنا تھی اور ملکی معیشت پر بار نہیں اٹھا سکتی تھی۔

خزانہ کا حال سب کو معلوم تھا کیونکہ پورنا وزیر خزانہ تھا اور وہ سازشیوں کا ایک اہم رکن تھا۔ چاہے تو یہ تھا کہ اس وقت وہ امیر اور وزیر جو خزانہ لوٹ کر کھا رہے تھے سلطان کی مدد کرتے اور انگریزوں کی طلب کردہ رقم حصہ ڈال کر پوری کر دیتے مگر اس نکتہ پر توجہ کرنے کے بجائے انہوں نے صلح کی شرائط کو قبول کرنے پر زور دینا شروع کر دیا۔ یہ ان کی غلاری اور خباثت کا کھلا ہوا ثبوت تھا۔

سلطان کے وفادار امرا دم بخود تھے۔ ان کے دل خون کے آنسو رو رہے تھے۔ ان بے چاروں نے بے ایمانی سے مال بھی نہیں جمع کیا تھا کہ اس وقت سلطان کی مدد کرتے مولائے خاموش رہنے کے ان کے پاس کوئی چارہ نہ تھا۔

سلطان کو غداروں کے جواب اور ان کی خواہشوں کا پہلے ہی علم تھا مگر اس نے یہ رسم بھی ادا کر دی۔ اس نے مزید دو روز اور توقف کیا کہ شاید امرا کے تاریک دلوں میں روشنی کی کوئی کرن چھوٹے مگر اللہ تو منافقوں کے دلوں پر تالے ڈال دیتا ہے۔ ان دلدلوں کی تاخیر سے ناواقف اندیشوں کو اپنے مستقبل کے اندیشے ستانے لگے کہ کہیں ان کے سارے کیے کراٹے پر پانی نہ پھر جائے۔

انہیں سب سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی بیرونی طاقت سلطان کی مدد کو پہنچ جائے اور وہ اپنے اُن انگریزوں سے وہ مراعات حاصل کرنے سے محروم ہو جائیں جن کے لیے انہوں نے ملت، ملک اور ایمان تک داؤ پر لگا دیے تھے۔

آخر سلطان نے مقتدر امر کے بگڑے ہوئے بتور دیکھ کر زہر کا یہ گھونٹ بھی حلق سے اتار لیا۔ اور اس نے اس ذلت آمیز صلح نامہ پر ۲۳۔ فروری ۱۷۹۲ء کو دستخط کر دیے۔

جس وقت دستخط شدہ صلح نامہ باہر آتا تو ایمان فروشوں کے چہرے دمک اٹھے اور وفادار امر کی آنکھوں میں اٹکتے ہوئے سیلاب کے بند ٹوٹ گئے۔ وہ اس قدر بھوٹ کر روئے کہ شاہی دربار کے بام و در بھی جیسے رو اٹھے۔

نہ قلم میں طاقت ہے اور نہ الفاظ میں زور کہ وہ اس دردناک اور رقت انگیز منظر کو بیان کر سکے جب سلطان کے دونوں چھوٹے بیٹوں کو والدین سے جدا کر کے دشمنوں کے ہمان خانہ کی طرف بھیجا جا رہا تھا۔

سلطان کے بڑے صاحبزادے شہزادہ فتح حیدر کی عمر اٹھارہ سال تھی اور اب بطور یرغمال بھیجے جانے والے شہزادوں عبدالغنی اور معز الدین کی عمریں دس اور آٹھ سال تھیں۔ دونوں شہزادے جس وقت ممنا بھری ماں اور شفقت و محبت بھری داوی اور دوسری عزیزہ خواہن سے رخصت ہوئے عکسراً سے باہر گئے، اس وقت کا حال نہ تو لکھا جاسکتا ہے اور نہ بیان ہو سکتا ہے اس کے لیے تو صرف یہ کہا جاسکتا ہے کہ گزرا تھا وہ گزری۔ اور اس طرح گزری کہ سیکڑوں آہوں، چیخوں اور اشکوں کا ایک سیلاب تھا جس میں محلات شاہی اور ان کے مکین لرزتے اور ہچکچاتے کھلتے محسوس ہوتے تھے۔

اس کے سوا کچھ اور کہنے کی طاقت نہیں! آپ اس منظر کو مرثیہ تصور کی آنکھوں سے ہی دیکھ سکتے ہیں۔ وہ قیامت کا سماں تھا یا کہ بلا کا ایک ہلکا سا عکس تھا۔

شہزادہ عبدالغنی اور معز الدین کی رخصتی کے مغرم جلوس کی ترتیب اس طرح تھی کہ سب سے آگے چند اونٹ سوار چل رہے تھے۔ ان کے پیچھے سات علمبردار مہر پرچم سنبھالے آ رہے تھے۔ ان کے عقب میں ایک سو پیادے چاندی کے پتھرے لیے چل رہے تھے۔ ان کے بعد دو ہاتھی تھے جن پر چاندی کے ہودوں میں ایک ایک شہزادے کی نشست تھی۔ دوسرے ہاتھیوں پر سلطان کے دو کبیل سوار تھے۔

جب یہ جلوس سلطان اور مصاحبین کے پاس سے گزرا تو کھٹی ٹھٹھامیوں اور اشکبار آنکھوں نے حاضرین پر موت جیسا سکوت طاری کر دیا۔

یہ خاموش قافلہ یا سلطنتِ خداداد کے اقتدار کے دو جنازے انگریزی یکپ کے قریب پہنچے تو مکار کارنوالس نے جس کا سینہ خوشی سے پھٹکار رہا تھا، آگے بڑھ کر بنگال رجمنٹ کی ایک بٹالین کے ساتھ مسکراتے ہوئے، شہزادوں کا استقبال کیا۔ جب شہزادوں کو عماریوں سے اتارا گیا تو وہ خود ان کا ہاتھ پکڑ کر خیمے میں لے گیا۔

نندار اور نمک حرام غلام علی خاں لنگڑے نے اس وقت کارنوالس کی طرف دیکھتے ہوئے بڑی مسرت بھری مکاری سے کہا:

”یہ دونوں شہزادے آج صبح تک میرے آقا کے بیٹے تھے لیکن میری درخواست ہے کہ اب آپ انہیں شفقت پداری عطا فرمائیے۔“

شہزادے ملل کے کڑتے زیب تن کیے ہوئے تھے اور بڑی سنجیدگی اور ممانعت سے خود کو اس اجنبی ماحول سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش میں مصروف تھے۔

ان کی ذہانت اس بات کی غماز تھی کہ سلطان نے ان کی کس اعلیٰ درجہ کی تربیت اور تہذیب کی ہے۔

اس وقت چھوٹا شہزادہ معز الدین باوقار اور خوش گفتار دکھائی دے رہا تھا جبکہ شہزادہ عبدالغنی خاموش خاموش تھا۔

دونوں شہزادے تھوڑی دیر کارنوالس کے خیمے میں رہے۔ پتہ نہیں اس نے ان سے کیا گفتگو کی۔ پھر تھوڑی ہی دیر بعد وہ شہزادوں کو باہر لے آیا اور انہیں عاریوں میں بٹھا کے ان خیموں کی طرف بھیج دیا جو ان کے لیے مخصوص کیے گئے تھے۔

دوسرے دن شہزادوں اور کارنوالس کی ایک اور ملاقات ہوئی۔ یہ ملاقات نسبتاً دوستانہ اور بے تکلفانہ تھی۔ اس ملاقات میں بھی نندار ملک و قوم غلام علی لنگڑا موجود تھا۔

غلام علی لنگڑے نے شہزادوں اور کارنوالس (جو فارسی کا ایک لفظ نہ جانتا تھا) کو فارسی کے بہت سے چٹکلے اور لطیفے سنائے۔

چھوٹے شہزادے معز الدین نے اپنی ذہانت کا ثبوت دیتے ہوئے خواجہ حافظ شیرازی کی ایک غزل سنائی۔ پھر کلامِ پاک کے ایک پورے سپارے کی تلاوت کی۔ ظاہر ہے کہ

اس وقت شہزادے کے پاس کلام پاک نہیں تھا اور جو کچھ تلاوت کیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ شہزادہ معز الدین آٹھ سال کی عمر میں کلام پاک یا اس کے کچھ حصوں کو حفظ کر چکا تھا۔ غلام علی ننگر سے کہ شہزادے کی یاقوت اور علمیت پر بڑی حیرانی ہوئی۔ وہ خود بھی پڑھا لکھا تھا مگر علم انسانی عقل کو جلا ضرور بخش تھا ہے اس کی راہیں متعین نہیں کرتا۔ عالم جو راہ چاہے اختیار کر سکتا ہے۔ غلام علی ننگر اگر اہو گیا تھا اور وطن فروشی اور نمک حرامی کے راستے پر چل پڑا تھا۔

دو شہزادے بطور برغال انگریزوں کی تحویل میں پہنچ چکے تھے۔

اس کے فوراً بعد سلطان نے ایک کروڑ ۶۵ لاکھ کی پہلی قسط بھی ادا کر دی تھی۔ اب سوال انگریزوں کو سلطنت خداداد کا اتنا علاقہ دینا تھا جو سالانہ تین کروڑ حاصل ادا کرتا ہو۔ سلطان نے اپنے طور پر اندازہ لگایا تو معلوم ہوا کہ اتنی رقم تو اس کی نصف سلطنت بھی مشکل سے ادا کر سکے گی، یعنی سلطان کو اپنی آدھی سلطنت انگریزوں کے حوالے کرنا پڑے گی۔

اس معاملہ پر جب گفتگو شروع ہوئی تو اس میں ایک ہینے لگ گیا۔

آخر شرائط کے مطابق سلطنت خداداد کو تقسیم کیا گیا۔

بارہ محل، سلیم، انورا نکری، سنگی درگ، ڈنڈیگل اور کالی کٹ کے علاقے انگریزوں کو دیے گئے۔

دریائے تنگ بھدرا کا شمالی علاقہ مرہٹوں کے پاس گیا۔

اور تار پتری، پارمری، بلاری وغیرہ نظام کے حوالے کیے گئے۔

قسط کی ادائیگی اور سلطنت کی تقسیم کے بعد انگریزوں کا پتہ بھاری ہو گیا اور اس کے ساتھ ہی اس ذلیل قوم کی فطری طبیعت میں ایک بار پھر فتور آ گیا۔

سلطان نے صلح نامے کی شرط کے مطابق محاصرہ اٹھانے کا مطالبہ کیا۔ سلطان کے وکیل نے کارنوالس کے سامنے جب یہ مطالبہ پیش کیا تو اس "دیانت دار" شخص نے بڑی ہی بے نرمی سے جواب دیا:

”کورگ کا علاقہ بھی ہمیں دیا جائے۔ تب محاصرہ اٹھانے کا سوال پیدا ہوگا۔“ صلح نامے میں یہ شرط ضرور نہیں تھی سلطان کا وکیل حیران رہ گیا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے یہ نیا مطالبہ واپس جا کر سلطان کے سامنے رکھ دیا۔ سلطان کو انگریزوں کی ذہنیت پر بڑا انشوس ہوا۔ اس نے وکیل ہی کے ذریعے کارنوالس کو پیغام بھیجا:

”اس نئے مطالبے کا جواز سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کی وضاحت کی جائے کہ جب تک شہزادے اور تاوان کی رقم نہیں پہنچی تھی اس

علاقہ کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا۔ اب ایسا کیوں کیا جا رہا ہے؟“

مگر سلطان کا احتجاج بیکار ثابت ہوا۔ کارنوالس کو یقین تھا کہ شہزادوں کی خاطر سلطان دوبارہ جنگ سے باز رہے گا۔

آخر سلطان کو کورگ بھی انگریزوں کے حوالے کرنا پڑا۔ اسے کہتے ہیں زبردست کا ہوتا سر پر یاز بردست مارے اور رونے بھی نہ دے!

سلطان نے کورگ کے سلسلے میں اس لیے بات آگے نہیں بڑھائی کہ یہ علاقہ اگرچہ سلطنت خداداد سے قریب اور انگریزوں کی عمارتوں سے دور تھا مگر دیہات ہمیشہ سازشیں اور فتنے پیدا ہوتے رہتے تھے اور سلطان کو ان کی سرکوبی کے لیے تعزیری میں بھیجنا پڑتی تھیں۔

کورگ کے بالا بار سے تھیں ہونے کی وجہ سے انگریزوں کی نظر میں بہت پہلے سے اس پر لگی ہوئی تھیں۔

کورگ بالا گھاٹ کے اوپر ایک جگہ واقع تھا جہاں سے سلطنت خداداد کا دارالسلطنت اور دوسرے علاقے اس کی زد میں آجاتے تھے اور اسی لیے انگریز کورگ پر مدت سے دانت لگائے بیٹھے تھے۔

کارنوالس نے سلطان سے کورگ کے مطالبہ کی ذلیل حرکت ہی نہ کی بلکہ اس نے اسے دے دیا مگر اس نے کورگ حوالے نہ کیا تو دوبارہ جنگ شروع کر دی جائے گی۔ چنانچہ سلطان نے دستخط شدہ کاغذات جن میں کورگ کی شمولیت بھی تحریر کر دی گئی تھی کارنوالس کو بھجوا دیے۔

کارنوالس نے اپنی کیبگی کا ایک اور مظاہرہ کیا۔

اس نے شہزادوں کو ذلیل کرنے کے لیے ان سے کہا کہ اس معاہدہ کی وہ اپنے ہاتھ سے دو نقلیں کر کے ایک نظام کے وکیل اور دوسری مرہٹہ وکیل کو دیں۔ شاہی خون جوش میں آ گیا۔

شہزادوں نے معاہدہ اٹھا کر پھینک دیا اور اس کی نقل کرنے سے صاف انکار کیا۔ شہزادوں کو برہم دیکھ کر کارنوالس گھبرا گیا۔ اور اس نے سوچا کہ ایسا نہ ہو، لینے کے دینے پڑ جائیں۔ سو اس نے معاہدے کی نقلیں خود ہی اتروائیں اور اپنے حلیفوں کو بھجوا دیں۔ سلطان کی اس شکست اور ذلت آمیز صلح نامے پر دستخط پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک نیس، کچی ہندو مؤرخین کہتے ہیں:

سلطنت خداداد کا، کارنوالس کے ہاتھوں بالکل خاتمہ ہو جاتا۔ جس شخص نے اس کو بحال کیا وہ نانا فرانسس تھا جو پیشوائے پونا کا وزیر اعظم تھا۔ اس کی دور بین نظر میں دیکھ رہی تھیں کہ کس طرح انگریز ملک پر حاوی ہو رہے ہیں۔

ہندو مؤرخین کے اس طرح کے بیانات کو سوائے ”جے پیوے پھوٹنے“ کے اور کچھ نہیں کہا جاسکتا اور یہ مسلمانوں پر خواہ مخواہ زبانی اوصاف جتانے کے سوا اور کچھ نہیں۔ دراصل سلطان کی بڑھتی ہوئی طاقت مرہٹوں کے لیے فضا کا پیغام بن گئی تھی۔ اس نے انگریزوں سے اتحاد اسی لیے کیا تھا کہ سلطنت خداداد کا خاتمہ کر دیا جائے۔

نانا فرانسس نہ تو عجب وطن تھا اور نہ دور اندیش۔ اس نے سلطنت خداداد کا خاتمہ کرنے کے لیے ہر امکانی کوشش کی تھی سلطان کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیتے ہوئے وہ یہ بھول گیا تھا کہ انگریزوں نے نارائن راؤ اور رگھو باکو کس طرح لڑا دیا تھا۔ اس کو یہ یاد نہ آیا کہ انگریزوں نے بنگال کے نواب مرزا علی اللہ کو کن سازشوں کا نشانہ بنا کر شہ قتل کیا تھا۔ اور یہاں جنوبی ہند میں بھی اسی کارنوالس نے والا جاہ نواب محمد علی کو کرناٹک سے کس طرح بے دخل کر رکھا تھا۔

کرناٹک کا پورا لشکر انگریز کمانڈروں کے ماتحت تھا اور حکومت کا انتظام و انصرام ہی انگریز ہی کرتے تھے اور نواب ان کی روٹیوں پر بڑا تھا۔

اس صلح نامے کا ایک دلچسپ پس منظر یہ بھی تھا کہ یہ جنگ ٹراونکور کے راجہ کے نام پر

شروع ہوئی تھی مگر اس صلح نامے میں اس کا کہیں ذکر نہ تھا۔ بلکہ مدراس واپسی پر اٹا انگریزوں نے راجہ سے جنگ کے افواہات کی مد میں نصف محاصل طلب کر لیے تھے۔ جس وقت اس صلح نامے کی خبر انگلستان پہنچی تو مسٹر فاکس نے واضح الفاظ میں پارلیمنٹ میں کہا:

”کارنوالس نے یسٹروں کا ایک جھٹکار کیا ہے اور اس کے ذریعے وہ حقداروں کا حق لوٹ رہا ہے۔“

برطانوی عوام نے یہ محسوس کیا تھا کہ سلطان نے اپنا کردار بڑی بہادری سے ادا کیا ہے اور کارنوالس کا سلطان کے بچوں کو ریشمال بنا کر رکھنا ایک غیر انسانی فعل ہے۔ یہاں تک کہ مدراس کے گورنر کے ایڈیٹر نے ”سلطان سے معافی“ کے عنوان سے ایک ادارہ بھی سکھا جس میں انگریز قوم کے سلطان کے ساتھ اس سلوک کو سلطان کی برسر عام توہین قرار دیا گیا۔ انگلستان کی بد احساس پارلیمنٹ پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا بلکہ اس نے کارنوالس کی اس رقی حرکت کو ایک کارنامہ قرار دیتے ہوئے اس کا رتبہ بڑھا دیا اور اسے ”مارکوئیس“ کا خطاب دیا گیا۔

کارنوالس کا میرمنشی جو اس جنگ میں شریک تھا اپنی تاریخ میں کارنوالس کی حکمت عملی کے متعلق لکھتا ہے:

”جب ہماری (انگریزوں کی) فوج موضع کرار میں تھی اس دن عرم کا چاند نظر آیا۔ کارنوالس نے عشرہ محرم کے دوران دس دن تک کیپ ڈالنے کا حکم دیا کیونکہ ہندوستان کے تمام سپاہی محرم کی دس تاریخ تک ردپ اور سوانگ بھر کر تعزیر اور علم بنا کر دنگل وغیرہ قائم کرتے ہیں۔“

اس قسم کی تمام رسومات سلطنت خداداد میں سلطان کے حکم سے بد کر دی گئی تھیں۔ کارنوالس نے ان رسومات کو جاری کر دیا اور سپاہیوں کو دس دن کی چھٹی دیدی کہ محرم منائیں۔

اس کے ساتھ ہی کارنوالس نے حکم دیا کہ سوانگ بھرنے والے اس کے خیمے کے سامنے سے گزریں کیونکہ وہ انہیں دیکھنا چاہتا ہے



وقت تک بچے ہوئے ہیں جب تک انگریزوں کو سلطان کا خطرہ ہے ورنہ سلطان کے انگریز ہمیں کب چھوڑیں گے۔

اور آئندہ چل کے ان کا یہ اندیشہ صحیح ثابت ہوا نہ صرف نظام ہمیشہ کے لیے انگریزوں کا ہو گیا بلکہ مرہٹوں کا وجود بھی انگریزوں کے رحم و کرم پر رہ گیا۔  
کارنوالس تو چاہتا تھا کہ سلطان کی طاقت کو پورے طور سے ختم کر دیا جائے مگر حالات اسے صلح کرنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس نے میسوری رائیوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ سلطان سے منت چھین کے ان کے حوالے کر دے گا لیکن کسی وقت وہ یہ سوچ کے گھبرا اٹھا تھا کہ کہیں نہ ہو کہ ان کے جانشین سلطان سے بھی زیادہ خطرناک نکلیں۔

شہزادہ عبداللہی اور شہزادہ معزالدین مدد راس پہنچ چکے تھے۔ ان کے اتالیق علی رضا خاں میر غلام علی خاں مقرر کیے گئے تھے۔ کرنل ڈیوٹن کو شہزادوں کی میزبانی کے فرائض سونپے گئے۔ شہزادوں کے عزیزوں اور ملازمین کو ان سے ملنے کی اجازت تھی۔  
ایک روایت کے مطابق والا جاہ محمد علی برائے نام حکمران کرناٹک نے انگریزوں سے مارش کی تھی کہ شہزادوں کی عزت و وقار آرام و آسائش اور کسی حد تک ناز برداریوں کا خیال رکھا جائے۔

ان شہزادوں کی داپسی اب باقی اقساط کی ادائیگی پر منحصر تھی مگر جس طور سلطنت کے حصے سے ہوئے تھے اور تباہی مچی تھی اس کے بعد اتنی بھاری قسطوں کا ادا کرنا دشوار نظر آتا تھا۔  
لاکھوں کے لیے بڑی جرات، اہمیت اور جانشینی کی ضرورت تھی لیکن حوصلہ مند سلطان جس کے اعلان کو اس وقت بھی مفاد پرست اور تک حرام گھن کی طرح چاٹ رہے تھے، اس نے اہمیت مردانہ سے تمام مشکلات پر نہ صرف قابو پایا بلکہ اس کا وقار بھی دوبارہ بحال ہو گیا اور انگریزوں کی بقیہ اقساط ادا کرنے کے قابل ہو گیا۔

اسی دوران یورپ میں انگلستان اور فرانس کے درمیان جنگ پھڑپھڑ گئی۔ چنانچہ اس کا اثر یورپی ممالک میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کے مقبوضات پر بھی پڑا۔ انگریزوں نے فرانس،

مگر سب سے زیادہ مضبوط مرکز پر قبضہ کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔

اور اسے اپنی سعادت سمجھتا ہے۔

چنانچہ سات محرم سے دس محرم تک علم، تعزیے اور سواگ بھرنے والے لوگ کارنوالس کے خیمے کے سامنے سے گزرتے رہے۔

کارنوالس خیمے کے باہر کرسی پر بیٹھ جاتا اور جب کوئی علم یا تعزیہ نظر آتا تو وہ اس کے احترام میں کھڑا ہو جاتا اور دو تین قدم پیچھے ہٹ کر آنکھیں بند کر لیتا۔ پھر جب علم یا تعزیہ آگے بڑھنے لگتا تو کارنوالس اپنے سیکرٹری مسٹر جری کو حکم دیتا کہ نذر گزاری جائے اسی وقت چاندی کے طباق میں روپے رکھ کر نذر دی جاتی۔

کارنوالس تین دن تک یہ مکاری کرتا رہا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چاروں طرف یہ خبر پھیل گئی کہ جن انگریزوں کو کافر کہا جاتا ہے وہ حسن سلوک اور اعتقاد میں مسلمان بادشاہوں سے اچھے ہیں۔

کارنوالس نے درگاہوں پر پیروں کو نذرانے لینے کی پھر سے اجازت دے دی۔

اتحادیوں کا مقصد پورا ہو گیا تھا اس لیے کارنوالس نے سرنگا پٹم میں مزید قیام مناسب نہ سمجھا کیونکہ خشک مصالحوں سے تیار کردہ سامان بے کار ہو چکا تھا۔ بیکار پڑے رہنے والے فوجیوں میں طرح طرح کی بیماریاں پھیل گئی تھیں۔ پس کارنوالس نے شہزادوں کو کرناٹک کی طرف روانہ کر دیا اور محاصرہ اٹھا کر روانگی کے لیے سامان باندھا جانے لگا۔

اپریل مہینے آغاز میں اتحادی سرنگا پٹم چھوڑ کے اپنے اپنے ٹھکانوں کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ اس طرح رخصت ہوئے جیسے ان میں باہم کوئی اتحاد کبھی تھا ہی نہیں اور یہ ٹھیک بھی تھا۔ انہوں نے یہ اتحاد تو سلطان کی طاقت کو کم کرنے کے لیے کیا تھا۔ سوائے کارنوالس کے انھوں نے مرہٹے یہ نہیں چاہتے تھے کہ سلطان کی طاقت کو کبھی ختم کر دیا جائے۔ جس طرح انہیں سلطان کی بڑھتی ہوئی طاقت سے یہ خطرہ تھا کہ یہ آتش فشاں انہیں جلا کر خاک نہ کر دے اسی طرح انہیں بھی خوب جانتے تھے کہ انگریز بھی سلطان سے کم طاقتور نہیں اور وہ انگریزوں کے شہ

جب باپ بیٹوں کا سامنا ہوا تو دونوں طرف خاموشی طاری تھی۔ صرف آنکھیں غناک تھیں۔ نہ نالو سکوت تھا۔

شہزادوں نے جھک کر اپنے ذی شان باپ کے قدم چھوئے اور باپ نے محبت سے دونوں کے سر پر ہاتھ پھیرا مگر صبر و استقلال کا یہ عالم تھا کہ کیا مجال جو باپ یا بیٹوں کی آنکھوں سے ایک لہر اشک بھی ٹپکا ہو۔

شہزادوں کی آمد کی خوشی میں ایک جشن طرب منعقد ہوا۔ اس جشن میں سلطان نے امور مملکت کو ننانوے (۹۹) عکوں میں تقسیم کیا اور ہر عکمہ کا نام اسم الہی پر رکھا مثلاً رحمان کچہری، ہم کچہری، ستار کچہری، اغفار کچہری وغیرہ۔

سلطان نے تمام سرداروں پر نوازشات خسروانہ کیں اور سید غفار کو میر میران اول کا خطاب دیا گیا۔

سلطان اگرچہ اہل ناٹھ سے خوش نہ تھا مگر اس نے ان کے دلداری کے لیے پھر بھی ان کے کئی لوگوں کو اور سیدزادوں کو میر میران کے خطاب عطا کیے۔

قارئین کو یاد ہو گا کہ سید غفار وہی جو افر دہے جس کے سپرد "قلعہ بینی" کی حفاظت کی گئی تھی۔ جب انگریز اپنی شامز کو شمش کے باوجود سلطان کو شکست نہ دے سکے اور صلح پر مجبور ہو گئے تو جنرل میڈوز نے اس صلح کی شدید مخالفت کی تھی۔

کارنوالس نے میڈوز کو سمجھایا تھا کہ اس وقت سلطان کو شکست دے کر سرنگاٹم پر قبضہ کرنا قطعی ناممکن ہے مگر میڈوز کسی طرح نہ مانتا تھا۔ آخر اس نے یہ شرط رکھی کہ اسے قلعہ بینی پر حملہ کی اجازت دی جائے۔ اگر وہ قلعہ بینی پر قبضہ کر لے تو جنگ جاری رکھی جائے اور اگر وہ ناکام رہے تو صلح کر لی جائے۔

کارنوالس نے مجبور ہو کر میڈوز کو قلعہ بینی پر حملہ کا اجازت دے دی چنانچہ اس نے قلعہ بینی پر شدید حملہ کیا۔

مگر اسے معلوم نہیں تھا کہ قلعہ کا محافظ سید غفار ہے۔ اس نے تھوڑی ہی دیر میں میڈوز کے حملہ کو ناکام بنادیا اور اسے بھاگنے پر مجبور کر دیا۔

میڈوز نے اس ناکامی کے بعد فوراً ہی سینٹیل کر دوبارہ حملہ کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اسے دو ہزار سپاہیوں کی بھیبت دے کر شرمندہ ہو کر واپس آنا پڑا۔ سلطان نے سید غفار کی سی

کارنوالس ان دنوں کلکتہ میں تھا۔ وہ فوراً مدراس آیا۔ یہاں پہنچ کے اس نے کرنل فلائڈ کو خشکی کے ذریعے اور اپنے بھائی کو ڈور کارنوالس کو سمندر کے راستے پانڈ بچری پر حملہ غرض سے روانہ کیا۔ پھر وہ خود اگست ۱۸۴۳ء میں انگلستان چلا گیا۔

کارنوالس کے انگلستان جانے سے پہلے اس کی جانشینی کا مسئلہ اٹھلے جسے کارنوالس نے خود اس طرح طے کر دیا تھا کہ اس نے اپنی جگہ جنرل میڈوز کو نامزد کر دیا مگر جنرل میڈوز اس کی پالیسیوں کے خلاف تھا۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ میڈوز نے صلح نامے پر دستخط کے موقع پر ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے خود کشی کی کوشش بھی کی تھی۔ اب پتہ نہیں یہ واقعی احتجاجاً خود کشی تھی یا محض ایک ڈھونگ۔ کیونکہ بیان یہ کیا گیا ہے کہ گولی اس نے سر میں مارنے کی کوشش کی مگر وہ پیٹ کے پار ہو گئی۔

یہ بات کسی طرح بھی قابل یقین نہیں!

کارنوالس اپنے جانے سے پہلے سلطان کی اشک، شوقی کے لیے اس کے بیٹوں کو واپس کر دینا چاہتا تھا لیکن نظام دکن کے ساتھ چند وہیات کی ملکیت کا جھگڑا کھڑا ہو گیا اس لیے شہزادوں کی واپسی کا معاملہ معطل ہو گیا اور یہ کام اس کے جانے کے بعد ہوا۔

سلطان کے دونوں بیٹے عبدالغنی اور شہزادہ معز الدین اگرچہ مدراس میں بہت آرام سے تھے مگر انہیں اس سونے کے بچے میں بند ہونے دو سال کا عرصہ ہو رہا تھا اور وہ اپنے والدین اور دیگر اعزہ سے ملنے کے لیے بہت بے چین بلکہ پریشان ہو رہے تھے۔

آخر مارچ ۱۸۴۴ء میں کارنوالس کے جانشین سر جان شور نے انہیں مدراس سے جانے کی اجازت دے دی۔

شہزادے اپنے میزبان ڈیوٹن اور دونوں اتالیقوں علی رضا خاں اور غلام علی خاں لنگڑے کے ہمراہ مدراس سے ملیسور کی طرف روانہ ہوئے۔

شہزادوں کی روانگی ۱۸ مارچ ۱۸۴۴ء کو ہوئی اور یہ مختصر قافلہ بارہ دن کے بعد ملیسور پہنچا تھا۔

سلطان اس وقت اپنے پیدا نشی شہزادوں ہی میں مقیم تھا۔ اس نے آگے بڑھ کے شہزادہ کا استقبال کیا۔ یہ ایک غناک خوشی کا موقع تھا۔

بادری کے اعتراف میں اسے "میر میران اول" کا خطاب دیا تھا۔

پہلے بنایا جا چکا ہے کہ سلطان نے ایک شاہی تخت تیار کر لیا تھا اس کا نام "تخت ہما" رکھا گیا تھا۔ چونکہ سلطان خود نشتر تھا۔ اسے نشیروں سے اس قدر لگاؤ تھا کہ زور آسانی کے لیے اس نے نشر پال رکھے تھے۔ چنانچہ اسی مناسبت سے سلطان نے اس تخت کو نشیروں کے پایوں پر رکھا تھا۔

اسے اس تخت پر بیٹھنے کی بڑی آمدنی تھی لیکن اس تخت پر جلوس کے لیے ایک خاص رسم ادا کی جاتی تھی جس کا نام "ٹیکہ" تھا۔

"ٹیکہ" کی رسم مغلیہ شہنشاہ جلال الدین اکبر کے زمانے میں رائج ہوئی تھی جب اکبر نے تمام راجپوت راجاؤں کو شکست دے کر تخت شاہی پر جلوس کیا تھا تو اودے پور کے راجہ جسونت راؤ کی بیٹی "ٹیکہ" لے کر آئی تھی اور اس نے اکبر کے ماتھے پر ٹیکہ لگایا تھا۔ اس وقت سے خاندان و سلطنت مغلیہ میں رسم پڑ گئی تھی کہ جب کوئی بادشاہ تخت نشین ہوتا تو اودے پور کی راجکماروں اس کے ٹیکہ لگانے آیا کرتی تھی۔

سلطان بھی یہی چاہتا تھا کہ اس کے جلوس کے موقع پر کسی ہندو راجہ کی بیٹی اس کے ٹیکہ لگائے۔

چنانچہ اس نے اس سلسلہ میں "کچھ کے راجہ" کو کئی لاکھ کے تحفے تحائف بھیج کر اس پر راضی کیا تھا کہ اس کی لڑکی سلطان کو ٹیکہ لگانے آئے گی لیکن مسلسل جنگوں نے سلطان کو اتنا سکون ہی نہ لینے دیا کہ وہ اس رسم کو ادا کر کے "تخت ہما" پر جلوس نہ لے سکے۔

۱۷۹۵ء میں سلطان نے خدیجہ زمان سے تیسری شادی کی۔

خوشی کے اس موقع پر سلطان نے ایک دفتر خوان عام بھجوا دیا اس پر ہر چھوٹے بڑے کو بٹھایا گیا۔

سلطان نے ان سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھایا۔ بعد میں اس نے ایک مختصر سی تقریر کی جس میں اس نے کہا:

"اسلام نے ایک مکان کو دوسرے کا بھائی بنایا ہے اس لیے

چھوٹے بڑے کے امتیاز کو دل سے نکال دو۔ قبیلہ اور خاندان کے کمتر اور بہتر ہونے کے فرق کو مٹا دو۔ سب مل کر رہو اور خلا پر بھر دے رکھو۔

سب مل کے کافروں کے خلاف جہاد کرو اور شہادت کے لیے ہر دم تیار رہو۔

پھر سلطان نے تمام حاضرین میں خلعتیں تقسیم کیں۔ یہ تمام خلعتیں ایک کپڑے اور ایک ہی ڈیزائن کی بنی ہوئی تھیں۔ سب کا رنگ سرخ تھا۔ خلعتوں کی تقسیم کے بعد سلطان نے کہا:

"ان خلعتوں کو شہادت کا لباس سمجھو۔"

اس سے اگلے سال سلطان نے اپنے ایک بیٹے شہزادہ محمد الدین کی شادی محمد علی عرف جوج میاں کی بیٹی سے کی اور محمد الدین کی بڑی بہن کو جوج میاں کے بیٹے سے بیاہ دیا۔

اسی سال ایران کا شہزادہ جو سلطان کا مہمان تھا، اپنے ملک واپس گیا۔

اس ایرانی شہزادے کا قصہ یہ تھا کہ عالم غربت میں سلطان کے پاس سرنگا پٹم پہنچا سلطان نے اسے بڑے احترام سے ایک شاہی مہمان کی حیثیت دے کر اپنے پاس رکھا۔ اس کے رہنے کے لیے ایک حویلی دی اور نوکر چاکر مقرر کیے اور شہزادے کا دس ہزار روپے ماہانہ وظیفہ بھی جاری کیا۔ کئی سال تک سلطان کے پاس مہمان رہنے کے بعد اب وہ ایران اپنے ملک واپس جا رہا تھا۔

سلطان نے شہزادے کو عزت سے رخصت کیا اور فرمایا:

"شہزادے۔ آپ ایران پہنچ کے پہلے اپنی سلطنت کے معاملات درست کریں۔ پھر ہم آپ اور زماں شاہ والی کابل مل کر ہند اور دکن کے نظم و نسق کی طرف توجہ دیں گے۔"



صلح کے بعد انگریز، امریسٹے اور نظام اپنی فوجوں کے ساتھ سرنگا پٹم سے رخصت ہو گئے مگر سلطان کی عزت اور وقار کو اس قدر داغدار کر گئے کہ عوام کے دلوں سے شاہ کی عزت و حریت

رخصت ہو گئی۔ وہ اب سلطان کو ایک شکست خوردہ بادشاہ سے زیادہ درجہ نہ دیتے تھے مگر سلطان نے بے عزتی، بدنامی اور شکست کے اس داغ کو اپنی تقدیر نہیں بنایا بلکہ ایک نئے عزم کے ساتھ ملک کے استحکام میں لگ گیا۔

اب اس کی زندگی کا ایک ہی مقصد تھا کہ وہ کسی طرح اتنی طاقت حاصل کر لے کہ انگریزوں سے اس ذلت کا انتقام لے سکے اور سلطنت کو پہلے جیسی سر بلندی اور سرخروئی کے درجہ پر پہنچا دے۔

سلطان نے اپنی شکست کے اسباب معلوم کرنے کے لیے ایک فوجی کمیشن مقرر کیا مگر انگریزوں نے اپنی مصلحت کی بنا پر اس کمیشن کے کام میں طرح طرح کے روٹے بٹکائے اور اسے کسی نتیجہ پر نہ پہنچنے دیا۔ بہر حال سلطان کی سمجھ میں یہ بات آسانی سے آگئی کہ اس ذلت آمیز شکست کے لیے سلطنت کا بڑے سے بڑا اور چھوٹے سے چھوٹا افسر انگریزوں کے ساتھ سازش میں شریک تھا۔ سلطان کے ہمدرد اور وفادار یا تو لڑتے لڑتے شہید ہو گئے تھے یا پھر دربار پر سازشیوں کا دور دورہ دیکھ کر خاموشی سے اگک ہو گئے تھے۔

ان حالات میں سلطان کسی کو مزا نہیں دے سکتا تھا کہ ہر دو سرا آدمی جو رافضی پرست یا غدار تھا۔

پس سلطان نے اس وقت وہی کیا جو اس کے بس میں تھا۔ اس نے تمام مسلمان وزیروں اور افسروں کو مسجد اعلیٰ میں جمع کیا اور کہا:

”یہ سلطنت خدا واد خاص میری نہیں بلکہ عوام کی ہے۔ اس کی بقا مسلمانوں کی بقا اور اس کی آزادی مسلمانوں کی آزادی ہے۔

ہم سے نادانی میں جو کچھ ہوا اس پر خاک ڈالو۔ بھول جاؤ اور

اب نئے سرے سے اس کی سر بلندی کا عہد کرو۔“

اس کے بعد سلطان نے ہر ایک سے حلف اٹھوایا اور سب نے حلف اٹھایا۔ سلطان کے مسلمان افسروں خاص کر میر صادق نے اس وقت جس قسم کا عہد اور حلف اٹھایا تھا، اس عہد اور حلف

یہ وہی مسجد ہے جسے سلطان نے اس وعدے کے مطابق تعمیر کرایا تھا جو اس نے بچپن میں ایک درویش سے کیا تھا۔

کی ایک نقل کتاب نارٹن میسور کے صفحہ ۷۲ پر دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ عہد نامہ اس طرح لکھا ہوا ہے:

### عہد نامہ میر صادق

میں میر صادق نیک خوار ملازم سلطنت خدا واد اپنے پروردگار اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور کلام اللہ کو حاضر ناظر اور شاہد سمجھ کر اور خدا کی قسم کھاتے ہوئے مدق دل سے اقرار کرتا ہوں کہ میں نہایت وفاداری سے اپنے آقا سلطان کی اطاعت کروں گا اور اس کے حکم کو ہر چیز پر مقدم رکھوں گا۔ میرا دل کبھی اس کی اطاعت سے منحرف نہ ہو گا۔ میری زبان اس کے خلاف کبھی ایک لفظ نہیں کہے گی۔ میری آنکھ اس کی بے وفائی نہ دیکھ سکے گی۔ میرے کان کبھی اس کے خلاف نہ سن سکیں گے۔ میرے ہاتھ ہمیشہ اس کی برتری اور بھلائی کے لیے کوشاں رہیں گے۔

اور میں یہ اقرار کرتا ہوں کہ اس کے خلاف میں جو کچھ دیکھوں گا یا سنوں گا تو اسی وقت حضوری میں بیان کر دوں گا۔

اگر مجھ سے خدا نخواستہ ان مذکورہ بالا شرائط کی کبھی خلاف ورزی ہو جائے یا میری اطاعت میں فرق آجائے تو میں خدا کے برتر اور توانا کو جس کا دوسرا نام منتقم بھی ہے، حاضر و ناظر سمجھ کے کہتا ہوں کہ وہ مجھے اپنے غضب میں پکڑے اور مجھے تباہ کر دے۔“

میر صادق کے اس عہد نامے پر صاحب ”نشانِ حیدری“ نے کیا خوب تبصرہ فرمایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

”لیکن وہ تو دُور ہی پلٹ چکا تھا اور وہ سیاہ دل، قوی زندگی آزادی یا شہادت کو کیا جانتے تھے اس لیے سب زمانہ سازی کی باتیں کہہ کے واپس ہو گئے اور جو سپے، دیندار اور پکے وفادار تھے ان سے سلطان کو کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی۔“

مگر جاں نثار لوگ باقی کہاں تھے؟

دہ یاز شہادت کے درجہ پر فائز ہو چکے تھے یا دربار پر منکح اموں کا قبضہ دیکھ کر گوشہ نشین ہو گئے تھے۔

سلطان کو ہر شخص پر اعتماد تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ زمانہ نے سلطان کو ہر شخص پر اعتماد کرنے کا سبق سکھایا تھا کیونکہ مصلحت ہی یہی تھی۔ اس لیے سلطان نے اطمینان کا سانس لیا اور دوسرے امور سلطنت میں مشغول ہو گیا۔

سلطان نے اسباب شکست کے لیے جو کمیشن مقرر کیا تھا اس کو ذیل کرنے کے لیے انگریزوں نے اپنے گروں کے ذریعے ایڑی چوٹی کا زور لگایا اور اس کی کارکردگی اگرچہ ناقص ہو کر رہ گئی اس لیے کہ ہر امیر مجرم تھا مگر اس کے خلاف کوئی شہادت نہ ملتی تھی۔ پھر بھی سلطان کے وزیر میر ہمدی خاں ہمدی ناٹھ گرفت میں آ گئے۔

ان پر یہ الزام ثابت ہو گیا کہ میسوری تیسری جنگ کے دوران میر ہمدی ناٹھ نے چند کرناٹکی ساہوکاروں اور دوسرے نمک حراموں کے ساتھ مل کر انگریزوں سے سازش کی اور نظم و نسق کے تمام شعبوں میں ابتری پیدا کی۔

میر ہمدی ناٹھ پر یہ الزام بھی ثابت ہو گیا کہ اس نے سرنگاپٹم پر حملہ کے وقت سلطانی فوج کو ادھر ادھر منتشر کر دیا تھا۔ قلعوں کے دروازے کھلوا دیے تھے اور انگریزوں کو بے دھڑک گڑھیوں تک پہنچنے کا موقع فراہم کیا تھا۔ یہی نہیں بلکہ عین لڑائی کے وقت ۶۹ توپوں کو مٹی اور ریت سے بھر دیا کہ بیکار کر دیا تھا۔

چنانچہ جتنے اشخاص بھی مجرم ثابت ہوئے انہیں سلطان کے حکم سے کیفر کردار تک پہنچا دیا گیا۔

سلطان ٹیپو کو دورانہ لیش کہا جاتا ہے اور یہ ٹھیک بھی ہے کیونکہ اس نے ایران، ترکی، افغانستان اور دوسری مسلم سلطنتوں کی مدد سے ہند میں ایک عظیم مسلم مملکت بنانے کی بھرپور کوشش کی تھی لیکن اس نے اپنے گرد موجود نمک حراموں کو اور غداروں کو مناسب مزانہ دے کر ان کے حوصلے بڑھا دیے تھے۔ میر ہمدی خاں ناٹھ کا جرم ثابت ہو گیا تھا مگر

اسے ٹوٹی پر چڑھانے کے بجائے صرف برطرف کیا گیا۔

پورنیا اور میر صادق پر قوی شبہ ہونے کے باوجود انہیں ان کے عہدوں سے نہیں ہٹایا گیا اور پورنیا کو وزارت مال اور میر صادق کو دیوان یعنی وزیر اعظم کے عہدے پر فائز رکھا گیا۔

سلطان کو فی الحال انگریزوں، مرہٹوں اور نظام سے کوئی خطرہ نہ تھا اس لیے اس نے اندرونی غداروں سے غمٹنے کے لیے فوجی میں روانہ کرنا شروع کیں۔

انہی دنوں بعض جاسوسوں نے اطلاع دی کہ شمالی علاقوں کے پالیگار بغاوت پر آمادہ ہیں۔ ایک شخص نے سپانائیک کا رشتہ دار ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور اس نے چار ہزار پیادے فراہم کر کے ہوجنی درگ کے قلعہ پر قبضہ کر لیا ہے اور اب ہر ہن ہلی پر دانت لگائے ہوئے ہے۔

اس اطلاع پر سلطان نے قمر الدین کو بھاری جمعیت کے ساتھ بغاوت فرو کرنے بھیجا۔ قمر الدین لشکر لے کر ہو جنگی درگ پہنچا اور قلعہ کا سختی سے محاصرہ کر لیا۔

یہ سخت محاصرہ سات ماہ تک جاری رہا۔ پھر جب قلعہ پر قمر الدین کا قبضہ ہو گیا تو اس نے تمام باغیوں اور غداروں کے ہاتھ پیر ٹھوادیے۔ سپانائیک کے فرنی رشتہ دار اور اس کے ساتھیوں کو ٹوٹی پر چڑھا دیا۔

اس طرح چند ہی ماہ میں شمالی علاقوں کا امن و امان بحال ہو گیا۔ اس علاقے کا صوبدار بیرنگ تھا جو فوج کی کمی کی وجہ سے قلعہ چھوڑ کے جیش درگ میں پناہ گزین ہو گیا تھا۔ قمر الدین نے اسے بلا کر دوبارہ واپس کا حاکم مقرر کیا۔

اسی طرح کا ایک آدمی بنگلی گورہ تھا۔ اس نے خود کو ایک پالیگار مرکیسی کی اولاد کا ظاہر کیا اور گورہ بندہ پر قابض ہو گیا۔

اس کی سرکوبی کے لیے سلطان نے سید حمید کو فوج دے کے روانہ کیا۔ سید حمید نے تین ماہ کی سخت جدوجہد کے بعد قلعہ گورہ بندہ فتح کیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے رتن گیری اور مد گیری کو بھی باغیوں سے چھین لیا۔ پھر باغیوں کے ناک کاٹ ٹھوادیے۔

اس کارکردگی کے صلہ میں سید حمید کو نوبت، عاری دار کھٹی اور نواب کا خطاب ملا اور سلطان نے اسے بد نور کا صوبہ دار مقرر کر دیا مگر اس کی عمر نے وفات کی اور وہ چند ماہ

بعد ہی انتقال کر گیا۔

روایت ہے کہ میر قمر الدین اپنی کارکردگی کے صلہ میں سلطان کی فرزند کا خواہش مند تھا اور اسی لیے ہر معرکہ میں بڑھ چڑھ کے حصہ لیتا تھا مگر سلطان نے اس کی خواہش پر توجہ نہ دی بلکہ اس کی شادی اسی سال نائطہ خاندان کی ایک لڑکی سے کرادی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ سلطان کا سخت مخالف ہو گیا۔

ان امور سے فارغ ہو کر سلطان نے ملکی نظم و نسق پر توجہ دی۔ لوگوں کی خطائیں معاف کیں۔ مزا کے طور پر جن کا تبادلہ کر دیا گیا تھا انہیں سرنگا پیٹم بلوایا گیا۔ پھر سب کو عیدالاضحیٰ کے موقع پر لال باغ میں جمع کیا اور بعد نماز عید مسلمانوں نے قرآن پڑھا، برہمنوں نے رامائن پڑھا اور دوسرے افسروں نے دودھ اور چاول پڑھ کر حلف اٹھا یا کہ وہ خزانہ کی ادائیگی میں غفلت نہیں برتیں گے۔ رشوت نہیں لیں گے۔ غبن نہیں کریں گے۔ رعیت کو تکلیف نہ پہنچائیں گے اور گناہوں اور برائیوں سے اجتناب کریں گے۔

سلطان نے اپنے طور پر سلطنت کے عاملوں کو مدھارنے کی بہت کوشش کی مگر وہ حقیقت میں اخلاقی طور پر دیوانہ ہو چکے تھے۔

سلطان نے دفتری زبان فارسی مقرر کی تھی اس سے برہمنوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ مگر وہ عامل جنہیں سلطان ان کی بہادری کے صلے میں جاگیر یا کہیں کی حکومت عطا کرتا وہ وہاں پہنچ کے انتظام برہمنوں کے ہاتھوں میں دیدیتے اور خود عیش و عشرت میں مشغول ہو جاتے۔ اس طرح یہ اخلاق باختہ عامل حکومت اور درپردہ برہمن جنہیں میسر کے راجہ کے زمانے میں خوب مراعات حاصل تھیں، دونوں طبقے مل کر سلطنت کی بنیادوں کو دیک بن کر چاٹ رہے تھے اور سلطان کا اصلاحات کا سارا پروگرام اور یہ حلف نامے اور قسمیں ان پر خاک اثر نہ کر پتی تھیں۔

میر صادق اور غلام علی خاں سنگھ سے جیسے لوگ سلطان کے سامنے تو بھگی بٹی بنے رہتے مگر رات کے اندھیرے میں ہمیشہ سلطان کا تختہ لٹنے کی سازشوں میں لگے رہتے تھے۔

اس سلسلے میں سلطان کو ذمہ دار نہیں ٹھہرایا جاسکتا اس لیے کہ اس نے ایک اسلامی معاشرہ تشکیل دینے کے لیے ہر گاؤں اور موضع میں ایک مسجد تعمیر کرائی تھی جس میں ایک مؤذن ایک ملا اور ایک قاضی مقرر کیا گیا تھا۔ اسی طرح انھوں نے مسلمان بچوں کی تعلیم و تدریس کے علاوہ

قاضی مقرر کر کے سلطان انصاف ہر شخص کے گھر کے دروازے تک پہنچا دیتا تھا مگر بد قسمتی تو یہ تھی کہ سلطنت خداداد کے عہد سے دار اسلامی سلطنت کی بیخ کنی کرنے میں دن رات کوشاں رہتے تھے۔

اس حلف کے بعد سلطان نے ملکی طرز حکومت کو خزانہ کے طرز پر جمہوری انداز میں ڈھال دیا۔ سلطان نے اپنے اختیارات وزیروں کے میر و صدور کو سونپ دیے۔ عوام کو حکومت میں اختیارات دینے اور عوام کو عوام کی خدمت کرنے کے لیے ایک دیوان (پارلیمنٹ) بنایا جس کا نام 'ذمرہ غم نہ باشد' رکھا گیا مگر یہ جمہوریت غلامانہ ذہن رکھنے والوں کو راس نہ آئی۔ وزیروں کے ہاتھوں میں اختیارات آئے تو انہوں نے بد نظمی اور رشوت ستانی کا بازار گرم کر دیا اور رستم نگوں میں اتاری پھیل گئی۔

سلطنت خداداد کا دیوان یعنی وزیر اعظم یا میر صدور میر صادق تھا۔ اس نے عیس و وزراء کو کٹھ پتلی بنا کر رکھ دیا اور تمام اختیارات اس کے ہاتھ میں جمع ہو گئے۔ وہ جو چاہتا سو کرتا تھا مگر سلطان کو اس کی خبر بھی نہ ہوتی تھی۔

یہ بات بھی کچھ کم حیرت انگیز نہ تھی کہ سلطان جیسا پڑ عزم اور مدبر حکمران میر صادق کے اشاروں پر چلنے لگا تھا۔ سول اور فوجی عہدے وارڈوں نے ہندو رکھلے الفاظ میں بار بار سلطان کو اس بات سے آگاہ کرنے کی کوشش کی کہ میر صادق اپنے دشمنوں (جو دراصل سلطنت خداداد کے وفادار تھے) کو ختم کرنے اور اختیارات کو زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر میں ہے مگر سلطان بجانے کیوں میر صادق کی حرکتوں کی پردہ پوشی کرتا یا اس سے صرف نظر کرتا تھا۔

سلطان نے اسی سال دار السلطنت سرنگا پیٹم کی از سر نو تعمیر شروع کرائی۔ پرانی تفصیل کو منہم کر دیا گیا اور اس کی جگہ دریائے کاویری کی طرف دو نئی تفصیلیں، برج اور حصار کمری خندق کے ساتھ تعمیر کرائے۔ جنوب کی سمت تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پانچ نئی گڑھیاں بنوائیں۔ اس طرح دریا دولت باغ جو حصار کے باہر تھا اب جو تھے حصار میں آ گیا۔ قلعہ کے مغرب کی جانب چار نئی گڑھیاں کی تعمیر شروع کرائی مگر ان میں سے صرف دو تعمیر ہوئیں۔

جلے عورت اور مقام آفسوس ہے کہ ان تمام عمارات میں پہلے سلطانی عمل اور بارہوری

ہم تھے۔  
ناشتہ کے بعد سلطان کچری منعقد کرتا۔ دربار کی یہ نشست صبح دس بجے سے گہری رات تک جی رہتی تھی۔

ایک خواجہ مرا کے سپرد یہ کام تھا کہ وہ ہر صبح دربار میں سفید چادر میں اوقالین بچھوائے ان پر سلطان کے لیے قبلہ رخ ایک مسند لگائی جاتی جس میں تین سنہری تکیے رکھے جاتے تھے۔ سلطان کے دائیں جانب ایک خنجر، گٹار، دود پستول اور سہرے رنگ کا شیر کے سر کی طرح کا بنا ہوا خود اور ایک بھولوں سے بھری ٹوکری رکھی جاتی تھی۔ بائیں طرف اگالک ہوتا تھا۔ سلطان کے سر پر سفید رنگ کی برہن پوری دستار ہوتی تھی جس میں پیاس گز کپڑا صرف ہوتا تھا۔

سلطان زیادہ تر سفید کپڑے پہنتا۔ اس کی جیب میں پوری طرز کی ایک گھڑی ہمیشہ رہتی۔ سلطان آخری ایام میں عربی طرز کی سبز رنگ کی شلوار دستار پہننے لگا تھا۔ مسند پر بیٹھے ہی سلطان خطوط کے جواب لکھواتا۔ پھر اپنے سامنے موجود وزرا دکھانے دیتا۔ یہ حکم نامے اس کے منشی مختلف زبانوں (فارسی، ہندی، کینری، تلگو اور اردو) میں لکھتے تھے۔

اس کے بعد معاری، پاجوب سازی، کتابداری، خانہ داری، نکسال اور چوب داری کے دو دواہرین پیش ہوتے۔ ان میں سے ایک کو دن اور ایک کو رات کی ذمہ داریاں سونپی جاتی تھیں۔ اسی طرح کے اور ماہرین پیش ہوتے اور اپنے اپنے کام کے احکام سلطان سے حاصل کرتے۔

ان کے پیچھے کو توای شہر حاضر ہوتا اور مختلف مقدمات کے سلسلے میں سلطانی احکام سناتا تھا۔

دو پر دہ بجے کے قریب کھانے کا دسترخوان بچھتا۔ دسترخوان پر شہزادے، امرا اور درزا حاضر ہوتے۔

سلطان خود صاحبِ علم تھا اس لیے اہل علم کی پوری قدر دانی کرتا تھا۔ اس لیے ادبا، شعرا اور میرت و تقاسیر کے علما بھی ہر وقت ساتھ ہونے اور کھانے میں شرکت کرتے تھے البتہ بے ہودہ گوئی کا دربار میں کوئی گزرنہ ہوتا تھا۔

منہم کرائی گئی۔ پھر بنگلور کا محل بھی ڈھایا گیا۔ اس کا قہوڑا سا حصہ باقی ہے۔

بنگلور کی مسجد مراکش کے عربوں کے فن تعمیر کا پہلا نمونہ تھی۔ اس کا ایک ہی مینار تھا۔ اسے بھی شہید کر دیا گیا۔ بنگلور کے عجائب گھر میں اس کی تصویر موجود ہے۔ یہ مسجد شہر گوی پیم کی پہاڑی پر تھی۔ وہاں اب ایک مندر ہے۔

بھارت کی سیکولر حکومت جو دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کہلاتی ہے اسے بھارت میں نہ تو کسی خطہ پر اسلامی حکومت پسند ہے اور نہ وہ اسلامی روایات، جن کا سب سے اہم نشان "مسجد" ہوتا ہے، کو یہ سیکولر (غیر مذہبی) حکومت برداشت کرنے کو تیار ہے۔ یہ جہل بھارت میں بامری مسجد کو شہید کرنے کی کوششیں پورے عروج پر ہیں اور مقبوضہ کشمیر میں ہتے مسلمانوں کا قتل عام جاری ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ محترمہ تھا جو جذباتی طور پر قلم سے ادا ہو گیا۔ اب میں ہیر سلطان پٹو کے مرثیہ کی طرف آتا ہوں۔

جی ہاں۔ یہ بھی تو ایک مرثیہ ہے۔ جس طرح شامی لشکر جناب حسین نجی نواسٹر رسول کو گھر کر میدان کر بلا میں شہادت کے لیے لے گیا اسی طرح غدار اور نمک حرام مدیدارانِ حکومت میو ایک چھوٹی کر بلا پر پا کرنے میں کامیاب ہوئے جس کا ذکر آگے آتا ہے۔

سلطان کی عمر ۴۲ سال کی ہو چکی تھی۔ اس کے معمولات میں عبادت اور ریاضت کا زیادہ دخل ہو گیا تھا۔ اس شکست کے بعد سلطان نے قسم کھائی تھی کہ نہ تو وہ تخت پر بیٹھے گا اور نہ ہی چارپائی پر سوئے گا۔ اور نہ کھد ر کے سوا کسی اور گہڑے سے جسم کو ڈھانکے گا۔ چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ سلطان نے زندگی کے بقیہ ایام چٹائی پر سو کر گزارے۔

سلطان کے صبح و شام کچھ ایسے گزرتے تھے:

صبح جلد اٹھتا۔ ہلکی سی ورزش کرنا۔ سارے بدن پر ماش کروانا۔ پھر صبح کی نماز پڑھنے کے ایک گھنٹہ تلاوت میں مصروف رہنے کے بعد چہل قدمی کے لیے نکل جانا۔

واپس آکر جواہرات کا معائنہ کرنا۔ پھر ہلکا سا ناشتہ کرنے کے بعد پنجویں کو بلوانا جو روزانہ معمولات کے بارے میں سلطان کو ستاروں کی چابیں بتاتے تھے۔ اس کے بعد چند لکھے اور ایک بکر اصدقہ دینا۔ پھر دوپہر کے کھانے کے لیے مہزیوں کا انتخاب۔

نوبت کے قریب عام ناشتہ کیا جاتا جس میں شہزادے، امرا اور وزرا شریک دسترخوان

تین بیچ کے قریب سلطان آرام گاہ میں چلتا اور چند لمحے گزرنے پر فوج کے معائنہ روانہ ہو جاتا۔ نئے بھرتی ہونے والے سپاہیوں کو دیکھتا اور ان کی کارگزاری کا جائزہ لیتا۔ شام کی نماز اکثر وہیں پڑھتا۔

رات گئے محل میں واپس آتا۔ وہاں دسترخوان پر شہزادے اور امراء و وزراء اس کے منظر ہوتے۔ کھانے کے بعد ایک بار پھر تاریکی مباحث پھر جاتے۔ اس کے بعد سلطان خواب گاہ میں چلا جاتا اور دیر تک مطالعے میں مصروف رہتا۔

میسور کی تیسری جنگ کے بعد سلطان نے خواب گاہ سے پلنگ نکلا دیے تھے اور صرف ایک چٹائی بچھالی تھی جس پر سلطان زیادہ وقت عبادت میں گزارتا تھا۔

سلطان کے حرم میں ۶۰۰ کے قریب عورتیں تھیں مگر سلطان کے ان سے کوئی تعلقات نہ تھے۔ اس کا حرم محض زنان خانہ تھا جہاں عورتیں رہتی تھیں اور ان کی خدمت پر خواجہ سرا مامور تھے۔ عورتوں کو اجازت تھی اگر وہ زنان خانہ سے جانا چاہیں تو جاسکتی تھیں۔ ان خواتین میں حیدر علی مرحوم کی ۲۸ کنیزیں بھی تھیں جنہیں رخاست نہیں کیا گیا تھا۔

سلطان نے صرف تین شادیاں کیں۔ دو تو بچپن ہی میں ہو گئی تھیں۔ تیسری شادی اس نے ۱۷۹۵ء میں سید صاحب کی بیٹی سے کی تھی۔ اس عظیم سے ایک بیٹی پیدا ہوئی جو سلطان کے بعد تک زندہ رہی۔

غیب بات تھی کہ سلطان ایک پکا عبادت گزار ہونے کے باوجود توہم پرست بھی تھا۔ خوابوں اور نجوم پر اس کا اعتقاد یقین کی حد تک پختہ تھا اس لیے وہ مولویوں سے زیادہ نجومیوں کی بات پر دھیان دیتا تھا اور ستاروں کی مدد پر بہت زیادہ یقین رکھتا تھا۔

سلطان کے علم نجوم پر یقین کے سلسلے میں ایک واقعہ بہت مشہور ہے اور وہ ہزارہ تاریخ میں مذکور ہے۔ تاریکین کی لچپی کے لیے یہاں بھی تحریر کیا جا رہا ہے۔

سلطان کے اکثر یزوں کے ساتھ اس ذات آمیز صحنے سے تقریباً آٹھ سال پہلے ایک صبح سلطان سیر کو جا رہا تھا۔ اس وقت اس کا بدبہ ہندوستان سے نکل کر پوری دنیا پر چھا رہا تھا۔

سیر کے دوران سلطان کی نظر ایک فقیر پر پڑی جسے کچھ لوگ گھیرے ہوئے تھے۔ سلطان نے اپنے محافظ راجہ خاں سے پوچھا:

”راجہ خاں۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

راجہ خاں نے جواب دیا:

”مالی جاہ ایک نجومی ہے جسے لوگ گھیرے ہوئے ہیں۔“

سلطان نے راجہ خاں سے دریافت کیا:

”راجہ خاں۔ تمہیں نجوم پر اعتقاد ہے؟“

راجہ خاں ایک نو مسلم نوجوان تھوڑے گھبرا گیا۔ اسے یہ تو معلوم تھا کہ اسلام میں نجوم جیسی چیزوں کی کوئی وقعت نہیں پھر بھی اس نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا:

”مالی جاہ۔ نجوم ایک علم ہے اور اس کی حقیقت ان لوگوں کو معلوم ہے جو اس میں مہارت رکھتے ہیں۔“

سلطان کو راجہ خاں کے غیر ذمہ دارانہ جواب پر ہنسی آگئی۔ پھر اس نے حکم دیا:

”اچھا۔ اس نجومی کو محل میں پیش کیا جائے۔“

یہ کہہ کر سلطان محل میں چلا گیا۔

راجہ خاں نجومی کو لے کر محل میں پہنچا اور اسے ایک وسیع و عریض کمرے میں بٹھا دیا جس میں ایک خوبصورت قالین کا فرش تھا اور ایک نہایت آرام دہ صوف پڑا ہوا تھا۔

نجومی نہایت اطمینان سے قالین پر بیٹھ گیا اور راجہ خاں محل میں سلطان کو نجومی کی آمد کی اطلاع دینے چلا گیا۔

نقوڑی دیر کے بعد سلطان، راجہ خاں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔ تمام خدام آداب بجا لے کر نجومی نے ذرا بھی حرکت نہ کی اور اسی طرح قالین پر نظریں بھکائے بیٹھ رہا۔

اس خوبصورت قالین پر ایک جھاڑی بنی تھی جس میں گلاب کے پھول کھلے تھے۔ اس کے

ایک طرف ایک عظیم الجثہ شیر آرام کر رہا تھا اور جھڑی کے پیچھے ایک شکاری بندوق تھیں۔

ایک شیر کو تاک رہا تھا۔ شیر، اس شکاری کی موجودگی سے بالکل لاپرواہ نظر آ رہا تھا۔ نجومی کمال

حیرت سے ان نقش و نگار کو دیکھ رہا تھا۔

سلطان کے قریب آنے پر نجومی نے نظریں اٹھائیں اور بولا:

”آئیے۔ بیٹھے۔“

نجومی نے اس طرح کہا جیسے یہ عالی شان کمرہ خود اسی کا ہو۔



سلطان نے کھلا ہوا چاقو میں بلند کیا۔ طوطا جان کے خوف سے اور زور سے پھر پھڑپھڑایا۔  
چاقو پوری طاقت سے طوطے پر گرا مگر اس کش مکش میں گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ طوطا ہاتھ سے  
چھوٹ کر اڑ گیا۔ چاقو سلطان کے ہاتھ پر لگا جس سے خون بہنے لگا۔  
سلطان نے بڑے اطمینان سے اشارہ کرتے ہوئے حکم دیا:  
"کانڈا اٹھایا جائے۔"

راجہ خاں نے قدم بڑھاکے کانڈا اٹھایا اور سلطان کو دے دیا۔ سلطان نے کانڈا کھول  
کے پڑھا۔ اس میں کچھا تھا:

"تم اس پرندے کی جان نہیں لے سکتے۔ خدا کی یہ مخلوق  
بھی تمہاری طرح آزاد ہے۔ اس کے زخم نہیں آتے گا البتہ  
تم نقصان اٹھاؤ گے۔"

یہ پڑھ کے سلطان سراپا حیرت بن گیا۔  
اسی عالم میں اس نے بخوی کی طرف دیکھا۔ بخوی قابین سے اٹھ کر دروازے کے قریب  
پہنچ چکا تھا۔

سلطان صوفے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پیک کے بخوی کے پاس پہنچا اور بڑی منت سے کہا:  
"کچھ میری قسمت کے بارے میں بتائیے۔"  
بخوی پلٹا اور یہ کہہ کر باہر نکل گیا:  
"سلطان کی قسمت اس قابین پر نقش ہے۔"

بخوی کے جانے کے بعد سلطان نے قابین کے نقش و نگار دیکھے۔ اس وقت تو غور  
کرنے پر بھی اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا مگر جب انگریزوں سے اس کی جنگوں کا آغاز ہوا تو اس  
قابین کا نقش اس کے پردہ ذہن پر ثبت ہو کے رہ گیا اور اس کا اعتقاد علم بخوم پر روز بروز  
بڑھتا گیا!



سلطان نے صوفے پر بیٹھتے ہوئے سوال کیا:  
"آپ نے سلطنت خداداد میں کیا دیکھا؟"  
بخوی نے لاپرواہی سے جواب دیا:

"ہر طرف عدل و انصاف کا چرچا ہے۔ رعیت خوش حال ہے۔ ہندو مسلمان سب بھائی  
کی طرح رہتے ہیں۔"

اب سلطان نے وہ سوال کیا جس کے لیے اس نے بخوی کو بلوایا تھا۔

"کچھ بخوم کے بارے میں فرمائیے۔ کیا یہ علم صحیح ہے؟"

بخوی نے پورے اعتماد سے جواب دیا:

"علم بالکل صحیح ہے لیکن صرف جلنے والے ہی جانتے ہیں۔ دھوکہ بازوں نے اس  
علم کو بدنام کر رکھا ہے۔"

اس وقت سلطان نے راجہ خاں کو اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا اور چند لمحوں کے بعد واپس  
آیا تو اس کے ہاتھ میں ایک پیچہ تھا جس میں ایک طوطا تھا۔

راجہ کے پیچھے پیچھے ایک سپاہی آیا جس کے ہاتھ میں چاقو تھا۔ سلطان نے راجہ خاں  
کے ہاتھ سے پیچہ لیا۔ اسے کھولا اور طوطے کو ایک ہاتھ سے اس طرح پکڑا کہ اس کی دونوں  
ٹانگیں سلطان کی شمشیر میں آگئیں اور پر کھل گئے۔ پھر سلطان نے سپاہی کے ہاتھ سے تیز دھار چا  
لے لیا۔

اس وقت طوطا پھڑپھڑا رہا تھا۔

سلطان نے بخوی سے پوچھا:

"بتاؤ۔ اس طوطے کی قیمت میں کیل ہے؟"

بخوی نے اسی لاپرواہی سے کہا:

"کانڈا اور قلم منگایا جائے۔"

سلطان کے حکم سے دونوں چیزیں حاضر کر دی گئیں۔ بخوی نے کانڈے پر کچھ لکھا اور لپیٹ

کر دوسری جانب پھینک دیا۔

اب اس نے سلطان سے کہا:

"اب آپ جو چاہیں وہ کریں۔"

سلطان کے خواب نمبر ۲ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تختِ دہلی سے انگریزوں کا اثر دور کر کے اس پر کسی تیموری شہزادے کو بٹھانے کا خواہش مند ہے۔ وہ خود تختِ دہلی پر بیٹھنا نہیں چاہتا بلکہ اس کا نام کسی لائقِ فرزند کو تخت پر بٹھا کر واپس آ جاتا ہے۔

خواب نمبر ۳ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ خود بادشاہ بننا نہیں چاہتا بلکہ سکندر اور نبیلین کی طرح ایک عظیم جرنیل بننے کا خواہشمند ہے اور وہ بزرگانِ دین اور کبھی حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اپنے سر پر دستار باندھتے دیکھتا ہے۔

خواب نمبر ۱۲ میں اسے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بشارت ملتی ہے کہ حضورِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں:

”میں تمہارے بغیر جنت میں قدم نہیں رکھوں گا۔“

خواب نمبر ۲۵ سے سلطان کی اس خواہش کا اظہار ہوتا ہے کہ نظامِ دکن کا ایک سردار اسد علی ملاں جس نے انگریزوں کی طرف سے ۱۷۹۱ء کی جنگ میں حصہ لیا تھا، وہ نظام کو چھوڑ کر اس کی ملازمت میں آ جائے۔

خواب نمبر ۲۷ سے اس کی یہ خواہش ظاہر ہوتی ہے کہ اسے دس ہزار فرانسیسی سپاہی مل جائیں۔

خواب نمبر ۹ سے وہ شہنشاہِ چین سے مراسم پیدا کرنے کی خواہش کرتا ہے۔ وہ دیکھتا ہے کہ چینی شہنشاہ نے اسے سفید لٹنی کا تحفہ بھیجا ہے۔ یہ تحفہ شہنشاہِ چین نے سب سے پہلے سکندر اعظم کو دیا تھا (یہ بات محلِ نظر ہے)۔

سلطان کو ان دیسی لکڑیوں سے شدید نفرت تھی جو انگریز کے فریب میں مبتلا ہو کر اس سے جنگ کرتے تھے۔ چنانچہ سلطان انہیں بزدل سمجھتا ہے اور خواب میں اسے وہ حکمران عورت کی صورت میں نظر آتے ہیں اور کبھی وہ اسے رنجشوں کی شکل میں نظر آتے ہیں اور وہ ان کا شکار کرتا ہے (خواب نمبر ۱۱-۱۳)۔

خواب نمبر ۱۹ سے سلطان کی اپنی رعیت کے ساتھ محبت اور اس کی صلاح و بہبود کا اظہار ہوتا ہے۔ اسے اطلاع ملتی ہے کہ ایک بت خانہ میں آگ لگ گئی ہے تو اسے سب سے پہلے اپنی اس رعایا کا خیال آتا ہے جن کے مکان بت خانہ سے متصل ہیں۔ سلطان فوراً آدمی دوڑاتا ہے تاکہ ان لوگوں کی خیریت معلوم ہو۔



مشہور رہے کہ خواب زندگی کا عکس ہوتے ہیں۔

یہ قول سلطان پٹو پر پوری طرح صادق آتا ہے۔ اسے بھی اس بات پر یقین تھا اس لیے وہ جو خواب دیکھتا اسے ایک بیان میں ترتیب وار یا بے ترتیب کو ضرور یاد کرتا تھا۔ خوابوں کو قلم بند کرنے کا سلسلہ شاید اس نے میسوری تیسری جنگ میں شکست کھانے کے بعد شروع کیا تھا۔

اس کی وجہ اور خصوصیت یہ ہے کہ سلطان اپنے خوابوں میں یا تو خود کو انگریزوں، مرہٹوں اور نظام سے لڑتے ہوئے دیکھتا ہے یا پھر اسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، حضرت علیؓ اور بزرگانِ کرام خاص کہ حضرت خواجہ گیسو دمازؒ دکھائی دیتے ہیں، اس لحاظ سے ہم سلطان کے خوابوں کو تین حصوں میں تقسیم کر سکتے ہیں:

- ۱۔ ایک حصے میں مذہبی خواب
- ۲۔ دوسرے حصے میں جنگی خواب
- ۳۔ تیسرے حصے میں سیاسی خواب

ان خوابوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو ہر دم وطن کی آزادی اور دین کے فروغ کا خیال رہتا تھا۔ سلطان صرف دکن سے نہیں بلکہ دھوکہ باز اور مکار انگریزوں کو پورے ہند سے نکال باہر کرنے کا آرزو مند تھا۔

مقصود یہ ہے کہ سلطان کے تمام خوابوں سے اس کی امنگوں، خواہشوں اور تبادیہ کا اظہار ہوتا ہے لیکن بعض لوگوں نے سلطان کے خوابوں کا غلط مطلب نکال دیا ہے۔ ان کے خیال میں سلطان نے اپنے خوابوں میں انگریزوں سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے چنانچہ علمی زندگی میں بھی وہ انگریز قیدیوں کے ساتھ بڑا بر سلوک کرتا اور انہیں معاش میں مبتلا رکھتا ہے۔

جہاں تک ہندوؤں کے ساتھ اس کے سلوک کا تعلق ہے تو اس کی بے تعصبی اور ہندو ہیرواں کے بڑے واضح ثبوت ملتے ہیں۔ سلطان نے اپنے عالمان کو حکم دے رکھا تھا کہ مندروں اور گوردواروں کی حفاظت کی جائے اور انہیں جملہ ضروریات بہم پہنچی جائیں۔

سلطان کی اعلیٰ ملازمتوں میں ہندو شامل تھے۔ پورینا سلطنت خداداد کا وزیر مالیات تھا۔ سلطان نے کٹن راڈ کو اپنا محترم خاص بنایا تھا۔ پھر اسے سرنگاپٹم کا گورنر بنا کر بھیجا مگر اس تک حرام نے سلطان کے خلاف سازش کی اور گرفتار ہو کر کبیر کو دار کو پہنچا۔

جہاں تک انگریز قیدیوں کے ساتھ سلطان کے سلوک کا تعلق ہے تو خود واقعات اس الزام کو غلط ثابت کرتے ہیں۔ سلطان انگریز قیدیوں کے ساتھ ان کے مرتبہ کے مطابق سلوک کرتا تھا۔ اگر کوئی انگریز بخوشی مسلمان ہو جاتا تو سلطان اسے احمدی رسالہ میں جگہ دیتا اور اس کے ساتھ مزید بہتر سلوک کرتا تھا۔

لنڈ سے اور اس کے ساتھیوں کو عام قیدیوں کے ساتھ نہیں رکھا گیا تھا بلکہ انہیں سرنگاپٹم کی ایک جوبلی میں رکھا گیا تھا جس کی لمبائی ۷ فٹ اور چوڑائی ۵ فٹ تھی۔ اس جوبلی میں بغیر کھڑکیوں کے چار کمرے بنے تھے۔ انہیں اپنے مشاغل میں آزادی تھی۔ ان کا روزانہ اخراجات کے لیے صوبہ خراج مقرر تھا۔ سامان منگوانے کے لیے انہیں ملازم دیے گئے تھے۔ لنڈ سے اور ہیرڈ جیسے جرنل خود کو چوب کاری اور سلاخی میں مصروف رکھتے تھے۔

سلطان کی قید میں لنڈ سے کی داستان بڑی دلچسپ ہے۔

لنڈ سے نے کسی طرح قید خانہ کی ایک اینٹ ٹھسکائی تھی۔ وہ اینٹ ہٹا کر روزانہ دریا سے کادیر کے مناظر دیکھتا تھا۔ کبھی اسے برہمن عورتیں دریا میں نہاتی دکھائی دیتی تھیں تو کبھی مسلمان بارات کا منظر دکھائی دیتا۔ اسی روزوں سے وہ سلطان کے فتح کے جشن بھی دیکھا کرتا تھا۔ ملازم کے آنے سے پہلے وہ اینٹ کو اس کی جگہ پر جادیتا تھا۔ ملازم اس کے لیے چاول اور قورمہ کی دافتر

مقدار لاتا تھا۔ یہ اس کا صرف دوپہر کا کھانا ہوتا تھا۔

جنگی قیدیوں کے فرار کی داستانیں تو ہر زمانہ میں دلچسپی کا باعث رہی ہیں۔ سرنگاپٹم کی جوبلی سے جرنل برسٹو اور اس کے ساتھیوں کا فرار بھی اسی طرح کا ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ اس واقعہ کی تفصیل سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف اتنا کافی ہو گا کہ جس وقت کارنوالس نے سرنگاپٹم پر حملہ کیا تو اس وقت احمدی رسالہ کے بہت سے نو مسلم یورپین کورگ کی طرف بھاگ گئے تھے۔ جرنل برسٹو بھی ان لوگوں میں شامل تھا۔

جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے کہ برسٹو غیر سرنگاپٹم کی ایک جوبلی میں قید تھے۔ نومبر ۱۸۹۱ء میں انہوں نے اپنے ہاتھ پیر میٹر یوں سے آزاد کر لیے تھے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے چاقو سے ایک آری بنائی تھی۔

انگریز قیدیوں نے بیس دن رات میں ایک سرنگاپٹم کو دی تھی۔ جانظوں کو کھدائی کی آواز سے بے خبر رکھنے کے لیے یہ لوگ زور زور سے انگریزی گیت گاتے تھے۔ پھر ایک رات یہ سب قیدی اس سرنگاپٹم کے راستے سرنگاپٹم سے فرار ہوئے۔

برسٹو نے شمال مشرق کا راستہ اختیار کیا تاکہ وہ جلد از جلد مرہٹہ لشکر تک پہنچ جائے مگر وہ کپل کے قریب کرنل ریڈ کے گروہ تک پہنچ گیا اور اس نے ۱۸۹۲ء کی جنگ میں سلطان کے خلاف صدر دیا۔

سکرے نے اپنے فرار کی داستان میں کہا ہے کہ وہ چند رگ سے فرار ہوا اور اگست ۱۸۹۱ء میں بمبئی میں ڈاکٹر ٹل نے اسے پاس پہنچا۔

مگر ڈاکٹر ٹل نے سکرے کے جو واقعات بیان کیے ہیں وہ سکرے کے بیان سے مختلف ہیں۔ تاہم ان تمام واقعات سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انگریزی قیدی سلطان کے ظلم کی وجہ سے میں بلکہ فطری تقاضوں کی وجہ سے فرار ہوئے تھے۔

سلطان کا میر صادق کو سلطنت خداداد کا وزیر اعظم بنانا ایک ایسا اقدام تھا جس سے سلطنت کے تمام ہی خواہ اور وفادار دل برداشتہ ہو گئے۔ ان میں سے بعض تو سرنگاپٹم چھوڑ گئے اور کچھ گوشہ نشین ہو گئے۔

میرصادق نے سب سے پہلے اہل دائرہ کا اثر و رسوخ کم کیا۔ اہل دائرہ یا ہندویہ کی کمک طلبی اور وفاداری مشہور تھی لیکن میرصادق کو سلطنت کے نہیں اپنے وفادار چاہیے تھے اس لیے اس نے اٹے دن شکایات کے اہل دائرہ کو ملک بدر کر دیا۔

میرصادق نے تمام کلیدی اساسیوں پر اپنے آدمی مقرر کر دیے تھے۔ اس کا اثر و رسوخ اس درجہ بڑھ چکا تھا کہ سلطان کے محافظ خاص خادم اور جاسوس بھی سلطان سے کچھ کہنے کی ہمت نہ کرتے تھے۔

میرصادق سلطان کے نام آنے والی عرضیوں اور خطوط کو خود کھول کے پڑھتا اور سلطان کو اطلاع دے بغیر ان کے جوابات لکھا دیا کرتا تھا۔ میرصادق ہی کے کہنے پر سلطان نے دھونڈو جی واگہ کو قید میں ڈال دیا تھا۔

دھونڈو جی واگہ ایک بہت بڑا رہزن اور دیکھت تھا۔ جب سلطان نے سلطنت خداداد میں ایک اسلامی معاشرہ پیدا کرنے کے لیے ہر گاؤں اور موضع میں سکول اور قاضی مقرر کیے تو پوری سلطنت میں نماز روزے اور دینداری کا چرچا شروع ہو گیا۔

دھونڈو جی واگہ، سلطان کے ان کاموں سے ایسا متاثر ہوا کہ وہ اپنے گروہ سمیت تاب ہو کر سلطان کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔

سلطان، واگہ پر بہت خوش ہوا۔ اس نے اس کے ساتھیوں اور اس کے قیام کا خوب اچھا انتظام کر دیا تھا۔

واگہ ہر دم سلطان کی خدمت میں حاضر رہتا تھا اور سلطان کی خدمت ہی کو دین و دنیا کی ترغیب کا ذریعہ سمجھتا تھا۔

وہ سلطان کے قریب رہ کر جلد ہی مسلمان ہو گیا اور اس کا اسلامی نام شیخ احمد رکھا گیا۔ سلطان نے اس کی دینی تعلیمات کے لیے ایک عالم دین کی خدمات حاصل کیں اور وہ چند ہی دنوں میں پابندی سے نماز پڑھنے لگا۔

شیخ احمد نے سلطان کی بے انتہا خدمت کی۔ سلطان نے اس کی خدمات سے خوش ہو کر کسے جہاں خواہ کا خطاب دیا اور ایک قلعہ کی سرداری سونپنے کا ارادہ کیا۔

میرصادق کو معلوم ہوا تو اس نے شدید مخالفت کی۔ وہ تو یہ چاہتا ہی نہ تھا کہ سلطان کا کوئی وفادار بانی رہے۔

میرصادق نے کانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے سلطان کے کان بھرے:

"قبلہ عالم۔ آپ اگر شیخ احمد کو کوئی ذمے داری دینا چاہتے ہیں تو ضرور دیکھ لیکن اس لاپرواہی کے خیال میں ایک رہزن کو کوئی ذمے داری سونپنا عقلمندی نہ ہوگی۔

دھونڈو جی واگہ جو آج شیخ احمد ہے، کل تک اپنے لٹیروں کے ساتھ حیدر آباد اور مرنگا پٹم پر چھاپے مار کر گزر رہا تھا۔ ایک ایسے ناقابل اعتبار شخص کو قلعہ دار بنادینا مصلحت ملی کے لئے خلاف ہے کیونکہ ایسے آدمی سے کسی وقت بھی فتنہ و فساد کی توقع کی جاسکتی ہے۔ ایسا نہ ہو کہ طاقت حاصل کرنے کے بعد یہ دولت خداداد کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو جائے۔"

مشہور ہے کہ کہنے سننے سے تو دیواریں تک اپنی جگہ چھوڑ دیتی ہیں۔ میرصادق نے سلطان کے اس قدر کان بھرے کہ سلطان نے اسے قلعہ دار بنانے کا ارادہ ترک کر دیا اور اسے اپنے دربار سے ہٹا کر بڑے بیٹے فتح حیدر کی ملازمت میں بھیج دیا۔

صلح نامہ مرنگا پٹم کے بعد سلطان خود کو بے بس اور بے دست و پا محسوس کرنے لگا تھا۔ اس وقت کی تین طاقتیں انگریز، امرٹے اور نظام، تینوں ہی نے اس کے خلاف محاذ بنا کر اسے شکست سے دوچار کیا تھا۔

مرنگا پٹم سے ان متحدہ دشمنوں کے رخصت ہونے کے بعد سلطان نے ملکوں اور ریاستوں کو قاصد اور سفارتیں بھیجیں تاکہ ان سے اتحاد اور یگانگت پیدا کی جائے۔

سلطان نے سب سے پہلے قریبی ریاست یعنی مرہٹوں کو ٹٹولا۔ اس نے یہ محسوس کر لیا تھا کہ اس کی اتحادیوں بلکہ انگریزوں کے ہاتھوں شکست نے مرہٹوں اور نظام کی آنکھیں بھی کھول دی ہیں کیونکہ انگریزوں کا مقابلہ صرف سلطان ہی کر سکتا تھا۔ مرہٹوں اور نظام میں یہ طاقت نہ تھی کہ انگریزوں کے مقابلہ کی تاب لا سکتے۔

چنانچہ سلطان نے اگلے ہی سال یعنی ۱۷۹۳ء میں مادھوجی سندھیلا سے خط و کتابت کا آغاز کر دیا۔ اس نے سندھیلا پر یہ واضح کرنے کی کوشش کی کہ انگریز دراصل ہندوستانیوں میں تفرقہ پیدا کر کے پورے ہندوستان پر قبضہ کے خواب دیکھ رہا ہے۔

مادھوجی سندھیلا کے دماغ میں بھی کچھ اسی طرح کے خیالات جنم لے رہے تھے۔ ناٹھر نویس کے

مال جاہ کی حمایت کی تھی۔ اس وجہ سے نظام دکن کو مجبوراً سلطان کی طرف مائل ہونا پڑا۔  
یوں سلطان کو اپنے دونوں پڑوسینوں کی ایک طرح کی حمایت حاصل ہو گئی تھی۔ ویسے بھی اس نے  
اپنی طاقت کافی بڑھالی تھی۔

کارنوالس کا جانشین سر جان شور کچھ زیادہ کاٹ چھانٹ کا آدمی نہ تھا اس لیے انگریز حکومت  
نے سر جان شور کی جگہ لارڈ مارننگٹن ولزلی کو گورنر جنرل بنا کر ہندوستان بھیجا۔  
اس شکست نے سلطان کو بہت کچھ سکھایا تھا۔ اسی لیے اس نے اپنے ملک کے فرمانرواؤں کے  
علاوہ بیرونی حاکم سے بھی دوستی کی غرض سے خط و کتابت شروع کی۔

سلطان فی الحال انگریزوں سے الجھا نہیں چاہتا تھا بلکہ وہ اس قدر مضبوط ہونا چاہتا تھا کہ  
انگریزوں سے پوری طرح بدلہ لے سکے اور انہیں بھارت سے ہٹانے کے لیے نکال سکے۔ چنانچہ  
سلطان نے میسور کی تیسری جنگ کے فوراً بعد ماریشس (مدغاسکر) کے فرانسیسی گورنر کی معرفت  
شہنشاہ فرانس کوئی شانزدہم کے پاس دوستی کا خط بھیجا جس کا اسے کوئی جواب نہ ملا۔

اس سے اگلے سال سلطان نے پھر گورنر ماریشس کے پاس دوستی کا ایک خط روانہ کیا۔  
اس وقت ماریشس کا گورنر کو سینٹی تھا۔ یہ پابند بھری کا گورنر رہ چکا تھا۔ اس نے سلطان کے خط  
کا جواب بڑے خلوص و محبت سے دیا۔

اس سے اگلے سال سلطان نے گورنر ماریشس کے پاس بلحاظہ ایک فوجی وفد بھیجا جس کے  
ممبر محمد براہیم اور حسین علی خاں تھے۔

سلطان نے وفد کو زبانی پیغام کے علاوہ ایک خط بھی دیا جس کے مندرجات یہ تھے:

۱۔ تلچھری پر حملہ کے لیے فرانس دس ہزار سپاہی روانہ کرے۔ اسے  
تاخت و تاراج کرنے کے بعد یہ سپاہی سلطنت حذا داد کی ملازمت میں  
لے لیے جائیں گے۔ اور سلطان کی کمان میں کو چین، مدورا، ترچنا پل  
اور بنجور کی طرف بڑھیں گے۔

۲۔ ان مقامات پر قبضہ کرنے کے بعد پابند بھری اور مدراس پر چڑھائی  
کی جائے گی اور خشکی کے راستے کلکتہ پہنچ کے انگریزوں کو بنگال  
سے نکال باہر کیا جائے گا۔ پھر بجنی کا علاقہ فرانسیسیوں کے قبضہ  
میں دیدیا جائے گا۔

برسکس سندھیا، سلطان کا کسی قدر حامی اور ہندوستان کی آزادی کا علمبردار تھا۔ اس مرہٹہ سردار کی  
بھارت سے محبت پر جس قدر غور کیا جائے وہ کم ہے۔ اس نے شہنشاہ دہلی کے ساتھ مل کر انگریزوں کو  
ملک سے نکلانے اور بنگال واپس لینے کی تحریک چلائی تھی۔ شہنشاہ دہلی بھی اس کے منصوبہ سے  
متفق تھا اور ایک عرصہ تک ان میں مراعت جاری رہی۔

نظام دکن اور مرہٹوں کے درمیان کونول کے معاملہ پر کارنوالس کے زمانہ ہی میں اختلاف  
پیدا ہو گیا تھا۔ سلطان کی شکست کے بعد یہ علاقہ اتحادیوں کو ملا تھا۔ مرہٹے اسے اپنی مدد میں  
شامل کرنا چاہتے تھے اور نظام اس پر اپنا حق جتاتا تھا۔

کارنوالس کے جانشین سر جان شور نے اس معاملے میں غیر جانبداری کی پالیسی اپنائی سلطان  
اور سندھیا کی خط و کتابت ایک ہی سال تک جاری رہ سکی اور ۱۷۹۶ء میں مادھوجی سندھیا کا  
انتقال ہو گیا۔

اسی سال مرہٹوں اور نظام میں جنگ شروع ہو گئی۔ انگریز اس جنگ سے الگ رہے۔ حالانکہ  
انگریزوں کی دو بٹالین فوج نظام دکن کے علاقہ میں رہتی تھی۔ نظام کو انگریزوں کی غیر جانبداری پر  
نہ صرف افسوس ہوا بلکہ اسے اپنی سلامتی کی فکر پڑ گئی۔ چنانچہ اس نے فرانسیسیوں کی طرف دوستی  
کا ہاتھ بڑھایا۔ اس طرح فرانسیسیوں کا اثر دکن میں بڑھنے لگا اور نظام نے دونوں انگریز بٹالینوں  
کو اپنے علاقہ سے رخصت کر دیا۔

رجان شور نے پہلے تو اس بات کو کوئی اہمیت نہ دی لیکن جب نظام نے کڑپہ کا علاقہ فرانسیسی  
سردار وسپور بند کو دے دیا تو اسے کٹھ کا پیدا ہوا۔

پونا میں مادھوجی سندھیا کے مرنے کے بعد اس کا بھتیجا دولت راؤ سندھیا مرہٹوں کا پیشوا  
بنا۔ اس کا جھکاؤ بھی سلطان کی طرف رہا مگر اس نے کوئی عملی قدم اٹھانے پر آمادگی ظاہر نہ کی سوائے  
اس کے کہ وہ انگریزوں سے کشیدہ خاطر رہا۔

کارنوالس ہی کے زمانے میں یورپ میں انگریزوں اور فرانسیسیوں میں جنگ چھڑ گئی تھی۔  
اور کارنوالس پابند بھری لینے کے لیے بڑھا تھا۔

اس وقت فرانسیسی سردار سیورینٹ بھی کڑپہ سے اس کے مقابلے پر نکلا تھا۔ اس پر سر جان  
شور نے نظام دکن سے احتجاج کیا تھا۔

پھر جب نظام دکن کے بیٹے شہزادہ عالی جاہ نے باپ کے خلاف بغاوت کی تو انگریزوں نے

۳- دس ہزار فرانسیسی جوانوں کے ساتھ سلطان کے پچاس ہزار فوجی اس محم میں حصہ لیں گے اور آئندہ فرانس اور سلطنتِ خداداد اتحادی بن کے رہیں گے۔ انگریزوں کو ہندوستان سے نکال کر برطانیہ بھیج دیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان سے وہ تین کروڑ روپے بھی واپس لیے جائیں گے جو سلطان نے انگریزوں کو بطور تادانِ جنگ ادا کیے ہیں۔

یہ وفد بنگلور سے ہوتا ہوا ماریشس پہنچا اور اس نے بندرگاہ سے اترتے ہی سلطان پٹوکا پر تہنم بلند کر دیا۔ ماریشس کی فرانسیسی حکومت نے اس وفد کا شاندار طریقے سے اعلانِ استقبال کیا۔ اس وفد کے پہنچنے سے پہلے فرانسیسیوں کو نہ تو سلطان کی امداد کا خیال تھا اور نہ یہ معلوم تھا کہ سلطان، انگریزوں کے خلاف جنگ کرنے والا ہے۔ ماریشس کے گورنر نے سلطان کے خط کے ساتھ اپنا ایک خط لگا کر شہنشاہِ فرانس کے پاس روانہ کر دیا۔

گورنر نے اپنے خط میں شہنشاہ کو اطلاع دی کہ سلطان کے پاس ایک لاکھ بہترین فوج ہے جبکہ انگریزوں کی طاقت بارہ ہزار یورپی اور چالیس ہزار دیسی سپاہیوں پر مشتمل ہے اس لیے سلطان کی مدد کرنے میں کوئی اندیشہ نہیں۔ گورنر نے شہنشاہ کو یہ بھی لکھا کہ:

"ماریشس میں اس وقت بغاوت پھیل رہی ہے اس لیے سلطان کو براہِ راست مدد بھیجنا مناسب ہو گا۔ اس مقصد کے لیے پہلے اس امید پر قبضہ کیا جائے۔"

اس ساری کاروائی کو انتہائی پوشیدہ رکھا گیا۔ یہاں تک کہ یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ سلطان کا یہ خط فرانسیسی حکومت کو پہنچا بھی یا نہیں مگر یہ کتنے نطف کی بات ہے کہ انگریزوں کو اس خط کی خبر پہنچ گئی تھی اور یہ کام انگریزوں کے گروگوں یعنی سلطنتِ خداداد کے نمک حراموں اور خدروں نے کیا تھا۔

سلطان نے اس سلسلے میں شاہِ افغانستان زماں شاہ کے پاس بھی اسی طرح کی ایک

روانہ کی تھی۔ اس سفارت میں سید حبیب اللہ اور نواب بنگی (سید محمد رضا خان) شامل تھے سلطان نے سفارت کے ہاتھ جو خط لکھا اس میں تحریر تھا کہ:

شاہِ افغانستان کا اسلامی فرض ہے کہ وہ کافروں کو ہندوستان سے نکالنے میں سلطان کی مدد کرے۔

یہ سفارت کچھ اور کراچی کے راستے کابل پہنچی۔ شاہِ افغانستان نے سلطان کو جواب میں یہ اطمینان دلایا تھا کہ وہ فکر نہ کریں کیونکہ میں (شاہِ افغانستان) بہت جلد ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہوں۔

سلطان نے شاہِ افغانستان کا خط پاتے ہی اسے دوسرا خط لکھا جس میں اسے فرانسیسیوں کی متوقع مدد کی اطلاع دی گئی تھی اور شاہ کو لکھا گیا تھا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کس طرح کرے۔ سلطان کے اسی خط کے جواب میں شاہِ زماں والی افغانستان نے دسمبر ۱۷۹۸ء میں لاہور پر حملہ کیا تھا۔

زماں شاہ والی افغانستان، تیمور شاہ کابلی اور احمد شاہ ابدالی کا پوتا تھا۔ وہی احمد شاہ ابدالی جس نے ۱۷۶۱ء میں مرہٹوں کو پانی پت کی جنگ میں شکست دے کر انہیں شمالی ہند سے ہمیشہ کے لیے بے دخل کر دیا تھا۔

زماں شاہ بڑی تیزی سے کابل سے نکلنا اور بغیر مزاحمت کے لاہور پہنچ گیا۔ انگریزوں کو یہ تو معلوم تھا کہ سلطان پٹوکا ایران اور افغانستان سے جوڑ توڑ میں لگا ہوا ہے مگر انہیں یہ گمان نہ تھا کہ زماں شاہ اس قدر جلد ہندوستان پر حملہ کر دے گا۔

زماں شاہ کے لاہور پر قبضہ سے انگریزوں کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ لاہور سے دہلی کا فاصلہ اُن دنوں بیس منزلوں کا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگر زماں شاہ، دہلی کی طرف بڑھے تو کم از کم بیس دن میں دہلی پہنچے گا۔

انگریز چلنٹے تھے کہ زماں شاہ کو روکنے کی طاقت مرہٹوں میں نہیں ہے۔ اگر زماں شاہ دہلی پہنچ گیا تو ممکن تھا کہ وہ شہنشاہِ ہند کو سہارا دے کہ انگریزوں کے خلاف کھڑا کر دے اور پھر ان کو ہندوستان سے نکالنا پڑے۔ اس لیے وہ فوراً حرکت میں آ گئے اور انہوں نے افغان

میں زماں شاہ کے بھائی کے ذریعے بغاوت کرادی۔

زماں شاہ کو اپنے ملک میں بغاوت کا پتہ چلا تو وہ لاہور سے سرپر پیر رکھ کر کابل کی طرف روانہ ہو گیا اور سلطان منہ دیکھتا رہ گیا۔

زماں شاہ کے ساتھ صرف ۲۲ ہزار سپاہی تھے۔ سرجان شور کے خیال میں زماں شاہ نے ہندوستان پر حملہ نہیں کیا تھا بلکہ اس نے محض تجربہ کے لیے لشکر کے ساتھ لاہور تک کا سفر کیا تھا تاکہ آئندہ حملہ کے لیے اندازہ لگا سکے۔

مگر۔۔۔ بعد میں یہ بات کھلی کہ اگر زماں شاہ دہلی پہنچ جاتا تو نہ صرف دہلی پر قبضہ ہو جاتا بلکہ اتنا لشکر تو سلطنتِ اودھ پر بھی قابض ہو سکتا تھا۔ پھر انگریزوں کو ہندوستان سے اپنا یوریا بستر لیٹنا پڑتا۔

انہی دنوں منگلور میں ترکی لباس پہنے ہوئے ایک شخص دکھائی دیا۔ یہ شخص انگریزی اور فرانسیسی زبان بڑی روانی سے بولتا تھا۔ اس کے علاوہ وہ ہندوستان میں بولی جانے والی بہت سی زبانوں سے بھی واقف تھا۔

اس شخص کے کئی نام تھے۔ بصرہ میں وہ عبداللہ، سورت میں دردیش اور ماریشس میں ہلاش کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

یہ غیر ملکی اپنے جہاز میں شاید فرانس سے منگلور پہنچا تھا۔ منگلور میں اس کی ملاقات میر غلام علی نگر سے ہوئی۔

اس نے غلام علی نگر سے کو بتایا کہ اس کا اصل نام فرانکوئیس ریپاڈ ہے اور وہ ماریشس میں نائب کمانڈر تھا۔ اس نے بتایا کہ وہ یہاں اس لیے آیا ہے تاکہ سلطان سے ان رضا کاروں کے بارے میں گفتگو کرے جو سلطان کی مدد کے لیے سرنگا پٹم آنا چاہتے ہیں۔ نگر نے اسے سرنگا پٹم بھیج دیا۔

سلطان نے فرانکوئیس ریپاڈ کی باتیں بڑے غور سے سنیں اور اس بارے میں اپنے وزیر سے صلاح مشورے کیے۔

ماریشس ایک جزیرہ ہے جو براعظمِ افریقہ کے جنوب مشرقی ساحل کے قریب واقع ہے۔ اُن دنوں یہ سلطنتِ فرانس کی ایک نوآبادی تھی۔

یہ وہی زمانہ تھا جب سلطان، ماریشس کے گورنر کو دو خطرہ دانہ کرچکا تھا اور اب ایک اور بھیجنے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس چالاک شخص نے سلطان کو یہ تاثر دیا کہ وہ سلطان اور گورنر ماریشس کی مراسلت سے واقف ہے۔

سلطان کے وزرا نے فرانکوئیس کی شدید مخالفت کی۔ انہوں نے سلطان سے صاف الفاظ میں کہا کہ یہ شخص جعلی ہے اور اس کا آزادی کے ساتھ سرنگا پٹم میں گھومنا پھرنا خطرے سے مالا مال نہیں۔ اس لیے اسے گرفتار کر کے اس وقت تک قید رکھا جائے جب تک فرانس سے اس کے متعلق کوئی واضح اطلاع نہیں آتی۔

مگر۔

سلطان نے اپنے وزیروں کے اعتراض پر کوئی توجہ نہ دی بلکہ فرانکوئیس کو ماریشس بھیجنے کے لیے سلطان نے ایک آدمی کو سترہ ہزار روپے دیے کہ وہ ایک جہاز خریدے تاکہ وہ ریپاڈ ماریشس جا کر سلطنتِ خدا داد کے لیے تین ہزار جتنی اور دس ہزار فرانسیسی فوجی بھرتی کر کے لے آئے۔ مگر سلطان نے جس شخص کو رقم دی وہ رقم لے کر فرار ہو گیا۔

سلطان کے لیے اب یہ ایک مسئلہ بن گیا تھا۔ اس نے ابھی کچھ ہی دن پہلے اسی سلسلہ میں کچھ تاجروں کو ایک جہاز پر ماریشس بھیجا تھا اور اب ریپاڈ کے ساتھ محمد ابراہیم اور حسین علی خاں کو جانا تھا۔

بہر حال، سلطان نے نئے جہاز کی تیاری کا حکم دیدیا۔ ریپاڈ کو سرنگا پٹم بھیج دیا گیا کیونکہ مارشوں کے موسم میں منگلور کی بندرگاہ بند کر دی جاتی تھی۔

آخر جہاز تیار ہوا اور ریپاڈ، محمد ابراہیم اور حسین علی خاں ماریشس روانہ ہوئے۔ ایک ماہ کے بڑے سفر کے بعد یہ لوگ ماریشس پہنچے۔

اس وقت ماریشس کا گورنر میلنگ تھا۔ ریپاڈ نے گورنر سے علیحدگی میں کچھ گفتگو کی۔ پھر گورنر نے سلطان کے دونوں وکیلوں کا پُر تپاک استقبال کیا۔

پھر جب گورنر نے فوجی تعاون اور سپاہیوں کی بھرتی کی گفتگو شروع ہوئی تو سلطان کے وکیلوں نے غصے سے کہا کہ ریپاڈ کا رویہ اور انداز بڑا پراسرار اور محتاط ہے۔ وہ کچھ مول باتیں کر رہا تھا۔

گورنر نے وکیلوں کو بتایا کہ ماریشس میں فرانسیسی فوجیوں کی تعداد اس قدر کم ہے کہ وہ

سلطان کی مدد کرنے سے معذور ہے۔

اس وقت دکیوں نے ریپاڈ پر دباؤ ڈالا کہ وہ گورنر کو رضا مذکر سے گمروہ جلسہ ساز نہ کر سکتا تھا اس نے کیا۔ البتہ گورنر نے وعدہ کیا کہ وہ ان کی آمد کو مؤثر بنانے کی ذاتی طور پر کوشش کرے گا۔

پس۔ گورنر نے سرکاری طور پر ایک اعلان شائع کر دیا جس میں سلطان کے یہ رضا کاروں کی فراہمی کا ذکر کیا گیا۔

دکیوں نے بھی اعلان کیا کہ ہندوستان میں انگریزی مقبوضات کے خلاف ایک اقدالی جنگ چھڑنے والی ہے بلکہ اس وقت تک وہاں جنگ شروع ہو چکی ہوگی۔

آخر رضا کاروں کی بھرتی شروع ہوئی لیکن صرف ۹۹ رضا کار دستیاب ہو سکے۔ ان میں بری فوج کا کمانڈر موسیو سیو، بحری فوج کا کمانڈر موسیو ڈیوبک، یورپی فوج کا کمانڈر دیوین توپ خانہ کے دو افسر، بحریہ کے چھ افسر، جہاز سازی کے چار ماہرین، ۲۶ عام افسر، کپٹن دیو ۳۶ یورپی سپاہی اور ۲۲ حبشی اور دو غلی نسل کے سپاہی شامل تھے۔ یہ تمام لوگ جہاز میں سوار ہو کر میسور روانہ ہو گئے۔

جب یہ لوگ منگلور کے ساحل پر اترے تو اس سے دو دن پہلے لارڈ ولزلی ہندوستان پہنچا تھا۔

سلطان نے ان رضا کاروں کا پرتپاک استقبال کیا۔ محمد ابراہیم اور حسین علی خاں کو ان کی کامیابی پر داد دی اور ان کم تعداد رضا کاروں کو بہتر شرائط اور معقول مشاہرہ پر سلطنت خداداد کی ملازمت میں لے لیا۔

لارڈ مارلٹن ولزلی، کارنوالس کی جگہ پر گورنر جنرل ہو کر ہندوستان آیا تھا۔ اس وقت نرسوین نہیں بنی تھی اور یورپ سے ہندوستان آنے والوں کو پورے براعظم افریقہ کا کئی ہزار میل کا پیکر لگا کر اس امید ہوتے ہوئے ہندوستان آنا پڑتا تھا۔

جب ولزلی لندن سے اس امید پہنچا تو وہاں اس کی ملاقات ہندوستان کے تین انگریز سیاست شاطروں سے ہوئی۔

ان میں سے ایک گورنر جنرل میڈوز تھا جو سلطان کا جانی دشمن تھا۔

دوسرا جنرل میڈوز تھا جو عرصہ تک سلطان کی قید میں رہ چکا تھا۔

اور تیسرا بیجر کرک پیٹک تھا جو ایک مدت تک پونا اور حیدرآباد دکن میں ریڈیٹنٹ رہ چکا تھا۔

ولزلی اور ان شاطروں میں ہندوستان اور خصوصاً میسور اور سلطان کے بارے میں بہت کھل کے بات چیت ہوئی اور کارنوالس نے ولزلی کو سلطان اور ہندوستان کے بارے میں جو کچھ بتایا تھا اس کی نہ صرف تصدیق ہوئی بلکہ ان شاطروں نے ولزلی کو اس کے خیال میں بے انتہا معلومات فراہم کیں اور وہ سلطان کا کارنوالس سے بھی بڑا دشمن ہو گیا۔

ارل آف مارلٹن کا وطن آئر لینڈ تھا۔ وہ ۸۔ جون ۱۷۹۰ء کو پیدا ہوا۔ اس کا پورا نام رچرڈ کولی ولزلی تھا۔ وہ ۱۷۸۲ء میں پارلیمنٹ کا ممبر بنا اور اسی وقت سے اس نے ہندوستان کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا تھا۔

ولزلی کو پارلیمنٹری طرز حکومت قطعی پسند تھا۔ اس کی شخصیت میں شخصیت پرستی اور شاہ پسندی بدرجہ اتم موجود تھی۔ فرانسیسیوں سے اسے خاص طور پر دشمنی تھی اس لیے کہ اس کے زمانے میں فرانس میں جمہوریت قائم ہو رہی تھی۔

ولزلی کو فرانسیسیوں کے ساتھ جو مخصوص دشمنی تھی اس کی ایک اور وجہ بھی تھی جس کے بارے میں ایک مؤرخ نے لکھا ہے:

”لارڈ ولزلی کی بیوی ایک فرانسیسی خاتون تھی جس کے ساتھ لارڈ صاحب شادی سے پہلے ہی تعلقات کی تمام حدیں پھلانگ چکے تھے۔ پھر بعد ایک بہت بڑے جھگڑے کے، انہیں اس سے شادی کرنا پڑی۔“

پھر جب ولزلی کو ہندوستان کا گورنر جنرل بنایا گیا تو اس نے بیوی سے ساتھ چلنے کو کہا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ اگرچہ اس نے طلاق نہیں لی مگر ان میں علیحدگی ہو گئی۔

یہی وہ خاص وجہ تھی جس کے سبب ولزلی فرانسیسیوں کا جانی دشمن تھا؟



قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ انگلستان اور فرانس میں زمانہ قدیم سے دشمنی چلی آرہی ہے مگر اس کے باوجود ان دونوں ملکوں میں شادی بیاہ کا سلسلہ بھی ہمیشہ قائم رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ دونوں ملکوں میں خاندانی رشتہ داریاں تھیں جس کی وجہ سے کبھی دونوں ملکوں میں دوستی ہو جاتی تھی اور کبھی جنگ بلکہ شدید جنگ چھڑ جاتی تھی جو یورپ سے نکل کر ان کی نوآبادیوں تک جا پہنچتی تھی۔

چنانچہ کرک پیٹرک نے دلہنی کو یہ نکتہ کی بات بتادی تھی کہ جب تک ہندوستان میں فرانسیسیوں کا اثر مسوخ رہے گا تب تک انگریز نہ تو پورے ہندوستان پر قابض ہو سکیں گے نہ چین سے رو سکیں گے۔

دلہنی نے ہندوستان پہنچ کے جو خط و خد اس کو لکھا تھا اس سے اس کے وہ تمام ارادے ظاہر ہو جاتے ہیں جنہیں وہ ہندوستان میں رہ کر پورا کرنا چاہتا تھا۔ اس نے اس طویل خط میں لکھا:

”میرے لگاؤ کی صلح کے بعد اب اس ملک میں اندرونی طور پر مکمل سکون ہے مگر اس کے گرد و پیش کے ہمارے اتحادی (نظام اور مرہٹے) اندرونی بغاوتوں، باہمی لڑائیوں اور پیہم انقلاب کے بعد اب بالکل خستہ حال ہو گئے ہیں۔

جہاں تک بیٹو سلطان کا تعلق ہے وہ اپنی طاقت جمع کرنے، محصول بڑھانے اور اپنی فوج کو اعلیٰ تربیت دینے میں مصروف ہے اور اب کچھ عرصہ سے وہ دیسی علاقوں کو ہمارے خلاف اُکساد کر رہا ہے۔ اس نے نظام دکن کو یقیناً ایک خط بھیجا تھا جبکہ وہاں کا وزیراعظم (جو ہمارا دوست تھا) پوچھا تھا۔ اس نے حیدرآباد کی بساط سیاست پر گہرا اثر چھوڑا ہے۔ اب حیدرآباد میں سلطان کا ایک وکیل رہتا ہے سلطان نے پونا (مرہٹوں کا مرکز) میں بھی اپنے وکیل بھیجے ہیں۔ اس طرح وہ ہمارے خلاف دشمنی کو ہوا دے رہا ہے۔

میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آیا ہم بلا فمائش اور بلا نیابت ٹیپو کی اس دشمنی کو صبر سے بیٹھے دیکھتے رہیں؟

اس معاملہ میں میری رائے یہ ہے کہ ہم ٹیپو کو مخاطب کرتے وقت کوئی سفت کلمہ نہ لکھیں۔ دوسرے یہ نہ ہم اس کی چابازیوں پر چشم پوشی نہ کریں بلکہ اسے بتادیں کہ اس کی کوئی دغا بازی ہم سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔

دلہنی اپنے ایک اور خط میں لکھتا ہے:

”ان حالات میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ نظام ہماری دوستی حاصل کرنے پر مجبور ہے۔ چنانچہ ہمیں اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نظام سے اس کی فوجیں الگ کرنے کے لیے خط و کتابت کرنا چاہیے۔“

اس وقت نظام کے دربار میں جیس کرک پیٹرک ریزیدنٹ تھا۔ پیٹرک بڑی رنگین طبیعت کا مالک تھا۔ کہنے کو تو وہ انگریز ریزیدنٹ تھا مگر حیدرآباد کی کوئی ایسی بڑی عقل نہ ہوتی تھی کہ جس میں پیٹرک موجود نہ ہوتا۔

نظام کے تمام بڑے بڑے سول اور فوجی افسر اس کے ہم نوالہ وہم پیالہ تھے اور ہر روز کسی نہ کسی افسر کے ہاں محفلِ نشاط جمتی تھی جس میں شراب و کباب کے ساتھ شباب کا بھی انتظام ہوتا تھا۔

پیٹرک اس قدر بنگ اور بے باک تھا کہ اس نے حیدرآباد کے ایک امیر کی بیٹی کے ساتھ بیاہ کر لیا تھا۔ جس کے بارے میں واضح نہیں کہ اس نے اس کے ساتھ باقاعدہ بیاہ کیا تھا یا اسے داشتہ بنا کے رکھ چھوڑا تھا۔

”میر عالم کی سوانح عمری“ نامی کتاب جس کے مصنف محمد سراج الدین طالب حیدرآبادی ہیں، نے اپنی اس کتاب میں پیٹرک کے بارے میں لکھا ہے:

”جیس حیدرآباد میں اپنا ریزیدنٹ ہونے کے زمانہ میں اپنی راتیں اس مکان میں گزارتا تھا جو اس ریزیدنٹسی کے سرکاری مکان کے قریب ہی واقع تھا۔ اس مکان میں جیس کی ایک داشتہ رہتی تھی۔ اس داشتہ کی دوستی نواب مائل الدولہ کی نواسی خیر النساء بیگم سے تھی۔ خیر النساء کے باپ کا نام مہدی یار خاں اور ماں کا نام شرف النساء بیگم تھا۔ خیر النساء وزیر دکن میر عالم کے رشتہ میں بھی ہوتی تھی۔ وہ جیس کی داشتہ کے پاس

اور اسے مجبور کیا کہ وہ نظام دکن کو انگریزوں کے "سب سی ڈیاری" سسٹم کو ماننے پر مجبور کرے  
لیونکہ فرانسیسیوں کی شورش کو صرف انگریز ہی دبا سکتے ہیں اور انگریز اس وقت تک حرکت میں  
نہیں آئیں گے جب تک نظام ان کے "سسٹم" کو تسلیم نہ کرے۔

پنابچہ وزیر اعظم نے نظام دکن کو مشورہ دیا:  
"عالی جاہ - وقت کا تقاضہ ہے کہ ہم فوراً انگریزوں کا نظام حاصل کریں کیونکہ صرف انہی کی  
فوجیں فرانسیسی شورش کو ختم کر سکتی ہیں۔"

نظام دکن کے سامنے یہ "سسٹم" ایک بار پہلے بھی پیش کیا گیا تھا لیکن وہ ایک خود دار  
عمران تھا۔ اس نے اسے ماننے سے قطعی انکار کر دیا تھا۔ تاہم اب حالات تبدیل ہو چکے تھے۔ نظام نے  
کچھ سوچتے ہوئے جواب دیا:

"ہم مانتے ہیں کہ انگریز اس شورش کو ختم کر سکتے ہیں مگر اس کی حالت تو اس ضرب المثل کے  
مانند ہو جائے گی کہ آسمان سے گرتے ہوئے کچھ زمین اڑا۔ فرانسیسیوں سے جان چھڑانے کے لیے اگر ہم  
انگریز فوجوں سے کام لیں گے تو ان کے جنگل سے نکل کر ہم ان کے جنگل میں پھنس جائیں گے اور  
ہماری مطلق العنانی ختم ہو جائے گی۔"

نظام کا اندازہ بالکل درست تھا۔

اس نے شاید اس سسٹم پر پہلے ہی اچھی طرح غور و خوض کر لیا تھا مگر اس وقت فرانسیسیوں کی  
شورش کو دبانے کی ضرورت تھی۔

وہ گوگو کے عالم میں تھا کہ اس کے وزیر اعظم نے کہا:

"عالی جاہ - انگریز فوج تو آپ کی ملازم ہوگی۔ اسے آپ کے خزانے سے تنخواہ ملے گی اور  
اس کے قیام و طعام کی ذمہ داری ہمارے حکام کے سپرد ہوگی۔ پھر وہ ہم پر حاوی کیسے ہو سکتی  
ہے۔ جس طرح میں آپ کا غلام ہوں اسی طرح انگریز فوج آپ کی غلام اور پروردہ ہوگی۔"

نظام دکن کے گرد یہ جال بڑی خوبصورتی کے ساتھ پھیلا گیا تھا کیونکہ بعد میں اس بات کا پتہ  
چلا کہ انگریز فوج کو حیدرآباد کے قریب گنتور میں خفیہ طور پر تیار رکھا گیا تھا اور جیسے ہی  
فرانسیسی شورش شروع ہوئی انگریز فوج کو حیدرآباد کی طرف پیش قدمی کا حکم دے دیا گیا تھا  
پنابچہ جس وقت نظام اور وزیر اعظم اسطو جاہ میں یہ گفتگو ہو رہی تھی، انگریز فوجیں حیدرآباد  
کی سرحد پر پہنچ چکی تھیں۔

روز سہا کرتی اور اکثر انہیں وہیں گزارتی تھی۔

روزانہ آنے جانے کی وجہ سے غیر النساء پر پیٹرک کی نظر میں بھی  
پڑتی تھیں۔ پھر ان دونوں میں تعلقی پیدا ہو گیا اور اس لڑکی میں  
ریڈیڈٹ کی دلچسپی بہت زیادہ بڑھ گئی۔

جلد ہی یہ بات ہر طرف پھیل گئی۔ اس پر ریڈیڈٹ پیٹرک  
نے اس لڑکی کو اپنی ریڈیڈٹ کے مکان میں داخل کر دیا۔

ریڈیڈٹ پیٹرک کی چہرہ و سنیاں اس قدر بڑھ گئی تھیں کہ دوسرے امرائے دولت کے  
علاوہ میر عالم جسے انگریزوں نے وزیر اعظم بنایا تھا، اس نے بھی لارڈ ولزلی سے پیٹرک کی  
تشکایت کی تھی۔

ولزلی انگلستان سے اپنے ساتھ جو فدرولا لے کے آیا تھا اس کا نام تھا:

"سب سی ڈیاری"

اس کی وضاحت اس طرح کی جا سکتی ہے کہ اپنی فوج برخواست کر کے انگریز فوج کو اپنی  
مدد کے لیے رکھا۔

یعنی ولزلی یہ چاہتا تھا کہ ہندوستانی حکمرانوں کو اس بات پر مجبور کر دے کہ وہ اپنی فوجیں  
برخواست کر کے اپنی حفاظت کے لیے انگریز فوجوں کو ریاست میں رکھیں۔

اس عمل سے برعکس، انگریزوں کے ماتحت ہو جانا۔ پنابچہ ولزلی نے اس فارمولے کا  
پہلا تجربہ نظام دکن پر کرنے کا فیصلہ کیا۔

نظام کے پاس اس وقت کافی تعداد میں فرانسیسی فوجیں موجود تھیں اور ان کا اثر نظام  
پر تھا۔ ان نظام کا وزیر اعظم انگریزوں کا دوست تھا۔

ولزلی نے کسی طرح دکن میں موجود فرانسیسی فوج میں شورش پیدا کرادی۔

ایسا کیوں اور کیسے ہوا؟

اس کا پتہ کسی کو نہیں چل سکا۔ جب فرانسیسی فوج میں نظام کے خلاف بغاوت کے آثار پیدا  
ہوئے تو نظام گھر گیا۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ دکن کا ناچ و تخت اس کے ہاتھ سے نکل رہا ہے۔  
ولزلی ایسے ہی موقع کا منتظر تھا بلکہ یہ موقع اس نے خود ہی پیدا کر لیا تھا۔

ولزلی نے اپنے ریڈیڈٹ کے ذریعے فوراً انگریزوں کے پروردہ وزیر اعظم اسطو جاہ کو بلا

ارسطو جاہ کو فوجوں کے آنے کی خبر ملی تو وہ حیران رہ گیا مگر اب کیا ہو سکتا تھا !  
نظام دکن نے فکر مند نظروں سے ارسطو جاہ کو دیکھا اور گھٹی گھٹی آواز میں بولا :  
"ارسطو جاہ - خوب غور کر لو - ایسا نہ ہو کہ ہم انگریزوں کے ہاتھوں بالکل بے دست و پا ہو  
کر رہ جائیں۔"  
"عالی جاہ کو تردد و فرہ نے کی ضرورت نہیں۔"

ارسطو جاہ نے نظام کو سہارا دیا :

"فوج انگریز کی ہو یا ہماری - ملازم تو ہماری ہوگی - ہم اس کے حاکم ہوں گے - شاہی وقار  
کو کوئی دھچکا نہیں لگے گا - بس آپ کے حکم کی دیر ہے - انگریزی فوجیں حیدرآباد کی سرحد پر  
پہنچ چکی ہیں۔"

آخر نظام نے ہتھیار ڈال دیے :

"اچھا - تم جیسا مناسب سمجھو ویسا کر سکتے ہو۔"

نظام کی رضامندی حاصل ہوتے ہی ملک فروش ارسطو جاہ نے چند گھنٹوں کے اندر اندر تین شرط  
پر مشتمل معاہدہ نظام کے دستخط کے لیے سامنے رکھ دیا -

معاہدہ کی شرائط حسب ذیل تھیں :

۱۔ نظام الملک چھ ہزار فوج توپ خانہ کے لیے رکھیں گے جس کے انصر  
انگریز ہوں گے -

۲۔ اس فوج کے اخراجات ریاست حیدرآباد برداشت کرے گی -

۳۔ تمام فرانسیسیوں کو برخواست کر دیا جائے اور آئندہ ریاست میں سوائے  
انگریزوں کے کوئی اور یورپین ملازمت نہ کر سکے -

نظام دکن جال میں پوری طرح جکڑ گیا تھا -

فرانسیسیوں کی شورش سامنے تھی -

انگریزی فوجیں حیدرآباد پہنچ چکی تھیں -

سوائے معاہدہ پر دستخط کے اور کوئی چارہ نہ رہ گیا تھا - اس نے پچھتم نم معاہدہ پر دستخط  
کر دیے -

کلکتہ میں جیمز ٹاکنس کے ہال میں ایک تصویر آویزاں ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ

دلہنی کے ہاتھ میں ایک کاغذ ہے جس پر ،  
"سب سی ڈیاری حیدرآباد ۱۷۹۸ء"  
لکھا ہوا ہے -

اس معاہدہ پر دستخط ہوتے ہی حیدرآباد کی آزادی اور خود مختاری کا خاتمہ ہو گیا !

دلہنی نے سلطنت خداداد کو مٹانے کے لیے جو منصوبہ بنایا تھا اس کی بنیادیں پہلی اینٹ  
پر رکھی گئی کہ نظام دکن کو گھیر کے سازش کے ذریعے مجبور کیا گیا کہ وہ دلہنی کے سب سی ڈیاری  
سسٹم کو قبول کرے - چنانچہ نظام دکن نے اس معاہدہ پر دستخط کر کے اپنی آزادی کو نہ صرف  
ختم کر لیا بلکہ خود کو بالکل اس طرح انگریزوں کی گود میں ڈال دیا جس طرح کرناٹک کے والا جاہ محمد علی  
نے کیا تھا -

والا جاہ محمد علی کہنے کو تو ایک آزاد ریاست کا حکمران تھا لیکن اس کے پاس نہ کوئی اختیار تھا نہ  
فوج تھی - اس کی فوج انگریزی فوج میں ضم کر دی گئی تھی - اب نظام دکن کی بھی یہی کیفیت و حالت ہو  
گئی تھی -

اس سلسلے میں اب تک جو کچھ لکھا گیا ، انگریزی تاریخوں کے حوالے سے لکھا گیا ہے - اب آئیے  
دیکھتے ہیں کہ اس موت کے محضر یعنی "سب سی ڈیاری سسٹم" کے بارے میں خود حیدرآباد کی تاریخ  
کیا کہتی ہے -

یہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ دلہنی کے تمام اقدامات کا مقصد صرف اور صرف سلطنت خداداد کو  
مٹانا تھا -

"تاریخ نظام علی خاں" مطبوعہ حیدرآباد دکن کے مصنف اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں :

جنگِ میسور

۱۷۹۹ء

۱۲۱۳ھ

اسبابِ جنگ :

سلطان کے لڑکے جو سطح نامہ کے تحت بطور برغمال کمپنی کی زیر نگرانی

پاس فرانس سے دو سو فرانسیسی سپاہی اور عہدیدار آئے ہیں۔  
انگریزوں کو اس فوج کے آنے سے خیال کرتے ہیں کہ سلطان نے  
یہ فوج اس لیے بلوائی تھی کہ وہ انگریزوں سے اپنی پچھلی شکست کا  
بدلہ لینا چاہتے تھے لیکن اس بات سے اتفاق نہیں کیا جاسکتا کہ  
سلطان کو انگریزوں سے بدلہ لینے کے لیے فرانس کے صرف ۲۰۰ سپاہی  
چاہیے تھے۔

اب رہا خلیفہ المسلمین کو خط لکھنے کا سوال تو اس سلسلے میں یہ بات  
ظاہر ہے کہ ہر مسلمان بادشاہ اپنی بادشاہت کی سند خلیفہ سے منگواتا  
تھا اور سلطان نے اب تک یہ سند حاصل نہیں کی تھی۔ اس لیے ممکن ہے  
کہ سلطان نے خلیفہ سے سند سلطانی منگوانے کے لیے سفارت بھیجی ہو۔  
دوسری بات یہ کہ سلطان اور انگریزوں کے معاہدہ میں کوئی ایسی  
شرط نہ تھی جس سے انہیں اندرون ملک اور بیرون ملک سفارتی  
تعلقات قائم کرنے سے روکا گیا ہو۔

بہر حال سلطان کے ان اقدامات کو انگریزوں نے کمال شک  
شہ کی نظر سے دیکھا اور فیصلہ کیا کہ جس قدر جلد ہو سکے ان کی  
روز افزوں ترقی کو روک کر ان کی طاقت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر  
دیا جائے۔

اس کے لیے سب سے پہلے ولزلی نے مدراس گورنمنٹ کی فوج کو  
مالابار اور کورومنڈل میں اترنے کے احکامات دیے۔ اس کے  
بعد مرہٹوں اور نظام سے ایک نئے معاہدہ کی کوشش بھی شروع ہوئی  
تاکہ جنگ کی صورت میں یہ دونوں طاقتیں انگریزوں کے ماتحت  
سلطان کا مقابلہ کریں۔

اس کے ساتھ ہی انگریزوں کی نظر مرہٹہ دربار پونا پر بھی تھی۔ جس وقت ولزلی ہندوستان  
آیا اس وقت پونا دربار سازشوں کی آماجگاہ بنا ہوا تھا۔  
دولت راؤ سندھیانے نانافرونیس کو تیار کر دیا تھا اور باجی راؤ پیشوا بنا ہوا تھا۔ اصل طاقت

نئے وہ ۱۷۹۴ء میں بہ عزت و احترام واپس کر دیے گئے۔ اس کے بعد  
سلطان شاید اپنی سلطنت کو وسعت دینے اور مضبوط کرنے میں لگ  
گئے۔ انہوں نے قلعہ جات کو مضبوط کیا۔ بعض نئے قلعے تعمیر کرائے پھر  
قریب اور دور کے ملک میں سفارتیں بھیجیں۔

ایران کا ایک شہزادہ سلطان کے پاس کافی عرصہ مقیم رہ کر واپس  
گیا۔ سلطان نے فرانس کے پولین اعظم سے مراسلت کی شاہ افغانستان  
سے کوئی مفاہمت ہوئی۔ ایک سفیر خلیفہ المسلمین سلطان ترکی کے  
پاس بھیجا گیا۔

سلطان کے یہ تمام اعمال ایسے نہ تھے جن سے وہ جماعت (الابٹ)  
انڈیا کمپنی اور نظر کرتی جو انگلستان سے جلب منفعت اور ملک  
گیری کے لیے آتی تھی۔ چنانچہ کمپنی کے عہدیداروں نے ان تمام باتوں  
پر غور کرنے کے بعد یہ نتیجہ نکالا کہ سلطان انگریزوں ہی کے خلاف  
جارجانہ عزائم رکھتے ہیں۔

چنانچہ اس کے تدارک کے لیے کمپنی نے اقدام شروع کیے۔  
کمپنی کے کورٹ آف ڈائریکٹرز نے لارڈ ولزلی کو اسی لیے ہندوستان  
میں گورنر جنرل بنا کر بھیجا تھا اور ولزلی نے حالات پر غور کر کے  
ہوئے مرہٹوں کے خلاف نظام دکن کو مدد دینے کے سلسلہ میں  
پریسڈنٹ بورڈ آف کنٹرول کو ان الفاظ میں مطلع کیا تھا:  
”یہ کوئی دور اندیشی نہیں کہ نظام اور مرہٹے آپس میں لڑ کر کمزور ہو  
جائیں اور سلطان آرام میں رہیں۔“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزوں کا اصل مقصد صرف سلطان کو  
نشانہ بنانا تھا۔ اسی لیے گورنر جنرل ولزلی نے کوشش کی کہ مرہٹوں  
اور نظام کو معاہدوں کے ذریعے اپنے قابو میں لایا جائے تاکہ وہ  
سلطان سے تعاون کر کے اس کے لیے طاقت کا سامان نہ کریں۔  
ولزلی جب ہندوستان پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ سلطان کے

دولت راڈ سندھیا کے ہاتھ میں تھی۔

انگریز سلطان سے جنگ شروع کرنے سے پہلے سندھیا کو پونا سے ہٹا دینا چاہتے تھے مگر انہیں خطرہ تھا کہ یہ مرہٹہ سردار سلطان سے تعاون کرنے پر آمادہ ہو جائے گا۔

پس — ولزی نے پونا میں اپنے انگریز سفیر کو لکھا کہ:

”نانا فرنیس سے یہ عہد لے کر اگر اسے آزاد کر دیا گیا تو وہ

انگریزوں کا ساتھ دے گا۔“

یہ خط ابھی انگریز سفیر کو پہنچا ہی تھا کہ مرہٹوں کی آپس میں صلح ہو گئی اور نانا فرنیس آزاد ہو گیا۔ اس طرح انگریزوں کی نفاق ڈرنے کی کوشش ناکام ہو گئی۔

اب یہی بات مدہ گئی تھی کہ کسی طرح سندھیا کو پونا سے دُور کیا جائے۔ اس کے لیے انگریزوں نے یہ ترکیب کی کہ احمد شاہ ابدالی کا پوتا زماں شاہ والی افغانستان، ہندوستان پر حملہ کرنے والا ہے۔

اس افواہ سے مرہٹوں میں اضطراب پیدا ہوا۔ انگریزوں نے دولت راڈ سندھیا کو مشورہ دیا کہ وہ اپنے شمالی ہندوستان کے مقبوضات کی حفاظت کے لیے پونا سے شمال میں چلا جائے مگر سندھیا نے یہ مشورہ اس کان سے سنا اور اُس کان سے اڑا دیا۔

اب انگریزوں نے ایک اور تدبیر کی۔

انہوں نے مرہٹوں کے صدر مقام گوالیار میں کرنل کالنس کو سفیر بنا کر بھیجا۔ اس نے وہاں جا کر کیا گل کھلائے اس کا تو علم نہیں مگر یہ ضرور ہوا کہ گوالیار کے امیروں اور وزیروں میں نفاق پیدا ہو گیا۔

انگریزوں نے جنوب کے علاوہ شمالی ہندوستان میں بھی اپنے ہاتھ پر خوب پھیل لیے تھے۔ نواب اودھ، دارن، شینگن کے زمانہ سے انگریزوں کے تابع تھا۔ اودھ کی سرحد پر مرہٹوں کے مقبوضہ علاقے تھے۔ انگریزوں نے اپنی ایک فوج اس سرحد پر بھیج دی اور جواز یہ پیش کیا کہ شاہ افغانستان، ہند پر حملہ کرنے والا ہے اس لیے یہ فوج اودھ کی حفاظت کے لیے تعینات کی گئی ہے۔

دولت راڈ سندھیا کو جب اس کا پتہ چلا تو اس کی سمجھ میں یہ آیا کہ انگریز اس کے علاقوں پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ فوراً ایک لشکر لے کر شمالی سرحدوں کی طرف چل پڑا۔ اب پونا خالی تھا اور یہی انگریزوں کا مقصد تھا۔

دولت راڈ سندھیا کے منظر سے ہٹتے ہی انگریزوں نے نانا فرنیس اور پیشوا کے سامنے اپنا سب سی ڈیدی سسٹم پیش کیا۔

انہوں نے مرہٹوں کو یقین دلایا کہ پہلے معاہدے پر ہزار ہوں گے۔ اگر کمپنی اور سلطان میں جنگ ہو تو مرہٹوں کو کمپنی کا ساتھ دینا ہوگا۔

یہ بھی انگریزوں کی ایک چال تھی۔ وہ دراصل مرہٹوں سے کسی معاہدے کے خواہشمند نہیں تھے۔ بلکہ صرف یہ چاہتے تھے کہ سلطان سے جنگ کی صورت میں مرہٹے غیر جانبدار رہیں۔ اس لیے انہوں نے ایک اور حرکت کی۔

جب مرہٹے معاہدہ کرنے اور جنگ کی صورت میں ان کو امداد دینے پر آمادہ ہو گئے تو انگریزوں نے یہ کہہ کر پونا کی امداد کو متروک کر دیا کہ:

”مرہٹوں کے پیشوانے بغیر اپنے وزیر اعظم نانا فرنیس کو اطلاع دیے

سلطان کے سفیروں سے ۱۳ لاکھ روپے وصول کر لیے ہیں۔“

انگریز ایک کے بعد دوسری چال چل رہے تھے۔ روپیہ کا جھگڑا کھڑا کر کے وہ پیشوا اور نانا فرنیس میں نفاق پیدا کرنے میں بھی کامیاب ہو گئے۔

انگریزوں نے جب نظام اور مرہٹوں کو اپنے دامن میں پھانس لیا تو افغانستان کی طرف توجہ کی۔

انہوں نے یہ افواہ اڑائی تھی کہ شاہ افغانستان زمان شاہ ہندوستان پر حملہ کر رہا ہے مگر یہ افواہ حقیقت کا روپ دھار گئی۔ زمان شاہ نے واقعی ہندوستان پر حملے کا ارادہ کر لیا اور اپنی فوجوں کو سرحد کی طرف روانہ کر دیا۔

اب انگریز گھبرائے۔ انہوں نے سوچا کہ اگر شمال میں زمان شاہ آگئی تو پھر شمال میں وہ اور جنوب میں سلطان پٹو، دونوں مل کے انگریزوں کا خاتمہ کر دیں گے۔ اس کے توڑ کے لیے انہوں نے فوراً مراد آباد یو۔ پی کے ایک شیعہ کو عباس شاہ صفوی کے دربار میں بھیجا۔

انگریزوں کا یہ فرستادہ بہت چالاک اور چرب زبان تھا۔ اس نے عباس شاہ صفوی کے دربار میں جلتے ہی واویلا مچا دیا:

”اعلیٰ حضرت۔ عالی جاہ۔ شاہ معظم دہائی ہے۔ ہم پر بڑا وقت آن پڑا ہے۔ آپ ہی ہمیں شاہ افغانستان کے علم و متم سے بچا سکتے ہیں۔“

عباس شاہ صفوی اور اس کے درباری اس کے دادیلا سے بہت متاثر ہوئے۔ شاہ ایران نے اس سے دریافت کیا:

”اے شخص۔ تو کون ہے۔ تو کیا چاہتا ہے۔ تجھ پر کس نے ظلم کیا ہے؟“

”عالی جاہ!“

اس چرب زبان نے روتے ہوئے کہا:

”میرا نام کالم بخاری ہے۔ میرے تمام عزیز و اقارب ہندوستان اور کابل میں رہتے ہیں۔ میں ان سے ملنے گیا تھا۔ وہاں کا حال دیکھ کر میرا سینہ غم سے پھٹ گیا۔ میں نے یہ بہتر جانا کہ میں عالی جاہ کے دربار میں آکر فریاد کروں۔“

”کیا حال ہے کابل کا؟“ شاہ صفوی نے سوال کیا:

”ہیں تفصیل سے بتاؤ۔“

”عالی جاہ۔“

کالم بخاری نے ٹسو سے ہاتھ ہونٹے کہا:

”افغانستان میں ہم شیعوں پر حدودِ ظلم و ستم ہو رہے ہیں۔ شیعوں کے جان والی محفوظ نہیں۔ ان کے عقاید پر پابندیاں لگائی گئی ہیں اور سینکڑوں شیعہ، شیعہ ہونے کے بہم میں تہ تیغ کیے جا رہے ہیں۔“

یہی حال ہندوستان کا ہے۔ وہاں کے شیعوں پر بھی افغانوں نے طعنے حیات تنگ کر رکھا ہے۔“

مذہبی معاملات میں ہم مسلمان خواہ شیعہ ہوں یا سنی، فوراً بھڑک اٹھتے ہیں اور ہمارے ملک کے بعض علاقوں میں اس وقت بھی شیعہ سنی فساد کی اصل وجہ یہی جلد بازی اور بغیر تحقیق کے قدم اٹھنا ہے۔

چنانچہ کالم بخاری کی باتیں سن کے شاہ صفوی جذباتی ہو گیا۔ وہ مذہبی جذبات میں ایسا بہا کہ اس نے اس اہم خبر کی تصدیق کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور فوراً افغانستان پر حملہ کی تیاری کا حکم دے دیا۔



شاہ زماں ایک بڑے لشکر کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کے لیے روانہ ہوا تھا۔ ابھی وہ ہند کی سرحد پر پہنچا ہی تھا کہ اس کے وزیر اعظم کا ایک قاصد اس کے پاس پہنچا۔

”شاہ معظم و محترم!“

سوار قاصد نے وزیر اعظم کا خط پیش کرتے ہوئے زبانی کہا:

”وزیر اعظم نے تجھے حکم دیا ہے کہ ان کا یہ خط حضور عالی میں پیش کرتے ہوئے میں ان کی طرف سے یہ بھی عرض کر دوں کہ شاہ ایران عباس صفوی کی فوجیں افغانستان پر حملہ کے لیے تیار ہو رہی ہیں۔ اس لیے آپ سے درخواست ہے کہ ہندوستان کی ہم ملوثی کو کے آپ افغانستان کی ملاستی کے لیے فوراً واپس تشریف لے آئیں۔“

زمان شاہ قاصد سے حملے کی خبر سن کر پریشان ہو گیا۔ اس نے جلدی جلدی خط لکھا۔ وزیر اعظم نے زمان شاہ کو یہ بھی لکھا تھا کہ اس نے شاہ ایران کے پاس ایک قاصد روانہ کیا ہے کہ وہ شاہ سے معاہدہ امن کی خلاف ورزی کی وجہ دریافت کرے اور حملہ کو روکنے کی حتی الامکان کوشش کرے۔

یہ زبانی اور تحریری اطلاع ایسی تھی کہ زمان شاہ کو ہندوستان کی طرف بڑھتے ہوئے اپنے لشکر کے قدم اک دم روکنا پڑے۔ اس نے واپسی کا حکم دے دیا اور کمال پریشانی کے عالم میں کابل واپس پہنچا۔

اس وقت تک ایران کا حملہ تو نہ ہوا تھا مگر وزیر اعظم کا بھیجا ہوا قاصد بھی شاہ ایران سے مل کے اب تک واپس نہ آیا تھا۔

افغانستان کے وزیر اعظم کو اس کے ایک جاسوس نے ان الفاظ میں ایران کے ممکنہ حملے کی اطلاع دی تھی:

”محترم وزیر اعظم۔ جلد کوئی انتظام کیجیے۔ ایران کی فوجیں ہم پر حملہ کرنے کے لیے کیل لگاتی ہیں۔“

وزیر اعظم بھرا گیا۔ اس نے دریافت کیا:

”عزم کیا تمہیں یقین ہے کہ شاہ ایران ہم پر حملہ کرنے کے لیے تیار ہو رہا ہے؟“

عزم نے فوراً جواب دیا:

”محترم وزیر اعظم! میں اس خبر کی تصدیق کر کے آپ کے پاس آیا ہوں۔ فوج کے علاوہ میں نہ

دہان کے عوام میں بھی بڑا جوش و خروش دیکھا ہے۔ وہ بھی افغانستان کے بہت خلاف دکھائی دے رہے ہیں۔

”عجیب بات ہے۔“

وزیراعظم نے خود کلامی کے انداز میں کہا:

”مجھ میں نہیں آتا۔ شاہ ایران یا ایرانی عوام کا ہم نے کیا بگاڑا ہے کہ وہ بغیر کسی وجہ کے ہم پر حملہ کرنا چاہتے ہیں۔“

”محرم وزیراعظم“۔ عزم نے کہا:

”میں نے ایرانیوں کو باتیں کرتے سنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ افغان جو ہمارے بھائیوں پر ظلم و ستم کر رہے ہیں۔ ہم اس کا سخت انتقام لیں گے۔“

”کون ظلم کر رہا ہے۔ کس پر ظلم ہو رہا ہے؟“

وزیراعظم نے فکر مندی کے عالم میں تھوڑی دیر بعد دو تیز رفتار سوار حاضر کرنے کا حکم دیا۔ اس نے سواروں کے سامنے سے پہلے پہلے دو مختصر خط لکھے۔ ایک خط شاہ افغانستان زماں شاہ کے نام تھا جس میں اسے ایران کے متوقع حملہ کی اطلاع دے کر اس کے کابل واپس آنے کی درخواست کی گئی تھی۔

دوسرا خط جو شاہ عباس صفوی شاہ ایران کے نام تھا، اس کا متن کچھ اس طرح تھا:

محضور دالاجاہی شاہ عباس صفوی والا قدر حکمران دولت ایران! عاجز و ناہنجرز وزیراعظم افغانستان دالاجاہی کے حضور عرض پرور ہے کہ دشمنوں نے یہ افواہ اڑائی ہے کہ لشکر ایران، افغانستان کی سرحد کی طرف روانہ ہو گا۔

چونکہ شاہ افغانستان زماں شاہ ایک سرحدی ہم کے سلسلے میں کابل سے باہر ہیں اس لیے یہ غلام عزم خواہ ہے کہ ہماری طرف سے معاہدہ امن کی کوئی خلاف ورزی نہیں کی گئی۔ اس لیے افغانستان پر حملے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔

امید ہے کہ دالاجاہی اس سلسلہ میں محبت سے کام لیں گے۔ اگر ملت افغانستان کو یہ بتانے کی زحمت گوارا فرمائیں کہ یہ قہراً خوش بنا

پر کیا گیا ہے کہ ہمارے مابین معاہدے کی ایک شق کے مطابق کہ اگر کسی قسم کی غلط فہمی پیدا ہو جائے تو جنگ سے پہلے اس کے بارے میں دونوں اطراف سے وضاحتیں اور گفت و شنید ضروری ہو گی۔

امید ہے کہ دالاجاہی انتہائی قدم اٹھانے سے پہلے اس کی وجہ اور جوان سے ہیں آگاہ فرمائیں گے!

حقیقہ فیکر ناچیز:

(وزیراعظم)

شاہ ایران کو جب افغانستان کے وزیراعظم کا نہایت دوستانہ اور بہرہ خلوص خط ملا تو اسے جلد بازی میں اٹھائے ہوئے قدم پر قدم سے افسوس ہوا اور اس نے مزید تحقیق کے لیے زیادتی کو طلب کیا:

”زیادتی کاظم بخاری کو فوراً پیش کیا جائے۔“

فریادی نے اپنا تہ پتہ تو کچھ بتایا نہ تھا۔ سوائے اس کے کہ وہ شہر میں اجنبی ہے اور ایک سرکاری مراٹے میں ٹھہرا ہوا ہے۔

چنانچہ کو تو الی شہر کو حکم ہوا کہ شہر کی تمام سرکاری / شاہی مراٹوں میں کاظم بخاری کو تلاش کر کے فوراً دربار میں پیش کیا جائے۔

کاظم بخاری کی تلاش تین روز تک جاری رہی مگر اس نام کا کوئی شخص کسی مراٹے میں بھی گزشتہ ایک سال سے نہ کبھی آیا تھا اور نہ اس نے قیام کیا تھا۔

چنانچہ شاہ عباس صفوی نے اپنے امیروں اور وزیروں سے اس سلسلے میں مشورہ کیا اور وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ کوئی زبردست سازش تھی کہ ایران و افغانستان کو جنگ میں الجھا کر دونوں کی طاقت کو ضعف پہنچایا جائے۔

اُس وقت ایرانی لشکر ہرات پر حملہ کے لیے روانہ ہو چکا تھا۔ شاہ ایران نے لشکر کو فوراً واپس آنے کا حکم دیا۔

انگریزوں کی اس سازش کا حال ایک اور تاریخ میں زیادہ واضح اور ترین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ اس میں نام اور مقامات کا بھی فرق ہے اس لیے اسے بھی تاریخ کی دیکھی اور معطلات کے لیے درج کیا جا رہا ہے تاکہ مآثر کا پورا نقشہ سمجھ میں آ سکے۔

مؤرخ اس طرح رقم طراز ہے:

’ولزی کو جب یہ اطمینان ہو گیا کہ فرانسیسی سلطان کی مدد نہ کر سکیں گے تو وہ اب اس سلطان کے دوسرے اتحادیوں کی طرف متوجہ ہوا۔

اس وقت افغانستان کا شاہ ہندوستان پر حملہ کے لیے پُر تزلزل تھا۔ انگریزوں کو خطرہ تھا کہ اگر شاہ افغانستان دہلی تک پہنچ گیا تو پھر انگریزوں کا ہندوستان میں رہنا مشکل ہو جائے گا۔ پس اس نے سوچا کہ کوئی ایسی ترکیب کی جائے کہ شاہ ہندوستان پر حملہ نہ کر سکے اور خود اپنے ملک کے اندرونی معاملات میں ہی الجھ کر رہ جائے۔

ولزی نے اس سلسلے میں اپنے گورنروں کی کانفرنس منعقد کی اور اس میں یہ طے پایا کہ کوئی ایسا شخص تلاش کیا جائے جو ایران پہنچ کے وہاں شیعہ سنی فساد کی بنیاد رکھے اور شاہ ایران کو افغانستان پر حملہ کرنے پر مجبور کر دے۔

یہ کام مشکل ہی نہیں ناممکن نظر آتا تھا کہ مآثری انگریزوں نے ایسا زبردست منصوبہ بنایا کہ اس نے انگریزوں کی مرضی کے مطابق ایران اور افغانستان کو لٹا دیا۔

اس کانفرنس کے ایک ہفتے کے اندر اندر بمبئی کے گورنر لارڈ ڈکن نے ولزی کے پاس ایک شخص کو اس سفارتی کے ساتھ بھیجا کہ یہ شخص اس (ولزی) کے منصوبہ کی عملی جامہ پہنا سکتا ہے۔

دہ آدی شہر بمبئی تھا ایک شیعہ مہدی علی خاں تھا۔ ولزی نے مہدی سے گفتگو کی اور اسے اپنے مقصد کا پایا تو فوراً اپنا منصوبہ اس کے سامنے رکھ دیا۔

پس مہدی علی خاں (اس کا نام کاظم بخاری بھی لکھا گیا ہے) ایران کے شہر بڑ شہر گیا اور فوراً ایرانی رعایا بن گیا۔

وہاں بیٹھ کے اس نے ایرانی اور افغانی میں اپنا اثر و رسوخ بڑھایا۔ پھر اس نے شیعہ سنی اختلافات کی داستانوں کو نلک مچر لگا کر سنانا شروع کیا۔ اس نے یہاں تک کہا کہ افغانی، ہندوستانی شیعوں پر اس قدر مظالم توڑ رہے ہیں کہ لاہور کے شیعوں نے اپنا گھر بار چھوڑ کر کمپنی کے علاقوں میں پناہ لینا شروع کر دی ہے۔

مہدی علی خاں نے ایرانی دربار کو یقین دلایا کہ اگر شاہ افغان نے اس بار ہندوستان پر حملہ کر دیا تو وہ دہلی تک پہنچ جائے گا اور لاہور سے دہلی تک کے تمام علاقوں کے شیعوں کو اپنا گھر بار چھوڑنا پڑے گا۔ اس لیے شاہ کو ہندوستان پر حملہ سے روکنا صرف شیعوں کو بے گھر ہونے سے بچانا ہو گا بلکہ پوری انسانیت پر احسان ہو گا۔

اس زمانہ میں شاہ کے بھائی محمود شاہ کو بھائی سے بہت سی شکایات تھیں مگر کمزور ہونے کی وجہ سے وہ علی الاعلان شاہ کے خلاف کوئی قدم نہ اٹھا سکتا تھا۔

ادھر مہدی علی خاں نے اپنی چرب زبانی سے ایرانی امیروں کو پوری طرح اپنا ہمنوا بنالیا تھا۔ پس ایرانی امرا اور وزرا نے شاہ ایران عباس شاہ صفوی پر زور ڈالا کہ وہ شاہ کے بھائی محمود شاہ کی فوجی مدد کر کے افغانستان کا تختہ الٹ دے۔ اس طرح اگر افغانستان کا تختہ نہ بھی اٹا گیا تو کم از کم شاہ ہندوستان پر حملہ کرنے سے توباز رہے گا اور لاہور سے دہلی تک کے شیعہ اس کے شر سے محفوظ ہو جائیں گے۔

سنا ہی دربار میں شیعوں پر افغانیوں کے مظالم کا تذکرہ روزی ہوتا تھا اور شاہ صفوی اپنے فرقہ کے لوگوں کی مدد کرتا بھی جانتا تھا۔ اس لیے جب اس کے کان میں محمود شاہ کو فوجی مدد دے کر افغانستان میں شورش پیدا کرنے کی بات ڈالی گئی تو وہ فوراً آمادہ ہو گیا۔



اس طرح شاہ ایران، ہمدی علی خاں کے فریب میں بلا واسطہ آگیا اس نے محمود شاہ کو بلا کے ایک ایرانی لشکر اس کے حوالے کیا اور محمود شاہ نے اس لشکر کے زور پر افغانستان کے سرحدی صوبہ ہرات پر حملہ کر دیا۔

جب ایران و افغانستان میں جنگ چھڑ گئی تو ہمدی علی خاں کا کام ختم ہو گیا۔ کیونکہ ہرات پر حملہ کی خبر پا کر شاہ ہندوستان پر حملہ کرنے کے بجائے کابل واپس چلا گیا تاکہ اپنے ملک کو ایرانیوں کے حملے سے محفوظ کرے۔

شاہ کے کابل آنے پر یہ بات کھلی کہ کسی ہمدی علی خاں نے شاہ ایران کو افغانیوں کے شیعہوں پر غم و غم کی غلط داستانیں سن کر ہرات پر حملہ کا جواز پیدا کیا تھا مگر جب ہمدی علی خاں کہیں دستیاب نہ ہو سکا تو یہ سازش کھل گئی۔ شاہ ایران نے ہرات سے فوجیں واپس بلا لیں اور دونوں ملکوں میں از سر نو ایک صلح نامہ ترتیب پا گیا۔

مگر دہلی اپنے منصوبہ میں پوری طرح کامیاب ہوا۔ شاہ نے ہند پر حملہ ملتوی کر دیا اور انگریزوں کے افغانستان کی طرف سے دھدھنے ختم ہو گئے۔ یہ سب کچھ اس کے ایجنٹ ہمدی علی خاں کا کوششوں کا نتیجہ تھا۔

دہلی نے بجٹی کے گورنر لارڈ ڈکن کو اس منصوبے کی کامیابی کی مبارکباد دی اور اسے حکم دیا کہ ہمدی علی خاں کو اس کی خدمات کے صلہ میں دو لاکھ دس ہزار روپے ادا کیے جائیں۔

پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ فرانسیسی کاجرل (بادشاہ) پولیس براہ رنوتجات حاصل کر رہا تھا۔ انگریزوں کو اس بات کا علم تھا کہ سلطان شیخو نے پولیس کے پاس بھی سفارت بھیجی ہے اور اس کا جواب میں پولیس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ حوثی ملتے ہی اس کی مدد کو ضرور پہنچے گا۔ اسی سلسلہ میں انگریز امیرالبحرین کا وہ خط بڑی اہمیت رکھتا ہے جو اس نے اسکندریہ

دہلی کو نسل کو لکھا تھا۔

نیلسن نے اپنے خط میں ممکنہ خدشات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا تھا:

”انگریز پولیس کا قبضہ اسکندریہ پر ہو گیا تو اس کا اگلا قدم ہندوستان میں ہو گا تاکہ وہ شیخو سلطان کی مدد کر سکے۔ ہو سکتا ہے کہ بحر قزحہ کے راستے ہندوستان کے ساحل مالابار تک فرانسیسی بحری بیڑے کی قطار لگ جائے۔“

چونکہ بات بالکل واضح ہو گئی تھی اس لیے دہلی نے سرنگاپٹم پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ نے فوری طور پر سول اور فوجی حکام کو خطوط اور حکمانے روانہ کیے کہ وہ جنگ کے لیے تیار رہیں۔

نظام دکن کے فوجی تعاون کے لیے دہلی نے کرک پیرٹل کے چھوٹے بھائی کسٹن کرک پیرٹل نظام کے پاس بھیجا اور کولنر کو سندھیا کے پاس پونا روانہ کیا۔ نظام نے تو انگریزوں کا سب سے زیادہ سہم قبول کر لیا تھا البتہ مرٹوں نے یہ نظام قبول کیا مگر یہ وعدہ کیا کہ جنگ کی صورت میں انگریزوں کی فوجی مدد کریں گے۔

سلطان کو مرہاؤں کے رخ سے انگریزوں کے جنگی ارادوں کی تصدیق ہو گئی تھی اس لیے اس نے یوڈیو بک کو پولیس کے پاس خط دے کر روانہ کیا۔ اس فرانسیسی افسر کے ساتھ سلطان نے شیخ الرحیم اور محمد بسم اللہ کو بھی بھیجا تھا۔ سلطان نے پولیس کو لکھا کہ وہ ہندوستان پر حملہ کرے اور مالابار کے ساحل پر اپنی دس سے وہ ہزار فرانسیسی فوج اتار دے۔

اس وفد کو مارشس سے ہو کے پولیس کے پاس پہنچنا تھا مگر تاریخ سے پتہ چلتا ہے کہ یہ وفد بیش تو ضرور پہنچا مگر اس کے بعد اس پر کیا گزری اس کا کچھ پتہ نہیں چلتا۔ یقیناً وہ انگریزوں کی دش کائنکار ہو گیا ہو گا۔ اس سازش کی تصدیق دہلی کے اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو اس نے سلطان کو لکھے گئے اپنے خط میں ظاہر کیا ہے۔ اس نے لکھا:

"یہ تو ناممکن ہے کہ آپ اس بات سے انکسار کریں کہ آپ فرانسسینوں سے جو انگریزوں کے دشمن ہیں، جو خط و کتابت کر رہے ہیں، اس سے ہم بھی واقف ہیں۔۔۔۔۔ ان تمام نتائج کی ذمہ داری آپ پر ہوگی جو آپ کر رہے ہیں۔ کمپنی سے آپ کی دوستی بھی ختم ہو سکتی ہے۔ آپ کے ملک میں انتشار اور بد نظمی بھی پیدا ہو سکتی ہے۔ آپ کے مذہب کو بھی نقصان پہنچ سکتا ہے۔"

آگے چل کے وہ لکھا ہے:

"حالات کی تحقیق کے لیے مجھ کو لندن کو سفر لگانا پڑے گا۔ میں جہاں جا رہا ہوں اور اسے ہدایت کر دی گئی ہے کہ وہ کمپنی کی حفاظت کے لیے سلطان سے جو ملک چاہے، اطلب کرے۔"

دلزی نے سلطان کے جواب کا بھی انتظار نہیں کیا اور فوجوں کو تیاری کا حکم دے دیا۔ اس نے دسمبر ۱۷۹۸ء کو امیر البحر کو مندرجہ ذیل حکمنامہ بھیجا:

"نظام دکن کے ملک میں فرانسیسیوں کی تباہی (نظام دکن نے سبھی ڈیڑی معاہدہ کے تحت فرانسیسیوں کی نہ صرف فوج ملک سے نکال دی تھی بلکہ تمام فرانسیسیوں سے ملک سے نکل جانے کا حکم دے دیا گیا تھا) حاصل کار و مندرجہ بالا بار پر ہماری فوجی نیاریوں میں ہمارا ہمیشہ قدمی اور یورپ اور اس امید (جنوبی افریقہ) سے بڑی فوجی کمک کی توقع وغیرہ ایسی چیزیں ہیں جنہوں نے اس جزیرہ نما (جنوبی ہند) میں ہماری پوزیشن کو بہت مستحکم کر دیا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس موقع سے فائدہ اٹھاؤں اور سلطان کی فوجی طاقت کو کچل کے رکھ دوں۔"

اس کے ساتھ ہی فوجوں کی کان منہ لانے کے لیے دلزی کلکتہ سے مدراس پہنچ گیا۔ سلطان کو دھکی آ میر خط ۱۲ دسمبر ۱۷۹۸ء کو لکھا تھا۔ اس کا جواب سلطان نے ۲۵ دسمبر ۱۷۹۸ء سلطان کے جواب کے ہر لفظ سے اس کی بے بسی ٹپکتی ہے۔ ملک فروش اور ایمان فروشوں نے اس شیرازہ کو حالات کے شگن میں اس طرح جاکڑ دیا تھا کہ وہ بالکل بے اختیار ہو کر

سلطان نے دلزی کو لکھا:

"لارڈ دلزی اس بات سے انکسار کریں کہ سلطنت خدا دین ایک ایسی قوم بھی بستی ہے جو بحری تجارت کرتی ہے۔ اسی سلسلہ میں ایک جہاز چالو کر مارشس گیا تھا۔ واپسی پر وہاں چالیس بیروزگار تلاش معاش میں یہاں آئے تھے۔ ان میں سے دس کو سرکاری ملازم رکھ لیا گیا اور باقی جو بے ہنر تھے انہیں واپس بھیج دیا گیا۔"

میرادل مقصد یہ ہے کہ میں نے جو معاہدہ کیا ہے اس پر قائم رہوں اور اسے مستحکم کروں میں اس وقت محل میں تنہائی کی زندگی بسر کرتا ہوں۔ سوائے اس کے کہ کبھی کبھار لشکار کو لکھنا ہوں۔ اس پر آپ کا یہ لکھنا کہ اتحادیوں کو خوفناکی ضرورت ہے، انتہائی حیرت کی بات ہے۔ امید ہے کہ آپ دل میں کوئی ایسی ویسی بات نہ آنے دیں گے جس سے دلوں میں میل پیدا ہو۔

دہلی اہل فرانس کا معاملہ تو وہ لوگ مجھ میں شیطان ہیں۔ انہوں نے وقت سے فائدہ اٹھا کر زیر بحث اعلان شائع کر دیا تاکہ ہمارے اور آپ کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو جائیں۔

سلطان نامہ کی انجام آدھی کے وقت یہ فیصلہ ہوا تھا کہ چاروں فریق اس کے پابند رہیں گے اور اس معاہدہ میں کوئی رد و بدل نہ ہوگا۔ سلطان نے آخر میں لکھا اور پتہ نہیں کتنی مجبور یوں اور دباؤ کے تحت لکھا کہ:

"آپ بڑے سردار ہیں۔ پیکے دست ہیں۔ آپ میں قوت فیصلہ بہت عمدہ ہے۔ مجھے امید ہے کہ دانا اور فرزانه اصحاب کے دل شکوک اور بدگمانیوں سے آلودہ نہ ہوں گے۔"

میرے متعلق یہی خیال رکھیے کہ میں دل سے اتحاد اور دوستی کا خواہاں ہوں۔ آپ کے خطوط آنے سے مجھے دلی مسرت ہوتی ہے۔ اپنی خیریت سے شادمان کیجیے۔ اور کیا لکھوں۔"

اس کے جواب میں دلزی نے ایک اور پُر ضرب خط سلطان کو لکھا جس میں تحریر تھا کہ وہ انگریزوں کو اپنے دربار میں رکھے اور اس کے مشورے سے اتحادیوں سے شرائط صلح طے کرانے۔

اس کے فوراً بعد ولزی نے سلطان ترکی خلیفہ سلیم ثالث کا ایک خط جو انگریز سفیر سپنسر کے ذریعہ خلیفہ سے حاصل کیا گیا تھا، سلطان کو بھیجا۔ اس میں سلطان ترکی کی طرف سے سلطان ٹیپو کو لکھا گیا تھا کہ:

”فرانسیسی غدار اور بے ایمان ہیں۔ انگریز ہمارے دوست ہیں۔ فرانسیسی مسلمانوں کے مقامات مقدسہ کو برباد کرنا چاہتے ہیں۔ تم (سلطان ٹیپو) فرانسیسیوں سے قطع تعلقی کر کے انگریزوں سے صلح کر لو۔“

خلیفہ ترکی کا یہ خط جیسے سپنسر ہی نے تیار کر لیا تھا، اس کے ساتھ ولزی نے اپنا نوٹ بھی لکھا تھا کہ:

”آپ کے لیے بت رہے کہ تمام مذاہب کے دشمن اور خلیفہ اسلام پر حملہ کرنے والے فرانسیسیوں سے ہر قسم کے تعلقات منقطع کر لیں۔ خلیفہ کے خط سے آپ کو معلوم ہو گیا ہو گا کہ فرانسیسیوں نے خلیفہ کی توہین کی ہے اور بلاوجہ شام و مصر پر حملہ کیا ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جن کا احترام ہر مسلمان کرتا ہے اور ہاں مذاہب اسلام کے خزانے ہیں۔“

سلطان انگریزوں کے دلی مقاصد سے واقف ہو چکا تھا اور جانتا تھا کہ ولزی کی یہ خط و کتابت محض اس کے جھلاوے کے لیے ہے۔ پھر بھی وہ ولزی کے ہر خط کا باقاعدہ جواب دے رہا تھا۔ پہلے اس نے خلیفہ ترکی کے خط کا جواب بھیجا۔ پھر ولزی کو جواب دیا۔

اسی مہینہ نپولین نے سلطان کے نام ایک خط قاہرہ سے لکھا مگر یہ خط سلطان تک نہ پہنچ سکا اور ضمیر فرعونوں نے بیچ ہی میں اسے اچکایا۔ نپولین کے تاریخی خط کا مضمون یہ تھا:

”عظیم ترین سلطان اور ہمارے بہترین دوست ٹیپو صاحب!

جیسا کہ آپ کو علم ہے کہ میں بحیرہ احمر تک کثیر فوج کے ہمراہ اس دلی خواہش کے ساتھ پہنچ چکا ہوں کہ آپ کو انگریزوں کے پیچھے سے نجات دلانی چاہئے۔

میرا خیال ہے مسقط کے راستے آپ تک پہنچوں مگر اس سے قبل آپ کے ملکی حالات کا جائزہ لینا ضروری ہے اس لیے آپ اپنے ایک بااعتماد

اور بھرپور دہانے آدمی کو سوڈن یا قاہرہ کے راستے میرے پاس بھیجیں تاکہ میں اس کے ساتھ گفتگو کر سکوں۔  
خدا آپ کی قوت میں اضافہ کرے اور آپ کے دشمنوں کو غارت کرے۔“

نپولین نے اپنا یہ خط کسی فرانسیسی قاصد کے ہاتھ نہیں بھیجا کیونکہ اس بات کا امکان تھا کہ چونکہ انگریزوں نے سلطان کے گرد وطن فروشوں اور غداروں کا جال بچھا رکھا ہے اور اگر کسی فرانسیسی قاصد نے سلطان سے ملنے کی کوشش کی تو یقیناً ممکن تھا کہ وہ گرفتار ہو کر قتل کر دیا جائے۔ اس خیال کے تحت نپولین نے یہ خط شریف مکہ جو سلطان کا ہمدرد اور دینی بھائی سمجھا جاتا تھا، کی طرف سلطان کو روانہ کیا۔

سلطان کے اس خط کے ساتھ ہی نپولین نے شریف مکہ کو اس خط کی اہمیت کا احساس دلانے کے لیے الگ ایک خط لکھا، جس میں تحریر تھا:

”میں اپنی فوج طرموج کے ساتھ یہاں پہنچ گیا ہوں۔ میرا ارادہ ہے کہ میں اسلامی ممالک کو انگریزوں کے ہاتھ سے بنات دلاؤں اور خاص کر آپ کے دینی بھائی سلطان ٹیپو کی مدد کو پہنچوں۔ اعلیٰ میری درخواست ہے کہ آپ وہ خط جو سلطان کے نام ہے، کسی معتبر آدمی کے ذریعے اُن تک پہنچا دیتے۔“

مگر وہ ہاشمی زادہ اور دینی بھائی جس کے نام میں تو شریف ”شامل تھا“ دراصل ذات شریف تھا۔ اس نے اپنے نام کا بھی لحاظ نہ کیا اور یہ دونوں خطوط جلد میں مقیم انگریز سیاسی نمائندے سے دس کے والے کر دیے۔

یہ حال تھا اس شریف مکہ کا جو خود کو مسلمانوں کا سب سے بڑا ایڈر کہلاتا تھا۔

چنانچہ۔۔۔ یہ خط سلطان تک کبھی نہ پہنچ سکا۔ یاں یہ بات میں ملحوظ خاطر رہے کہ اگر یہ خط سلطان کے پاس پہنچ بھی جاتا تو بھی نپولین اتنے مختصر عرصہ میں ہندوستان اور خصوصاً جنوبی ہند پہنچ ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ ولزی نے اس خط کے لکھ جانے سے پہلے ہی اپنی فوجیں سلطنت خدا داد کی حدود میں داخل کر دی تھیں۔

شریف مکہ کی اس ردِ حرکت سے یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ اس زمانہ میں ترکی خلیفہ اور

لکھ کے حکمرانوں پر انگریزوں کا اتنا گہرا اثر تھا کہ وہ بھی مسلمانوں کو تباہ کرنے میں دشمنوں کی مدد کرنے میں کوئی عار نہ محسوس کرتے تھے۔

سلطان نے کسی موقع پر کہا تھا:

”پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم مجھ جیسے انسان ہیں۔ آپ کو فضیلت محض اس لیے حاصل ہے کہ آپ خدا کے رسول بھی ہیں۔“

اس زمانہ میں عرب اور ترکی میں دہائی تحریک زوروں پر تھی اور خلیفہ ترکی اور شریف مکہ اس تحریک کو پھیلنے کی کوشش میں لگے ہوئے تھے۔ چنانچہ انگریزوں نے سلطان کے درج بالا جھوٹے خوب فائدہ اٹھایا۔

انہوں نے خود اپنے طور پر خلیفہ ترکی اور شریف مکہ کی طرف سے اعلان شائع کر کے تمام اسلامی ممالک میں تقسیم کر دیا۔  
اعلان یہ تھا:

”جنوبی ہند کی ریاست مرگناٹم کا سلطان پیوڈا بی ہے اس لیے ہر مسلمان کا اس سے لڑنا جائز ہے۔“

سلطان اگرچہ بظاہر ان حالات سے لاپرواہ معلوم ہوتا تھا مگر ایسا نہیں تھا۔ چونکہ انتظام حکومت کا بیمہ کے سپرد تھا اور کاہینہ سلطان کو اندرونی یا بیرونی کسی خبر کی بھی ہوا نہ لگنے دیتی تھی۔ تمام اختیارات وزیراعظم میرصادق کے ہاتھ میں تھے۔ اس کے زمرہ خاص میں ہندو اور مسلمان دونوں قسم کے خدات شامل تھے جن میں پورنیا، تمل راؤ، میر غلام علی خاں لنگڑا، میر معین الدین، میر قمر الدین، میر قاسم اور بدر الزماں ناٹھ پیش پیش تھے۔

ان میں سے بعض تو ذاتی اعتراض کی بنا پر سلطان کے خلاف تھے اور بعض خاص کر میر صاحبان سلطان کی مذہبی اصلاحات کی وجہ سے برگشتہ خاطر تھے۔

انگریزوں نے ان کی مخالفت سے فائدہ اٹھایا اور کھلی رشوت اور بعض کو مستقبل کے وعدے کر کے اپنے ساتھ ملا لیا۔

ولزلی نے جنوری ۱۸۹۹ء میں اپنے ایک خط میں جنرل ہارس کو صاف الفاظ میں لکھا تھا کہ،

”مجھے یہ بات اچھی طرح معلوم ہے کہ امرا، وزراء، باجگزار اور رعایا

سلطان کے خلاف ہے اور ہمارے سایہ میں آنے کو تیار ہے۔ اب جبکہ

ہیں سلطان کی سختی اور بدعہدی (پتہ نہیں وہ مکار کس سختی اور بدعہدی کی طرف اشارہ کر رہا ہے) کی وجہ سے جنگ کرنا پڑ رہی ہے تو عین انصاف ہے کہ ہم رعایا کی پریشان حالی، بے اطمینانی اور ناراضگی سے فائدہ اٹھائیں۔ اس کام کے لیے کرنل کلوز، کرنل آر تھوولزی، بیفینٹ کرنل آر گینو، کیپٹن نکم اور کیپٹن میرکالے کے نام تجویز کرتا ہوں۔“

کرنل آر تھوولزی جو ولزلی کا بھائی تھا، اس کے ذمے یہ کام لگایا گیا کہ وہ ان باجگزار ریاستوں سے خط و کتابت کرے جو انگریزوں سے مل جانا چاہتی ہیں۔ دوسرا کام یہ کرے کہ ریاست کے معزول راجہ کے خاندان کے ہوا فرد موجود ہیں ان سے گفتگو کر کے انہیں ریاست کی ان کو واپسی کا یقین دلایا جائے۔

ولزلی نے سلطان کو جو شرائط لکھی تھیں ان میں کنارا اور منگلور کو کپڑے کے حوالے کر دینے کی بھی شرط رکھی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سبھی دیاری سسٹم کو قبول کرنے پر زور دیا گیا تھا لیکن سلطان کو ان شرائط پر گفتگو کا موقع نہیں دیا گیا بلکہ جب ولزلی، لکھتہ سے مدراس پہنچا تو اس نے ان شرائط میں ایک کثیر رقم بطور تادان جنگ ادا کرنے کی شرط بھی شامل کر دی۔ سلطان کو بات چیت کا قطعی موقع نہ دیا گیا اور ۱۳ فروری ۱۸۹۹ء کو انگریز فوج کو کاروائی کا حکم دے دیا گیا۔

سلطان انگریزوں کی ان حرکتوں کو بغور اور بڑی تشویش سے دیکھ رہا تھا مگر جب اس نے انگریزی حدود میں رد و بدل کے سلسلے میں اپنی تشویش سے اپنے امرا کو آگاہ کیا تو وزیراعظم غدار میرصادق نے اسے سنہی بن اڑا دیا۔ وہ بولا:

”اللہ پاک کی قسم حضور والا۔ یہ فرنگی کئی ہزار میل کا سفر کر کے ہندوستان پہنچے ہیں۔ ان کی فوج باری فوج حضور کی تازہ دم اور بہادر فوج سے کس طرح مقابلہ کر سکتی ہے۔ آپ کے غلام انہیں ایسا مزہ چکھائیں گے کہ یہ بھاگ کے اپنے ملک ہی میں جا کر دم لیں گے۔“

سلطان نے قدر سے ناگواری سے فرمایا:

”اگر انگریز ہمارے قوم ہوتی تو ہم نکر مند نہ ہوتے مگر یہ قوم مکار ہے جو میدان جنگ کے بجائے سازش کے قلعہ میں بیٹھ کر عیاری اور غداری کے ہتھیاروں سے لڑتی ہے۔“

ایمان فروش میر صادق نے فوراً جواب دیا:

”یہ تو اور بھی اچھلے حضور والا۔ قسم ہے کلام پاک کی رکھ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھتی۔ ان کی سازش اور مکاری بار بار تو کامیاب ہونے سے رہی۔“

جب ان کا یہ داؤد ہمارے بچے کو معلوم ہے تو ان کا یہ حربہ بیکار ہو جائے گا۔ سو وقت یہ کیا کریں گے؟“

سلطان نے بچے دل سے میر غلام علی سے پوچھا:

”کیوں میر صاحب۔ تمہارا کیا خیال ہے۔ کیا ہم انگریزوں کو ان کے ناپاک ارادوں میں ناکام بنادیں گے؟“

مکار اور عیار میر لنگڑے نے جواب دیا:

”حضور والا۔ یہ ایک ایسا سوال ہے کہ اگر اس کا جواب اثبات میں دیا جائے تو اسے خوشامد یا چا پلوسی پر محمول کیا جائے گا اور اگر نفی میں جواب ہو تو وہ دروغ گوئی ہو گا۔ اس لیے میں یہ مناسب سمجھتا ہوں کہ جو کچھ میر صادق نے فرمایا ہے اس کی تائید کر دوں۔“

اب سلطان نے اپنے وزیر مالیت پورنیا کی طرف دیکھا۔ پورنیا اپنا جواب پہلے ہی تیار کر چکا تھا۔

اس نے پرسکون لہجے میں کہا:

”حضور والا۔ مجھنا چیز کے خیال میں خداوند، انگریزوں سے خواہ مخواہ خوفزدہ ہو رہے ہیں یہ جو نظام دکن، مرہٹوں اور نواب ارکاٹ سے انگریزوں کے گھٹ جوڑی خبریں اڑاتی جا رہی ہیں یہ بالکل بے بنیاد اور سراسر غلط ہیں۔ بیتہ نہیں ایسی افواہیں کون پھیلاتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ افواہ خود انگریزوں نے ہی پھیلائی ہو تاکہ حضور ان سے خوفزدہ ہوں اور اپنے دوستوں سے دشمنی مول لے لیں۔“

سلطان سب کچھ دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ پورنیا کی بات پر کیا کہتا۔ اس نے بس روایتی سا جواب دیتے ہوئے کہا:

”خدا کرے ہی ٹھیک ہو جو تم کہہ رہے ہو مگر ہمیں ان کی طرف سے غافل نہ ہونا چاہیے۔“

پھر سلطان نے قرال الدین کی طرف دیکھ کر حکم دیا:

”فوجوں کو ہر وقت تیار رکھو۔ کیا معلوم کس وقت طیل جنگ بج جائے۔“

بجوبہ کار گمر مکار قرال الدین نے جواب دیا:

”حضور والا۔ بالکل نکرندہ فرمائیں۔ اب جو جنگ ہوگی وہ ہماری آخری جنگ ہوگی۔“

لیکن —

طیل جنگ بجنے کی نوبت ہی نہ آئی۔

جول ہارس نے ۲۲۔ فروری ۱۷۹۹ء کو سلطنت خداداد کی سرحدوں پر حملہ کر دیا۔ ولزلی نے اسے

اختیار دیا تھا کہ دوران جنگ اگر سلطان صبح کی بات کرے تو حالات کے مطابق شرائط طے کی جائیں۔ اگر

بھلائی فوج نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کر لی ہو یا قلعہ پر گولہ باری ہو رہی ہو اور سلطان کی طرف سے صلح کی کوئی

درخواست آئے تو سلطان سے اس کی سلطنت دینے کے ساتھ ساتھ دو کروڑ کے تادان کا بھی مطالبہ کیا جائے

اور شرائط کے پورا ہونے تک سلطان کے چار بیٹوں کو بطور ضمانت تمہاری تحویل میں دیا جائے۔

جول ہارس کی کمان میں اکیس ہزار فوج تھی۔ وہ اپنی فوج کے ساتھ ۳۔ مارچ ۱۷۹۹ء کو سلطنت

خداداد کی سرحد میں داخل ہوا۔

حیدر آباد نے اپنی ۱۸۔ ہزار سپاہ، میر عالم کی سپہ سالاری میں بھیجی جو جول ہارس سے کرنل گل

کے قریب آئے۔

بھٹی سے جنرل اسٹوارٹ چھ ہزار فوج کے ساتھ آگیا تھا۔ اس پورے لشکر کا سپہ سالار اعلیٰ

ولزلی کا بھائی کرنل آر تھرو ولزلی تھا۔

مرہٹوں کا پیشوا باجی راؤ، پیسورام بھاؤ اور اس کے بیٹے آپا صاحب کے ساتھ حسب وعدہ

انگریزوں کا مدد کر آگیا تھا۔ سدھیا اس دم کے خلاف تھا اس نے نانا فرنویس کو بھی اس سے باز رکھنے

کا گوشش کی۔

مرہٹے دربار میں سلطان کے دو کلیل (سفیر) احمد خاں اور غزال الدین موجود تھے۔ انگریز ان دونوں

کو پرنسے نکلوانے کی کوشش میں تھے اور مرہٹوں کو بھی سب سی ڈیاری سسٹم قبول کرانے کی

تدبیروں میں تھے۔

میسور کے راستے جول ہارس کا لشکر تین دن سفر کر کے کرگ کی سرحد پر پہنچا اور اس نے مددگار

کے راستے کے قریب پڑاؤ ڈالا۔

سلطان کو جیسے ہی اس لشکر کی خبر ملی وہ فوراً فوج لے کر سویسرہ کی طرف چل پڑا۔  
جنرل ہارس نے سلطان کے آنے کی خبر پا کر جنرل اسٹوارٹ کو دہل چھوڑا اور خود مرزا کا پٹم کے  
راستے پہنچا دیا۔

سلطان چنیا پٹن کے میدان میں پہنچ کے ٹھہر گیا۔ اسے بتایا گیا تھا کہ انگریز فوج اسی  
راستے سے گزرے گی مگر جنرل ہارس نے سلطان کی آمد کی خبر پا کر اپنا راستہ کاٹا اور خانخانان کی طرف  
چلا گیا۔

سلطان کو علم ہوا تو وہ بھی یلغار کرتا ہوا خانخانان کی طرف چلا اور گلشن آباد (لاہور) پہنچ  
کے انگریزوں کا راستہ روک دیا۔

سلطان کی فوج جس قدر بادرہ تھی اس کے سردار اسی قدر ملک فروش اور نیکو حرام تھے۔ اس  
وقت بھی پورنیا، میر معین الدین اور میر قمر الدین سلطان کے ساتھ تھے اور سلطان کے لشکر کو نقصان  
پہنچانے کی فکر میں تھے۔

جنرل ہارس کو اس میدان میں سلطان کا مقابلہ کرنا پڑا۔ بڑی خوریز جنگ ہوئی۔ انگریزوں کا  
بہت نقصان ہوا اور قریب تھا کہ جنرل ہارس کی فوج میدان چھوڑ جائے کہ غدار پورنیا اور میر معین نے  
سلطانی فوج کو انگریزی قوت خانہ کی زد پر لگا دیا۔ اس طرح دشمن کی گولہ باری نے سلطانی لشکر کو  
شدید نقصان پہنچایا۔

سلطان کو ایمان فروشوں کی غداری کی تو خبر نہ ہو سکی مگر اس نے فوراً مہینہ لایا اور حکمت علی  
تبدیل کرتے ہوئے باقی تمام لشکر کو یکجا کیا اور باقاعدہ جنگ لاکھم دیا۔

اس وقت بنکی نواب محمد رضا خاں، سید غفار اور حسین علی خاں کو اپنے ہمہ رکھانے کا موقع  
ملا اور انہوں نے اپنے اپنے دستوں کے ساتھ جنرل ہارس کے لشکر پر شدید حملے شروع کر دیے۔ اس  
وجہ سے انگریز فوج شدید دباؤ میں آ گئی۔

اس وقت قمر الدین نے پھر غداری کا مظاہرہ کیا اور سوار رسالوں کو اس طرح دوڑایا کہ ان کے  
گھوڑے آپس میں ٹکرائے اور خود ہی اپنی فوج کا نقصان کرنے لگے۔

اس بد نظمی اور بے ترتیبی کی وجہ سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور سلطانی لشکر کے بہت سے سپاہی  
دشمن کی بھینٹ چرٹھ گئے۔

سلطان نے اسی محکمہ میں میر قمر الدین کو جنرل اسٹوارٹ کے مقابلہ پر کورگ کی طرف روانہ کیا

اور اس کو حکم دیا کہ وہ جنرل اسٹوارٹ کا راستہ روکے مگر وہ نیک حرام انگریز فوج کے پاس پہنچ کر  
اس طرح خیمہ زن ہو گیا جیسے وہ ان کا محافظ ہو۔

ادھر سلطان کو اطلاع ملی یا خبر دی گئی کہ جنرل اسٹوارٹ اپنی فوج کے ساتھ مرزا کا پٹم کے قریب  
پہنچ گیا ہے۔

اس اطلاع پر سلطان نے میاں کے محاذ پر کچھ فوج چھوڑی اور خود بھی بڑی تیزی سے کورگ  
روانہ ہوا۔ تیسرے دن وہ انگریز فوج کے مقابلے پر پہنچ گیا۔

سلطان کے ساتھ نواب بنکی محمد رضا خاں اور سید غفار بھی تھے۔ ان دونوں سرداروں نے دواطراف  
سے انگریز فوج پر زبردست حملہ کیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دشمنوں کے

پشتے لگ گئے اور دشمن  
گھبرا کر جنگل میں گھس گیا۔

نواب بنکی اپنے دستوں کے ساتھ ان کے تعاقب میں جنگل میں داخل ہو گیا اور وہاں انگریزوں  
پر حملے کرنے لگا۔ قریب تھا کہ دشمن کی فوج منتشر ہو کر بھاگ نکلے کہ ناگہاں ایک گولی پیام اجل بن کے  
نواب بنکی محمد رضا خاں کے سر میں لگی اور اس جو افرارے نے جا شہادت نوش کیا۔

نواب بنکی کا شہید ہوا کہ جیسے سلطان کا ایک بازو کٹ گیا۔ سلطان بڑا متعجب مزاج اور بڑے  
دل گردے کا مالک تھا مگر جب نواب بنکی محمد رضا خاں کی لاش اس کے سامنے لائی گئی تو اس کی آنکھیں اٹکنا  
ہو گئیں۔ سلطان نے نواب بنکی کی لاش مرزا کا پٹم بھجوا دی اور خود دار السلطنت چلا گیا۔

سلطان کس قدر دلبرداشتہ تھا اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ وہ انگریزوں کے  
مقابلے کے لیے مرزا کا پٹم سے نکلا تھا اور اب خود ادھر ہی واپس جا رہا تھا۔

شاید سلطان کا تیرا اقبال غروب ہو رہا تھا!

کیا دار السلطنت اور کیا میدان جنگ، غداران وطن ہر جگہ اپنا کام دکھا رہے تھے۔ پورنیا  
اور میر صادق جیسے نیک حرام سلطان کو نقصان پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتے تھے۔ میر  
قمر الدین ایک اچھا بھلا اور تجربہ کار سردار تھا جس نے ماضی میں اپنا بے شش بادری کے جوہر دکھائے  
تھے مگر اس کے سر پر سلطان کا دایا ہنسنے کا محوت سوار ہو گیا تھا اور وہ اس ذریعے سے سلطان کی جگہ میسرور  
کے تحت دناج کا وارث بننا چاہتا تھا۔

چنانچہ اس نیک حرام کو جب سلطان نے جنرل اسٹوارٹ کو روکنے کے لیے کورگ بھیجا تو یہی  
پہنچ کے انگریزوں سے جنگ کرنے کے بجائے ان کا محافظ بن گیا اور یہ فرض اس وقت تک ادا کرتا رہا

جب تک سلطان مرزا کا پٹم واپس نہیں چلا گیا۔

سلطان کی مرزا کا پٹم واپسی پر یہ ملک فردش جوں اسٹوارٹ کے پیچھے پیچھے اس طرح آیا جیسے اسے انگریز فوج کی باربرداری کی خدمت پر مامور کیا گیا ہو۔

اسی طرح ایک اور غدار میر قاسم نے جزل ہارس کی رہنمائی کی اور اس کی فوج کو محفوظ راستوں سے لے جا کر مرزا کا پٹم کے مجبور مغربی حصہ میں گھسرایا۔

مرزا کا پٹم کا یہ حصہ قلعہ کا کمزور ترین حصہ تھا!



انگریزوں کو سلطان کے خلاف ایک جو کامیابیاں ہوئی تھیں ان کے متعلق یہ سوچنا کہ ان کے پاس اسلحہ کی افراط تھی یا ان کی فوج زیادہ بہادر تھی، قطعی غلط ہے۔ اُس دور کی لکھی ہوئی تاریخیں اور انگریزوں کے وہ خطوط جو انہوں نے ایک دوسرے کو لکھے اور جو تاریخ کا اب ایک حصہ بن چکے ہیں وہ اس بات کا واضح ثبوت ہیں کہ جنگ میں انگریزوں کی کامیابی جتھاروں اور فوجوں کی رہنمائی نہ تھی بلکہ سلطان کے امرا اور دزرا کی غداری تھی اور اس کے ساتھ ساتھ سلطان کے خلاف انگریزوں کا وہ زبردست پراپیگنڈہ تھا اور وہ سازشیں تھیں جن کے لیے میسور کی سابقہ رانیاں اور ریاست کے ہندو سربراہ دار اور مذہبی پیشوا داسے، درے، سنے، مذدگار بنے تھے۔

مورخ باسو اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"گزشتہ جنگ دیمسور کی تیسری لڑائی میں کارنوالس کی کامیابی بھی اسی سازش اور غداری کی رہنمائی تھی اور اس جنگ دیمسور کی چونہ لڑائی میں بھی یہی کچھ ہو رہا تھا۔ اس کا کھلا ہوا ثبوت اُس خط سے ملتا ہے جو گورنر مدراس نے لارڈ ولزلی کو لکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

"میں آپ کی ترجمہ کے لیے ایک تحریر روانہ کر رہا ہوں جس کی صداقت پر مجھے کامل اعتماد ہے۔ یہ تحریر اس شخص کی ہے جو سابق ریاست میسور

کر سی لیکن خاص اپنی حفاظت اور سلامتی کے لیے فرانس والوں کے اس ملک میں پہنچنے سے پیشتر ضروری ہے کہ سلطان سے بھگت لیا جائے۔  
اس خط کے ساتھ رانی نے اس معاہدہ کی نقل روانہ کی تھی جو سلطان اور فرانس والوں کے درمیان تھا۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ رانی کو اس معاہدہ کی نقل کہاں سے اور کس کے ذریعے ملی؟  
ہرے کہ رانی کے محل میں سوائے پورنیل کے اور کوئی شخص نہیں جاسکتا تھا!  
کتاب "ماڈرن میسور" کا مصنف اپنی کتاب میں ایک خط کا حوالہ اور دیتا ہے جو رانی کی طرف دلزنی کو بھیجا گیا تھا:

"ابھی حال میں معلوم ہوا کہ خدا نے آپ کو اعلیٰ مرتبہ بخش کے اس ملک میں بھیجا ہے۔ یہ بھی سننا ہے کہ آپ ارادوں کے نیک اور ہمدرد ہیں۔  
اس لیے ہم آپ کی حفاظت میں آنا چاہتے ہیں۔ اگلے عہد ناموں کے مطابق ہم کو ہمارا ملک لے کر دے دیجیے۔"

اس کا جواب دلزنی کے سیکرٹری جوشیوب نے اس طرح دیا تھا:  
"آپ کا پردہ خان ایک عرصہ سے ہیں آپ کے متعلق اطلاعات پہنچنا رہا ہے۔ لارڈ صاحب صدق دل سے وعدہ کرتے ہیں کہ آپ کی تائید کرتے ہوئے آپ کی ریاست آپ کو واپس کر دی جائے گی۔"

بہر طور انگریز فوجیں دو ماہ پیشتر سے سرحد پر موجود تھیں۔ وہ بڑی تیزی سے سلطنت خداداد لطف بڑھیں۔ ان کے ساتھ میر عالم کی سرکردگی میں حیدر آباد کی فوجیں بھی تھیں۔  
یہ فوجیں خفیہ طور پر آگے بڑھ کر سلطان کی حدود کے اندر رانی کو ڈپر قافلہ ہو گئیں۔ انگریزوں نے جاسوس اور سپاہی مختلف مقامات پر بھیج دیے ان ننداروں کے مکانوں میں جو اس سازش میں ریک تھے، مقیم ہو گئے اور یہ تمام قریب قریب مسلمان ہی تھے۔

یہ تو ابھی تک زبان زد خط و عاک ہے کہ شرچاپور وغیرہ میں بہت سے ایسے مسلمان تھے جو اپنے انوں میں انگریزوں کو چھپائے ہوئے رکھتے تھے۔

انگریزی فوج خفیہ طور پر آگے بڑھ رہی تھی مگر پورنیا اور میر صادق وغیرہ سلطان کو مسلسل دھوکہ دے رہے تھے کہ کیا حال ہے کہ انگریز ملک کے اندر قدم رکھ سکیں۔ جبکہ ایک طرف سے مدراس کی جانب

کے حکمران خاندان کا نہایت گمراہ دوست تھا اور جس کی اطلاعات گزشتہ جنگ میں نہایت اہم اور صحیح تھیں۔

تریل راؤ کے تعلقات میسور کی عمر رسیدہ رانی (جو بیٹو سلطان کی حرا میں ہے) سے نہایت دوستانہ ہیں اور جس کی تمام امیدیں اس جنگ سے وابستہ ہیں۔ اس بد قسمت عورت کے ارادوں اور خیالات سے میں آپ کو عنقریب مطلع کر دوں گا اور وہ تحریک کے غور و فکر کے قابل ہوگی۔  
تریل راؤ کے تعلقات ان لوگوں سے بھی ہیں جو سلطان کے مقرب بارگاہ ہیں (یعنی ملک اور اہل نروٹ)۔

مدراس کے گورنر نے میسور کی رانی کے جس خط کا حوالہ مندرجہ بالا تحریر میں دیا ہے، شاید یہ دہی خط ہے جو رانی نے تریل راؤ کو لکھا تھا۔ اس کا اقتباس کتاب "پردہ خان آف میسور" کے صفحات سے درج ذیل کیا جا رہا ہے رانی لکھتی ہے:

"ہم نے اپنی کھوٹی ہوئی حکومت کو حاصل کرنے کے لیے سب سے پہلے ۱۷۹۰ء میں نواب والا جاہ محمد علی کے توسط سے ایک ایچی بھیجا تھا۔ اس کے بعد بھی خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔

۱۷۸۶ء میں لارڈ میکارتھی (گورنر مدراس) نے ہیں یقین دلایا تھا کہ ہماری ریاست، ہمیں بحال کر دی جائے گی۔ اس کے لیے یہاں سازش کی گئی لیکن عین وقت پر اس کا علم ہو گیا اور ہم ناکام رہے۔

یہ تو آپ کو معلوم ہے کہ لارڈ کارنوالس کے زمانہ میں کیا گزری؟ اب سننا ہے کہ آپ اس ارادہ سے یہاں آئے ہیں کہ ہماری حکومت ہم کو دلا دی جائے۔ اس کے لیے اگر آپ کو شمشک کریں تو ایک کرڈ پکوڈ سے ایک پکوڈ برابر ۳۲ روپے) آپ کی نذر کیے جائیں۔ تریل راؤ سے آپ کو تفصیلات معلوم ہوں گی۔"

اس خط میں رانی نے تریل راؤ کو لکھا تھا:  
"گورنر اور انگریزوں سے کہو اگر وہ ہماری بہدہ نہ کرتے ہوں تو نہ



ملے آیا تھا۔

اس وقت سلطان کی فوج منتشر حالت میں تھی۔ کچھ فوج شمالی علاقہ میں اور کچھ جنوبی علاقہ میں تھی۔ یہ فوج کے اس معرکہ کا کمانڈر ولزی کا بھائی آر تھو ولزی تھا۔ اس نے آتے ہی قلعہ کی جنوبی جانب اس سے حملہ کر دیا مگر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ چنانچہ دوسرے دن ولزی نے اپنے بھائی سے کمانڈر برڈ کے ہاتھ میں دیدی۔

جنرل ہارس کی فوجوں کے سامنے نہ صرف ایک دیوار تھی بلکہ دریائے کاویری کی ایک شاخ بھی جو ایک چھوٹا سا ناپو بنا رہی تھی اس لیے مزید پندرہ دن تک یعنی ۲۰۔ اپریل تک انگریزوں حملے اور گولہ باری قلعہ کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔

دوسری طرف یعنی قلعہ کے انتہائی مغرب میں دریا کا پاٹ بہت کم تھا اور یہاں سے آسانی دریا بھاگ سکتا تھا اس لیے جنرل ہارس نے آخری حملہ کے لیے اس مقام کو پسند کیا۔ جنرل فلائڈ دو ہفتہ پہلے ہی جنرل اسٹوارٹ کی طرف روانہ ہو چکا تھا تاکہ اسے ساتھ لے کر آئے اور بلاپٹم پر شمال مغرب سے حملہ آور ہو۔

عداری کی انتہائی تھی کہ میر قزالدین ان دونوں کے پیچھے اپنی بغیر حملہ کیے چلا آیا۔ یہاں تک کہ یہ وہاں اپریل کے دوسرے ہفتہ میں سرنگا پٹم پہنچ گئیں اور انہوں نے عید گاہ کے قریب اپنے بوجھے آکر بیٹھے۔

سلطان کے پاس کل ۳۶ ہزار فوج تھی جس میں سے چودہ ہزار قلعہ میں تھے۔ آٹھ ہزار مختلف محاذوں اور باقی چودہ ہزار جس میں زیادہ سوار تھے، میر قزالدین، پورنیا اور فتح حیدر کی کمان میں تھی۔ چودہ ہزار میں سے صرف وہ فوج جو فتح حیدر کے ساتھ تھی، وفادار تھی۔ باقی فوج جو پورنیا اور قزالدین کی زیر کمان تھی سلطان کو فائدہ کے بجائے نقصان پہنچا رہی تھی۔

سلطان نے ۹۔ اپریل ۱۷۹۹ء کو جنرل ہارس کو ایک خط لکھا جس میں اس نے حملے کا سبب دریافت کرنے ہوئے لکھا تھا:

”گورنر جنرل لارڈ مارلٹن ہمارے نیچے ایک خط بھیجا تھا جس کی نقل منوں ہے۔ آپ اس سے سمجھ جائیں گے کہ میں اپنے وعدوں پر پوری طرح قائم ہوں۔ پھر انگریزوں کی اس چڑھائی کا کیا مطلب اور اس دہشت کا کیا سبب ہے؟ مطلع کریں۔ اور کیا لکھوں!“

سے جنرل ہارس کے ماتحت انگریزی فوج بڑھ رہی تھی تو دوسری سمت مالابار اور کورگ کے راستے ایک اور انگریزی فوج جنرل اسٹوارٹ کے ماتحت سرنگا پٹم کی طرف آ رہی تھی۔

سلطان کو جب اس کی خبر ہوئی تو بڑی حیرت ہوئی۔ اس کے خط کا جواب دینے کے بجائے اس فوج کشی کی گئی۔ اس نے ہمت نہیں ہاری اور وہ انگریزی فوج کے مقابلہ کے لیے نکلا۔

اب ہم پھر اس جگہ سے جنگ کے حالات شروع کرتے ہیں جہاں تک انگریزی فوجیں پہنچی تھیں۔ جنرل اسٹوارٹ کی فوجوں نے ان مورچوں پر قبضہ کر لیا جو سلطان نے قلعہ کے سامنے تھا۔ میں قیصر کیسے تھے۔ یہاں بھی سازش کی وجہ سے مدافعت بالکل نہ ہوئی۔

انگریزی فوج کا وہ حصہ جو جنرل ہارس کے ماتحت تھا، ہوسہلی کے پاس دریا پار کر کے دریا کے عین مقابل جنوب مغرب میں ایک گنجان باغ کے اندر جو فصیل قلعہ اور دریا سے بالکل نزدیک تھا مورچہ لگا کر بیٹھ گیا۔

وہ باغات اب بھی اسی طرح گنجان ہیں۔ یہاں چھپی ہوئی فوج فصیل سے نظر نہیں آتی۔ اس باغ سے فصیل قلعہ تک درمیان میں صرف دریائے کاویری اور خندق ہے۔

دریا کی چوڑائی اس جگہ بہت کم نہ گئی ہے۔ درمیان میں مختلف مقامات پر ایسی پتھریلی زمین ہے جو بالکل خشک رہتی ہے اس لیے محض اس موسم کے جب دریا میں طغیانی آتی ہے، اس مقام کو آسانی سے عبور کیا جاسکتا ہے اور فصیل قلعہ بھی یہاں زیادہ اونچی نہیں ہے۔

جنرل میڈوز اپنی کتاب ”پٹو سلطان“ میں لکھتا ہے:

”انگریزی فوجوں کو ہوسہلی کے محفوظ راستے سے قلعہ کے جنوب مغرب گوشہ کے عین مقابل ٹھراتے ہوئے قلعہ کے اس سب سے کمزور پسلو کو بتلانے والا میر قاسم علی بن پیل سید قزالدین تھا۔“

۵۔ اپریل کو جنرل ہارس نے دریائے کاویری کو جنوب مغرب سمت سے پار کیا اور ”سلطان پٹو“ کے قریب آکر چھپے لگائے۔

یہ مقام قلعہ سرنگا پٹم سے صرف تین چار میل کے فاصلہ پر ہے۔ بد قسمتی سے سلطان اس گوشہ کا محقول انتظام نہ کر سکا تھا۔ میر قاسم قلعہ کے اس کمزور پسلو سے واقف تھا اس لیے وہ جنرل ہارس کو ادھر

دوسری طرف میر صادق، پورینا اور میر قمر الدین جیسے نمک حرام تھے جو اپنے کھانے کی کھالی ہی میں  
بھید کر رہے تھے۔

موسیو کے جواب میں سلطان نے دریافت فرمایا:

”پھر سرنگا پیٹم کس پر پھوڑ جاؤں؟“

موسیو سپیو نے سینہ تان کر جواب دیا:

”حضور والا۔ سرنگا پیٹم کو فدوی اور فدوی کے ہم وطن سپہ سالار موسیو لالی کے سپرد کر جائیے۔

ہم وعدہ کرتے ہیں کہ جب نمک ہم میں سے ایک فرد بھی زندہ ہے حضور کے ادا کیے جی نمک میں  
کو تباہی نہیں کرے گا۔“

کس قدر عقل رائے جی موسیو سپیو کی۔

اگر سلطان قلعہ سے نکل جاتا تو ظاہر ہے کہ انگریزوں کو قلعہ کے سامنے سلطان کی نگر پڑ  
جاتی اور وہ خاموش اٹھا کر سلطان کے پیچھے روانہ ہو جاتے۔ اُدھر سلطان مرایا چینیل درگ پہنچ کر  
بہت محفوظ رہ جاتا اور ادھر فرانسیسی ایک ایک مذاکرہ کو چن چن کر ختم کر دیتے۔

جہاں تک موسیو سپیو کے مشورہ پر عمل کرنے سے ایک بہتری کی صورت ضرور نظر آتی تھی  
لیکن سلطان کو تو اسان کردوسوں نے گھیر رکھا تھا۔

موسیو سپیو کے جواب سے سلطان بے حد متاثر ہوا اس نے سپیو کو بڑے پیار سے دیکھا۔  
اسے محسوس ہوا کہ موسیو شاید کچھ اور بھی کہنا چاہتا ہے۔

چنانچہ سلطان نے فرمایا:

”موسیو سپیو۔ ہمارے خیال میں ابھی تمہاری بات ختم نہیں ہوئی۔ تم کچھ اور بھی کہنا  
چاہتے ہو؟“

”جی ہاں سلطان عزتم۔“

موسیو سپیو نے اب سے عرض کیا:

”میری ایک اور رائے بھی ہے۔“

”کوہ کو۔“

”میری رائے ہے کہ اگر حضور والا کو فدوی کی اس تجویز سے اختلاف ہو تو انگریزوں کو  
دوست بنانے کی ایک تجویز اور بھی میرے ذہن میں ہے۔“

۱۰۔ اپریل کو جنرل ہارس نے اس مکتوب کا جواب ان الفاظ سے دیا:

”آپ کا خط معہ گورنر جنرل کے خط کے موصول ہوا۔ انگریزی فوج کی

چڑھائی اور اس دشمنی کے سلسلے میں آپ وہ خطوط ملاحظہ کریں جو گورنر

جنرل نے آپ کو لکھے ہیں۔ ان میں اس کی تشریح موجود ہے۔

اور کیا لکھوں؟“

سلطان نے انگریزوں کے جواب اور اپنے سپہ داروں کی طرف سے گولہ باری کی خبر موثر انداز  
پر حیران ہو کر اپنے فرانسیسی افسروں کو طلب کیا اور ان سے شہرہ چاہا۔

سلطان نے فرانسیسیوں کے موسیو سپیو کو مخاطب کیا:

”میرے غیر ملکی دوستو۔ تم دیکھ رہے ہو کہ اس وقت ہم جن حالات سے دوچار ہیں، اُن پر

اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔ ہم اب تک جنہیں اپنا اعتماد و وفادار سمجھتے رہے ان کی دغا بازی اور مکاری

جنہیں انہوں سے دیکھ رہے ہیں۔ غنیم کا زور ہر لمحہ بڑھتا جا رہا ہے۔ ان حالات میں میں کیا کرنا چاہیے

سلطان کے ان چار جگہوں کے ہر نقطہ سے اس کے دل کا کرب ٹپکتا محسوس ہوتا ہے۔ ایک طرف

مکاری دشمن جو بہادری کے بجائے مکاری کے ہتھیاروں سے لڑ رہا تھا۔ خیرہ تو تھا ہی دشمن، اس کا شکوہ

عجب ہے کیونکہ یہ اپنیوں کا رویہ، روش اور ذلیل حرکتیں۔ سلطان کس قدر بے بس اور مجبور ہو گیا تھا

اسے اپنیوں سے ناامید ہو کر غیروں سے دکھ سکھ کرنا پڑ رہا تھا۔

فرانسیسی افسران سلطان کے ان جگہوں سے بے انتہا متاثر ہوئے اور ان کی آنکھیں اشک

ہو گئیں۔ آخر موسیو سپیو نے جواب دیا:

”حضور والا۔ ہم نے آپ کا نمک کھایا ہے اور آپ نے ہم پر ہمیشہ ہمدردی کی ہے۔ ہم ہر وقت

خون بہانے کو تیار ہیں۔“

ان نازک حالات میں ہم بھی رائے دے سکتے ہیں کہ حضور والا شاہی خزانہ، قیمتی سامان اور بیگار

کو ساتھ لے کر نصف شب کے بعد شہر کی صوبہ مرآ یا چینیل درگ چلے جائیں اور اپنے ساتھ دس ہزار

اور پانچ ہزار باقاعدہ سوار بھی لے جائیں۔“

فرانسیسیوں کو سلطان کے نمک کا اس قدر پاس تھا کہ وہ اس پر اپنی جانیں نثار کرنے کو تیار

تھیں تو یوں میں بارود کے بجائے مٹی اور سن بھرا جاتا تھا۔

سلطان نے فوراً کہا:  
"بیان کرو سپیو"

موسیو سپیو نے دلیرانہ عرض کیا:

"حضور والا۔ انگریزوں کو ہم فرانسیسیوں سے خاص پرغاش ہے۔ آپ ہم سب فرانسیسیوں کو اُن کے حوالے کر دیجئے۔ ہمیں یقین ہے کہ ہماری گرفتاری کے بعد انگریز آپ سے مصالحت پر آمادہ ہو جائیں گے۔"

سلطان نے پہلے تو موسیو سپیو کو حیران نظروں سے دیکھا پھر بڑے دکھ سے کہا:

"دوستو! تم غریب الوطن ہماری طلبی پر یہاں آئے ہو۔ تم ہمیشہ ہمارے وفادار اور رفیق رہے ہو پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ تم جیسے شریف بہادر اور وفادار دوستوں کو ہم دشمن کے حوالے کر دیں۔ اگر ہماری پوری سلطنت بھی تاراج ہو جائے تو ہمیں افسوس نہ ہو گا مگر یہ ناگہن ہے کہ ہم تمہیں انگریزوں کے حوالے کر دیں۔"

اللہ اللہ۔ ایک طرف میرصادق، پورنیا، میر قاسم، بدرالزمان، نائٹ اور میر قمر الدین، جو خود کو وفادار کہتے تھے اور ان کا شمار خاص اپنوں میں ہوتا تھا، ان کی غداریاں اور دوسری طرف وہ غیر لوگ یعنی فرانسیسی جو سات سمندر پار سے سلطان کے بلاوے پر اس کی ملازمت میں آئے تھے اُن کی وفاداریاں کہ اپنی جانبیں قربان کرنے پر آمادہ۔

سلطان کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا کرے اور کیا نہ کرے!

فرانسیسیوں سے ملاقات کے بعد سلطان نے ان تک حراموں کو طلب کیا جو سلطان کے سینے پر اپنا خون بہانے کے دعویدار تھے۔

میرصادق، پورنیا اور بدرالزمان نائٹ آئے اور سلطان کے سامنے سر جھکا کر کھڑے ہو گئے۔ سلطان کچھ بر خاموش کھڑا دیکھتا رہا اور سوچتا رہا۔ پھر اس نے ان غداروں کو مخاطب کیا:  
"لطفاً کا جو حال تھے وہ تمہارے سامنے ہے۔ ہم جن حالات سے دوچار ہیں ان پر اطمینان نہیں کیا جاسکتا۔"

ہم نے اپنے وفادار فرانسیسی سرداروں کو بلا کر ان سے مشورہ کیا ہے۔ ان کی رائے ہمک

صاف رائے کو ہمارا دل بھی تسلیم کرتا ہے کہ ہم خزانہ سے جواہرات کی پیٹیاں اور توشک خانے کا قیمتی سامان لے کر خواتین کو سرا کے ساتھ موبہ سرا یا جینٹل درگ منتقل ہو جائیں اور قلعہ فرانسیسیوں کی حفاظت میں چھوڑ جائیں۔ تمہاری کیا رائے ہے؟

جہاں تک یہاں کی جنگ کا مسئلہ ہے تو اسے تو ہم ہار ہی چکے ہیں۔ باہر جا کر ہم پھر سے مقابلہ کی کوشش کر سکتے ہیں۔"

سلطان کی زبانی یہ بات سن کر غداروں کی امیدوں پر پانی پھر گیا۔ وہ تو اپنے خیال میں شیر کو جال میں پھنسا چکے تھے جبکہ وہ اب جال کو توڑ جانا چاہتا تھا۔

دعویٰ تک خاموش رہے اور ایک دوسرے کو کنکھیلوں سے دیکھتے رہے۔ پھر غدار وزیراعظم میرصادق نے نہایت انکسار سے عرض کیا:

"حضور والا۔ آپ اپنے ارادوں کے مالک ہیں جو چاہے سو کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ ہم سے رائے طلب کرتے ہیں تو میں یہ کہوں گا کہ ہم تک خوار جب تک زندہ ہیں آپ کے سینے پر خون بہا دیں گے۔ مگر آپ کا قلعہ چھوڑنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔"

اب پورنیا نے اپنی غدار کی کوان الفاظ میں چھپانے کی کوشش کی:  
"جہاں پناہ فرانسیسی قوم نے کس کے ساتھ دفائی ہے جو آپ کے ساتھ کرے گی۔ فرانسیسی اور انگریز دونوں قومیں اندر سے ایک ہیں۔"

ایک سگ زر تو دوسرا اور شغال

(ایک دولت کا کتا تو دوسرا گیدڑ کا بھائی)

آپ جیسے ہی قلعہ فرانسیسیوں کے حوالے کریں گے یہ اُسے انگریزوں کے حوالے کر دیں گے۔

"پھر تم لوگ انگریزوں سے صلح کی گفت گو کرنا۔ آخر سلطان نے فیصلہ کیا۔"

پورنیا نے فوراً کہا:

"عالی جاہ۔ یہ آسان اور ممکن ہے۔"

ایک تاریخی حوالہ کے مطابق سلطان نے ۲۰۔ اپریل ۱۷۹۹ء کو اپنے دکن کے اٹھ انگریزوں کو مندرجہ ذیل پیغام بھیجا۔

”لارڈ مارنگٹن نے خط میں لکھا ہے کہ معاملہ کی صفائی کے لیے ایک شخص کو مقرر کیا جائے گا جس کے اختیارات آپ کو ہوں گے تاکہ معاہدہ عمل میں لایا جاسکے۔“

آپ دونوں سرکاروں کے بھی خواہ میں آپ کی خوشی کس بات میں ہے مطلع کیجیے تاکہ معاہدہ کی گفت و شنید کی جاسکے۔“

اس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ لارڈ ولزلی نے جرنل مارس کو صلح کے اعتبارات کے ساتھ چارٹرٹن بھی تحریر کر دی تھیں۔ چنانچہ جرنل مارس نے سلطان کو جو جوابی پیغام بھجوا دیا اس میں مجوزہ شرطوں میں اپنی طرف سے بھی کچھ اضافہ کر دیا۔ دراصل جرنل مارس جنگ بند کرنا نہیں چاہتا تھا۔

سلطان کو جو شرائط بھی لکھیں وہ مندرجہ ذیل تھیں:

- ۱۔ سلطان اپنی نصف سلطنت کمپنی کے حوالے کر دے۔
- ۲۔ فرانسیزیوں کو چھٹی دے کہ انگریزوں کو ملازم رکھے۔
- ۳۔ دو کروڑ کا تادان جنگ ادا کرے جس میں سے ایک کروڑ جو بیس گھنٹوں میں انگریزی فوج میں پہنچ جانا چاہیے۔

باقی ایک کروڑ کے لیے سلطان کو اپنے چار لاکھ (۱۶) سلطان بادشاہ

۲۔ فتح حیدر ۳۔ معین الدین ۴۔ عبدالحق) انگریزوں کی تحویل میں دینا ہوں گے۔

جرنل مارس نے اپنی طرف سے جو شرطیں شامل کی تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ شہزادوں کے ساتھ چار وکیل:

۱۔ میر قمر الدین

۲۔ میر صادق

۳۔ پورنیا

۴۔ سید غفار

بھی انگریزوں کے حوالے کیے جائیں۔

ان میں سوائے سید غفار کے باقی تینوں انگریزوں کے ایجنٹ تھے۔ سید غفار اس وقت سلطان کا سب سے زیادہ مضبوط اور وفادار سپہ سالار تھا۔ چنانچہ انگریز اسے سلطان سے الگ کرنا چاہتے تھے

لہذا باقی تینوں کو بطور وکیل وہ اس لیے طلب کر رہے تھے کہ انہیں شبہ تھا کہیں سلطان ان تینوں کو قتل نہ کر دے۔

جرنل مارس کو شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ بدرازمان نائٹھ بھی ان تینوں ہی جیسا غدار اور نہک حرام مرد اور تھا ورنہ اسے بھی مزدور طلب کر لیتے۔

سلطان کو یہ شرائط قبول کرنے کے لیے مرن ۲۴ گھنٹے کا وقفہ دیا گیا تھا۔ بھلا اس کی حیثیت، شرافت اور عزت نفس ان شرائط کو کیسے قبول کر سکتی تھی۔

پچھلی مرتبہ انگریزوں کی تحویل میں اس کے دو بیٹے ایک طویل عرصہ تک رہے تھے اور اب وہ اس کے چار بیٹوں کو بطور برغال طلب کر رہے تھے۔

سلطان کی شفقت پداری اور محنت یہ کیسے گوارا کر سکتی تھی کہ وہ ایک وقت چار بیٹوں کو خود سے جدا کر کے ظالم انگریزوں کے حوالے کر دے جن کے ساتھ وہ جو چاہے سلوک کر سکتے تھے۔

ان چوبیس گھنٹوں کے دوران انگریزوں کی طرف سے قلعہ پر مسلسل گولہ باری ہوتی رہی اور اس کے جواب میں قلعہ کی طرف سے انگریزوں پر ہو گئے پھینکے جا رہے تھے ان میں مٹی اور سن بھی ہوتی تھی اور اس بات کا ثبوت بھی موجود تھا۔

آخر سلطان نے وہی فیصلہ کیا جو ایک غیرت مند اور جوانمرد سپاہی کو کرنا چاہیے تھا۔ اس نے فیصلہ کیا کہ وہ میدان جنگ میں ایک سپاہی کی طرح لڑتا ہوا مارا جائے گا بجائے اس کے کہ وہ خود کو کافروں کے رحم و کرم پر بھروسہ کر دے۔

اب جنگ کے سوا کوئی اور چارہ نہ رہا تھا۔ سلطان نے چاہا کہ وہ سرگاکپٹم سے نکل کے کسی اور جگہ چلا جائے اور وہاں سے جنگ جاری رکھے۔

اس نے حکم دیا:

”جواہرات، توشک خانہ اور مستورات کو چیتل درگ روانہ کر دیا جائے۔“

غلام نے حکم کی تعمیل کی اور تمام مال و متاع ہاتھیوں، اونٹوں اور بیلیوں اور پاکبازوں پر لدوا دیا۔

جب روانگی کی تمام تیاریاں مکمل ہو گئیں تو سلطان نے اس کی مجلس مشاورت طلب کی۔

جب تمام امرا جن میں تقریباً سب کے سب ایسا فردوش اور غدارانہ نام و دلت تھے، جمع ہو گئے تو سلطان نے کہا:

”ہمارے فرانسیزی دوستوں کی رائے درست تھی۔ ہم مرابا چیتل درگ روانہ ہو رہے ہیں۔“

سرنگا پٹم کی جنگ میں اب کچھ نہیں رہا۔

امرانے یہ سمجھ لیا کہ اگر سلطان قلعہ سے باہر نکل گیا تو ان کی سازش کامیاب نہیں ہوگی اور تمام کیے دھوے پر پانی پھر جائے گا۔

اس وقت غدار وطن بدر الزماں آگے آیا اور اس وطن فروش اور کینہ پرور نے دست بستہ عرض کیا:

”قبلہ عالم۔ آپ کیا غضب فرما رہے ہیں اگر حضور نے یہ اقدام کیا اور جان نثاروں کو یہ معلوم ہوا کہ حضرت والا اپنے حرم اور تمام خزانے کے ساتھ سرنگا پٹم سے باہر جا رہے ہیں تو ان کی ہمت میں ٹوٹ جائیں گی اور مارا شیرازہ بکھر کر رہ جائے گا۔

ایسے حالات میں یہ نمک خوار اور دغا دار ملک و ملت حضور والا کے اس فیصلے پر شامہ اور غیر شریفانہ اقدام، جو آپ کے شایان شان نہیں ہے، کی تائید اور حمایت نہیں کر سکتا۔

سلطان نے بدر الزماں کے اس پرفرب جواب پر اپنے سامنے کھڑے تمام امر کی طرف دیکھا۔ ان کے سر جھکے ہوئے تھے اور کسی میں سلطان سے آنکھ ملانے کی ہمت نہ تھی۔

سلطان نے ایک پشمرہ، افسرہ اور حسرت بھری نظر، جس میں امر کی غداری، مکاری اور ایمان فروشی کے لیے ایک کسک تھی، امر پر ڈالی۔ پھر ایک سرد آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھا اور کہا:

”رخصائے مولا بر اولیٰ“

(اللہ کی مرضی سب سے اول و افضل)

اور — سلطان نے مارا بندھا ہوا سامان تو شک خانہ میں واپس بھیج دیا۔

اس طرح سلطان نے انگریزوں سے خوف کھا کر نہیں بلکہ اپنے امرا جن کی امارت، حکومت، برتری کے لیے وہ اب تک لڑتا چلا آ رہا تھا، ان کی نمک حرامی، ایمان فروشی اور ملک و ملت سے غداری کے سلسلے خود اپنی موت کے محضر پر دستخط کر دیے۔

امرانے سلطان کو مجبور کر دیا کہ وہ سرنگا پٹم میں آخری وقت تک قیام کرے۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ سلطان نے یہ فیصلہ کن جذبات کے تحت کیا۔ بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے یہ فیصلہ، اپنے امرا، مجدد اصل غدار تھے، کے کہنے پر کیا تھا لیکن اس فیصلہ کی طرف ہی وجہ نہ تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سلطان کو آخری وقت تک یہ امید تھی کہ اس کے امرا راہِ راست پر آجائیں گے اور وہ سرنگا پٹم کو انگریزوں کے ہاتھوں سے بچانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

یہ بات صحیح بھی تھی۔

اگر غدار اپنی غداریوں سے باز آ جاتے اور مزید کوئی حرکت نہ کرتے تو اس وقت بھی سلطان اور اس کے لشکر میں اتنی طاقت ہوتی کہ وہ دشمنوں کی متحدہ قوت کو بارہ بارہ کر دیتے مگر ایمان فروشوں کے دل سیاہ ہو چکے تھے اور بہر صورت سلطنتِ خداداد اور سلطان کا خاتمہ دیکھنا چاہتے تھے۔

سلطان کے اس فیصلہ سے نمک حرام بہت خوش ہوئے۔ اس خوشی میں اہل فرائض پیش پیش تھے کیونکہ غداری، ایمان فروشی اور انگریزوں سے دوستی میں دہی سب سے آگے تھے۔ بیسویں تیسری جنگ کی سازش میں بھی انہوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا مگر وہ سازش ناکام ہو گئی تھی۔ اس دفعہ ان کی سازش پہلے سے زیادہ منظم تھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ اس معاہدہ کے دوران اہل فرائض کے گھروں میں سے انگریزوں کو مٹھائی اور پلاؤ تحفہ کے طور پر روزانہ بھیجا جاتا تھا۔

سلطان نے جنگ کا فیصلہ کیا تھا اس لیے اس نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ تمام اہم مقامات پر فوج متعین ہونے کے باوجود انگریزوں کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں۔

اس سے سلطان نے اندازہ لگا لیا کہ اس کے امرا اسے تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس لیے اس نے حکم دیا کہ علمبرائے گرد خندق کھود کر اس میں بارود بھر دیا جائے تاکہ اگر انگریز اندر آجائیں تو حفاظت ناموں کے لیے بارود میں آگ لگا کر علمبر کو اڑا دیا جائے۔

اس کام سے فارغ ہونے کے بعد سلطان نے سرداروں کو مختلف مقامات پر متعین کیا اور ایک دستہ فوج کو انگریزوں کی رسد رکھنے کے لیے روانہ کیا مگر — دہاں تو آدے سے کا آدہ ہی بگڑا ہوا تھا۔ نیچے سے اور پربک کے تمام امرا ایمان بیچ چکے تھے اس لیے سلطان کے کسی حکم کی تعمیل ہی نہ کی جاتی تھی۔ غداروں کی جرات کی انتہا یہ ہو چکی تھی کہ یہ لوگ لیفٹیننٹ ہل اور لارنس کو خندق پار کر کے قلعہ میں لے آئے تھے اور یہ دونوں انگریز قلعہ کے تمام انتظامات اپنی آنکھوں سے دیکھ گئے تھے۔

پھر اس غداری نے وہ وقت بھی دکھایا کہ انگریزوں کی شدید گولہ باری سے قلعہ کی ایک دیوار منہدم ہو گئی اور انگریزوں نے قلعہ میں داخل ہونے کے لیے پیش قدمی شروع کر دی۔ انہیں روکنے والا

کوئی نہ تھا۔ روکنے والوں نے تو خود ان کی رہبری کے فرائض ادا کیے تھے۔

قلعہ سے جوابی گولہ باری ہو رہی تھی لیکن توپوں میں گولے نہ تھے بلکہ سن اور مٹی بھری جاتی تھی۔ غداروں کا یہ عالم تھا کہ سلطان کو نہ قلعہ کی دیوار منہدم ہونے کی اطلاع دی گئی اور نہ انگریزوں کے داخلہ کی خبر اس کے کانوں تک پہنچنے دی گئی۔

آخر ۷۔ مئی ۱۸۹۹ء کو سلطان پر ایمان فروشوں اور غداروں کا حال پوری طرح کھل گیا اور سب کے چہرے بے نقاب ہو گئے۔

سلطان نے ایک پرچہ پر غداروں کے نام لکھ کر میر معین الدین کے حوالے کیا۔ اس پر درج تھا کہ ان غداروں کو آج رات قتل کر دیا جائے۔

سلطان نے اگرچہ غداروں کے چہرے دیکھ لیے تھے مگر انہوں نے کہ وہ اب تک اس بات سے بے خبر تھا کہ میر معین الدین خود بھی ان غداروں میں شامل ہے جس کے نام سلطان نے پرچہ پر لکھ کر اس کے حوالے کیے تھے۔

میر معین الدین نے سر در بادی پرچہ کھول کر پڑھنا شروع کر دیا۔ یہ حرکت اس نے جان بوجھ کر کی تھی تاکہ ایک طرف تو غداروں کو سلطان کے حکم کی اطلاع ہو جائے دوسرے یہ کہ سلطان پر یہ بات عیاں ہو جائے کہ اب وہ ان غداروں کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

تاریخی ایک روایت کے مطابق غداروں کی اس فہرست میں میر صادق کا نام سرفہرست تھا۔ میر معین الدین کے قریب کھڑے ہوئے کسی شخص نے میر صادق کا نام پڑھ لیا اور اسے سلطان کے حکم کی خبر کر دی۔

اس تاریخی حوالہ میں کچھ زیادہ وزن نہیں ہے اس لیے کہ جس نے میر صادق کا نام پڑھا تھا اس نے دوسروں کے نام بھی ضرور پڑھے ہوں گے اور ان سب غداران ملک و ملت کو بھی اس کی اطلاع ہو گئی ہوگی۔

مگر

حقیقت سے قریب ترین بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ میر معین الدین، جو خود بھی ان غداروں کا ایک ساتھی تھا، خود ہی سب ایمان فروشوں کو سلطان کے حکم کی اطلاع دے دی ہوگی کہ سلطان نے ان کے قتل کا حکم صادر کر دیا ہے۔ میر معین الدین اور یہ سب دوسرے غدار، ایک ہی قصبہ کی

چٹے بنے تھے۔

میر معین الدین کی غداروں نے کام دکھایا اور سب غداروں اور ایمان فروشوں کو صاف بچا لے گئی۔ اگر وہ ایسا نہ کرتا اور سلطان کے حکم کی تعمیل ہو جاتی تو سرنگا پٹم کی اس آخری جنگ کے نتائج اور ثمرات کچھ اور ہوتے!



مدتے میں دیا۔  
اس کے علاوہ خٹاجوں اور غریبوں میں نقد رقم اور کپڑا تقسیم کر آیا۔ پھر قلعہ کی دیوار میں شنگاف کے بالکل قریب اپنا خیمہ لگوا لیا۔

انگریزی فوج غداروں کی مدد سے پچھلی رات کو نصیب کے عین نیچے پہنچ چکی تھی اور وہ اس وقت دیوار کے شنگاف کے بالکل قریب موجود تھی۔

نصیب کے باہر جو خندق تھی اس میں صرف گھٹنوں تک پانی تھا۔ اس جگہ سلطان نے میر معین الدین کو تعینات کیا تھا اور اس ایمان فردوش نے خندق کو پانی سے خالی کر رکھا تھا۔ تاکہ انگریزوں کو خندق پار کرنے میں دقت نہ ہو۔

میر معین الدین کے ماتحت سپہ دار سید غفار تھا جو بڑی مستندی سے شنگاف کے سامنے کھڑا اپنے فرائض ادا کر رہا تھا۔

غور طلب بات یہ ہے کہ ان سب باتوں کے باوجود انگریز قلعہ میں داخل ہونے کی ہمت نہ کر رہے تھے اور نہ معین الدین انہیں اندر داخل ہونے کا اشارہ دے رہا تھا۔

اس کی وجہ سید غفار کی وہ ہمداری اور سلطان سے وفاداری تھی جو وہ اب تک مختلف محاذوں پر دکھانا چلا آ رہا تھا۔

میر معین الدین دانت پس پس کے سید غفار کو دیکھ رہا تھا اور اس کا بس نہ چل رہا تھا کہ وہ اسے اس کی جگہ سے کس طرح ہٹائے کیونکہ اس کی موجودگی میں انگریز فوج کا شنگاف کے ذریعے قلعہ میں داخلہ ممکن نظر نہ آ رہا تھا۔

آخر کار میر معین الدین نے ایک شاطرانہ چال چلی۔ وہ بڑھکے سید غفار کے پاس پہنچا اور اس سے مرگوشی میں کہا:

”سلطان معظم کو جا کے ہوشیار کر دو کہ آج انگریزی فوج کے حملہ کا پورا امکان ہے اس لیے وہ اپنے دستوں کے ساتھ مستعد رہیں۔“

سید غفار ایک خالص وفادار سپاہی تھا۔ وہ میر معین الدین کی اس مکاری کو نہ سمجھ سکا اور اپنے افسر کے حکم کی بجا آوری میں اپنی جگہ چھوڑ کے سلطان کو اطلاع دینے چلا گیا۔

سید غفار کے بٹتے ہی انگریز فوج کو نینا رہنے کا اشارہ دے دیا گیا اور سید غفار کی نشانددی اس طرح کی گئی کہ جو نئی سید غفار سلطان کو اطلاع دینے کے بعد اپنی جگہ واپس آ کر کھڑا ہوا، اس پر

۴۔ مئی ۱۷۹۹ء کا دن طلوع ہوا۔  
صبح کا دھند لکا بہت ادا اس تھا۔ قلعہ سرنگاٹم سما ہوا نظر آ رہا تھا اور ہر طرف بایوسی چھائی ہوئی محسوس ہوتی تھی۔

سلطان نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد قلعہ کی شکستہ دیوار دیکھنے کے لیے گیا۔  
اس جگہ یہ نکتہ ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ یہ دیوار ایک دن پہلے شکستہ ہو کر گر چکی تھی۔ انگریز اندر داخل ہونے کی کوشش میں تھے۔ غداروں نے انہیں اطمینان دلادیا تھا کہ خطر سے کسی کوئی بات نہیں وہ قلعہ میں بے دھڑک داخل ہو جائیں۔

مگر۔۔۔ انگریز لشکر اب بھی سلطان کے رعب سے لرزہ بر اندام تھا کیونکہ اسے بتایا گیا تھا کہ اس شکستہ دیوار کے قریب سلطان خود خیمہ نصب کیے موجود ہے۔

سلطان نے اپنا خیمہ جوڑی گوشے میں لگوا لیا تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے ملازمت کا ارادہ کر لیا اور دیوار کے شنگاف کو بھرنے کا حکم دیا۔

دن کے دس بجے تھے کہ غومیوں کی ایک جماعت نے حاضری دی اور سلطان کو آگاہ کیا:

”اُن دانا۔ آج کا دن آپ کے لیے مخموس ہے۔“

پس سلطان نے مدد کا سامان تیار کرنے کا حکم دیا اور خود حمام میں چلا گیا غسل سے فارغ ہو کر سلطان باہر آیا اور اس نے ایک برہمن کو کستی میرومیوں میں پروٹی ہوئی ایک بھار کے ساتھ ایک ہاتھی

ایک سبز رنگ کی چھتری تان دی گئی تاکہ اسے آسانی سے نشانہ بنایا جاسکے۔  
چنانچہ سید غفار کے یہ پوچھنے سے قبل ہی کہ اس کے لیے یہ چھتری کا اہتمام کیوں کیا گیا ہے اس پر دشمن نے گولیوں کی اس قدر بارش کی کہ اس نے وہیں جان، جان، آغزوں کے سپرد کر دی۔  
سید غفار کے شہید ہونے ہی اس کے دستوں کو جو شنگاف کی حفاظت پر مامور تھے ادا کر کے ہٹایا گیا۔

پھر اسی وقت وزیراعظم بلجور میر صادق نے حکم بھیجا کہ فوج آ کر اپنی تختواہ لے جائے۔  
مارچ بتاتی ہے کہ یہ میر صادق اور میر معین الدین نے مل کر منصوبہ بنایا تھا کہ عین موقع پر فوج کو تختواہ کے ہانے دہاں سے ہٹا لیا جائے گا۔  
ایک دوسری روایت یہ ہے کہ فوج کو تختواہ دھول کرنے کا حکم وزیر مایات پورینا کی طرف سے دیا گیا تھا کیونکہ وہ وزیر خزانہ تھا۔

بہر حال۔ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میر صادق ہو یا پورینا۔ دونوں کا مقصد ایک ہی تھا کہ کسی طرح فوج کو شنگاف کے پاس سے ہٹا لیا جائے تاکہ انگریزی فوج کو قلعہ میں داخل ہونے میں کوئی دقت پیش نہ آئے۔

پس دشمنوں کا منصوبہ کامیاب ہوا اور انگریزی فوج کو جھنڈیوں کے ذریعے اطلاع دی گئی کہ میدان بالکل خالی ہے اس لیے وہ غداروں کے ہاتھوں سے بنے ہوئے راستے سے بے دھڑک قلعہ میں داخل ہو سکتی ہے۔

درجے سے کچھ پہلے انگریزی فوج نے قلعہ پر حملہ کیا۔ اس حملہ آور فوج کی کان بیرڈ کے ہاتھ میں تھی۔

بیرڈ تین سال تک سلطان کی قید میں رہ چکا تھا اور جوش انتقام سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے خندق کے اوپر آ کر آواز دی:

"کیا تم سب تیار ہو؟"

اسے جواب ملا:

"ہاں۔"

اس پر جہز بیرڈ نے بلند آواز میں کہا:

"تو پھر اسے بہادر۔ میرے ساتھ آؤ اور آج انگریز سپاہیوں کی لاج رکھ لو۔"

جہز بیرڈ کی کان میں ۴۲،۶۹ سپاہی تھے۔ ان میں ۲۴۹۴ یورپین تھے۔ اس نے فوج کو دو حصوں میں تقسیم کیا۔ ایک حصہ کی کان جہز بیرڈ کے اور دوسرے حصہ کی کان جہز بیرڈ کے سپرد کر دی۔

منصوبہ یہ تھا کہ آگے پیچھے فضا میں پر پڑھنے کے بعد ایک حصہ جنوبی دیوار پر قابض ہونے کے بعد بنگلوری دروازے پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے اور دوسرا حصہ شمالی فضا میں قبضہ کرتے ہوئے فوج سے آئے۔

جہز بیرڈ کی فوج کو فضا میں پر پڑھنے میں صرف چھ منٹ لگے کیونکہ اس کی رہنمائی میر قاسم کر رہا تھا جو اس سے پہلے ہی انگریز فوج کو بغیر کسی مزاحمت کے فضا میں پہنچا چکا تھا۔

سب سے پہلے میر قاسم فضا میں پر پڑھا۔ پھر تھوڑی دیر میں ساری فوج فضا میں پہنچ گئی اور دو حصوں میں تقسیم ہو کر شمال اور جنوب کو چل پڑی۔

انگریزوں نے فضا میں پر پڑھتے ہی اپنا جھنڈا اُٹھ کر دیا۔ سرنگا پٹم کی فضاؤں نے اس سے پہلے اپنے قلعہ پر کسی غیر ملک کا جھنڈا نہ دیکھا تھا لیکن آج اپنے ہی غداروں کی وجہ سے قلعہ پر انگریزی پرچم لہا دیا گیا تھا۔

جنوبی فضا میں کے لیے جو فوج مقرر کی گئی تھی وہ منصوبہ کے مطابق بنگلوری دروازے کی طرف بڑھی اسے روکنے والا کوئی نہ تھا اس لیے کہ روکنے والے تو خود جھنڈیاں لہا لہا کر حملہ آوروں کی رہبری کر رہے تھے۔

شمالی حصہ میں جانے والی فوج کو مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ میجر بیٹن، ویلاس اور میجر ہلن برج سے چکر کاٹ کر دوسری طرف پہنچے۔

اُدھر لاشوں کا ڈھیر لگا تھا۔ اس ڈھیر میں ایک شخص میں زندگی کے کچھ آثار نظر آئے۔ ویلاس نے فوراً اس پر گولیوں کی بارش کر دی۔

مگر۔ اچانک اس نے اسے پہچان لیا۔ وہ زور سے چیخا:

"سید صاحب۔ کیا یہ آپ ہیں؟"

میجر ویلاس نے اسے جھک پہچان لیا تھا۔ وہ واقعی سید میر معین الدین تھا۔ اس نے سسکتے ہوئے خود اپنی شناخت کرائی:

"ہاں۔ میں سید ہی ہوں۔"



یہ دوپہر کا وقت تھا۔

سلطان کے سامنے دسترخوان بچھا یا گیا۔ اپنے پرانے جو امرا بھی وہاں موجود تھے سلطان کے ماتھے دسترخوان پر بیٹھے۔

سلطان نے پہلا ہی لقمہ اٹھایا تھا کہ جنوب کی طرف سے واویلہ کی آوازیں بلند ہوئیں۔ سلطان کا قلم دالا ہوا تھینچے آگیا۔

سلطان نے حکم دیا:

”معلوم کر دے کہ کیا شور ہے؟“

کسی نے جواب دیا:

”مہرکار کے دفادار جرنیل سید مختار نے حضور پر جان نثار کر دی اور اب انگریزی فوج بڑھتی چلی آ رہی ہے۔“

سلطان نے ایک سرواۓ کھینچی اور اس کی زبان سے نکلا:

”جہاد موت سے نہیں ڈرا کرتے۔ سید مختار کبھی موت سے نہیں ڈرا۔“

پھر سلطان نے اپنے امرا اور وزرا پر ایک نظر ڈالی۔ وہ سب بہت مطمئن اور بے فکر مہرکار کے کھڑے تھے۔

سلطان نے زندگی میں پہلی مرتبہ اپنے وزیروں اور امیروں پر ملامت بھری نظر ڈالی اور نفرت سے کہا:

”غدارو۔ تمہاری غداری کا جو صلہ تمہیں ملے گا۔ وہ ہمیں معلوم ہے۔ ہندوستان، غیر قوم کی غلامی میں چلا جائے گا۔ یہاں کی صنعت و معیشت تباہ ہو کر رہ جائے گی۔“

تمہاری غداری، ایمان فروشی اور ملک و ملت سے بے وفائی انگریزوں کے چہروں پر سرخی بن کے چلے گی۔

تمہیں اس وقت اس ملک حرامی کا احساس ہو گا جب تم اور تمہاری آئندہ نسلیں بیاز کی ایک ایک گٹھی کو ترس دیں گی۔“

اس کے بعد سلطان نے اپنے گھوڑے طاووس کو طلب کیا۔

مختار سوئے۔ ہتھیار سجائے۔ گلیں تلوار لٹکائی۔ ہاتھوں میں دو نالی بندق پکڑی اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

میر جٹ یلاس نے فوراً اس کے منہ سے پانی کی چھال لگا دی۔ میر معین الدین کے ہوش ذرا ٹھکانے ہوئے تو اسے اٹھا کر بٹھایا گیا۔

میر جٹ یلاس سے میر معین الدین نے پوچھا:

”آپ نے مجھے کس طرح پہچانا؟“

میر جٹ یلاس کا دھیان فوراً کرناٹک میں اس کا نفرنس کی طرف گیا جس میں منگلور بھیجے جانے والے کمشنروں کے ناموں پر گفتگو ہو رہی تھی۔ سید میر معین الدین اس کا نفرنس میں موجود تھا۔

یہ کا نفرنس ۱۸۷۴ء میں ہوئی تھی مگر میر معین الدین کی غداری کا آغا اس سے بھی پہلے ہو چکا تھا۔ وہ انگریزوں کی تمام اہم میٹنگوں میں حصہ لیتا تھا۔

میر جٹ یلاس نے مسکرا کر جواب دیا:

”سید صاحب۔ میں نے آپ کو کرناٹک کی میٹنگ میں دیکھا تھا۔“

میر معین الدین جواب تو نہ دے سکا البتہ اس کے لبوں پر ایک پھینکی سی مسکراہٹ لرز کے لگی۔ وہ چونکہ بڑے اہم اور خاص غداروں میں سے تھا اور انگریزوں کا بے حد پیارا دوست تھا اس لیے اس کے لیے فوراً پانکی منگوائی گئی۔

پانکی آگئی۔

میر معین الدین کو سارا دے کر کھڑا کیا گیا مگر اس کے ذہن اول اور دماغ پر غداری کا اس قدر بوجھ تھا کہ وہ ایمان فروشی کا یہ بوجھ سر پر لیے کھڑا نہ رہ سکا۔

لٹ کھڑا۔

گرا۔

اور گرے ہی سر گیا۔

قدرت نے اس سے ملک و ملت فروشی کا بدلہ لے لیا تھا اور بدلہ بھی اس قدر خوفناک کہ جس قوم کے لیے اس نے اپنے دل سے غداری کی تھی اُسی قوم کے ایک فرد نے اسے اپنی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

سلطان بیوا اور سلطنت خداداد میسور کا ایک بڑا غدار، سلطنت خداداد کے زوال سے پہلے ہی انگریزوں کے ہاتھوں گٹے کی موت مارا گیا تھا۔

ایک غدار کے لیے یہ موت کس قدر عبرت ناک تھی!

”کل تک نہیں جانا تھا مگر آج جان گیا ہوں کہ تیری اصلیت کیل ہے“  
اس کے ساتھ ہی احمد خاں کی تلوار چلی۔

میر صادق نے کمر میں لگا پٹینچر کھینچا کہ احمد خاں کو گولی سے اڑا دے مگر احمد خاں کی تلوار نے اسے ملت نہ دی۔ وہ برقی خاطف بن کر میر صادق پر گری اور اس کے سر کو کاٹتی چلی گئی۔  
احمد خاں کا دار اس قدر شدید تھا کہ میر صادق کا لاشہ گھوڑے سے زمین پر گر کر ترپٹنے لگا اور ٹھنڈا ہو گیا۔

میر صادق کا نام غداروں میں پہلا تھا مگر وہ اپنے انجام کو میر معین الدین کے بعد پہنچا۔

سلطان اپنے وفادار دستوں کے ساتھ دہلی دروازے پر پہنچا۔ انگریزی فوج وہاں پہلے سے موجود تھی سلطان کو ادھر آتا دیکھ کر اس کے نیک حرام امراد رکھڑے روالا ہلا کر انگریز فوجیوں کو سلطان کی نشاندہی کر رہے تھے۔ گویا وہ اپنی ناپاک زبان سے کہہ رہے ہوں:  
”تمہارا شکار جال میں پھنس چکا ہے۔ بچنے نہ جانے پائے۔“

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ سلطان کو اپنی وفاداری کا فریب دے کر ان امیروں نے مکاں انگریز کے جال میں پھنسا دیا تھا۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا تھا کہ اس وقت سلطان کی مثال ایک ایسے شیر کی تھی جو گیدڑوں کے زغے میں آ گیا ہو۔

انگریزوں نے امیروں کا اشارہ پر اپنا سارا زور ادھر ہی لگا دیا۔ سلطان یہ جب زیادہ دباؤ پڑا تو وہ واپس ہو کر ڈوٹی دروازے پر پہنچا اور دروازہ کھولنے کا حکم دیا:  
”مگر اس گھر کو مال لگ گئی گھر کے چراغ سے۔“ نیک حرام میر صادق یہ دروازہ اپنی موت سے پہلے بند کر گیا تھا۔

دروازے پر دستک دی گئی تو اندر سے کسی ایمان فروش نے جواب دیا:  
”یہ دروازہ اب نہیں کھل سکتا۔ سلطان سے کہو کہ وہ خود کو انگریزوں کے خالے کر دیں۔“  
سلطان غداروں کی اس حرکت پر دانت پیستتا ہوا نرم سرا کی طرف بڑھا جس کے گرد اس نے اسے بارود بھرا دیا تھا کہ آخری وقت میں اسے اڑایا جاسکے۔ اب سلطان اسی خیال سے اس طرف جانا چاہتا تھا

گھوڑا آگے بڑھانے سے پہلے سلطان نے اپنے دغا باز امرا اور دزدان پر ایک نفرت انگیز نظر ڈالی اور اعلان کیا:

”اب ہماری باری ہے۔“

اور — طاؤس اپنے سوار کو لے کے ڈوٹی دروازے سے باہر نکلا۔  
سلطان کے باہر جانے ہی تک حرام امیر و وزیر ادھر دھرمٹتے ہو گئے۔ غداروں کے سرغنہ میر صادق نے ڈوٹی دروازے کو فوراً بند کر دیا اور حکم دیا:  
”خبردار۔ اب یہ دروازہ جو کسی نے کھولا۔ اب یہ دروازہ کسی کے لیے نہیں کھلے گا خواہ وہ سلطان ہی کیوں نہ ہو۔ کسی کا کیا بھروسہ۔ ممکن ہے کوئی سلطان کا نام لے کر دروازہ کھولے اور اندر آنے کی کوشش کرے۔“

یہ حکم دے کر میر صادق اپنے گھوڑے پر سوار ہوا اور شہر کی سمت روانہ ہو گیا۔ ڈوٹی دروازے کا پیریدار احمد خاں ان تک حرام میر صادق کے پیچے ہوا۔  
احمد خاں نے سن لیا تھا کہ سلطان نے تمام امیروں اور وزیروں کو ”غدار“ کہہ کر مخالف کیا تھا اور سب کی اچھی طرح خبر لی تھی۔ اگر اسے کچھ شک بھی تھا تو میر صادق نے ڈوٹی دروازہ کو بند کر کے خود ہی اسے شک کو دور کر دیا تھا۔

احمد خاں کی نظروں کے سامنے ”میر صادق“ کا بالکل ننگا غدار چہرہ آ گیا تھا۔  
اس کا موہم سا خیال تھا کہ شاید میر صادق سلطان کے پیچھے میدان جنگ کی طرف جاتے گا مگر جب اس نے میر صادق کو حملہ گھم کی طرف جانے دیکھا جہاں اس کا گھر تھا تو وہ گھوڑا تیز کر کے اس کی طرف بڑھا۔

میر صادق اپنے گھر اس لیے جا رہا تھا کہ وہ وہاں انگریزوں کو خوش آمدید کہہ سکے لیکن:

احمد خاں گھوڑا دوڑاتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا:

”ٹھہر جا او غدار۔ اب کہاں جاتا ہے؟“

احمد خاں کی گھر چدار آواز سنائی دی تو میر صادق نے پلٹ کر دیکھا۔

احمد خاں کو خوشی بکھٹ دیکھ کر وہ پہنچا:

”ہوش میں آ احمد خاں۔ جانتا ہے میں کون ہوں؟“

احمد خاں نے نفرت سے تھوک دیا:

سلطان کے جاں نثار جو چاروں طرف سے اسے گھیرے ہوئے تھے، انہوں نے سلطان کو گرتے دیکھا تو چند جاں نثار گھوڑوں سے کود کر سلطان کے پاس پہنچے اور اسے ایک ہالکی میں لٹا دیا۔ اسی وقت تک انگریزی فوج چاروں طرف پھیل چکی تھی۔

آہ — سلطنتِ خدا و کا نیرِ اعظم، ملک و ملت کار کھولا، حریت کا علم بردار، آزادی کا نقیب، آزادی ہند کا آخری سہارا اور ملتِ اسلامیہ کے ترکش کا آخری تیرا پنہ ہی امیرِ دل

وزیروں اور منصب داروں کی غداری کا شکار ہو کر تشنہ لب اپنے ہی خون میں نہا کر  
شہید ہو گیا۔  
اللہ وانا الیہ راجعون۔

چلے گئے اور ادھر انگریزی فوج کو سفید نشان اڑا کر (جس کا پہلے سے  
سمجھوتہ ہو چکا تھا) خبر دے دی گئی کہ میدان خالی ہے آ جاؤ۔ چنانچہ تمام  
انگریزی فوج نہایت آسانی کے ساتھ تفصیل پر چڑھ کے قلعہ میں داخل  
ہو گئی۔  
جنرل میڈوز اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

”دوپہر کا وقت تھا جب حملہ کی سب تیاریاں مکمل ہو گئیں تو جنرل بیرڈ  
اپنی فوج کو لے کر خندقوں سے نکلا اور دریا پار کر کے تفصیل قلعہ پر چڑھا۔  
انگریزی فوج میں جو شخص سب سے آدھ تھا وہ جنرل بیرڈ تھا مگر اس کی  
رہنمائی کے لیے ایک اور شخص بھی اس سے آگے آگے تھا اور وہ میر قاسم علی  
تھا جو تفصیل قلعہ پر بیرڈ سے بھی پہلے چڑھا تھا۔“

سلطان ڈوڈی دروازے سے نکل کر اپنے باڈی گارڈ (محافظ) دستے کے ساتھ علم تیری کی طرف  
چلا۔ اس کی خبر محکوم وزرا نے فوراً انگریز فوج کو پہنچادی۔  
اس واقعہ کے سلسلے میں ایک دستاویزی ثبوت یہ تصویر ہے جو دریا دولت (ایک محل) میں  
اب بھی موجود ہے۔ جس میں صاف طور پر شاہد ہے کہ میر صادق، سلطان کے سامنے کھڑا آداب  
پیش کر رہا ہے اور پیچھے مڑ کر انگریز فوج کو اشارہ بھی دے رہا ہے۔  
سلطان کا دہلی دروازے کے قریب انگریزی فوج سے مقابلہ ہو گیا جو قلعہ کی تفصیل پر آ رہی  
تھی۔ سلطان اور اس کے محافظ دستہ نے انگریز فوج کے بڑھتے ہوئے سیلاب کو روک دیا۔  
اس جگہ جو جنگ ہو رہی تھی اس میں ہندوؤں کے ساتھ تلواریں بھی چل رہی تھیں۔ اگر جنوبی  
تفصیل پر سے پوریا فوج نہ ہٹا لیتا تو اس تفصیل پر بھی دشمن کی یلغار کو روک دیا جاتا۔  
سلطان نے تین گھنٹوں تک انگریزوں کے بڑھتے ہوئے قدموں کو روک رکھا لیکن اس وقت  
جو فوج پوریا اور میر معین الدین کی غداری سے جنوبی تفصیل اور شرقی دروازے پر قابض ہو چکی تھی وہ  
اندرونی تفصیل سے ہو کر جنوب میں آگئی تھی اور وہاں سے گویاں چلا رہی تھی۔ اس سے مجبور ہو کر  
سلطان کو پیچھے ہٹنا پڑا۔  
جب سلطان پسپا ہو کر ڈوڈی دروازے پر پہنچا تو اسے بند پایا۔ کیونکہ سلطان کے دروازے

ایک اور مؤرخ نے آخری دوپہر اور شام کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے:  
”تفصیل کے معائنہ کے بعد دوپہر میں سلطان نے اسی جگہ جہاں  
سایہ دار آسمان کے درخت ہیں، بیٹھ کے خاقانہ طلب کیا۔ ابھی ایک لقمہ  
تناول فرمایا تھا کہ دوسرا لقمہ اٹھا یا چاہتا تھا کہ لوگ داویلا کرتے ہوئے  
دوڑے آئے کہ سید غفار و فادار نے اپنی جان کو سلطان پر نثار کیا۔  
سلطان نے اس نوالہ کو اسی طرح چھوڑ کے دسترخوان سے ہاتھ اٹھایا۔  
عام طور پر مشہور ہے کہ سلطان نے ان امرا و وزرا پر جو وہاں موجود تھے  
نظر ڈالتے ہوئے کہا:

”اس غداری کا نتیجہ تمہیں اس وقت معلوم ہو گا جب تم اور تمہاری  
مہینہ نسلیں اس ملک میں محتاج ہو کر ایک ایک دانہ چاول اور پیاز  
کی ایک ایک گٹھی کو ترسیں گی۔“

یہ کہہ کر سلطان نے اپنی تلوار پر تلے (غلاف) میں ڈالی۔ دونالی  
بندوق ہاتھ میں پکڑ لی اور چھوٹے دروازے سے باہر نکلا۔ اس وقت  
سلطان غیر رنگ کپڑے کی قبائیں پہنے ہوئے تھا۔

جس وقت سید غفار کو گولہ لگا، دوپہر کا وقت تھا مگر سپاہ مستعدی  
کے ساتھ اپنے کام پر لگی ہوئی تھی۔ پوریا نے حکم بھیجا کہ تنخواہ تقسیم ہو  
رہی ہے سپاہ آ کر اپنی تنخواہ لے جائے اور درپردہ سازش یہ تھی  
کہ جب سپاہ یہاں سے ہٹ جائے تو انگریزی سپاہ کو چڑھ آنے  
کے لیے اشارہ کیا جائے۔

حسب الحکم سپاہی اپنی تنخواہ لینے کے لیے مسجد اعلیٰ کے پاس

خدمات میں مستحسور توں کے دستے بھی قائم کیے تھے جو زمانہ امن میں عسکرت کے انتظامات میں مصروف رہتیں اور زمانہ جنگ میں باقاعدہ فوجیوں کی طرح جنگ میں حصہ لیتی تھیں۔ ایک اور انگریز افسر نے لکھا ہے:

"لاشوں میں کئی عورتوں کی لاشیں بھی تھیں جن کے قیمتی کپڑوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ حرم سلطانی سے تعلق رکھتی ہیں۔" (مرنگا پٹم از پارسنس)

مقامی روایت ہے کہ:

"حرم سلطانی کی پردہ نشین عفاف اس آخری وقت میں آبرو دے وطن و ملت کی خاطر اپنی جان دینے کی خاطر مسخ ہو کر میدان جنگ میں آگئی تھیں۔"

بمجرور دلاؤس مشرقی دروازے تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے محل کے اندر بھاگ کر دیکھا۔ وہاں بہت سے لوگ دو تومند آدمیوں کے سامنے باادب بیٹھے تھے۔ اسے خیال ہوا کہ سلطان ابھی تک محل میں موجود ہے۔ اس پر بمجرور آئیں کو ایک دستے کے ساتھ محل کے اندر بھگا گیا کہ وہ یہ اعلان کر دے کہ اگر سلطان خود کو بغیر کسی مقابلہ کے حوالے کر دے تو اس کی جان کی حفاظت کی جائے گی۔ بمجرور آئیں مفید علم اٹھائے قلعہ کے دروازے پر پہنچا۔ قلعہ دار میرندیم اس کے قریب آیا اور جان کی امان طلب کی۔ امان ملنے پر اس نے دروازہ کھول دیا۔ (یہ دراصل محل کا دروازہ تھا)۔ بمجرور آئیں اندر داخل ہوا۔ وہاں سلطان کی مسخ فوج موجود تھی۔

بمجرور آئیں نے خیرنگالی کے اٹھارے طور پر اپنی تلوار قلعہ دار کے سپرد کر دی۔ سپاہیوں نے اسے یقین دلایا تھا کہ سلطان محل میں موجود ہے۔ چنانچہ اس نے محل میں داخل ہونے کی اجازت مانگی۔ تھوڑی دیر بعد اسے اندر بلا لیا گیا۔

وہاں سلطان کے در شہزادے بیٹھے تھے۔

آئیں نے معز الدین کو تسلی دیتے ہوئے کہا:

"سلطان کی جان کی سلامتی کی ضمانت صرف اسی صورت میں دی جاسکتی ہے اگر وہ بلا مزاحمت خود کو حوالے کر دیں۔"

شہزادے نے واضح الفاظ میں بتایا:

سے نکلے ہی نہ ہو حرام میرصادق نے یہ دروازہ بند کر دیا تھا۔ سلطان اور آگے بڑھ گیا۔

انگریز فوج اندرونی فیصل پر سے برابر گولیاں برسا رہی تھی لیکن سلطان قدم قدم پر مدافعت کرتا ہوا پیچھے ہٹتا رہا اور عین اس وقت جب سلطان شہر کے دروازے کے قریب پہنچا تو اس کی پشت پر سے یعنی جنوب مشرقی سمت سے انگریز فوج نے بلب لول دیا جس کی وجہ سے سلطان تین اطراف سے محاصرے میں آ گیا۔

اس وقت سلطان کے ایک افسر نے کہا:

"حضور۔ اپنے آپ کو انگریز فوج پر ظاہر کر دیجیے۔"

سلطان نے پلٹ کر غصہ سے جواب دیا:

"گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔"

انگریزی حساب سے اس جنگ میں کل پانچ ہزار آدمی مارے گئے لیکن کتاب الاعراض میں تعداد بارہ ہزار بتائی گئی ہے تاہم وہ بھی درست نہیں ہے۔

اس سلسلہ میں یہ بات نہایت حیرت انگیز ہے کہ ان جاں نثاران وطن میں جو سلطان کے ساتھ شہید ہوئے ان میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی تھیں۔

کانسٹنس اپنی کتاب "مرنگا پٹم" کے صفحہ ۸۶ پر رقم طراز ہے:

"سلطان شیو کی لاش کے قریب بے شمار عورتوں کی لاشیں بھی

پڑی ہوئی تھیں جن کے لباس اور وضع قطع سے معلوم ہوتا تھا کہ

وہ حرم سلطانی ہیں۔"

انہیں جان کنگ بولا شوں کو اٹھانے پر مامور تھا، لکھتا ہے:

"عورتوں کی لاشوں میں ایک خوب صورت برہمن لڑکی کی لاش

بھی ملی تھی۔"

کرنی کوک پیٹرک نے لکھا ہے:

"معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے مردوں کے ساتھ عورتوں کو بھی

فوج میں شامل کیا تھا۔"

اس تحریر سے اس گمان کو تقویت ملتی ہے کہ سلطان نے دوسرے مسلم بادشاہوں کی طرح اپنے

سلطان محل میں نہیں ہیں۔

میجر آسن کو یقین نہ آیا۔ اس نے حکم دیا: "محل کے تمام بند دروازے کھول دیے جائیں تاکہ تلاشی لی جاسکے۔"

شہزادہ معز الدین نے میجر سے درخواست کی:

"میجر آپ کے حکم کی تعمیل ہوگی مگر ناموس حرم کی خاطر میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ کسی کو اندر نہ آنے دیا جائے۔"

میجر نے اس بات کا وعدہ کیا۔

محل کے تمام دروازے کھل گئے۔ اچھی طرح تلاشی لی گئی مگر سلطان دہاں ہوتا تو ملتا۔

جہل بیرڈ اس وقت تک باہر کھڑا تھا۔ کسی دشمن نے اسے اطلاع دی کہ قلعہ میں قید تمام انگریزوں کو قتل کر دیا گیا ہے۔

یہ سننے ہی جہل بیرڈ غصہ سے پاگل ہو گیا۔ اس نے حکم دیا:

"تمام شہزادوں کو پکڑ کر میرے پاس لاؤ۔"

چنانچہ شہزادے اس طرح جہل کے سامنے لائے گئے جیسے جانور ہنگامہ لائے جاتے ہیں۔ جہل بیرڈ شہزادوں کو دیکھتے ہی چیخا:

"تاؤ۔ سلطان کہاں چھپا ہوا ہے؟ درنہ تم سب کو قتل کر دیا جائے گا!"

تمام شہزادے بالکل ہراسہ میں تھے جیسے کسی نے ان پر سحر کر دیا ہو۔ دراصل شدت غم نے ان پر سحر طاری کر دیا تھا۔ ان پر بیرڈ کے غصہ کا کوئی اثر نہ ہوا۔

شہزادہ معز الدین نے بڑی مستقل مزاجی سے جواب دیا:

"محل کے تمام دروازے کھلے پڑے ہیں۔ چھپ چھپ کر تلاشی لی جا چکی ہے۔ ہم پہلے ہی کہہ چکے ہیں کہ سلطان محل میں موجود نہیں ہیں اور نہ ہیں یہ علم ہے کہ وہ کہاں ہیں۔"

جہل بیرڈ نے بے یقینی سے کہا:

"خوب سوچ لو۔ اگر سلطان محل سے پکڑا گیا تو تم لوگوں کی خیر نہیں۔"

شہزادے نے اسی مستقل مزاجی سے جواب دیا:

"جہل۔ سب کچھ مٹ گیا ہے۔ لٹ گیا ہے۔ جھن گیا ہے۔ اب کیا باقی بچا ہے جس کی ہم خیر نہائیں اس وقت اختیار اور اقتدار ہمارے ہاتھ میں ہے تم جو چاہو سو کر سکتے ہو۔"

جہل بیرڈ نے دوسرا بیٹہ تبادلہ:

"اچھا۔ تمہیں یہ تو معلوم ہو گا کہ انگریز قیدیوں کے قتل کا حکم کس نے دیا؟"

شہزادے نے متانت سے کہا:

"ہمیں اس بار سے میں کوئی علم نہیں لیکن۔ یہ یقین ضرور ہے کہ اگر انگریز سلطان کی قید میں تھے تو سلطان ان کے قتل کا حکم کسی صورت نہیں دے سکتے تھے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ سلطان کے کسی دشمن نے انہیں قتل کر کے الزام سلطان کے مرتعوب دیا ہو۔"

جہل بیرڈ، شہزادے کی متانت اور اس سے زیادہ ذہانت پر عیش کشی کر اٹھا۔ اس نے کیپٹن بیرڈ کو حکم دیا:

"شہزادوں کو اپنی حراست میں انگریزی کیپٹن میں بھیجا دو۔"

اس طرح سلطان شہید ہوا۔

اور۔۔۔

اس کے تحت جگر ایک بار پھر انگریزوں کی قید میں پہنچ گئے!



ہیچ کے کہا۔

"میں سلطان کا محافظ راجہ خان ہوں۔ زخمی گھگھایا۔  
"سلطان کہاں ہے؟" آئن اور ولزی نے ایک ساتھ سوال کیا۔  
زخمی نے ایک ڈھیر کی طرف اشارہ کیا:  
"سلطان ادھر ہے۔ مجھے نہ مارو۔"

ولزی نے گھبرا کر پوچھا:  
"کیا سلطان زندہ ہے؟"  
"نہیں۔" راجہ خان بولا:  
"وہ دیر ہوئی مر چکا ہے۔"

ولزی اور آئن نے اطمینان کا سانس لیا۔ پھر وہ اس ڈھیر پر گئے۔ آخر سلطان کی لاش کو  
دیکھ کر لیا گیا۔

سلطان کا جسدِ خاکی کئی لاشوں کے درمیان دبا ہوا تھا جس سے معلوم ہوتا تھا کہ سلطان کے  
انٹاروں نے آخر وقت تک اس کی حفاظت کی ہے۔  
ولزی نے جھک کے دیکھا۔ سلطان کی آنکھیں کھلی تھیں۔ اس نے جسم ٹٹولا تو وہ گرم تھا۔ اسے  
بہ ہوا کہ سلطان زندہ ہے۔ ولزی نے گھبرا کر سلطان کی بنف سے ہاتھ رکھا۔  
بنف ساکت تھی۔

اس کا شک و دور ہو گیا۔

سلطان کے جسم میں چار گولیاں بیوست ہوئی تھیں اور چاروں زخم نظر آرہے تھے۔ ایک گول  
انسان اس کے دائیں کان پر تھا۔

سلطان کے جسم پر سفید لہلیں کی قمیض اور پھلدار جینٹ کا ڈھیلا پاجامہ تھا۔ سرخ رنگ کا ایک نشی  
روبراسوٹی کپڑا اس کی کمر کے گرد بندھا تھا۔ سرخ اطلس کی ایک بیٹی کا ندھوں پر پڑی تھی۔

سلطان کا سر ننگا تھا۔ شاید گھوڑے سے اترتے وقت اس کا عامہ کہیں گر گیا تھا۔ اس کے  
پیرھے بازو پر ایک قویٰ بندھا تھا۔

سلطان شہد کو پاکی میں ڈال کر عمل میں لایا گیا۔

سلطان کا لاشہ دیکھتے ہی محل میں کہرام مچ گیا۔ سوگواروں نے چیخیں مار مار کر آسمان سر پہ اٹھایا۔

شہد کا اندھیرا رات کی سیاہی میں تبدیل ہو چکا تھا۔

سلطان کا اب تک کسی کو کوئی پتہ نہ چلا تھا۔ انگریزوں کو تو یقین ہو گیا تھا کہ سلطان اب زندہ  
نہیں مگر اس کی لاش کہاں ہے، اس کی تلاش تیزی سے جاری تھی۔  
جنرل بیرڈ خود تلاش کے لیے تیار ہوا۔ اس نے مشعلیں منگوائیں اور سب لوگ اس دروازے  
پر پہنچے جہاں دوپہر سے شام سات بجے تک خونریز جنگ ہوئی تھی۔  
اس جھوٹی سی جگہ میں بے شمار لاشیں پڑی تھیں جن کی تیز کرنا مشکل ہی نہیں بلکہ  
ناممکن تھا۔

آئن اور ولزی نے دروازے کے قریب سلطان کی پاکی پڑی دیکھی۔ پاکی کے قریب ہی  
لاشوں کے ڈھیر میں ایک شخص دکھائی دیا جس کے جسم میں حرکت تھی۔  
یہ لوگ سمجھے کہ وہی سلطان ہے۔ آئن اور ولزی نے گھبرا کر اپنے ہتھیار سنبھال لیے اور گولی  
چلانے کا قصد کیا۔

اسی وقت اس سکتے جسم نے گھٹی گھٹی آواز میں ابھائی:

"خدا کے لیے مجھے نہ مارو۔ میں سلطان نہیں ہوں۔"

اور اس زخمی نے ان دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔

"پھر تم کون ہو۔ جلدی اپنی شناخت کراؤ۔ ورنہ گولی مار دوں گا۔ کرنل ولزی نے زور

مخوم چروں کے ساتھ جھک جھک کر سلطان کی میت کو دیکھ رہے تھے۔  
سلطان کا جنازہ لال باغ پہنچا تو یکایک قلعہ سے ماتمی توپیں چھوٹنا شروع ہوئیں اور اوصد  
ہے میں شریک لوگوں نے غم آلود دھاڑیں مارنا شروع کیں۔  
کئی لاکھ سوگواروں کے رونے، ماتم کرنے اور دھاڑیں مارنے سے اس قدر شور بلند ہوا کہ  
میں توپوں کی آواز دب کر رہ گئی۔

پھر ایسا ہوا کہ آسمان پر چھلٹے ہوئے بادلوں نے مشرق سے مغرب اور شمال سے جنوب تک  
ساتھ گرجنا شروع کیا۔  
فضا کی عبرت ناک سجدگی میں دہشت پیدا ہو گئی اور ہر شخص کا چہرہ یوں دھوواں دھوواں ہو گیا  
ہے وہ سب اپنے اپنے گھر سے اپنے کسی عزیز کے جنازے کو کا ندھا دیتے ہوئے یہاں تک  
ہوں۔  
بادلوں کی گرج ختم نہ ہوئی تھی کہ آسمان پر بجلی بھی ترپنے لگی جیسے وہ بھی سلطان کے غم میں شامل  
ہو۔

بادل کی گرج اور بجلی کی کڑک نے فضا کو بڑا خوفناک بنا دیا تھا۔ جنازے میں شریک انگریز افسر  
بچا ہی بگھر گئے۔ ان کے اومان خطا ہوئے جا رہے تھے۔  
صاحب تاریخ خدا داد (میسور) سلطان کی تدفین کے بیان میں اس طرح رقم طراز ہے:  
”جہول ہارس کے حکم سے صبح کو تمام شہزادوں اور ندیوں کو سلطان کا  
دیدار کرانے ان کی تجمیز اور تدفین کا حکم دیا گیا۔  
جنازہ نہایت احترام اور وقار کے ساتھ ۲۸ فریقہ ۱۲۱۳- ہجری  
بوقتِ نظر قلعہ سے روانہ ہوا۔ تمام شہزادے، سردار اور عمدیدار شریک  
تھے۔

نواب حیدر علی خاں کے مقبرہ پر جسے گنبد کہتے ہیں، جنازہ ٹھرایا گیا۔  
قیضی شہر نے سارے پڑھائی بارہ ہزار روپے فقا کو دیے گئے اور اس  
بیکر جلالی کو اس کے باپ کے پہلو میں سپرد خاک کیا گیا اور یہ ایکسٹ  
مدت تک بڑے بوڑھوں کی زبان پر رہا کہ جب جہول ہارس کو سلطان کی  
شہادت کی خبر پہنچی تو وہ لاش پر آیا اور فرط خوشی سے پکار اٹھا:

خواتین نے اپنے بال نوچ ڈالے اور درود یار سے ٹکری مارنے لگیں۔ تمام رات عمل میں قیامت ہوا  
برپا رہی۔  
اسی رات انگریزی فوج صبح تک عوام و خواص کو لوٹتی رہی اور اپنی شرافت و تہذیب کا ثبوت  
دیتی رہی۔

سلطان کی تجمیز و تکفین کا کام قاضی شہر کے سپرد کیا گیا۔  
دوسرے دن سلطان شہید کو غسل دے کر مکہ معظمہ سے لایا ہوا لکھن پہنچایا گیا۔ شام چار بجے جنازہ  
نیار ہوا۔  
محل کے تمام لوگ جنازے کے ہمراہ تھے۔ جنازہ محل سے برآمد ہوا۔ راستے کے دونوں طرف  
انگریزی فوج نصف بستہ تھی۔

یہ وہی فوج تھی جو کل تک سلطان کے خلاف صفت آرا تھی اور گزشتہ تمام رات عوام اور خواص  
کو جی بھر کے لوٹتی رہی تھی۔  
جنازے کے آگے چار کمپنیاں چل رہی تھیں۔ جنازے کے ہمراہ اعیان سلطنت، امراء و وزراء  
معززین شہر کے علاوہ عوام کی کثیر تعداد دھاڑیں مارتی چل رہی تھی۔  
سب سے پیچھے گھوڑے پر سوار شہزادہ عبدالخالق تھا۔ وہ سر رہنہ تھا۔  
جنازے کا جلوس آہستہ آہستہ قلعہ سے نکل کر شہر کی مرکز پر آ گیا۔ سوگواروں کی تعداد دم بہ دم  
بڑھتی جا رہی تھی۔ ان میں ہندو بھی تھے اور مسلمان بھی۔ مرد بھی تھے اور عورتیں بھی۔ خواتین سروں پر  
مٹی ڈال کر دھاڑیں مار رہی تھیں۔ عوام کی آنکھوں سے آنسوؤں کا سیل رزاں جاری تھا۔ ہر ایک اپنے  
محبوب سلطان کے غم میں ماتم کتا تھا۔

جنازہ جس وقت مقبرہ تک پہنچا تو سوگواروں کی تعداد لاکھوں تک پہنچ چکی تھی۔  
اس دن سرنگاپٹم کی فضا بھی سوگوار تھی۔ آسمان پر گہرے بادل چھائے ہوئے تھے مگر ہوا نام کو  
بھی نہیں تھی۔ ایک پتہ بھی نہ ہل رہا تھا۔ ایک عجیب سا جھس جھس تھا۔  
ہر شخص سہا ہوا تھا۔ جیسے ہر ایک کو کسی نامعلوم خون نے گھیر لیا ہو۔ لوگ آسمان کی طرف دیکھتے  
اور گہرا کمرہ کھاتے تھے۔ نہ معلوم آسمانوں میں کیا ہو رہا تھا۔ شاید اہل آسمان بھی مگر یہ کہاں تھے اور



”آج ہندوستان ہمارا ہے۔“

سلطان کی موت دراصل اسلامی جاہ و جلال اور اسلامی شان و شوکت کی موت تھی۔ ہندوستان کی آزادی کی موت تھی۔ ہندوستان کی غیرت و خودداری کی موت تھی۔

سلطان ایک پڑھا لکھا انسان تھا۔ اس کی نظروں میں بڑے بڑے مجاہد مسلمان سرداروں، فضلا، محدثوں، مفسروں اور اماموں کی مرفورث نہ موت تھی۔ ان لوگوں کی موت تھی جو باطل کے سامنے پیاد بن کر کھڑے ہوئے اور اس وقت تک کھڑے رہے جب تک جبروت کے تیشوں نے ان کے سر پاش پاش نہ کیے۔ ان کی گردنیں قلم نہ کیں۔

یہ ہندوستان کے اس سپہوت کی موت تھی جس پر دنیا والے نوا لگ رہے آسمان بھی آسمان بھلے بغیر نہ رہ سکا۔

روایت ہے کہ دفعتاً ایک طوفان اٹھا۔ بادل کی نمیب گرج اور بجلی کی خوفناک کڑک نے زمین کو ہلا کر رکھ دیا۔ تدفین کے وقت اکثر مقامات پر بجلی گری خصوصاً سلطان کے دیوان خانہ، مجلس اور مسجد اعلیٰ بجلی کی لپیٹ میں آئے۔

دریائے کاویری پایاب تھا۔ اس میں یکا یک بڑے زوروں کی طغیانی آگئی۔

ایک ایسا ہیبت ناک اور عبرت ناک سماں چھا گیا کہ جیسے زمین پر زبردست مصیبت آگئی ہو اور جس پر آسمان بھی غم کر رہا ہو اور برق و بار اس کے شریک نہ ہوں۔

اس زمانہ میں ایسی باتوں پر کچھ زیادہ توجہ نہ دی جاتی تھی بلکہ بے اعتنائی رتی جاتی تھی مگر کیا کیا جلتے کہ ہزارین اس طرح کے واقعات سے بھری پڑی ہے اور اس کا میں ثبوت دیتی ہے یہ بات نہیں کہ اس طرح کے واقعات صرف اسلامی تاریخوں میں لکھے گئے ہیں بلکہ انگریزی تاریخیں اس کا ثبوت دے رہی ہیں۔

وینس رئیس اپنی کتاب میں اور بورنگ، حیات پیپو میں لکھتا ہے:

”اس وقت ایک طرف تو فلعہ سے ماتمی تو ہیں سر ہو رہی تھیں اور دوسری طرف بجلی کی چمک اور بادل کی گرج نہایت خوفناک تھی جس سے

اس واقعہ کی سبب دگی اور دوبالا ہو گئی تھی۔“

سرنگاپٹم کے بڑے بوڑھوں کا بیان ہے کہ ان کی زندگی میں اتنا زبردست طوفان پہلے نہ آیا تھا سلطان کی تدفین کے دن آیا۔ اتنی بجلیاں گریں جن کا حساب نہیں۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے شہر پر خوفناک مصیبت آگئی ہے اور دروہام لرزہ بر اندام تھے۔ دریائے طغیانی اس جوش و خروش پر ہیبت طاری ہو جاتی تھی اور سب کو اس بات کی حسرت تھی کہ یہ طوفان ایک دن پہلے کیوں نہ آیا نہ ہو سکتا۔

حزق میڈوز ٹیلر اپنی کتاب میں بیان کرتا ہے:

”رات ختم ہو گئی۔ صبح ہوئی۔ تمام ارات شہر پر خوف و ہراس چھایا رہا۔ ہر جگہ بند وقوں کی آوازیں، مجروحین کی چیخیں اور ترم رسیدوں کی آہ و فغا کی آوازیں آتی رہیں۔ رات بھر شہر میں لوٹ مار اور غارت گری ہوتی رہی۔ دن گرم تھا۔ ہوا بند تھی۔ کیس ایک پتھر نہ ہلتا تھا۔ تمام آسمان پر بجلیاں ایک گوشہ سے نکل کر دوسرے گوشہ کی طرف بہم جاری تھیں۔“

خطیب کی آواز بہت زوردار تھی۔ جیسے ہی اس کی زبان سے تکبیر کہنے کے لیے لفظ ”اللہ“ نکلا تو یوں معلوم ہوا جیسے آسمان ٹوٹ کر زمین پر گر رہا ہے۔

ایک ہیبت ناک کڑا کے کے ساتھ بجلی چمکا اور ایک روشنی کے زوردار جھماکے سے سب کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ایک زبردست گرج کی آواز نے دلوں کو ہلا دیا اور یہ معلوم ہوا جیسے خطیب کی زبان سے ”اللہ“ کے بعد کوئی لفظ نکلا ہی نہیں۔

اس کے بعد ایک عرصہ تک خاموشی طاری رہی۔

لاش کو اس کی آخری آرام گاہ میں رکھا گیا۔ جونہی لاش رکھ کے اسلام علیکم ورحمۃ اللہ۔ کہا گیا تو پھر ایک بار بجلی کڑکی۔ ایسی زبردست روشنی ہوئی کہ آنکھیں خیرہ ہو گئیں اور جسم پر لرزہ طاری ہو گیا۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ لوگ کیا کہہ رہے تھے اور کیا ہو رہا تھا! اس کے بعد

بجلی اور گرج کا ایک عجیب سلسلہ شروع ہو گیا۔ ابھی تک بارش کا ایک قطرہ زمین پر نہ گرا تھا۔ کالی گھٹائیوں لہر رہی تھی جیسے ابھی زمین پہ اتر آئے گی۔

اس وقت یہ ظاہر ہو رہا تھا کہ انسانی طاقت قدرت کے آگے کتنی حقیر ہے۔ دراصل آفرینندہ مطلق (خلاق عالم) کی آواز اس وقت سنائی دے رہی تھی۔

فوج کو حکم دیا گیا کہ آخری سلامی اُتارے۔

ادھر ہندو قبیلے جھوٹیں۔ ادھر آسمان سے ہزار ہا توپیں پھوٹیں شروع ہو گئیں جن کی آواز میں ہندوؤں کی آواز دب کر رہ گئی۔

فارغ کے بعد جو بینڈ بجایا گیا، معلوم نہیں وہ کیسا تھا اور کس قسم کا تھا۔ آسمانی گرج از بین کے بینڈ کا منہ چڑھ رہی تھی۔

میر عالم چند حیدر آبادی انہوں کے ساتھ مقررے کے پاس آکر ملا۔

گرج اور بجلی غضب ڈھا رہی تھی۔ انگریزی کیمپ پر ہلکی گری جس سے دوا شہر اور کچھ سپاہی ہلاک اور زخمی ہوئے۔

سلطان کے شہید ہوتے ہی ایک قہر تھا جو مرگاکا پٹم پر ٹوٹ پڑا۔ تقریباً بارہ ہزار شہیدانہ جانیں سلطان پر نثار کر چکے تھے۔

ادھر سلطان کی لاش محل میں لائی گئی ادھر شہر میں ہر جگہ لوٹ مار اور قتل و غارت گری کا بازار گرم ہو گیا۔

قری ماہ کی آخری تاریخ تھی رگھوپ اندھیرا چھا یا ہوا تھا۔ اس اندھیرے کو جلتے مکانات کے زخمیوں کی چیخ و پکار اور بے بس عورتوں کے نالہ و فریاد نے اور بیگانہ بنا دیا تھا۔

ان شعلوں میں جو کچھ نظر آتا تھا اس سے انسانیت کی روح بھی کانپ رہی تھی مال و زر کا عورتوں کی بے رحمی، بچوں، جوانوں اور بوڑھوں کے قتل عام سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ دنیا بھلائیوں سرنگا پٹم پر ٹوٹ پڑی ہیں۔

مہجر آئل اپنی یادداشتوں میں اس رات کا حال اس طرح لکھتے ہیں:

"جنرل بیرڈ جودن بھر کا تھکا ہوا تھا وہ ذرا آرام کرنے کے لیے محل کے برآمدے میں لیٹ گیا۔

ابھی اس کی آنکھ بھی نہ لگی تھی کہ لوگوں نے اسے جگادیا اور بتایا کہ شہر میں کئی مقامات پر آگ لگی ہوئی ہے اور ہر جگہ لوٹ مار ہو رہی ہے۔ اس نے دو ایک جگہ سپاہیوں کو لوٹ مار سے روکنا چاہا مگر اسے کامیابی نہ ہوئی۔

قلعو کی فوج کے بعد سپاہی اپنی پلٹوں میں واپس نہیں گئے بلکہ شہر میں داخل ہو کے لوٹ مار کرنے لگے۔

فوج کے وہ سپاہی جو بار برداری کے کاموں پر مامور تھے وہ کیمپوں سے نکل کر شہر میں آگئے اور لوٹ مار میں شامل ہو گئے۔

جگہ جگہ لوگوں کو کیمپ کے پیٹا جا رہا تھا کہ وہ اپنی پوشیدہ دولت کا پتہ بتائیں۔

سورتیں مکانات چھوڑ کر گلیوں میں آکر کھڑی ہو گئی تھیں تاکہ اپنے عرصت کی حفاظت کر سکیں۔

چند ہی گھنٹوں میں سونے اور جواہرات کے ڈھیر لوٹنے والوں کے ہاتھوں میں تھے۔ بڑے بڑے سرداروں اور اشراف کے مکانوں کو لوٹ کر نہادہ بر باد کر دیا گیا تھا۔

سلطانی خزانہ جہاں بے حساب دولت تھی وہاں پہرہ لگاتھ لیکن کچھ لوگ خفیہ راستوں سے خزانے تک پہنچ گئے اور انہوں نے جواہرات سے اپنی جیبیں بھری تھیں۔

غیب بات یہ تھی کہ لوگ مال لوٹ لوٹ کر اپنی جیبیں بھر رہے تھے اور بیچ بیچنے والے لوگوں کو منع کرتے جلتے تھے۔"

(ماڈرن میسور)

واقعات تو انگریزوں کے چشم دید ہیں۔ ان سے قطع نظر اگر مقامی روایات کو لیا جائے تو

ہمارے کمپ کے بازار میں ہمارے سپاہی بیش قیمت جو اہرات،  
سونے کی سلاخیں اور دوسری قیمتی اشیاء بہت سستے داموں بیچ رہے  
ہیں یا انہیں دوسری چیزوں کے عوض دے رہے ہیں۔ ایک ایک بیش  
قیمت موقی ایک پیالہ شراب کے عوض دیا جا رہا ہے۔

ایک فوجی ڈاکٹر نے ایک سپاہی سے دو بازو بند خریدے جن میں میرے دوست  
ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک جو دوسرے سے کم قیمت کا بتایا جاتا ہے اس کو  
حیدر آباد کے ایک جوہری نے تیس ہزار روپے کا بنایا ہے اور دوسرے کے  
بارے میں اس نے کہا کہ وہ اس قدر قیمتی ہے کہ اس کی قیمت کا اندازہ نہیں  
کیا جاسکتا۔

اس قدر مال و دولت حاصل کرنے کے باوجود ہمارے افسر اور سپاہی  
ان اطلاق اور زلزلے کو بس لوٹا چلے رہے ہیں جو محل سے دستیاب ہو رہے۔ فوج کا  
ہر شخص سچی کہ جرنل مارس تک اس کے لیے مضطرب ہے کہ مالی غنیمت جلد از  
جلد تقسیم ہو جائے۔

فتح مند فوج جسے اب اور کوئی کام نہیں ہے، قابو سے بالکل باہر  
ہو رہی ہے۔

کرنی ولزلی مالی غنیمت کے بارے میں اپنے بھائی کو اس طرح لکھتا ہے :  
"مالی غنیمت کی تقسیم کے لیے جو ایکٹ مقرر ہوئے ہیں وہ جو تکوں سے  
زیادہ خطرناک ہیں۔ انھوں نے محل کے دروازے، سلطان کے لباس اور  
دوسرے کپڑوں تک کو فروخت کر دیا ہے اور ابھی ان کے پاس سلطان کے  
لبوسات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے۔

یہ وہ کپڑے ہیں جو سلطان کے استعمال میں تھے اور وہ انہیں پہنا کرتا تھا۔  
اگر ان کپڑوں کی فروخت کو نہ روکا گیا تو اس بات کا خطرہ ہے کہ یہاں کے  
لوگ جو ہمارے قبضہ سے بیزار ہیں، سلطان کے ان کپڑوں کو بطور نشانی اور  
نبرک خرید لیں گے اور یہ بات ہمارے لیے بڑی شرمناک ہے۔

اس لیے میری رائے ہے کہ ان کپڑوں کو خود گورنمنٹ خرید لے اور

تکم میں اتنی طاقت نہیں کہ وہ ان واقعات کو نگہ سکے۔  
کہا جاتا ہے کہ غداروں نے جو غداری کی تھی، اس کا نتیجہ انہوں نے سلطان کی شہادت کے ہا  
ہی گھنٹوں بعد دیکھ لیا۔

یہ ایک فوری خدائی انتقام تھا جو غداروں سے لیا گیا۔ ان کا مال، گھر بار، ذات و وقار بٹا  
کہ ان کی عورتوں کی ناموس بھی غداری کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔

صبح کو جب جرنل مارس کو رات کے واقعات کا علم ہوا تو اس نے جرنل میرڈ کی جگہ کرنی ولزلی کو  
مامور کیا اور پڑے پڑے لوگوں کے گھروں پر پہرہ لگا دیا۔ لیکن شہر میں قتل و غارت کا بازار پھرم  
گرہم رہا۔ کوئی گھر اور کوئی خاندان اس سے محفوظ نہ رہا۔

آخر تک اس کے کرنی ولزلی نے جرنل مارس کو دکھا:

سرنگا پٹم کے زوال کے بعد وہاں کی رعایا پر اس قدر ظلم و ستم کیا گیا ہے  
کہ اس کے آگے سلطان کے مفروضہ مظالم کچھ حقیقت نہیں رکھتے اور یہ  
مظالم کرنے والے سب انگریز سپاہی تھے۔

اس نے مزید لکھا:

"انگریز حاکم شہر (کو تو ال) کو میرے پاس بھیجا جائے اور اسے میرے  
حکم کے تابع رکھا جائے۔

جب تک لوٹ مار کرنے والوں میں سے چند لوگوں کو پھانسی نہیں دی  
جائے گی اس وقت تک لوٹ مار روکنا محال ہے۔

اس وقت ہماری جہنٹوں کے سپاہی اور جرنل اسٹوارٹ شہر میں ہیں  
اس لیے زیادہ خوف و دہشت پھیل رہی ہے۔

جب تک ہم نوٹ ذرائع اختیار نہ کریں گے لوگ اپنے گھروں کو  
واپس نہ جائیں گے۔

کرنی ولزلی نے اپنے بھائی لارڈ ولزلی، گورنر جرنل ایسٹ انڈیا کمپنی کو سرنگا پٹم کے عوام پر انگریزوں  
کے ہاتھوں ہونے والے ظلم کی داستان ان الفاظ میں لکھی تھی:

"مئی ۱۹۹ء کو شب سرنگا پٹم پر جو مصیبت آئی اس کی مثال نہیں  
مل سکتی۔ شہر میں مشکل ہی سے کوئی ایسا گھر ہوگا جو لوٹ سے بچا ہوگا۔

انہیں شہزادوں کے حوالے کر دے یا جس طرح مناسب سمجھے کرے۔

پرائز کیٹیجی یعنی وہ لوگ جو مال غنیمت کی تقسیم پر مامور تھے انہوں نے یہاں تک پیروہ دہتی کی کہ محس کے زمان خانے کی بھی تلاشی لی کہ کہیں وہاں مال و زر چھپا کر نہ رکھا گیا ہو۔  
اس کی بجائے گورنر جنرل لارڈ ولزلی تک پہنچی تو اس نے پرائز کیٹیجی والوں پر اعتراض کیا اور انہیں ایک سخت خط بھیجا۔

اس خط کا پرائز کیٹیجی کی طرف سے مندرجہ ذیل جواب دیا گیا:  
”زمانہ حصہ میں جو عورتیں تھیں انہیں تلاشی سے پہلے عمل کے دوسرے

حصہ میں منتقل کر دیا گیا تھا۔

گورنر جنرل کو دیے جانے والے اس جواب سے پرائز کیٹیجی کی خود مری کا اندازہ ہو جاتا ہے!

جس وقت جنرل ہارس کو سلطان ٹیپو کی شہادت کی خبر ملی تو وہ فرط مسرت سے بیچ اٹھا:

”آج ہندوستان ہمارا ہے۔“

گلکٹہ کے چیف جسٹس سر جان تھروڈ نے اپنی خوشی کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

”سلطان ٹیپو کی طاقت ہی ہمارے راستے کی سدا رہ تھی۔ اس کے

مرنے ہی ہندوستان پر ہمارا قبضہ ہمیشہ کے لیے ہو گیا۔“

لارڈ ولزلی، گورنر جنرل ہندوستان کو سلطان کی شہادت کا مشورہ سنایا گیا تو اس نے ایک

عظیم الشان جشن منعقد کرنے کا اعلان کیا۔

لارڈ ولزلی ۱۷ فروری ۱۸۰۰ء کو گلکٹہ واپس گیا تو وہاں اس کا شاندار جلوس نکالا گیا۔ اس جلوس

میں چیف جسٹس ایما نڈرا چیف، ممبران کونسل اور دیگر افسران بالا شریک ہوئے اور گر جاگھر تک

پا پیادہ گئے۔

راستے کے دونوں طرف۔ انگریز فوج صف باندھے کھڑی تھی اور ہندوستان میں یہ پہلا موقع تھا

کہ انگریزوں نے اتنا بڑا جلوس نکالا اور اسے مذہبی رنگ دیا ہو۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت تھی کہ صرف سلطان کی ذات نے انگریزوں کو اب تک ہندوستان پر

قبضہ سے باز رکھا تھا اور اس کی شہادت کے بعد تو ہندوستان کے مختلف علاقے چپکے چپکے اس کی طرح

انگریزوں کی جھول میں گنا شروع ہو گئے۔

مالی منیت کی تقسیم کے لیے ایک کمیٹی بنائی گئی۔

جب یہ کمیٹی قلعہ میں داخل ہوئی تو یہ لوگ محل کی دولت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ لاکھوں جواہرات کے علاوہ سونے چاندی کی سلاخیں، زیورات اور بیش قیمت اشیاء محل میں موجود تھیں۔ بہت سی اشیاء برآمدوں اور صحن میں بکھری پڑی تھیں۔

پتہ چلا کہ بیرونی دروازے سے بعض سپاہی اور کچھ توپ خانہ والے اندر داخل ہوئے اور بت ماساماں لوٹ لے گئے تھے۔

جواہرات کو منتقل صندوقوں میں رکھا گیا تھا۔ صندوقوں پر حیدر علی اور سلطان ٹیپو کی تہریروں کی تصدیق سونے کی سلاخیں اور زیورات دوسری جگہ صندوقوں میں تھے۔ زیورات میں بازو بند، انگلیں، گلو بند اور سر کی آرائش کی چیزیں تھیں۔

ادھر کے کمروں میں چاندی کی سلاخیں تھیں۔

ایک جگہ دو ہودے تھے جو پورے کے پورے چاندی کے بنے ہوئے تھے۔ چاندی کے بہت سے طباق تھے جن پر میرے جواہرات لگے تھے۔

ان کے علاوہ قیمتی فرنیچر، دوربینیں، شیشے کا سامان، چاندی کے ظروف اور قیمتی کپڑوں کے سینکڑوں ٹکڑے تھے۔ قیلوں میں بیس لاکھ پونڈ سے تھے۔ ان کی قیمت اس وقت ۵ لاکھ پونڈ تھی۔ جواہرات کا اندازہ بیس لاکھ پونڈ لگایا گیا تھا۔ اس میں سے جزل ہارس کو سولہواں حصہ دیا گیا۔ اس طرح اس کے حصے میں ایک لاکھ ۴۲ ہزار نو سو پونڈ کے جواہرات آئے۔ اس کے علاوہ دس لاکھ پونڈ کا حصہ دوسروں کو دیا گیا۔

سلطان کے محل کی اشیاء میں اس کے ذاتی استعمال کے ۸۴ عمامے، ۵۰ رومال، ۲۶ ٹوپیاں اور آٹھ زمر میں جگہ لگے دو خود تھے۔ ان کو یادگار کے طور پر محفوظ کر لیا گیا۔

سلطان کا تخت ہمارے ہونے کے ۸ شیروں کی پشت پر قائم تھا، محلے سے گھرے کر دیا گیا اور ہر جگہ اسی نہ کم کی کے حصے میں آیا۔ ان میں سے ہر ایک ۱۸۰ پونڈ مالیت کا تھا۔

تخت کی چھت ایک انجیر کوئی گینٹ کو دی گئی۔ اس نے یہ چھت ایک ہزار سات سو ساٹھ (۱،۶۰۰) پونڈ میں فروخت کی۔

بعد میں گورنر جزل کی خواہش پر تخت کے تمام محلے خرید لیے گئے تاکہ بادشاہ کو بھجوائے جاسکیں۔ آج بھی یہ تخت قلعہ وندھن میں موجود ہے۔

لارڈ ولزلی کے ہندوستان کے بارے میں کیا خیالات تھے، ان کا پتہ اس کے ایک خط سے چلتا ہے جو اس نے اپنے ایک دوست کو لکھا تھا۔ وہ لکھتا ہے:

”میں ہندوستان میں اپنی فتوحات کا دائرہ اس قدر وسیع کر دوں گا کہ کمپنی کے ڈائریکٹران مجھ سے ہندوستان پر رحم کرنے کی درخواست کریں گے۔“

چیف جسٹس سر جان فکروٹ نے لارڈ ولزلی کو، ۱۷ مئی ۱۹۹۱ء کو مندرجہ ذیل الفاظ میں مبارکباد پیش کی تھی:

”ہماری تاریخ ہندوستان کا سب سے شاندار اور عظیم کارنامہ آپ کے ہاتھوں انجام پانے پر میں آپ کو تیر دل سے مبارکباد دیتا ہوں۔“

۱۸۴۱ء کے مصلحانہ بیگلور کے وقت سلطان کی حیثیت ایک فاتح کی تھی مگر اس کے چند ہی سال کے اندر اس کی تمام قوت خاک میں مل گئی۔ اس کے خاندان کو حکومت سے برطرف کر دیا گیا اور انگریزوں کا اقتدار دولت حاصل ہوئی جو ان کے تصور سے بھی زیادہ تھی۔ انگلستان کے لوگ جب بھی اس فتح کا ذکر کرتے تو لارڈ مارشلٹن ولزلی کو ضرور خراج تحسین پیش کرتے تھے۔

اس سکارانہ کامیابی پر ولزلی کو ”مارکوئیس“ کا خطاب دیا گیا۔

جزل ہارس کو لارڈ ہارس آف مرگاکاٹم بنا دیا گیا۔

سپاہیوں کو تحفے دیے گئے۔ ان تحفوں کے ایک طرف فتح مرگاکاٹم کی تاریخ درج تھی اور دوسری جانب دریائے کاویری میں ایک شکست خوردہ شیر کی تصویر بنائی گئی تھی جسے بٹ جارج ایک گھوڑے پر سوار ہو کے نیزہ مار رہا تھا۔

تحفہ پر یہ تصویر بنا کر انگریزوں نے یہ بات تو تسلیم کر لی کہ سلطان ٹیپو صرف مرگاکاٹم ہی کا نہیں بلکہ پورے ہندوستان کا شیر تھا جس نے تخت و تاج کو ٹھکرایا اور میدان جنگ میں کود پڑا۔ پھر اس نے ایک سپاہی کی طرح رٹتے ہوئے جان دی۔

(نوٹ :

اگر خدائے ہم پر کرم کیا تو ہم اس تخت کو انگلستان سے واپس لائیں گے  
سلطان کے جنگلی جانوروں میں سے نہیں جیتے شاہ انگلستان جارج سوم کو بھیجے گئے تھے جیتوں کے  
ساتھ ان کی دیکھ بھال کرنے والے چولہا زم بھی بھیجے گئے تھے۔ ایک عدد بیل گاڑی اور دو بیل بھی شاہ  
کو تحفہ پیش کیے گئے تھے۔

سلطان ٹیپو کی خواہش کے مطابق ہر دو کو بطور تحفہ دی گئی۔ ایڈنبرا میں یہ آج بھی موجود ہے۔

گورنر جنرل ولزلی کو ایک تلوار اور لارڈ کارنوالس کو ایک تلوار اور ایک خنجر دیا گیا۔

سلطان کے پاس ایک نہایت نادر کتب خانہ تھا جس میں اسلامیات، فلسفہ، تاریخ، شاعری،  
ادب اور قانون وغیرہ کی کتابیں اردو، فارسی اور مقامی زبانوں میں موجود تھیں۔ ان کتابوں کا ایک جگہ ڈھیر  
لگا دیا گیا جسے دیکھ دیکھ کر شہزادے دل سوستے تھے۔

محل کے ساتھ انداز کے سات اور دوسری چیزوں کے ۲۰ گودام تھے جن میں چاول، گھی اور گرم مصالحہ  
وغیرہ بھرا تھا۔

ایک گودام میں چاول نکالنے کے لیے بیکارہ سال پرانا دھان بھرا ہوا تھا جو نہایت اچھی حالت میں

تھا۔

قلعہ میں ایک ہزار توپیں، پانچ لاکھ گولیاں، بارہ ہزار گولے اور ساٹھ ہزار بندوقیں رکھی تھیں۔  
توپوں میں ۵۱۔ انگریزی ساخت کی اور باقی سلطان کے کارخانوں کی بنی ہوئی تھیں۔

مالِ غنیمت کی تقسیم کے وقت حیدر آباد دکن کا سپہ سالار میر عالم مرنگا پٹم میں موجود تھا۔ اس  
نے اس مالِ غنیمت میں حیدر بہاد کا حصہ مانگا۔

جنرل مارسل نے اسے جواب دیا :

”مرنگا پٹم کو ہم انگریزوں نے فتح کیا ہے اس لیے کسی اور کو اس کا حصہ نہیں دیا جاسکتا۔“

اس سلسلہ میں تاریخ ”نظام علی خاں“ میں تحریر ہے :

”وزیر اعظم ارطو جہ اور میر عالم نے جنرل مارسل کی شکایت لارڈ

ولزلی سے کی تھی۔“

”گورنر مارسل“ کا مصنف اس بارے میں ایک ادراہی حکایت بیان کرتا ہے۔ اس کے صفحہ

۲۳۸ پر لکھا ہے :

”جب محل کی تمام دولت تقسیم ہو چکی اور کوئی چیز باقی نہ رہی تو آخر  
میں محل میں سلطان کے کثیر التعداد جانوروں کو ٹھکانے لگانے کا سوال  
پیش آیا۔ ان میں کثرت سے شیر اور چیتے تھے۔

جنگ کی ہونہا کیوں میں ان جانوروں کی دیکھ بھال کرنے والے بھی  
مارے گئے تھے اس لیے جانور کئی دن سے بھوک و پیاس سے بلبلا رہے تھے۔  
لارڈ ولزلی کے بھائی کرنل آر تھر ولزلی نے میر عالم سپہ سالار لشکر حیدر بہاد  
سے کہا کہ اگر وہ چاہیں تو ان جانوروں کو اپنے ساتھ لے جاسکتے ہیں۔

میر عالم نے اس پیش کش کو رد کر دیا۔ آخر سلطان کے ان محبوب جانوروں  
کو گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔“

مرنگا پٹم پر قبضہ کے وقت سلطان کا بڑا بیٹا شہزادہ فتح حیدر قلعہ میں موجود نہ تھا۔ اس کے سلسلے  
میں بہت سی روایتیں مشہور ہیں۔

کرماتی لکھتا ہے :

”سلطان کی شہادت کے دن شہزادہ فتح حیدر اپنی فوج کے ساتھ کرماتی  
کی پھاڑی کے اُس پار تھا۔ جب اسے سلطان کی شہادت کی اور مرنگا پٹم پر  
انگریزوں کے قبضہ کی خبر ملی تو وہ پرہیزگار چلا گیا۔

سلطان کے غدار امراء اور وزراء جنگ کی صحیح خبریں شہزادے  
تک نہیں پہنچنے دیتے تھے۔

ایک انگریز مورخ نے شہزادے کے بارے میں لکھا ہے کہ :

”اس المناک دن شہزادہ فرانسسین کی چھاؤنی میں تھا۔“

مگر یہ خیال غلط ہے۔ شہزادے کے اپنے ہی آدمیوں کا ایک چھوٹا سا لشکر تھا جس میں کچھ  
فرانسیسی بھی شامل تھے۔

انگریزوں نے شہزادے کو رام کرنے کے لیے قمر الدین اور پوریا کو بھیجا۔ اس وقت تک انگریزوں  
کا یہ خیال تھا کہ وہ مرنگا پٹم کا تخت و تاج شہزادہ فتح حیدر کو دیں گے بشرطیکہ وہ بغیر جنگ کے خود کو  
ان کے حوالے کر دے۔ چنانچہ قمر الدین اور پوریا نے اس سے اسی خطویر گفتگو کی۔

ہمارے لشکر کے غدار بھی ہیں اور تمہیں دشمن کے حوالے کر دیں گے۔  
ہم مرزا کا پٹم چاہتے ہیں اور تمہیں اپنی وفاداری سے آزاد کرتے ہیں۔ ہم اطاعت کے لیے جا رہے ہیں اسی لیے ہمیں کسی فوج کی ضرورت نہیں۔ چاہو تو لشکر تم لے جاسکتے ہو۔ ہم تمہارے لیے دعا گو رہیں گے۔

ملک جہان خاں نے بھی استغناء ہی دکھ سے جواب دیا:

”شہزادہ عالم۔ ہم نے سلطان اور سلطنتِ خدا داد سے وفاداری کی قسم کھائی تھی سلطان ہاشمید ہو گئے لیکن سلطنتِ خدا داد ابھی باقی ہے۔ ہم سلطنتِ خدا داد سے بے وفائی نہیں کر سکتے اور انگریزوں سے اس فتنہ تک لڑتے رہیں گے جب تک ہماری روح اور جسم کا رشتہ باقی ہے۔ آپ مرزا کا پٹم تشریف لے جائیے۔ خدا آپ کو محفوظ رکھے۔“

تاریخ بتاتی ہے اس وقت شہزادے کی فوج میں صرف ایک سو بیس فرانسیسی سپاہی تھے اور سلطنتِ خدا داد میں موجود فرانسیسیوں کی یہی تعداد تھی۔

ان سپاہیوں کے سردار نے شہزادے سے عرض کیا:

”مصاحبِ عالم۔ ہم نے سلطان سے عہد کیا تھا کہ ہم شہزادے کو اپنی زندگی میں تمہا نہیں چھوڑیں گے اس لیے آپ ہیں اپنے ساتھ چلنے کی اجازت دیں۔“

ہم جانتے ہیں کہ انگریز ہمارے شدید دشمن ہیں مگر ہم آپ کو تنہا نہیں جانے دیں گے اور آخری وقت تک آپ کے ساتھ رہیں گے۔“

شہزادہ فتح حیدر کی آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

قدرت کی یہ کتنی بڑی قسم ظریفی تھی کہ سلطنتِ خدا داد میں ایک طرف تو پورنیا، میر حادق اور میر علی الدین اور میر قزالدین جیسے غدار تھے اور دوسری طرف جہان خاں، ناصر علی اور فرانسیسیوں کی وفاداری بھی موجود تھی جو ہر حالت میں شہزادے پر جہاں نثار کرنے پر آمادہ تھے۔

شہزادہ فتح حیدر اپنے ایک سو بیس فرانسیسی سپاہیوں کے ساتھ انگریزوں کی اطاعت کے لیے مرزا کا پٹم روانہ ہو گیا۔

پورنیا اور قزالدین کی یہ ایک اور کامیابی تھی۔ وہ دل ہی دل میں مسکرا رہے تھے۔

شہزادے نے ان غداروں سے دریافت کیا:

”اب تم لوگ میرے پاس کیوں آئے ہو؟“

نیک حرام پورینے نے سر جھکا کر بڑے عجز سے عرض کیا:

”مصاحبِ عالم۔ جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب جنگ فصول ہے۔ اگر آپ انگریزوں کی اطاعت پر آمادہ ہو جائیں تو آپ کو حکومت مل سکتی ہے۔“

شہزادے نے قزالدین سے پوچھا:

”تم کیا کہتے ہو اس سلسلے میں؟“

قزالدین نے بھی سسکھام نہ بنا کر کہا:

”مصاحبِ عالم۔ مجھ سے انگریزوں نے وعدہ کیا ہے کہ اگر شہزادے نے جنگ کے فیروزہ کو حوالے کر دیا تو سلطان شہید کی حکومت انہیں دیدی جاسکے گی۔“

اب شہزادے نے اپنے وفادار سپہ سالار ملک جہان خاں کی طرف دیکھا:

”ملک جہان خاں۔ تمہارا کیا خیال ہے؟“

ملک نے دست بستہ عرض کیا:

”مصاحبِ عالم۔ آپ پورنیا اور قزالدین کی باتوں کا اعتبار نہ کیجیے۔ یہ دونوں احسان فراموش اور غدار ہیں صرف ایک مرزا کا پٹم کا فتنہ تھا۔ سچ سے گیا ہے۔ ابھی تو سلطنتِ خدا داد کا وسیع ملک اور مضبوط قلعے موجود ہیں اور ہم وفادار آپ کے ساتھ ہیں۔“

سپہ سالار ملک جہان خاں اور دوسرے سردار میر میراں ناصر علی نے شہزادے کو بہت سمجھایا بکھایا مگر شہزادہ دیر تک کوئی فیصلہ نہ کر سکا۔

پھر اس نے آخری فیصلے سے پہلے اپنے سرداروں کے چہرے ایک ایک کر کے پڑھنا شروع کیے۔ اس وقت اس کی چھٹی سس بڑی تیزی سے پھٹ کر شروع ہو گئی اور اس نے عموماً کیا کہ ملک جہان خاں اور میر میراں ناصر علی کے علاوہ سوائے ایک دوسرے کے اور باقی تمام سردار ایک دوسرے کو کھینچوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اور ان کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔

آخر شہزادے نے بڑے دکھ سے فیصلہ کیا:

”جہان خاں اور ناصر علی! ہم تمہارے شکر گزار ہیں کہ تم جیسے وفادار اب بھی موجود ہیں مگر جس طرح سلطان کو شہید کرنے میں ان کے اپنے امیر و وزیر پیش پیش تھے اسی طرح اگر ہم نے جنگ جاری رکھی تو

دوسری طرف وفادار سپہ سالار ملک جہاں خاں آنسو بہانا ہوا اپنے مختصر لشکر کے ساتھ دوسری جانب جا رہا تھا۔

ملک جہاں خاں کو اپنی منزل کا کوئی پتہ نہ تھا۔ ہاں اس کے پیش نظر ایک مقصد ضرور تھا اور یہ مقصد تھا:

”انگریزوں سے جنگ۔ آخری سانس تک جنگ۔“

میر میراں نامرعلی نے سلطنت خداداد کے تمام امیروں سے باغی ہو کر سلطان اور اس کے بیٹے کی وفاداری کا حلف اٹھایا تھا اور وہ اپنے عہد پر تمام عمر قائم رہا حالانکہ باقی تمام میروں اور میر میرافوں نے اپنی غداری کے عوض انگریزوں سے بڑے بڑے وظیفے حاصل کیے تھے مگر میر میراں نامرعلی، شہزادے کے سپہ سالار ملک جہاں خاں کے ساتھ چلا گیا تھا اور اپنی آخری سانس تک انگریزوں سے لڑتا رہا۔

سلطنت خداداد کے ان دونوں وفاداروں نے انگریزوں کے خلاف اپنی جنگ کو کس طرح جاری رکھا اس کے ذکر سے پہلے ملک جہاں خاں کے بارے میں کچھ بتانا ضروری ہے۔

پورخ پلس لکھتا ہے:

”کتاب تذکرۃ اہلداد والا سلام“ کے دسویں باب میں ملک جہاں خاں

کے حالات اس طرح تحریر ہیں:

ملک جہاں خاں بمطابق قومیت مرہٹہ تھا۔ اس کا پہلا ناؤ ڈونڈیاں داغ تھا۔ بعض تاریخوں میں اس کا نام دھونڈیا واگمہ لکھا گیا ہے۔ خان موصوف ایک نہایت شجاع اور جری مرد میدان تھا۔ سلطان کی ملازمت میں آنے سے پہلے اس کے پاس تین چار سوار تھے۔ وہ ہمیشہ مرہٹوں، نظام اور سلطنت خداداد پر چھاپے مار کر لوٹ مار کیا کرتا تھا اور کبھی کسی کے ہاتھ نہیں آیا۔ سلطانی فوج بھی اس کی گرفتاری سے عاجز آگئی تھی۔

اس وقت سلطان نے اسے ایک اقرار نامہ بھیجا کہ اگر وہ ملازمت سلطانی میں آجائے تو اس کے جان و مال کے علاوہ اس کے مراتب بھی بڑھا دیے جائیں گے۔

چنانچہ سلطان کے قول کا اعتبار کرتے ہوئے وہ دارالسلطنت آیا۔ یہاں سلطان نے اسکی بہت آؤ بھگت کی۔

ڈونڈیا داغ کی اس آؤ بھگت سے نکت حرام میر صادق کو حسد پیدا ہوا اور وہ موقع کی تلاش میں رہا۔

ایک طرف تو وہ دن رات سلطان سے اس کی شکایتیں کرتا اور دوسری طرف اس کی تباہی کی سازشیں کرتا رہتا تھا۔

آخر ایک دن اس کو موقع مل گیا۔ چنانچہ اس نے سلطان سے اس قدر جھوٹی شکایتیں کیں کہ خان موصوف کی طلبی ہو گئی۔

جب جہاں خاں محل کے دروازے پر پہنچا تو اسے گرفتار کر کے حرمت میں رکھا گیا اور اس کی فوج سلطانی فوج میں داخل کر لی گئی۔ مگر سلطان کے دل میں جہاں خاں کے لیے جگہ تھی۔

اگرچہ جہاں خاں کا خرچ صرف تین روپے روزانہ مقرر کیا گیا تھا مگر جہاں خاں نے اس کا کوئی گلہ نہ کیا۔ یہاں تک کہ کچھ دنوں بعد سلطان نے ایک لیٹن جہاں خاں کے نام سے تیار کی اور خان موصوف کی رہائی کا حکم دیا۔ نکت حرام میر صادق نے عین دقت پر پھر جہاں خاں کی شکایت کرتے ہوئے دل کا شمار نکالا اور کہا:

”جہاں پناہ۔ ڈونڈیا جیسا مکار اور بد طبیعت انسان دنیا کے پردے پر نہ ہوگا۔ جب تک وہ آزاد رہا، اپنے چند سواروں کے ساتھ سلطنت خداداد مرہٹوں اور نظام کے علاقوں کو جس طرح تاخت و تاراج کرتا رہا وہ ذاتِ شاہ سے مخفی نہیں۔ اگر اس کو اتنا بڑا عمدہ اور کثیر فوج دے دی گئی تو سلطنت کی خیر نہیں۔“

سلطان پھر نکت حرام میر صادق کے بہکاوے میں آ گیا۔ اس نے جہاں خاں کی رہائی کا حکم موقوف کر دیا۔

ڈونڈیا داغ کو بھی خبر تھی کہ سلطان کے دل میں اس کی کس قدر عزت ہے۔ چند ہی دن اس طرح گزرے تھے کہ سلطان نے اسے رہ کر دیا۔

اس رہائی کے بعد ڈونڈیا داغ مسلمان ہو گیا۔ اس کا اسلامی نام شیخ احمد رکھا گیا مگر اس نے اپنے لیے جہاں خاں کا نام پسند کیا۔



میرصادق کے شر سے بچنے کے لیے جہان خاں شہزادہ فتح حیدر کے

پاس چلا گیا۔

جب شہزادے نے انگریزوں کی اطاعت کا اعلان کیا تو جہان خاں نے صاف الفاظ میں شہزادے

سے کہا:

”صاحبِ عالم! میں اس کام میں آپ کی اطاعت کرنے سے معذور ہوں۔“

یہ کہہ کے اس نے اپنا گھوڑا اوڑا اور شہزادے کے کیمپ سے نکل گیا۔

بہی مؤرخ اگے چل کر لکھتا ہے:

”جب شہزادہ حیدر پر اس کی نصیحت کارگر نہ ہوئی تو جہان خاں

شہزادے سے الگ ہو کر مغرب کی طرف چلا گیا۔ بہت جلد اس کے پاس

چند سوار جمع ہو گئے۔

پھر ادھر ادھر تاخت و تاراج کر کے جہان خاں نے اس قدر طاقت اکٹری

کہ اس کے پاس بیس سے ۲۵ ہزار کے درمیان فوج اکٹھا ہو گئی۔

پھر تو یہ عالم ہوا کہ دو آہستہ دریلے تنگ بھدرا اور دیائے کو شہنا

میں اس کے ناک سے دلوں میں دہشت پیدا ہو جاتی تھی۔

جہان خاں نے سلطان کے دشمنوں سے انتقام لینا شروع کیا۔ مرہٹہ

سردار گوگلے اور پرورام جو سلطان کے مقابلہ پر کئی مرتبہ آئے تھے، جہان خاں

نے ان کے سر نیزوں پر چڑھا کے تشہیر کی۔

انگریزی فوج کے کئی دستے اس کے مقابلے پر آئے اور انہیں سخت

ناکامی ہوئی۔

آخر کرنل آر تھروڈیل ایک زبردست فوج کے ساتھ جہان خاں کے مقابلہ

پر آیا اور اس نے آہستہ ہی جنگ کے بجائے جہان خاں کی فوج میں سازش

کے دروازے کھولنا شروع کر دیے۔ پھر بھی جہان خاں نے دو سال تک

انگریزوں کو ناکوں چنے نہ چوائے۔

جہان خاں کے پاس چونکہ کوئی قلعہ نہ تھا اس لیے اس نے کرنل اور کورٹ پیہ

کے بچانوں کا سہارا لیا۔ مگر بچانوں نے غداری کی اور ان کی غداری کی وجہ سے

یہ وفا دار کو مال بھنوار کے قریب شہید کر دیا گیا۔

سلطان ٹیپو کے بعد یہ دوسرا عجیب وطن تھا جو اس طرح ناموری کے

ساتھ شہید ہوا۔

تاریخ کے اس بیان میں تھوڑا سا سہو یا جاناب ہے۔ کیونکہ جنگ آزادی یعنی مرگاکاٹیم کی چوٹی

بلک کا پہلا نامور شہید سید غفار تھا۔ سید غفار کے مر پر سبز چتری تان کر انگریزوں کو اس کی نشان دہی

کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی سید غفار کو توپ کے گولے سے نشانہ بنا کر شہید کر دیا گیا تھا۔

دوسرا نامور شہید خود سلطان ٹیپو تھا۔

اور اب تیسرا نامور شہید جہان خاں تھا جسے کرنل اور کورٹ پیہ کے بچانوں کی غداری سے انگریزوں

نے شہید کیا۔

ایک اور مؤرخ ریکس نے ملک جہاں خاں کا حال اس طرح بیان کیا ہے:

”ملک جہاں خاں مرہٹہ تھا جو حیدر علی کے سواروں میں ۱۷۹۰ء میں

بھرتی ہوا۔

۱۷۹۲ء میں جب کلارنوالس نے مرگاکاٹیم کا محاصرہ کیا تو یہ فرار ہو کر

دھاڑواڑ پہنچا اور وہاں ادھر ادھر قزاقی کرتا پھرا۔ ۱۷۹۴ء میں اسے سلطان

نے طلب کیا۔

اس کے ساتھ ۲۰۰ سوار تھے۔ جب وہ سلطان کے حضور پہنچا تو سلطان

نے اسے اسلام قبول کرنے کو کہا۔ انکار پر اسے قید کر دیا گیا۔

جب ۱۷۹۹ء میں انگریزوں نے قبضہ کیا تو اسے اس حال میں پایا

کہ ایک دیوار سے وحشی جانوروں کی طرح جکڑا ہوا تھا۔

اسے رہا کیا گیا تو یہاں سے فرار ہو کر وہ مرہٹہ سردار پر پہنچا اور وہاں

ایک بڑی فوج جمع کر کے میسور پر حملے کرنے لگا۔ آخر کرنل ولزلی کو

اس کے مقابل بھیجا گیا۔

حمینوں کی مسلسل کوشش اور جنگوں کے بعد ایک جگہ جہاں خاں

اور اس کی فوج انگریزوں کے زرخے میں پھنس گئی اور ملک جہاں خاں اس

معرکہ میں مارا گیا۔“

اس مؤرخ کا قلم اس قدر زہر آلود ہے جس کی مثال نہیں ملتی۔ اس نے نہ صرف ملک جہاں خاں کی وفاداری، حب الوطنی اور وطن دوستی کی توہین کی ہے بلکہ سلطان کو بھی ایک ظالم اور اسان فراموش انسان ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔



سرنگاپٹم پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور سلطنت خداداد کے بڑے بڑے سردار جو سلطنت اور سلطان کے ہی خواہ اور وفادار تھے، وہ تمام کے تمام شہید ہو چکے تھے اس لیے انگریزوں نے اپنی مرضی کے مطابق سلطنت خداداد کے حصے بخرے کرنا شروع کر دیے۔ حالانکہ شہزادہ فتح حیدر نے بغیر جنگ کے انگریزوں کی اطاعت قبول کر لی تھی اور قمر الدین اور پورینا نے شہزادے کو یہ ضمانت دی تھی کہ وہ انگریزوں سے اسے سلطنت دلا دیں گے۔

مگر۔۔۔ انگریزوں کو اب کس کا خوف تھا کہ وہ اس طرح کی باتوں، وعدوں اور اصولوں کی پابندی کرتے۔ دوسری بات یہ کہ لارڈ ولزلی اور کرنل ولزلی دونوں نے یہ بات پہلے ہی طے کر لی تھی کہ سلطنت خداداد سلطان کی اولاد کو واپس نہیں کی جائے گی۔

پس۔۔۔

دکھاوے کے لیے اور سلطنت پر قبضہ کرنے کے لیے جنرل ہارسی نے ایک کمیشن بٹھایا جس کا صدر وہ خود بنا اور کرنل ولزلی، سر باری کلوز اور کرنل کرک پیٹرک اس کے ممبر مقرر کیے گئے۔

ان کے علاوہ حیدر آباد کے سپہ سالار میر عالم اور سلطان شہید کے چند وزراء کو صرف مشاورت کے لیے منتخب کیا گیا۔

کمیشن کے سامنے سلطنت کے دو دعویدار تھے :

۱۔ سلطان شہید کے عاجزادے۔

مندرجہ بالا دلائل کی روشنی اور ملکی حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے کمیشن نے مندرجہ ذیل نتائج مرتب کیے ہیں:

۱۔ اگر سلطنت سلطان کے شہزادوں کو تعزیفی کی جائے تو اس بات کا امکان ہے کہ ان کے دل میں انتقام لینے کا جذبہ موجود رہے گا۔

۲۔ سلطان کے شہزادے دربار کا جاہ و جلال اور سلطنت کی وسعت دیکھ چکے ہیں۔ وہ اس کو فراخوش نہ کرتے ہوئے اسے حاصل کرنے کی کوشش کریں گے۔

۳۔ سلطان کے شہزادوں کو معلوم ہے کہ سلطان نے کس طرح فرانسیسیوں اور دیگر اقوام سے معاہدے کیے تھے اور ابھی جبکہ فرانسیسی خطرہ موجود ہے تو بین ملکی ہے کہ وہ پھر سے ماز بار شہزادے کو دیں۔

۴۔ اگر سلطان کے کسی شہزادے کو تخت نشین کیا جائے تو وہ یقیناً ان لوگوں کو معاف نہیں کرے گا جو سلطنت کی تباہی اور شاہی خاندان کی حکومت کو ممانہ موجودہ حالت کے ذمہ دار ہیں۔

دیہ اشارہ میر قمر الدین، پورینا اور میر قاسم جیسے عداؤں کی طرف ہے۔

۵۔ نظام علی خاں والی حیدر آباد کو جو اس جنگ میں ہمارا حلیف ہے، سلطان کے شہزادوں کو تخت دینے کا مخالف ہے۔ اس کے ثبوت میں کمیشن کے پاس حیدر آباد کے وزیر اعظم ارسطو جاہ کا ایک خط ہے جس میں اس نے اپنے سپہ سالار میر عالم کو لکھا ہے:

”سلطان ٹپو کے فرزندوں اور سپہ سالاروں نے انگریزی کمپنی کے ذریعے جو استدعا کی تھی کہ انہیں بغرض پرورش نصف سلطنت اور نصف خزانہ دیا جائے تو (انہیں) تم کیوں نہیں کہتے کہ قلعہ ہم نے فتح کیا ہے اور وہ اسیرانِ جنگ میں سے ہیں۔ ان کے لیے قوتِ لایوت کے موافق تجویز کو ناجائز ہے۔“

پھر اس کمیشن کو مخالف کہہ کر شہزادوں کو بھڑکانے کی کوشش کی:

۲۔ میسور کا قدیم ہندو خاندان۔  
معاملات کی چھان بین کے بعد کمیشن کے آگے مندرجہ ذیل دلائل رکھے گئے۔

### شہزادوں کی طرف سے دلائل:

۱۔ حیدر علی خاں کو اگر غاصب سلطنت تسلیم کر بھی لیا جائے تو اس بات کو اتنا عرصہ گزر چکا ہے کہ سلطنت پر اس کا حق مسلم ہو چکا ہے۔

۲۔ حیدر علی خاں اگر غاصب سلطنت تھے تو ان کے فرزند سلطان ٹپو اور اور ان کے شہزادے اس الزام سے بالکل بری اور جائز وارث سلطنت ہیں۔

۳۔ سلطان ٹپو نے اپنے بیٹوں کی تعلیم و تربیت اس طرح کی ہے کہ وہ حکومت کرنے کے اہل ہیں اور ان کے دل امیدوں سے بھرے ہوئے ہیں۔

۴۔ سلطنت کا رقبہ اس قدر وسیع ہو چکا ہے کہ میسور کی سلطنت نے کبھی اتنی وسعت نہ دیکھی تھی۔

### ہندو خاندان کی طرف سے دلائل:

۱۔ سلطنت میسور نے اپنے حق سے کبھی دست برداری نہیں کی اور ہمیشہ اپنی سلطنت کو حاصل کرنا چاہا۔

۲۔ حیدر علی یا سلطان ٹپو نے اسے اعلان کیا کہ اس حق سے محروم نہیں کیا۔

۳۔ دھرم کا اتوار جو ایک سیاسی حیثیت رکھتا ہے، اس سے روکنے کی بھی حیدر علی یا سلطان ٹپو نے کبھی کوشش نہیں کی جس کی وجہ سے ہندو رعایا کے دل میں قدیم خاندان کا وقار بخنہ باقی ہے۔

”ابن جانب (ارسطو جاہ) کو یقین ہے کہ سلطان کے لڑکوں اور بیاندگان کو منشا سے سرکار اور اظہار میر صاحب (میر عالم) کے موافق کیا جائے گا اور نصف ملک ان کو ہرگز نہ دیا جائے گا“

کمیشن نے اپنے خاص دلائل اور حیدر آباد وکن کی رائے ظاہر کرنے کے بعد سلطان کے امراء و وزراء سے بھی رائے طلب کی۔ اس وقت غلام علی خاں ننگر سے نے جواب دیا تھا:

”افعی کشتن و بچہ اش نگہداشتن کا رخرو منداں نیست“

(صاف مارنا اور اس کے بچے کو پانا عقلمندوں کا کام نہیں)۔

سلطنت خداداد کی تقسیم کے بارے میں کمیشن نے جو فیصلہ کیا اس کے بارے میں یہ بات یقین سے کہی جاسکتی ہے کہ یہ فیصلہ نہ تو کمیشن نے کیا اور نہ فیصلہ کرنے کے لیے یہ کمیشن بٹھایا گیا تھا بلکہ کمیشن صرف اس لیے بٹھایا گیا تھا کہ وہ انگریزوں کے اس طے شدہ فیصلہ کو اس انداز سے ترتیب دے کہ پیش کرے کہ عوام کو اس سے بے وقوف بنایا جاسکے اور انگریز قوم تاریخ میں خود کو اس قریب دہی کے مابوجود انصاف پسند کہلا سکے۔

دراصل کمیشن کا یہ فیصلہ وہی فیصلہ ہے جس کی تفصیل گورنر جنرل لاڈ و لرنلی نے اپنے دو خطوط میں انگلستان کو بھیجی تھی۔

اس کا کھلا ہوا ثبوت یہ ہے کہ لرنلی کے ان دونوں خطوط کو لفظ بہ لفظ اس کمیشن کے فیصلہ میں بالکل اسی طرح سمودیا گیا ہے جس طرح لرنلی نے لکھا تھا۔

ان خطوط کا پیش کرنا ایک طرح سے فیصلہ کا توار ہو گا مگر صرف چند جملوں سے تاریخ کو اندازہ ہو جائے گا کہ یہ سب لرنلی کا کیا دھرا تھا۔

لرنلی اپنے پہلے خط میں لکھتا ہے:

”سلطان شیو کے دل میں کو انہی اصولوں کی تعلیم دی گئی ہوگی، وہی جذبات اور تعصبات اس میں بھرے ہوں گے۔ اب ہمارے بھٹ و کم اور انگریزانی میں اس کا تخت نشین ہونا اس کے لیے اس قدر سخت کمزوری اور ذلت کا باعث ہو گا کہ کوئی غیرت مند تاجدار اسے گوارا نہیں کر سکتا۔ اگر محدود نقطہ نظر سے بھی اس پر غور کیا جائے تو یہ بات تسلیم کرنا پڑے گی کہ سلطان شیو کا بیٹا اس انتظام کو (جس سے اس کی سلطنت کے ٹکڑے ہوں اور

اس کی آزادی مفقود ہوگئی ہو) درہم برہم کرنا اپنا فرض سمجھے گا۔ خود اس کی خوابیاں اسے اس بات پر مجبور کرتی ہیں کہ وہ ہماری قوت اور ہمدردی سے ہمیشہ دلی نفرت رکھے۔ لہذا اس خاندان کے شہزادے کو تخت نشین کرانے سے ہمارے جدید نظام کے خاتمے کی ابتدا ہو جاتی۔“

اب ملاحظہ ہو کہ سلطان کے کسی شہزادے کے بجائے ہندو خاندان کو تخت نشین کرنے میں دلزلی کی کیا مصلحت پوشیدہ تھی۔

دلزلی اپنے ایک مراسلہ میں لکھتا ہے:

”میسور کے خاندان نے انتہائی ذلتیں برداشت کی ہیں لہذا یہ خاندان ہمارا احسان مند ہو گا اور ہمارے ساتھ خلوص کا اظہار کرے گا کیونکہ ہم نے اسے قعر ذلت سے نکال کر باہم عروج پر پہنچا دیا ہے۔ اس خاندان کے ہمیشہ برطانوی حکومت سے دوستانہ تعلقات رہے ہیں۔ اپنے بڑے دنوں میں بھی اس خاندان نے ہمارے دشمنوں سے کسی طرح کے تعلقات نہیں رکھے لہذا انہیں برسرِ اقتدار لانا ہماری نیابتی کا کام ہو گا اور وہ محض ہماری اعانت سے ہی سلطان شیو کے خاندان والوں اور دیگر دعویداروں سے اپنے تخت و تاج کو برقرار رکھنے کی توقع کر سکتے ہیں۔“

— وہ فرانسیسیوں اور دوسری طاقتوں کے خلاف ہوں گے۔

میسور کے معاملات کا اس طرح سے انتظام ہو جانے سے اس مخالف طاقت کا محض خاتمہ ہی نہ ہو گا بلکہ میسور کی سلطنت جس کے نام سے پورا کوٹناکھ تھرا تھا اب ہماری پشت پناہ ہوگی اور کمپنی، اس کی رعایا اور اس کے حلیفوں کے لیے دولت اور قوت کا سرچشمہ ہوگی۔“

پس — لاڈ و لرنلی کے منصوبے کے مطابق سلطان کے خاندان کو سلطنت سے محروم کر کے سلطنت خدا کی مندرجہ ذیل بند باندھ لی گئی:

۱۔ انگریزوں نے کنارہ کا صوبہ، کوٹھتورہ دارا پورم اور دیناٹ کے اضلاع اور وہ تمام علاقہ لے لیا جو مالابار اور کرناٹک کے درمیان زیریں گھاٹ پر واقع ہے۔

یا دو گار رہے گی۔ ہماری اولاد آپ کی گورنمنٹ سے اس اظہارِ حسنِ عقیدت کو کبھی فراموش نہ کرے گی۔ اسی کی امداد پر پہلا بھروسہ ہے۔  
دستخط:

۱۔ دیو ارجی منی

۲۔ لکھی منی

اس مرحلے کے طے ہونے کے بعد نئے راجہ کی تخت نشینی کا مسئلہ پیش ہوا تو مناسب یہ سمجھا گیا کہ اس سے پیشتر سلطان کے شہزادوں کو ملک سے باہر بھیج دیا جائے۔  
اس سے متعلق ماڈرن میسور کا معصفت لکھتا ہے:

”جب یہ طے ہو گیا کہ ہندو راج قائم کیا جائے تو کرنل ولزلی نے شہزادہ فتح حیدر کو اطلاع دی:

”گورنر جنرل کے خیال میں انگریزوں کے اتحادیوں کے مفاد کو مد نظر رکھتے ہوئے یہ مناسب نہیں ہے کہ تختِ سلطان کے وارثوں کو دیا جائے۔ اس لیے سات لاکھ سالانہ کی پیش گزار سے کے لیے غصوں کی گئی ہے۔ اس لیے اب یہ طے شدہ ہے کہ آپ (شہزادہ فتح حیدر) اور سلطان کے اہلِ خاندان کو میسور کی حدود سے باہر بھیج دیا جائے۔“

اس کا ردائی کے لیے دوسرا دن مقرر کیا گیا۔ شہزادہ فتح حیدر نے اس مجلسِ ادر حکم پر تعجب کا اظہار کیا اور کہا:

”میں نے انگریزوں کے قول پر بھروسہ کر کے اپنے آپ کو سپرد کر دیا تھا۔ اگر کمپنی تخت و تاج نہ بھی دے تو اپنے باپ دادا کے مزاروں کو چھوڑ کر نہیں جاسکتا۔“

کرنل ولزلی نے اس کے جواب میں کہا:

”قول جو دیا گیا تھا اس کے کوئی اور معنی نہیں ہے جاسکتے یہ یقین نہیں دلا گیا تھا کہ تخت و تاج دیے جائیں گے۔“

اس کے علاوہ یہ انگریزی قانون ہے کہ حکومت اگر چاہے تو اپنی رعایا میں سے کسی شخص کو بھی اپنی جائے رہائش چھوڑ کے کسی اور جگہ رہنے پر مجبور

اس کے علاوہ تلع میرنگا پٹم اور تمام قلعے جو گھاٹ کے دروں کے ناکوں پر چھائے ہوئے تھے، انگریزوں نے قبضے میں لے لیے۔

۲۔ نواب نظام الملک کو گنتی اور گرم کٹہ کے علاقے، پیش درگ کے تمام علاقے اور میسور کے سرحدی علاقے دیے گئے۔

۳۔ مرہٹوں کو دونوں طاقتوں کے نصف سے زیادہ حصہ دیا گیا مگر یہ شرط لگائی گئی کہ وہ فرانسسپور کے خلاف صاف اور واضح معاہدہ کریں اور کمپنی کی مرضی کے بغیر کسی یورپین کو ملازم نہ رکھیں۔

نیز یہ کہ میسور میں جو ریاست قائم کی جا رہی ہے اس کے استحکام کی ضمانت دیں۔

مرہٹہ پیشوا نے اس شرط سے انکار کر دیا چنانچہ اس کے حصہ کو بھی کمپنی اور نظام نے آپس میں بانٹ لیا۔

۴۔ بقیہ سلطنت ہندو راجہ کو دیدی گئی۔ اسے گدی پر بٹھانے میں یہ بھی مصلحت تھی کہ ہندوؤں کی تالیفِ قلب کی جائے۔ بعد ازاں ۲۲ جون ۱۷۹۹ء کے معاہدے کے تحت یہ علاقہ بھی انگریزوں کے ماتحت چلا گیا۔

ایٹ اینڈ یا کمپنی کے اس عطیہ کو بیوہ رائیون نے ۲۴ جون ۱۷۹۹ء کو شکریہ کا مندرجہ ذیل خط لکھ کر قبول کیا:

”آپ نے ہمارے بچے کے لیے میسور نگر کی حکومت مع تعلقات کے

بجائ کو دی ہے اور پورنیا کو دیوان مقرر کیا ہے۔ اس سے ہم بیدار ہو رہے ہیں۔

ہماری سلطنت کو ہمارے ہاتھ سے نکلے چالیس برس چھوٹے تھے۔ اب آپ نے

اپنی ہمرانی سے پھر ہمارا ملک ہم کو دیا۔ اور پورنیا کو ہمارا دیوان مقرر کیا ہے۔

جب تک چاند سورج تباہ ہیں ہم آپ کی گورنمنٹ کے خلاف کوئی کاروائی نہیں

کر سکیں گے اور ہمیشہ اپنے آپ کو آپ کے زیرِ سایہ اور آپ کا تابع فرمان

سمجھیں گے۔

آپ نے ہمارا نام قائم کیا۔ یہ بات ہمارے خاندان میں پشتِ پشت تک

کر سکتی ہے۔

یہ سچ ہے کہ انگریز حکومت نے تخت و تاج کے معاملے میں انصاف اور  
رحمدلی سے غور کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن اب موجودہ وقت میں وہ اس کے  
مفاد کے خلاف ہے خصوصاً جب اسے معلوم ہوا کہ سلطان ٹیپو اور اس کے  
اہل خاندان کا رجحان فرانس والوں کی طرف زیادہ ہے جو انگریزوں کو

ہندوستان سے نکلنا چاہتے ہیں۔

اس کے ساتھ ہی شہزادہ فتح حیدر کو دھکی دھکی گئی کہ اگر اس نے گورنر جنرل کے حکم کی خلاف  
ورزی کی تو اس کا نتیجہ اچھا نہ ہو گا۔ یہی دھکی شہزادہ عبدالخالق، شہزادہ معز الدین اور شہزادہ محمد الدین  
کو بھی دی گئی۔

پھر شہزادگان کو ۱۸ جون ۱۷۹۹ء کو دہلیور بھیج دیا گیا اور ۱۸۰۶ء میں سلطان کے پورے  
خاندان کو کلکتہ بھیج دیا گیا۔

سلطان ٹیپو نے میسور کے ہندو راجہ کے خاندان کے جس لڑکے کو راجہ بنایا تھا اس کا نام  
خاصہ چامراج تھا۔ وہ ۱۷۹۶ء میں مر گیا۔ اس کے بعد اس کا بیٹا کرشن راج تھا۔  
ورلانی نے اسے سندھیشی کے لیے چنا اور مرنگا پٹم کے بجائے شہر میسور کو اس کا دار السلطنت  
قرار دیا۔

پورنیا کو اس کی خدمات یعنی خدایوں کے صلہ میں ریاست کا دیوان (وزیر اعظم) مقرر کیا گیا اور  
تخت نشینی کی تاریخ ۳ جون ۱۷۹۹ء طے پائی۔  
چنانچہ ۳ جون کو رسم تاجپوشی ادا کی گئی۔

یہ رسم دوپہر کے وقت منعقد ہوئی۔ اس کے لیے راجاؤں کا پرانا تخت لایا گیا اور ایک خاندان  
جسٹ منایا گیا۔

انگریزی کمیشن کے ارکان اور میر عالم میسور آ گئے۔ پورنیا نے بہت سے ہندوؤں کے ساتھ ان کا  
استقبال کیا۔ جنرل ہارسن اور میر عالم نے کرشن راج کا ہاتھ پکڑ کر تخت پر بٹھایا۔ اسے توپوں اور ہندوؤں  
کی سلامی دی گئی۔

تین روز بعد کمیشن واپس چلا گیا۔ پورنیا کو دیوان اور کرنل باری کلوز کو ریزیڈنٹ مقرر کر دیا گیا۔  
پھر ۸ جولائی ۱۷۹۹ء کو ایک نئے معاہدے کے تحت میسور کا نیا راجہ سیاسی معاملات میں کمپنی کا ماتحت  
ہو گیا۔

معاہدے کی دوسری شرط یہ قرار پایا کہ:

۱۔ ریاست کی حفاظت کے لیے کمپنی ایک فوج رکھے گی جس کے مصارف کے

لیے راجہ سالانہ سات لاکھ پگوڑے ادا کرے گا۔

۲۔ راجہ کسی غیر سلطنت سے کسی قسم کے تعلقات پیدا نہیں کرے گا نہ ہی کسی

یورپین کو ملازمت میں رکھے گا۔

۳۔ حکومت برطانیہ کو اختیار ہو گا کہ وہ ریاست کی حفاظت کے لیے جس

قلعہ میں چاہے اپنی فوج رکھے۔

سلطنتِ خداوادی چوتھی جنگ ۱۷۹۹ء کے خاتمہ پر سلطان شہیدی جج بندی کے حساب سے بقیہ  
سلطنتِ خداوادی آمدنی کا اندازہ ۵۵۲۹۰۵۳۶ پگوڑے تھا جبکہ ۱۷۹۲ء میں کل ریاست کی آمدنی  
کا اندازہ ۵۰۹۸۰۹۸ پگوڑے تھا۔  
انتظامی اخراجات وضع کرنے کے بعد انگریزوں نے آمدنی کا حساب تقریباً ۳۵۲۲۲۲۲ پگوڑے  
لگایا اور ورلانی نے اس کی تقسیم مندرجہ ذیل طریقے پر کی:

۱۔ میسور کی نئی ریاست	۲۹۴۳۳ مربع میل	۱۳۷۴۰۷۶ پگوڑے
۲۔ انگریزوں کا حصہ		۷۷۷۷۷۰
۳۔ نظام کا حصہ		۲۰۷۳۳۲
۴۔ مرہٹوں کا حصہ (جو انہوں نے نہیں لیا)		۲۶۳۹۵۷

میزان کل: ۳۰۲۲۲۲۲۵

انگریزوں نے اپنے حصہ میں سے ۲ لاکھ ۴۰ ہزار پگوڑے سالانہ وظیفہ سلطان کے مندرجہ  
ذیل شہزادوں کو دینا منظور کیے:

باقی شہزادوں کو نواب حیدر حسین، غلام علی اور امام بخش کے ساتھ باہر میں دیلور روانہ کیا گیا۔

جس وقت یہ قافلہ مرنگا پٹم سے نکلا تو نوکر چاکر سمیت اس کی مجموعی تعداد ۷۰۰۔ افراد پر مشتمل تھی۔ ولزی نے یہ کوشش بھی کی کہ سلطان کے اہل خاندان اور ان کے ملازموں کے علاوہ خاندان بھر کے دور دراز کے ناکارشتہ داروں کو بھی مرنگا پٹم سے نکال دے۔

اس کے برعکس غداروں پر نظر ڈالی بہائے تو معلوم ہوا کہ میر قمر الدین کو ستر ہزار پگوڑے سالانہ پورنیا کو چھ ہزار پگوڑے سالانہ جمع ایک فیصد حاصل سالانہ جو تقریباً ۱۹۔ ہزار پگوڑے بنتا تھا۔ اس کے علاوہ مرنگا پٹم کے جنوب میں بطور جاگیر دیا گیا جو ۱۹۶۵ء تک اس کے خاندان کے پاس رہی۔ میر غلام علی لنگڑا، علی رضا اور دوسرے میر میراں کو تین تین ہزار پگوڑے سالانہ تاحیات دیے گئے۔

ایک اور میر میراں کو ۲۴۰۰ پگوڑے سالانہ اور ایک دوسرے میر میراں کو ۵۰۰ پگوڑے سالانہ وظیفہ دیا گیا۔

یہ وظیفے اور نشین ان لوگوں کو ملک و ملت سے غداری اور ایمان فروشی کے صلے میں عطا ہوئے۔ نیلے درجہ کے تمام غدارا فردوں کو تنخواہ کا نصف پٹن کے طور پر دے کر انہیں ملازمتوں سے ہمیشہ کے لیے سبکدوش کر دیا گیا۔

قیق ہو جانے والے غداروں کے اہل و عیال کو بھی وظیفے دیے گئے۔

سید صاحب یعنی میر معین الدین کے خاندان کو جسے لوگوں نے اسی رات بے گھر کر دیا تھا اور اس کے تمام احوال جاننا کو جلا کر رکھ کر دیا تھا، دوسو پگوڑے ماہوار تنخواہ مقرر کی گئی۔

ولزی نے مرنگا پٹم سے صرف سلطان کے خاندان کو ہی نہیں نکالا بلکہ اس نے دہان کے زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو بھی شہر بدر کرنے کی حکمت عملی اختیار کر لی۔

اس نے ایک خط جنرل ہارس کو لکھا جس میں تحریر تھا:

”میری آمد زو ہے کہ آپ اپنا دفتر مرنگا پٹم سے منگور منتقل کر لیں جس سے سردست یہ فائدہ ہو گا کہ (آپ کے دفتر میں کام کرنے والے) کثیر تعداد میں مسلمان مرنگا پٹم سے دفتر کے ساتھ منگور چلے جائیں گے۔ اس کام میں جلدی کیجیے کیونکہ یہ امر میسور میں ہمارے اہلینان کے لیے

۱۔ شہزادہ فتح حیدر سلطان

۲۔ معین الدین سلطان

۳۔ عبدالحق سلطان

۴۔ معز الدین

۵۔ محمد سبحان

۶۔ شکر اللہ

۷۔ غلام احمد

۸۔ غلام محمد

۹۔ سرور الدین

۱۰۔ محمد یاسین

۱۱۔ جامع الدین

۱۲۔ منیر الدین

سلطان کے بارہ وارثوں کے ساتھ ولزی نے یہ انعام کیا۔ اس طرح اس بندر بانٹ میں ہر جائز وارث کو صرف ۱۲ ہزار سالانہ یعنی ایک ہزار ماہوار پگوڑے کا وظیفہ مقرر کیا تاکہ چند دنوں کے بعد وہ فاقوں سے دوچار ہو جائیں۔

برخلاف اس کے ایک غدار میر قمر الدین کو اس کی غداری کے صلے میں ستر ہزار پگوڑے سالانہ وظیفہ دینا منظور ہوا اور پورنیا کو میسور کا وزیراعظم یعنی دہان کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا گیا۔

ان میں سے چار شہزادوں کو کیپٹن میرٹ کے ساتھ ۱۲۔ جون ۱۷۹۹ء کو دیلور بھیجا گیا۔ ان کے ناکام یہ تھے:

۱۔ شہزادہ فتح حیدر

۲۔ عبدالحق

۳۔ معز الدین

۴۔ معین الدین

دہان میجر ڈیوٹن کو ان کی میزبانی یعنی چوکیداری پر لگایا گیا۔

بہت ضروری ہے۔  
منگور دفتر منتقل ہونے سے کثیر تعداد میں مسلمانوں کو سرنگا بٹم چھوڑ کر منگور جانا پڑا۔  
”سلطنت خداداد میسور“ کے مصنف محمد منگوری نے یہ بات بالکل ٹھیک کہی ہے کہ:  
”زوال سلطنت خداداد میسور، ہندوستان کی تاریخ کا ایک اہم اور  
انتہائی عظیم المیہ ہے۔“

مگر اس زوال کے اسباب پر تواریخ میں مفصل طور پر نہیں لکھا گیا اور صرف یہ بات کہنے پر اکتفا  
کی گئی کہ سلطان کے امراء اور وزراء نے آخری وقت میں سلطان سے غداری کی۔ اس وجہ سے سلطنت پر  
زوال آگیا۔

تاریخ حیدری اور تاریخ مغللات حیدری میں بھی صرف یہی لکھا گیا ہے۔ بلاشبہ یہ ایک تاریخی  
حقیقت ہے اور اس سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔  
لیکن۔

صرف یہ کہنے سے کہ امراء اور وزراء کی غداری اس زوال کی وجہ ہے، قاری کا ذہن صاف نہیں ہوتا۔  
کیونکہ تاریخ اور تاریخی ناول کا قاری یہ ضرور معلوم کرنا چاہتا ہے کہ آخر امراء اور وزراء نے سلطان  
سے غداری کیوں کی؟

اس غداری کی بہت سطحی سی وجوہات بیان کی گئی ہیں اس لیے ہم ذیل میں اس کی مفصل اور مدلل  
تاریخی وجوہات بیان کرتے ہیں تاکہ تاریخ کا طالب علم پوری طرح مطمئن ہو سکے۔  
اس بیان میں ہمیں بعض ایسی باتوں کو دہرانا پڑے گا جو پہلے کہی جا چکی ہیں لیکن بغیر انہیں دہرائے  
تاریخی افسانہ نویسی کا حق ادا نہیں ہوتا۔

آئیے۔ اب ہم حالات و واقعات پر آواز سے ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں:

سلطان شہید کے والد نواب حیدر علی خاں نے جس زمانہ میں سلطنت کی داغ بیل ڈالی اس وقت جنوبی  
ہند میں ان کے مندرجہ ذیل حریف موجود تھے:

اس سلسلہ میں سب سے پہلا نام نواب محمد علی والا جاہ کا آتا ہے۔

یہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ ہندوستان (جنوبی ہند) میں انگریزوں کے قدم حملے والا سب سے پہلا

ران بھی نواب والا جاہ تھا۔ والا جاہ انگریزوں کی تائید اور مدد سے ارکاٹ کا نواب بنا تھا۔ اس کی یہ  
زوتھی کہ کسی طرح حیدر آباد کوں کا بھی حکمران بن جائے۔

اس مقصد کے حصول کے لیے والا جاہ محمد علی نے انگریزوں اور حیدر آباد کے بعض امراء کی مدد  
نظام حیدر آباد کے خلاف سازشیں تیار کرنا شروع کیں۔

والا جاہ ابھی اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو پایا تھا کہ اسے میسور میں حیدر علی خاں کے عروج نے  
اس کو دیا اور وہ حیدر آباد کو چھوڑ کر میسور کو ختم کرنے کے درپے ہو گیا۔

میسور اسی وقت تک صوبہ سرائے کے ماتحت تھا اور نظام الملک آڈل کے زمانہ سے سرائے کا صوبہ بھی  
ناٹ میں ضم ہو چکا تھا۔

والا جاہ اپنے آپ کو پورے جنوبی ہند کا بلا شرکت غیرے مالک سمجھتا تھا۔ اس لیے جب حیدر آباد  
بملاکت جنگ نے صوبہ سرائے کی حیدر علی کو دیدی تو والا جاہ حیدر علی کے خلاف ہو گیا اور اس  
خلاف انگریزوں سے ساز باز کرنے لگا۔

نواب بسالت صوبہ سرائے کا صوبیدار حیدر علی کو بنانے کے بعد زیادہ عرصہ حیدر آباد کا  
ب نذرہ رکھا اور اس کے بھائی نظام الملک دوم نے اسے معزول کر کے خود تخت پر قبضہ کر لیا اس لیے  
یہ پسند نہ تھا کہ اس کے معزول شدہ بھائی کا بنایا ہوا گورنر حیدر علی صوبہ سرائے کا گورنر باقی رہے۔  
کے علاوہ حیدر علی خاں کی طاقت اس قدر تیزی سے بڑھ رہی تھی کہ اسے یہ خطرہ بھی پیدا ہو گیا تھا کہ  
ہ حیدر علی تمام جنوبی و شمالی ہند پر قبضہ کر کے پورے ہندوستان کا بادشاہ بن جائے جبکہ خود  
ادوم بھی شہنشاہ ہند ہونے کے خواب دیکھ رہا تھا۔

جنوبی ہند کی تیسری طاقت یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی بھی ہوس ملک گیری کے تحت پورے ہندوستان پر  
ن ہونے کے خواب دیکھ رہی تھی۔ اس نے ارکاٹ اور حیدر آباد میں اپنی سازشوں اور مکاریوں کا جال  
دیا تھا۔

نواب ارکاٹ والا جاہ نے اسے کو رومٹل کا علاقہ دے دیا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کو اپنی باقی  
ست کا ایجنٹ بھی بنا دیا تھا۔

اس طرح کمپنی یعنی انگریز ارکاٹ کے ایک طرح حاکم بن گئے تھے اور نواب والا جاہ محض  
اوسے کا حکمران رہ گیا تھا۔

انگریزوں کو بھی حیدر علی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی طاقت پسند تھی اور انہوں نے بھی یہ محسوس کر لیا تھا



کہ اگر جنوبی ہند میں حیدر علی خاں کی حکومت باقی رہی تو ان کے قدم ہندوستان میں نہ جم سکیں گے۔ جنوبی ہند کی چوتھی طاقت مرہٹے تھے۔ مرہٹوں کو بھی ایک نئی اسلامی سلطنت کا جنوبی ہند میں تیزی سے اقتدار حاصل کرنا ناگوار لگا رہا تھا۔

جنوبی ہند کی آخری اور سب سے کمزور طاقت ریاست میسور کا ہندو خاندان تھا جسے حیدر علی نے معزول کر کے ایک رسمی سارا جہ بنادیا تھا۔ یہ خاندان حیدر علی سے اپنا افتدار واپس لینے کی کوشش میں تھا، خصوصاً میسور کی رانیاں دن رات اسی تنگ و دو میں لگی رہتی تھیں۔

میسور کے پچھلے حالات میں بیان کیا جا چکا ہے کہ جس وقت حیدر علی، میسور کے سپہ سالار تھے اس وقت راجہ میسور نے اپنے ہندو سردار کھانڈے راؤ اور مرہٹہ شکو کا میدان جنگ میں مقابلہ کی تھی تاکہ حیدر علی کا خاتمہ کیا جاسکے مگر یہ سازش کامیاب نہ ہو سکی۔

اس سازش کے نتیجے میں حیدر علی کو راجہ، کھانڈے راؤ اور مرہٹہ شکو کا میدان جنگ میں مقابلہ کرنا پڑا حیدر علی کامیاب ہوئے اور انہوں نے راجہ کو اقتدار سے محروم کر کے اس کے لیے تین لاکھ کی جاگیر مقرر کر کے اسے مرنگاپٹیم ہی میں رہنے کی اجازت دیدی۔

یہ شاید نہیں، یقیناً بہت بڑی غلطی تھی۔ کیونکہ راجہ کا خاندان اپنی سابقہ شان و شوکت کی واپسی کی سازشوں میں مشغول رہنے لگا تھا۔

نواب حیدر علی خاں کی اس غلطی نتیجے میں ان کے خلاف پہلی سازش ہوئی۔

اس سازش کے بعد مزید سازشوں کا سلسلہ اس طرح شروع ہوا کہ میسور کی رانیاں نے اپنے ایک معتمد رائے درگ سری نواس راؤ کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے گورنر کے پاس بھیجا تاکہ کمپنی حیدر علی کے خلاف انہیں مدد دے۔

اس وقت کمپنی کا گورنر لارڈ پیکاٹ تھا۔ اس نے اس سفارت کا جواب مثبت انداز میں دیا اور رانیاں کو مدد کا یقین دلایا۔

لیکن تب تک انگریزوں کی یہ صرف زبانی یقین دہانی تھی۔ انہوں نے رانیاں سے وعدہ کے باوجود حیدر علی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ دراصل وہ اس وقت حیدر علی کے خلاف کوئی کارروائی کرنے کے قابل ہی نہ تھے۔

ادھر سے مایوس ہو کر رانیاں نے ۱۷۶۵ء میں اپنا ایک ایچی مرہٹوں کے پیشوا مادھو راؤ کے پاس بھیجا۔ وہ پونا میں تھا۔

رانیاں نے اس سے درخواست کی کہ ہندو ہونے کے ناطے وہ میسور کو حیدر علی کے ہاتھوں سے بھات دلائے۔

یہ حیدر علی کے خلاف دوسری سازش تھی۔

اس سازش کے نتیجے میں مادھو راؤ پیشوا ایک بڑے مرہٹہ شکو کے ساتھ حیدر علی پر حملہ آور ہوا لیکن اس نے حیدر علی خاں کے ہاتھوں پہلے درپے شکستیں کھائیں اور اُسے بالآخر صلح کر کے اپنے مرکز پونا واپس جانا پڑا۔

اس کے دو سال بعد یعنی ۱۷۶۷ء میں حیدر علی کے خلاف تیسری سازش ہوئی۔

اس سازش میں محمد علی والا جاہ، نظام الملک دوم اور انگریز یعنی ایسٹ انڈیا کمپنی شامل تھے۔

والا جاہ محمد علی اراکٹ کا خود مختار حکمران ہونا چاہتا تھا اور انگریز اس کے ایجنٹ تھے۔

حیدر آباد کے میراظم اور وزیر اعظم رکن الدولہ انگریزوں کے حال میں پھنس گئے تھے۔ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں نے حیدر آباد سے ایک معاہدہ کیا۔

اس معاہدے میں مندرجہ ذیل شرائط طے ہوئیں:

۱۔ والا جاہ کو صوبہ اراکٹ کا مستقل اور آزاد حکمران تسلیم کیا گیا اور اسے نذرانہ پیش کرنے سے معاف کر دیا گیا۔

۲۔ نظاما دکن نے درپائے کرشنا کے جنوبی علاقے سے دستبرداری لکھ دی۔

۳۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کو نواب والا جاہ کا نائبہ (ایجنٹ) تسلیم کر لیا گیا۔

اس معاہدے میں اور بھی بہت سی شرطیں تھیں لیکن شرط نمبر دس بہت دلچسپ تھی

اس کی رُو سے نظاما دکن نے صوبہ سرکاری دیوانی سات لاکھ روپے سالانہ پیش کش

کے عوض کمپنی کو بخش دیا۔

لیکن صوبہ سرانیر نواب حیدر علی خاں کا قبضہ تھا اس لیے اس معاہدہ کی شق نمبر ۹

کے تحت نواب حیدر علی کو غائب قرار دیا گیا۔

اس سازش کو اپنے طور پر مکمل کرنے کے بعد انگریزوں، والا جاہ اور نظاما کی فوجوں نے مل کر حیدر

پر حملہ کر دیا۔



کے نام تھے۔ یہ سازش بھی پکڑ لی گئی۔  
سازش اس طرح پکڑ لی گئی کہ سرنگاپٹم کے قلعہ دار کرشن راؤ کی بیوی اپنے  
غدار شوہر سے باغی ہو گئی اور اس نے سلطان کی والدہ کے پاس پہنچ کے یہ  
رازا فشا کر دیا کہ اس کا شوہر، سلطان کے خلاف ایک زبردست سازش  
میں ملوث ہے۔  
چنانچہ اس کے شوہر کرشن راؤ کو گرفتار کر کے قتل کر دیا گیا۔

میسور کی تیسری جنگ کے دوران یہ بات کھل کے سامنے آ گئی تھی اور سلطان کو بھی اس کا پتہ چل گیا  
تھا کہ اس کی شکست اس کے غدار امراء اور وزرائے کی وجہ سے ہوئی ہے مگر سلطان نے انہیں ختم کر کے  
اس مصیبت کو ہمیشہ کے لیے دفن کر دینے کے بجائے انہیں معاف کر دیا اور ان سے مسیحی اعلیٰ میں قسم لے کر  
اور حلف اٹھو اگر پھر سازشوں کے لیے کھلا چھوڑ دیا۔  
اس طرح اس نے خود کو امراء اور وزرائے کی طرف سے مطمئن کر لیا اور پارلیمنٹ کی بنیاد رکھی تاکہ رعایا خود اپنے  
ہاتھ میں ملکی انتظام لے لے اور خود وہ فوج کی بحری اور بری طاقت مضبوط کرنے میں لگ گیا۔  
سلطان نے ایک بار پھر اندرون اور بیرون ہند کے مسلمان حکمرانوں کو اسلام کی سر بلندی کے لیے متحد  
کرنے کی کوششیں شروع کر دیں لیکن حکام امراء اور وزرائے کے دل بدل چکے تھے اور انہوں نے بے غیری  
اور ملک و ملت دشمنی کا جیسے بیڑا اٹھایا تھا۔

وہ اپنی غدار یوں سے باز نہیں آئے اور آخر میسور کی چوتھی جنگ میں اس قدر غداری ہوئی جس کے  
ذکر سے روح کا پٹ اٹھی اور قلم تھرا جاتا ہے۔

سلطان نے میسور کی تیسری جنگ کے بعد جس میں سلطان اور انگریز دونوں کو بھاری نقصان اٹھانا پڑا  
تھا، خود کو جلد ہی سنبھال لیا اور اب اس نے انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنے کا محکم ارادہ کر لیا۔  
انگریز بھی سلطان کی کوششوں سے واقف تھے چنانچہ انہوں نے جوان کاروائی کے طور پر سلطان کے خلاف  
سازشوں کا زبردست جال پھیلایا۔

ان سازشوں کے نتیجے میں ہندوستانیوں اور سلطنت کے ہندو افسران کے علاوہ ہندو عوام بھی کھل کر  
سلطان کے خلاف ہو گئے۔

بیچ دیا گیا۔ ان سازشوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔  
انگریزوں نے عبسور ہو کر سلطان شیپو سے سلطان کی شرائط پر  
معاہدہ کیا۔

میسور کی دوسری جنگ سے مرہٹوں اور نظام کو یہ امید ہوئی تھی کہ  
اس جنگ میں سلطان کا خاتمہ ہو جائے گا مگر ان کی امیدوں پر اس وقت  
پانی پھر گیا جب سلطان نے اس جنگ میں فتح حاصل کی۔  
چنانچہ مرہٹوں اور نظام میں ۸۴ء میں ایک معاہدہ ہوا جس کا نام معاہدہ  
ایت گہ تھا۔

یہ دراصل سلطنت خداداد کے خلاف ساتویں سازش تھی۔  
بہر حال نظام اور مرہٹوں کے مشترکہ لشکر نے سلطان کے خلاف جنگ کا  
آغاز کر دیا۔ یہ جنگ تین سال جاری رہی اور اس کے نتیجے میں نظام دکن اور  
مرہٹوں کو شکست ہوئی اور انہیں اپنے کچھ علاقوں سے ہاتھ دھونا پڑا۔  
سلطنت خداداد کے خلاف ساتویں سازش میں رانی کے دیوان تیل راؤ  
اور اس کے بھائی نارائن راؤ کا سب سے زیادہ ہاتھ تھا۔ ان دونوں نے  
انگریزوں سے مل کر پھر سازش کی اور انگریز جنرل سندرز نے سلطان کے  
خلاف جنگ چھیڑ دی۔ سلطان نے میدوز کو کوہیم شکستیں دے کر اس کے  
غور کو توڑ دیا۔

اس کے بعد سلطان کے خلاف آٹھویں سازش ہوئی۔  
اس موقع پر انگریز امریشے اور نظام تینوں یکجا ہو گئے۔ انہوں نے  
مل کر سلطان کے خلاف کاروائی کی۔

یہ بڑی زبردست سازش تھی اور میسور کی رانیاں اور ان کے گھر کے  
دور پردہ اس میں شریک تھے۔

اتفاقاً عین میدان جنگ میں کرنل ریڈ کا ایک جاسوس پکڑا گیا جس کے  
پاس جاس کے نام خط تھا۔ جاسوس نے یہ خط ایک ہائی کے اندر چھپا رکھا تھا  
جسے وہ عساکے طور پر استعمال کرتا تھا۔ اس میں شیشہ گری راؤ اور کرشن راؤ

پھر میسور کی وہ چوتھی جنگ ہوئی جس میں ایہاں فروشی اور نمک حرام امراء و وزرائے محل کر سلطان کے خلاف کام کیا اور سلطان ایک بہادر سپاہی کی طرح دھڑا ہوا میدان جنگ میں شہید ہو گیا۔  
سلطنت کے حصے بٹے کر کے انگریزوں اور نظام نے آپس میں تقسیم کر لیے۔

اور  
میسور کے معزول ہندو خاندان کو ایک بار پھر میسور کی گدی بخشی گئی۔

ان حالات کے بیان کے بعد قارئین یہ معلوم کرنے کے ضرور خواہشمند ہوں گے کہ:  
سلطان کے خلاف جن لوگوں نے سازش کی ان کی اصلیت کیا تھی؟ اور انہوں نے اپنی غداری کا کیا صلہ پایا؟

یہ بات تو ہم آپ سمجھی جانتے ہیں کہ سلطان کی شہادت اور انگریزوں کی فتح ان کے ہتھیاروں یا ان کے فوجیوں کی بہادری کی وجہ سے نہیں ہوئی بلکہ یہ فتح انہیں سلطان کے گھر کے بھیدیوں کی وجہ سے حاصل ہوئی تھی۔ ان نمک حراموں کو انگریزوں کے حکم جاسوسی نے طرح طرح کے لالچ دے کر اپنے ساتھ ملا لیا تھا۔ سلطان کے یہ نمک حرام، غدار اور ایہاں فروشی امراء اور وزراء یہ چاہتے تھے کہ سلطنت، سلطان کے ہاتھ سے نکل جائے اور انگریز فتح یاب ہو کر انہیں مال و دولت اور اعلیٰ عہدوں سے نوازے۔

پس۔

جب اتحادیوں کی فوجیں سلطنت کی حدود میں داخل ہوئیں تو انگریزوں کے جاسوس اور سپاہی بھیس بدل کے ان غداروں کے مکانات میں آ مقیم ہوئے جو اس سازش میں شریک تھے۔

یہ تمام لوگ تقریباً مسلمان ہی تھے اور یہ تو ابھی تک مشہور ہے کہ شرچاپور (بالاپور) اور دیون ہلی والوں نے انگریزوں کو اپنے گھروں میں چھپا کر رکھا تھا جس کا عاوضہ بعض خاندانوں کو "چراغی" کے نام سے ملتا تھا۔

انگریزوں کی پیش قدمی جاری رہی۔

نمک حرام میرصادق، سلطان کو یہ یقین دلانے لگا کہ انگریزوں کی کیا جلال کہ وہ سلطنت کی حدود میں داخل ہونے کی جرأت کر سکیں۔

پھر جب سلطان خود تلوار سونت کر انگریزوں کے مقابلے پر آیا تو میرمعین الدین اور پورنیا نے سلطانی فوجوں کو انگریزوں کے توپ خانہ کی زد پر لگا کر ہزاروں مسلمانوں کو شہید کر دیا۔

میر قزالدین جو سلطان کے بعد خود سلطان بننے کے خواب دیکھ رہا تھا وہ انگریز فوج کے پیچھے پیچھے

اس طرح آیا جیسے دشمن کے بار بار وار و ستون میں شامل ہو۔

میر قاسم نے جرنل مارکس کے دستوں کی قطعہ کے اندر تک رہنمائی کی تھی اور قطعہ کے غداروں کا یہ عالم تھا کہ ان کے حکم سے توپوں میں گولوں کے بجائے سس اور مٹی بھر کر انگریزوں پر پھینکی جاتی تھی۔

سید غفار کو انہی غداروں نے شہید کر دیا۔

فوج کو تنخواہ کے بہانے تحصیل سے ہٹا لیا گیا۔

سلطان کو قطعہ سے نکال کر دروازہ بند کر لیا گیا۔

حد تو یہ ہے کہ اس مجاہد بے مثل کو آخری دقت میں پانی کا ایک قطرہ بھی نہ دیا گیا اور اس کی شہادت کے بعد اس کے وارثوں کو سلطنت سے محروم کر دیا گیا۔

سلطان نے ان غداروں اور ایہاں فروشیوں کے ساتھ کیا حسن سلوک کیا اور انہوں نے اس کا کیا صلہ دیا؟ یہ سب باتیں تاریخ ہند اور تاریخ جنوبی ہند کا حصہ بن چکی ہیں۔

ہندوستان اور خاص کر مسلمان قوم ان نمک حراموں کو نہیں بھول سکتی جنہوں نے جلد مازی، دنیا داری اور لالچ میں آ کر ایک ہولناک ہجری اور جلیل القدر مسلمان حکمران کو شہید کرانے میں انگریزوں کا پورا پورا ساتھ دیا۔ ان کی غداریوں اور سیاہ کاریوں کی داستان بہت طویل ہے یہاں پر ہم صرف ان کا ایک مختصر سا جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

بنگال کے نواب سراج الدولہ کے ساتھ غداری کرنے والوں میں میر جعفر کا نام سرفہرست ہے۔ بالکل اسی طرح میسور میں جن لوگوں نے سلطان شیو کے خلاف نمک حرامی اور غداری کا مظاہرہ کیا ان میں سب سے پہلا اور بڑا نام میرصادق کا ہے۔

میر صادق پہلے صوبہ سرزمین رہتا تھا بعد میں ارکاٹ چلا گیا۔ یہ وہی ارکاٹ ہے جس کا حکمران والا جاہ محمد علی تھا۔

جب ارکاٹ کو حیدر علی خاں نے فتح کیا تو والا جاہ کے بہت سے ملازم حیدر علی کی ملازمت میں آ گئے ان میں یہ میر صادق بھی تھا۔

حیدر علی نے اسے ارکاٹ کا ناظم مقرر کر دیا تھا۔

"سلطانی میں میر صادق نے پہلے آصف کے درجہ پر ترقی پائی۔ اس کے بعد سلطان کا چیف سیکرٹری

اور وزیر بنا۔

میسور میں یہ بات عام طور پر مشہور ہے کہ میر صادق دراصل نظام دکن کے وزیر اعظم میر عاظم کا بھائی تھا یہ بھی النعل اور اہل تشیع سید تھا۔

صاحب تاریخ سلطنت خداداد محمود جنگواری کا بیان ہے کہ:

”میر فارسی لفظ ہے، معلوم ہوتا ہے کہ سادہ و عجم نے عرب اور عجم میں امتیاز رکھنے کے لیے، سید کیونکہ عربی لفظ ہے اس لیے اس کے بجائے میر کا لفظ

جو کہ فارسی ہے، اسے رواج دیا تھا“۔

میر صادق کی سلطان سے دشمنی کی وجہ یہ بیان کی گئی ہے کہ سلطان نے اسے ایک بار معزول کر دیا تھا۔ پھر بعد میں اسے بحال بھی کر دیا تھا مگر یہ میر زادہ اس توہین کا درد پروردہ انتقام لینے پر تلا ہوا تھا۔

اس بات میں کچھ زیادہ وزن معلوم نہیں ہوتا۔ میر صادق فطرتاً کیمنہ پروردہ اور کیمنی فطرت کا انسان معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے کہ جب حیدر علی خاں نے نواب ارکاٹ کو شکست دے کر ارکاٹ پر قبضہ کیا تھا تو اس شخص نے حیدر علی کو خوش کرنے کے لیے کہا تھا:

”نواب بہادر۔ میں نے اتنے روز والا جاہ محمد علی کی اس قدر خدمت کی مگر اس نے

میر ان خدمات کا کوئی صلہ نہ دیا۔ مجھے تو بیوں محسوس ہوتا ہے جیسے میں اب

نیک قید خانہ میں تھا اور آج آزاد ہوا ہوں“۔

میر صادق نے اپنی چالاکی اور چالوسی سے بہت جلد حیدر علی کے مزاج میں دخل حاصل کر لیا اور نواب نے اسے ارکاٹ کا ناظم مقرر کر دیا۔

انگریز مورخ ملکس اور بوننگ لکھتے ہیں:

”میر صادق نے میسور کی تیسری جنگ کے بعد رعایا پر تشدد شروع کر دیا

تھا۔ مقصد یہ تھا کہ رعیت کو سلطان کے خلاف کیا جائے“۔

میسور کی تیسری جنگ کے بعد سلطان نے ایک مجلس شوریٰ بنا کر رعایا کو حکومت کی ذمہ داری دے دی تھی۔ اس پارلیمنٹ یا مجلس شوریٰ کا نام ”زمرہ غم نہا شدہ“ رکھا گیا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ جب رعایا کو حکومت کا ذمہ دار کر دیا گیا یعنی حکومت عوام کی ہو گئی تو پھر نہ تو عوام کوئی سازش کریں گے اور نہ ترقی کے کاموں میں دخل اندازی کریں گے۔

صاحب نشان حیدری لکھتے ہیں کہ:

”میر صادق نے اپنے رسوخ سے اس پارلیمنٹ کو یکساں بنا دیا تھا اور

تمام اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے تھے۔“

اسی کتاب میں ایک اور جگہ رقم ہے:

”یہ میر زادہ (میر صادق) جب سلطان کے روبرو ہوتا تو بات پر

قرآن کی قسم کھاتا تھا اس لیے سلطان کو اس پر حد درجہ اعتماد تھا“۔

سیوگزیٹر کا مصنف بحوالہ کر مانی لکھتا ہے:

”میر صادق، سلطان تک کوئی خیر پہنچنے نہیں دیتا تھا“۔

یہی وجہ تھی کہ سلطان کو میسور کی تیسری اور چوتھی جنگ میں مسلسل شکستیں اٹھانا پڑیں۔

محاصرے کے آخری دن یعنی ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو جب سلطان کو انگریزوں کے قلعہ میں آنے کی اطلاع ملی تو سلطان سوار ہو کر ڈی دروازے سے باہر نکلا۔

اس وقت اس ملک حرام میر صادق نے ڈی دروازے کو اندر سے بند کر دیا۔ اسے خطرہ تھا کہ کہیں سلطان واپس آ کر انگریزوں سے صلح نہ کر لے۔

دروازہ بند کرانے کے بعد اس ایسا فریاد و فغاں اٹھایا کہ انگریزوں کو نصیب قلعہ پر سلطان کی موجودگی کی خبر بھیجی جس کے نتیجہ میں انگریز فوجوں نے سمٹ کر تین اطراف سے سلطان پر گولیوں کی بارش کر دی اور سلطان تشدد ہو گیا۔

میر صادق کی غداری کا پتہ اس تصویر سے بھی چلتا ہے جو دریا دولت باغ کی مغربی دیوار پر بائیں جانب لگی ہے۔

اس تصویر میں دکھایا گیا ہے کہ میر صادق، گھوڑے پر سوار سلطان کے آگے ہاتھ جوڑے تسلیم کرتا ہوا،

منہ پھیر کر انگریز فوج کو اشارہ کر رہا ہے کہ:

”سلطان یہی ہے“۔

اس تصویر میں دوسرے غداروں کو بھی دکھایا گیا ہے جو دائیں اور بائیں سے اشارے کرتے ہوئے

بتلا رہے ہیں کہ:

”سلطان یہی ہے“۔

یہ تصویر کرنل ولزلی کے حکم سے کھینچی گئی تھی۔

تاریخ نشان حیدری میں لکھا ہے:

کچھ بھی ہو مگر اس کی قبر عبرت کا ایک نمونہ ہے اور اس پر ایسی دیرانی برستی ہے کہ دیکھنے والے پر خوف اور دہشت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔  
علامہ اقبال نے جاوید نامہ "میں عالم خیال میں دوزخ کے اس طبقہ کی تصویر کھینچی ہے جہاں ارواحِ ذلیلہ رکھی جاتی ہیں۔ دہلی ہنگال کے غدار میر جعفر اور میسور کے غدار میر صادق کو اس طرح رکھے ہوئے دکھایا گیا ہے:

اندرونِ او دو طاغوتِ کمن  
روحِ قویٰ کشتہ از بسہِ وطن  
جعفر از ہنگال و صادق از دکن  
ننگِ آدم، ننگِ دیں، ننگِ وطن

ترجمہ:

یہاں (دوزخ میں) دو ایسے پُرانے شیطانوں کی روحیں موجود ہیں جنہوں نے قوم اور وطن کی روحوں کو قتل کر دیا تھا۔  
ان میں ایک روح ہنگال کے مردِ مجاہد اور شہیدِ آزادی سراج الدولہ کے قاتل میر جعفر کی ہے اور دوسری روح شیردکن سلطان پٹو اور سلطنتِ خداؤں کے قاتل میر صادق کی ہے۔

علامہ اقبال کی اس نظم بھی یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ میر جعفر اور میر صادق دونوں مچکے ہیں سیکیں ان کی روحیں زندہ ہیں اور ملتوں اور قوموں کو غارت کرنے کے لیے آج بھی جگہ جگہ میر جعفر اور میر صادق موجود ہیں۔

اس فریاد کو سن کے دوزخ بھی ان شیطانوں کی ارجح کو قبول کرنے سے انکار کر دیتی ہے  
اس پر یہ غدار دہائی دیتے اور فریاد کرتے ہیں تو دوزخ جواب دیتی ہے کہ:  
"یہ دنیا بے ابتدا اور بے انتہا ہے اور یہاں غدار کسے لیے کپٹی جگہ نہیں اور نہ اس کا کوئی مولا ہے۔"

"نہک حرام میر صادق نے سلطان کو مورچہ کی طرف جلتے ہوئے دیکھ کر ڈوڑی دروازہ کو جو سلطان کی واپسی کا راستہ تھا بند کر دیا اور خود گنجام کا راستہ لیا (نہک قلعہ کے باہر جا کر اپنی کونٹھی میں رہے) لیکن جب وہ قلعہ کے مشرقی دروازے پر پہنچا تو سلطان کے ایک جانشین سپاہی نے جو اُسی کی نہک حرامی سے واقف ہو چکا تھا، اسے گھوڑے سے کھینچ کے تلوار کے ایک ہی وار سے اس کا کام کر دیا۔ اس کے چار دن بعد اس کی بے گور و کفن لاش اسی جگہ گاڑ دی گئی۔  
آج بھی لوگ آتے جلتے اسی کی قبر پر تھکتے، پیشاب کرتے اور لعنت سے یاد کرتے ہیں۔"

جس سپاہی نے نہک حرام میر صادق کو قتل کیا تھا اسی کا نام احمد خاں تھا۔ وہ کمر پتہ کا باشندہ تھا۔ عام طور پر یہی مشہور ہے کہ میر صادق کی لاش اسی جگہ دفن کر دی گئی جہاں وہ قتل ہوا تھا اور آج بھی لوگ قلعہ کے مشرقی دروازے کے قریب مٹی کے ایک ڈھیر پر پتھر اور ٹھنڈا مار تے اور پیشاب کرتے ہیں۔  
عمود بنگلوری کا خیال ہے کہ:

"جس طرح میر معین الدین کی قبر کو یہ کہہ کر لوگوں کی لعنت اور نضہ سے محفوظ کر لیا گیا کہ وہ ایک بڑے پیر کی قبر ہے اسی طرح میر صادق کی اصل قبر کو چھپایا گیا ہو اور یہ بات مشہور کر دی گئی ہو کہ وہ غدار جس جگہ قتل ہوا تھا، اسی جگہ دفن ہے۔ لیکن اس بارے میں کوئی مصدقہ روایت نہیں ملتی۔ یہ مفروضہ ہے کہ لوگ میر صادق سے اس قدر برا فردضہ تھے کہ اس کی قبر بھی بنانے دیتے تھے۔"

ایک تحقیق یہ بھی ہے کہ:

"میر صادق کی لاش کو انگریزوں نے اٹھ کر قلعہ کے شمال مشرق میں برج سے تھوڑے فاصلے پر دفن کر دیا تھا مگر انگریزوں کو یہ علم نہ تھا کہ مسلمانوں کے مردے شمالاً جنوباً دفن ہوتے ہیں۔ اس لیے انگریزوں نے اسے شرقاً غرباً دفن کر دیا اور اس کی یہ قبر آج تک اسی طرح (شرقاً غروباً) موجود ہے۔"

سلطان کے جن بڑے بڑے امرا اور وزرا نے سلطان اور ملک و ملت سے غداری کی میر غلام علی بنگال

ان میں دوسرے نمبر پر ہے۔

بہس وقت نواب حیدر علی خاں نے اراکٹ فتح کیا تھا تو میرنگڑ ابھی میر صادق اور دوسرے ملازمین مرکار اراکٹ کے ساتھ، خوشامد کر کے حیدر علی کی ملازمت میں آگیا تھا اور یہاں آتے ہی میر صادق کا دست باز دین گیا تھا۔

سلطان کے دربار میں میر صاحبان کی جو ایک فوج کی فوج نظر آتی ہے، یہ سب کے سب نواب بہادر کے نیک خوار تھے جو اراکٹ کی فتح کے بعد سلطنت خداداد کی خدمت میں آگئے تھے۔

میر غلام علی لنگڑ ابھی عجی سید زادہ تھا اور اس کا تعلق شیعہ فرقے سے تھا۔ سلطان نے باپ کے انتقال پر ان کے تمام امراء اور وزراء کو اپنی ملازمت میں قبول کر لیا تھا۔ سلطان نے اس لنگڑے کو افواج کا ناظم (آئی جی) بنادیا تھا۔ بعد میں یہ میریم (لارڈ آف دی انڈیز میٹری) اور وزیر بنا۔

میرنگڑ ابطا تیز طرار، چالاک اور زود فہم تھا۔ سلطان نے دربار ترکی اور دیگر شاہوں و بادشاہوں کے درباروں میں جو سفارتیں بھی نہیں یہ ان میں شامل رہا تھا۔

یہ شخص حاضر جوانی میں اپنا نانی نہ رکھتا تھا۔

ایک مرتبہ جب یہ قسطنطنیہ (ترکی) کی ایک سڑک پر جا رہا تھا تو اچانک بارش آگئی۔ یہ پناہ لینے کے لیے تیز تیز بھاگنے لگا۔

اس کے ساتھ جو ترکی افسر تھا، اس نے کہا:

”بارش تو خدا کی رحمت ہوتی ہے۔ تم اس سے کیوں بھاگ رہے ہو؟“

میرنگڑ نے فوراً جواب دیا:

”بے شک بارش رحمت الہی ہے مگر میں اس وجہ سے بھاگ رہا ہوں کہ کہیں بارش میرے قدحوں تلے نہ آجائے اور یہ بات اس کی بے حرمتی کا باعث ہوگی۔“

اسی میرنگڑ کے بارے میں یہ قصہ بھی مشہور ہے کہ جب وہ قسطنطنیہ کے بعد مصر و عرب سے واپس کر رہا تھا تو اس کے پاس بہت سے قیمتی ثنائت اور مال و دولت تھی جو اسے ترکی اور مصر میں نذر کی گئی تھی۔

شریف مکہ جو انتہائی لالچی آدمی تھا، اتنا مال و دولت دیکھ کر اس کے منہ میں پانی بھر آیا اور اس نے میرنگڑ سے کہا:

”میر غلام علی۔ تمہاری سفارت کا انتہا بڑا اثر ازلے کر سفر کرنا مناسب نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ تم یہ خزانہ فی الحال خرمن دیدو۔ پھر بوقت ضرورت یہ قرض تمہیں بھجوا دیا جائے گا۔“

میرنگڑ، شریف مکہ کی نیت بھانپ گیا۔

اس نے اسے کوئی جواب نہ دیا بلکہ عرب میں اپنے قیام کو طویل کر دیا تاکہ وہ شریف مکہ کو یہ اطمینان دلا سکے کہ اسے شریف مکہ سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔

دوسری طرف اس نے سلطان کی طرف سے ایک جعلی خط خود اپنے نام لکھ کر چند آدمیوں کو دہان سے باہر بھجوا دیا۔

یہ لوگ وہ جعلی خط جو میرنگڑ کے نام تھا لیکر مکہ پہنچے۔ مکہ میں باہر سے آنے والوں کی سخت تلاشی لی جاتی تھی۔ چنانچہ وہ جعلی خط شریف مکہ کے آدمیوں نے برآمد کر کے شریف مکہ کو پہنچا دیا۔ شریف مکہ نے وہ خط کھول کر پڑھا۔ اس میں سلطان نے میرنگڑے کو لکھا تھا:

”میر غلام علی کو معلوم ہو کہ خدا کے فضل و کرم سے پورا ہندوستان ہم نے فتح کر لیا ہے۔ اب ہم بہت جلد ایک زبردست فوج کے ساتھ ساحل عرب پر

حملہ کرنے والے ہیں تاکہ مقامات مقدسہ پر بھی سلطنت خداداد کا قبضہ رہے۔“

یہ خط پڑھ کر شریف مکہ کے ہوش اڑ گئے اور اس کے لڑکے اور اداوے ٹھٹھے پڑ گئے۔ اس نے میرنگڑے کی بہت زیادہ خدمت کرنا شروع کر دی۔ مبادا وہ سلطان کے حملہ کی صورت میں کہیں اس کی شکایت سلطان سے نہ کر دے۔

میر غلام علی کے لنگڑا ہونے کا سبب یہ بیان کیا گیا ہے کہ وہ بے انتہا مغرور اور خود پرست تھا۔ کسی کے سامنے سوجھ کانا نہ اپنی تو میں سمجھتا تھا اس لیے اس نے اپنی انائی نہیں کے لیے کسی حکم سے کوئی دوا لے کر استعمال کی جس سے اس کے ایک پیر میں ننگ پیدا ہو گیا۔

چنانچہ جب کبھی اسے دربار میں جانا ہوتا تو وہ چاندی کی ایک چوکی پر بیٹھ کے جاتا تھا اور انگریزوں میں وہ ”غلام آف دی سلور چیئر“ (نقرتی چوکی کا غلام) کے نام سے مشہور تھا۔

نواب حیدر علی کے زمانے میں طرز معاشرت اور دربار داری کے اصول کچھ اور تھے۔ ان کے دربار میں تعظیم و تکریم لازمی خیال کی جاتی تھی اور یہی وجہ میر غلام علی کے پریشک کر لینے کی تھی کہ دربار میں تعظیم و تکریم سے اسے معذور سمجھا جائے۔

سلطان کے برسرِ اقتدار آنے تک میر غلام علی یا تو واقعی لنگڑا ہو گیا تھا یا لوگوں نے اسے ہمیشہ کا لنگڑا تسلیم کر لیا تھا۔

سلطان نے لارڈ کارنوالس سے معاہدے کی شرائط طے کرنے کے لیے میرنگڑے ہی کو بھیجا تھا۔ جب

یہ انگریزی کیپس پہنچا تو اس طرح کہ وہ چاندی کی چوکی پر بیٹھا تھا اور چوکی اٹھائے دو آدمی چل رہے تھے۔ وہاں لارڈ کارنوالس کے علاوہ مرہٹہ سردار اور میر نظام علی خاں بھی بیٹھے تھے۔

غلام علی خاں چوکی سے اترے اور فرشتے پر پاؤں پھیلے کے بیٹھ گیا۔ یہاں یہ تھا کہ وہ لنگڑا ہے۔

غلام علی خاں نے یہ خبر سلطان تک پہنچا دی اور یہاں تک بخبری ہوئی کہ میر لنگڑا نے چوکی کیا ہوا سامان اپنے گھر کے کس کمرے میں رکھا ہے؟

سلطان نے کوڑا لے کر میر لنگڑے کے محل پر چھاپہ مارنے کا حکم دیا بخبری بالکل صحیح ہوئی تھی۔ تمام تحائف برآمد کر لیے گئے۔

سلطان نے بڑے افسوس کے ساتھ اسے نظر بند کر دیا۔ یہ بات بھی مشہور ہے کہ اپنے قسطنطنیہ میں قیام کے دوران میر لنگڑے نے وہاں موجود انگریز سفیر سے رشوت لے کر اسے سلطان کے اس خط کے مندرجات سے آگاہ کر دیا تھا جو سلطان نے ترکی کے خلیفہ کو لکھا تھا۔

اب یہ سلطان کی کمزوری تھی یا عفو و درگزر کی انتہا کہ سلطان نے اسے چند ہی دنوں بعد معافی دیکر رہا کر دیا۔ یہ نہیں بلکہ اس کے عہد سے میں اضافہ کر کے اسے وزیر بحر بنا دیا۔ سلطان کو اس پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ ہر کام میں اس سے مشورہ لیا کرتا تھا۔

ان تمام نوازشات کے باوجود یہ ایسا نامک حرام تھا کہ یہ سلطان کا شدید مخالف ہو گیا اور جب سلطان کی شہادت کے بعد سلطنت قبضہ ہونے لگی اور سلطان کے کسی شہزادے کو تخت نشین کرنے پر غور شروع ہوا تو یہی غدار شخص نے یکیش کے سامنے کہا تھا کہ:

افعی کشتن و بچہ اش را نگہداشتن کار خردمندان نیست  
(سامنے کو مارنا اور اس کے بچہ کو بالنا کوئی عقلمندی کی بات نہیں)

مشہور ہے کہ میر لنگڑے کی اسی رائے کے پیش نظر یکیش نے سلطان کے شہزادوں کو نہ صرف سلطنت

ختم کر دیا بلکہ پورے شاہی خاندان کو مع جملہ متعلقین اور غلام اور لونڈیوں کے مرزگا پٹم بدر کر کے مٹے بیچ دیا۔

اپنے نئے حسن و آقا کو سامنے سے تشبیہ دینا اور اس کے بچوں کو سلطنت سے محروم کرنا میر غلام علی لنگڑے جیسا نامک حرام اور ایمان فروش ہی کر سکتا تھا۔

بقول محمود بنگلوری:

"میر غلام علی لنگڑے کو دراصل یہ خطرہ تھا کہ اگر سلطان کے کسی شہزادے کو حکومت مل گئی تو وہ اس سے ضرور انتقام لے گا۔ اس لیے میر لنگڑا اور اس فتنیل کے تمام لوگوں کی یہ کوشش تھی کہ حکومت شہزادوں کو نہ دی جائے اور وہ اس میں کامیاب ہوئے۔"

میر غلام علی کی قبر اس کے بولے ہوئے قبرے میں ہے۔ گنبد میں دو قبریں ہیں۔ ایک بڑی اور بری چھوٹی۔ بڑی قبر میر لنگڑے کی ہے۔

لوگوں کے ڈر کی وجہ سے بڑی قبر ایک زمانہ تک زمانہ طرز کی بنی رہی۔ پھر بعد میں تبدیل دی گئی تھی۔

کتاب مرزگا پٹم کے مصنف پارسنس نے میر لنگڑے کا مقبرہ دیکھا تھا اور اس نے ۱۹۳۱ء میں یہ لکھا کہ:

"گنبد میں دو زمانہ قبریں ہیں۔"

ن جب وہ ۱۹۳۹ء میں وہاں دوبارہ گیا تو بڑی قبر مردانہ طرز کی بنا دی گئی تھی۔ چنانچہ اس نے واپس لکھا کہ:

"اب وہ قبر مردانہ طرز پر بن گئی ہے جو دس سال پہلے زمانہ طرز کی تھی۔"

میر غلام علی لنگڑا، ذوالمرزگا پٹم کے بعد دس سال تک زندہ رہا۔ کرنل کرک پیٹرک نے اسے کہہ:

"میں نے میر غلام علی لنگڑے کو ۱۸۰۹ء میں مرزگا پٹم میں دیکھا تھا۔ اس کے عزیز و اقارب اب بھی دیلور اور حیدر آباد میں موجود ہیں۔"

انگریز اس شخص کی چالاکی اور بددیانتی سے اس قدر مخالف تھے کہ انہوں نے ذوال سلطنت کے بعد کوئی سرکاری عہدہ نہیں دیا۔ اسے صرف تین ہزار طلائی پکودے سالانہ دے کر کاروبار سلطنت سے



ہمیشہ کے لیے الگ کر دیا گیا۔

لڑکی نے کنوئیں میں گر کر خود کشی کر لی۔

ایک اور بیان کے مطابق لڑکی کے عزیزوں نے اپنی جھوٹی انا اور خاندانی غفلت پر اس بے گناہ لڑکی کو قربان کر دیا۔

یہ وہ داغ تھا جس نے اہل نائطہ کو سلطان کا دشمن بنادیا۔

اس عداوت اور دشمنی کا بدلہ لینے کے لیے میسور کی تیسری جنگ میں ہندی علی نائطہ نے عید گاہ کا مورچہ عذاری کوہ کے انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔

اسی طرح میسور کی چوتھی جنگ میں جب سلطان نے جتن درگ جلنے کا فیصلہ کیا تو محمد مراد نائطہ کے بیٹے بدر الزماں نائطہ نے باقاعدہ سازش کے تحت سلطان کو دباؤ جانے سے روک دیا۔ یہی وجہ ہے کہ میسور کے مسلمان سلطنت خداداد کا تباہی کا ذمہ دار اہل نائطہ کو گردانتے ہیں۔

یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اہل نائطہ نے سلطان کی مکمل تباہی کا مقصد پہلے سے ہی تیار کر رکھا ہو مگر جب انگریز فیصل پر بغیر کسی مزاحمت کے چڑھ آئے اور سلطان کی واپسی کا راستہ بند ہو گیا تو لوگوں کی ہمتیں ٹھہریں اور انہیں معلوم ہو گیا کہ یہ سب اہل نائطہ کی عذاری سے ہو رہے۔ چنانچہ انہوں نے ان عذاروں اور ان کے ساتھیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔

سلطان کے دفا داروں نے چار شے داروں اور محمد درویش کو قتل کر دیا۔ علی رضا، غلام علی نائطہ اور بدر الزماں خاں کہیں چھپ گئے اور دفا داروں کے ہاتھ نہ آ سکے، اس وجہ سے بچ گئے مگر میر صادق اور شیر خاں قتل کر دیے گئے۔

عام طور پر سلطان کی شکست اور شہادت کی ذمہ داری میر صادق پر ڈالی گئی ہے اور یہ محض اتفاق تھا کہ یہ عذار سب سے پہلے قتل ہو اور نہ اس کی پوری ذمہ داری اس کی مجلس وزارت پر آتی جس میں غلام علی نائطہ، بدر الزماں نائطہ اور علی رضا اور اس کے رشتہ دار تھے۔ گویا ان سب نے مل کر سلطان کو تخت سے لے کر کے مارے کی سازشیں کیں مگر وہ تو سلطان کی اولوالعربی اور حوصلہ مندی تھی کہ ان کی ایک نہ جلتی تھی چنانچہ یوں نے یہ فیصلہ کیا کہ سلطان کسی صورت شہید ہو جائے تو قصہ ہی ختم ہو جائے۔ ان کا خیال تھا کہ سلطان بے جانشین اتنے طاقتور نہیں کہ ان کی سازشوں کا مقابلہ کر سکیں۔

انگریزوں نے نائطہ کی عذاری کے صلہ میں انہیں پیشین اور جاگیریں دے کر مرزا کاظم سے رخصت کر دیا۔

بدر الزماں خاں کو تین ہزار پلوں سے مالانہ کی پیشین ملی جس کے لیے اس نے اہل نائطہ اور اہل ایمان بچا تھا

سلطنت خداداد کا تیسرا بڑا غدار اور ایمان فروش بدر الزماں خاں نائطہ اور اس کے خاندان کا بیان کیا گیا ہے۔

جس طرح ارکاٹ کی فتح کے بعد میردوں کا خاندان (میر صادق، میر سنگھ، میر قمر الدین وغیرہ) مرزا کاظم کو اپنا خاندان ہی طرح اہل نائطہ بھی ارکاٹ سے مرزا کاظم آگئے تھے۔

اس خاندان نے نواب حیدر علی خاں کے افسروں میں سب سے پہلے بددی بھیلہ تھی۔ فضل اللہ خاں ہمدت جنگ کی معزولی اہل نائطہ کی سازشوں ہی کا نتیجہ تھی۔

اہل نائطہ آداب گفتگو اور آداب نشست و برخاست کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جب یہ لوگ حیدر علی خاں کی ملازمت میں آئے تو انہوں نے دربار کے آداب میں انقلاب پیدا کر دیا۔

حیدر علی کو پہلے درباری آداب کا انتخاب نہ تھا لیکن اہل نائطہ کے آنے سے اس کے دربار میں شان و شوکت اور طریقے برتنے جانے لگے۔

ان لوگوں کو اپنے ذاتی حسب و نسب پر بھی بڑا ناز تھا۔ اہل نائطہ کا دکن میں بے حد اثر و رسوخ اور پہنچ تھی۔

بدر الزماں نائطہ اور اس کے خاندان والے سلطان سے اس لیے ناراض اور جوش انتقام میں بھرے ہوئے تھے کہ سلطان نے اپنے برادر نسبتی برہان الدین کی شادی بدر الزماں کی بیٹی سے طے کر دی تھی۔

اہل نائطہ اپنے خاندان کو دنیا کا سب سے معزز اور اپنے نسب کو سب سے اعلیٰ سمجھتے تھے۔ سلطان جب بدر الزماں کی بیٹی کا رشتہ ملا تو بدر الزماں انکار تو نہ کر سکا مگر اسے بہت ناگوار گزرا۔

بیان پر اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہے کہ حیدر علی خاں کو خالقین اور ہندوؤں نے بڑا ناز کرنے کے لیے یہ مشہور کر دیا تھا کہ وہ نامک خاندان سے تعلق رکھتے ہیں اس لیے وہ کم ذات ہیں۔

مکن ہے کہ ہندوستان یا ہندوؤں میں نائیک کوئی ذات ہو مگر حیدر علی خاں خاندانی طور پر نامک نہیں تھے بلکہ ان کے والد نے جینیت نائیک فوج میں نوکری کی تھی۔ یہ عمدہ اس وقت بھی فوج میں موجود تھا اور آج بھی موجود ہے۔

برہان الدین اور بدر الزماں کی بیٹی کی شادی ہوئی اور ایک بیان کے مطابق شاہ

زادِ اہلِ مملکت کے بعد وہ ایک عرصہ تک زندہ رہا۔  
وہ کس نے اپنی تاریخ مرتب کرنے میں بدر الزماں نائٹ سے مدد لی تھی لیکن اس کے ساتھ ہی اس نے ایک جگہ لکھا تھا کہ:

بدر الزماں نائٹ کی باتوں میں سچائی نہیں ہوتی تھی۔

بدر الزماں کی سلطان سے عداوت کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ ایک مرتبہ سلطنت کے وزیر اعظم میر صادق نے سلطان سے بدر الزماں کی شکایت کی تھی اور سلطان نے بدر الزماں کو دو ہفتے کے لیے نظر بند کر دیا تھا۔ اس وجہ سے وہ سلطان کا دشمن ہو گیا تھا۔

بالفرض اگر ایسا کوئی واقعہ پیش آیا بھی تھا اور بدر الزماں کو سلطان سے پرغاش ہو گئی تھی تو اسے سلطان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا چاہیے تھی نہ کہ اس نے سلطنتِ خداداد ہی کو اپنی اس دشمنی کی بھینٹ چڑھا دیا۔

سلطنتِ خداداد میسور اور سلطانِ ٹیپو کے ساتھ غداری کرنے والے ملک حراموں میں میر صادق میر غلام علی سنگھ اور بدر الزماں نائٹ کے بعد چوتھے نمبر پر دو نام آتے ہیں:

۱۔ میر معین الدین

۲۔ میر قمر الدین

تمام انگریز تواریخ میں میر معین الدین کا نام "سید صاحب" لکھا گیا ہے اور بہ ایمان فروش اس نام سے مشہور تھا۔

سید صاحب جس نے ملک و قوم اور سلطان سے غداری کر کے "سیدوں" کا نام بھی ڈبو دیا، یہ پہلے کرناٹک کی فوج میں ایک معمولی عہدے پر تھا۔ پھر جب نواب حیدر علی نے کرناٹک پر قبضہ کیا تو یہ نواب حیدر علی کی ملازمت میں آ گیا۔

تو رخصت نہیں لکھتا ہے:

نواب حیدر علی خاں کے زمانے میں میر معین الدین نے حیدر علی سے غداری کی تھی اور گرم کٹہہ کی جاگیر اپنے نام لکھوا لی تھی۔ گرم کٹہہ کی جاگیر دراصل حیدر علی خاں کی جاگیر تھی جو نواب بسالت جنگ (دکن) نے اس وقت

حیدر علی کو دی تھی جب انہیں صوبہ سرکا صوبیدار بنایا گیا تھا۔  
لیکن وہ کس نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے کہ:

"گرم کٹہہ کی جاگیر سلطنتِ مغلیہ کے زمانہ سے میر علی رضا کے خاندان میں چلی آ رہی تھی۔ میر علی رضا کی ہمیشہ سے حیدر علی خاں نے شادی کی تھی جب میر علی رضا کی محمود بندر میں وفات ہو گئی تو یہ جاگیر سلطنتِ خداداد میں شامل کر لی گئی۔"

اصل بات یہ تھی کہ گرم کٹہہ ایک نہایت مضبوط قلعہ تھا۔ جنگی نقطہ نظر اور اپنے علی وقوع کے لحاظ سے یہ قلعہ میسور اور پائیں گھاٹ کی کبھی کبھار جاتا تھا۔ گویا جس کے پاس گرم کٹہہ کا قلعہ ہو وہ میسور اور پائیں گھاٹ پر دباؤ ڈال سکتا تھا۔

میر معین الدین اس قلعہ کی اہمیت سے واقف تھا اور وہ اپنی ایک الگ حکومت قائم کرنا چاہتا تھا۔ اسی لیے اس نے مرہٹوں سے مارش کر کے گرم کٹہہ کی جاگیر اپنے نام لکھوا لی تھی۔ میسور کی چوتھی جنگ میں بھی میر معین الدین نے اسی جاگیر کے حصول کے لیے سلطان سے غداری کی تھی۔

حیدر علی خاں نے میر معین الدین کو غداری کے باوجود معاف کر کے اس کے عہدہ پر بحال کر دیا تھا پھر میسور کی تیسری جنگ میں میر معین الدین نے بڑی وفاداری اور بہادری دکھائی۔ اسی وفاداری کی بنا پر سلطان نے اسے سپہ سالار بنا دیا۔ اور ۱۷۹۵ء میں سلطان نے اس کی دختر خدیجہ زبانی بیگم سے عقد کیا تھا اس بیگم سے ۱۷۹۷ء میں ایک بچہ پیدا ہوا مگر چند ہی دن بعد زچہ و بچہ دونوں انتقال کر گئے۔

میسور کی تیسری جنگ میں انگریزوں کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سلطان کے وفادار کون ہیں اور غدار کون ہیں۔ چنانچہ میسور کی چوتھی جنگ کے موقع پر انگریزوں نے سلطان کے تمام وفاداروں پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیے تھے۔

انگریزوں کو یہ بھی علم ہو گیا تھا کہ میر معین الدین کے علاوہ میر قمر الدین بھی گرم کٹہہ کی جاگیر رکھتا تھا۔ خواہش مند ہے۔ پس۔ مکار ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان دونوں کو الگ الگ اس بات کا یقین دلایا کہ سلطنتِ خداداد کے خاتمہ پر گرم کٹہہ اسے دیا جائے گا۔

اس فریب کے تحت ہی دونوں "میر" سلطان کے خلاف میسور کی چوتھی جنگ میں سرگرم عمل نظر آتے ہیں۔

میر قمر الدین نے غدار کے صلہ میں گرم کٹڈہ کی جاگیر حاصل کر لی مگر میر معین الدین اپنے آقاؤں ہی کے ہاتھوں گتے کی موت مارا گیا۔

میر معین الدین نے مالوہلی (گلشن آباد) کے میدان میں سلطان فوج کو انگریزی توپ خانے کی زد پر لگا کر سلطان کے ساتھ غدار کی کاثبت دیا تھا۔ اس کے بعد پھر جب ایک اور غدار میر قاسم نے جرنل ہارس کی فوج کو جنوب مغربی گوشہ میں ایک گھنے باغ کی آڑ میں ٹھہرایا تھا تو اس وقت اس گوشہ کی مدافعت میر معین الدین کے سپرد ہوئی تھی۔

غدار میر قاسم قلعہ کے اس گوشہ کی کمزوری سے واقف تھا کیونکہ ایک زمانے میں وہ قلعہ دار رہ چکا تھا۔

میر معین الدین نے اس گوشہ قلعہ کی مدافعت کی ہی نہیں اس نے یہاں سے سلطان کے دغا دار سپہ سالار سید غفار کو ہٹایا۔ پھر فوج کو تنخواہ لینے کے بہانے فیصل سے نیچے بھیج دیا اور اپنی کینہہ طبع کاثبت دیتے ہوئے جھنڈیوں کے ذریعے انگریزوں کو میدان صاف ہونے کی اطلاع دیدی اور انگریز فوج بغیر کسی مزاحمت کے قلعہ میں داخل ہو گئی۔

میر معین الدین نے ہی دغا دار ملک و ملت سپہ دار سید غفار کے سر پر سبز چھتری لگا کر انگریزوں کو اس جانبازی نشانہ دہی کی تھی جس پر انگریزوں نے اس جو اند کو گولیوں سے بھون ڈالا تھا۔

قلعہ پر انگریزوں کے قبضہ کے دوران افغان تفری کے عالم میں میر معین الدین انگریزوں ہی کے ہاتھوں سخت زخمی ہوا۔ مہر ڈلاس اور مہر آسن نے اسے پاکی میں ڈلوایا مگر بھولانے کی کوشش کی مگر وہ وہیں دم توڑ گیا۔

دوسرے دن مہر آسن اس کے بھائی کے ہمراہ اس کے گھر گیا۔ اس کی حویلی بڑی ناگفتہ بہ حالت میں تھی کیونکہ اسے ٹوٹ کر برباد کر دیا گیا تھا۔ لوٹنے والوں نے غورتوں اور بچوں سے بھی بڑی بدسلوکی کا مظاہرہ کیا تھا۔

میر معین الدین کی لاش ایک ہمسائے کے گھر پڑی تھی اور اس کے پاس میر معین الدین کا آٹھ سالہ بچہ بیٹھا رو رہا تھا۔

لاش کو دہان سے اٹھوا کر اکاٹ باغ کے احاطہ میں دفن کیا گیا اور قبر کو توہن سے بچانے کے لیے

یہ مشہور کر دیا گیا کہ یہ کسی پیر کی قبر ہے۔

اس طرح یہ غدار گرم کٹڈہ کی جاگیر حاصل کرنے کی خواہش دل ہی میں لیے ہوئے تیر خاک پہنچ گیا۔

میر معین الدین کی قبر کے تعویذ کو سبز رنگ سے رنگا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے یہ قبر سید کی ہے قبر کے چاروں طرف ایک مختصر سی چار دیواری اور سائبان ہے۔ سائبان کی کمارت معمول اور شکستہ ہے۔ یہ قبر اسی غدار کی ہونے کاثبت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ یہ اسی جگہ واقع ہے جہاں اس کی کوٹھی تھی۔ مہر آسن کی تحریر بھی اس کاثبت پیش کرتی ہے۔

میر معین الدین اور میر قمر الدین، دونوں غدار آپس میں رشتہ دار بھی تھے۔



یہاں تک کہ یہ دونوں آدمی یعنی میر قمر الدین اور میر معین الدین آپس میں رشتہ دار بھی تھے؟  
یہ چیز ہمیں معیوب معلوم ہوتی ہے لیکن انگریزوں سے اسے ایک سیاسی چال قرار دیتی ہے۔ انگریزوں  
نے مختلف اوقات میں اس قسم کی حرکات کی ہیں۔ موجودہ دور میں فلسطین کے معاملہ میں بھی انگریزوں نے  
اسی پالیسی نہ کی بلکہ یہ کام ظاہر کیا ہے کہ ایک طرف انہوں نے فلسطین عربوں کو دینے کا وعدہ کیا تھا اور دوسری  
طرف یہودیوں سے بھی یہی وعدہ کر رکھا تھا۔ پھر وقت آنے پر فلسطین یہودیوں کو دے دیا گیا اور عرب  
منہ دیکھتے رہ گئے۔

یہاں گرم کٹہہ کی جاگیر بھی ایک دقت میں انگریزوں نے میر معین الدین اور میر قمر الدین کو دینے کا  
وعدہ بلکہ تحریری معاہدہ کیا مگر معین الدین جو کہ ۲۷ مئی کو مارا گیا اس لیے گرم کٹہہ کی جاگیر قمر الدین  
کو ملی گئی۔

قمر الدین نے فتح زر کٹہہ کے موقع پر بھی سلطان سے غدار کی کھائی اور حیدر آباد سے سلطان کے خلاف  
خط و کتابت کرتا رہا تھا جس کی رپورٹ سپر سالار برہان الدین نے سلطان کو بھیجی تھی اور قمر الدین کو چند دن کے  
لیے نظر بند بھی کر دیا گیا تھا مگر پھر بحال کر کے عافی دیدی گئی تھی۔  
کرنل وکس نے اپنی تاریخ میں میر قمر الدین کا ایک واقعہ اور بھی لکھا ہے جس سے اس کی غدار، مکاری  
اور ایمان فروشی ظاہر ہوتی ہے۔  
ایک دوسرے واقعے کے تذکرے سے میر قمر الدین کی تخت و تاج سے بے پناہ محبت اور چاہت کا  
اظہار ہوتا ہے۔  
کرنل وکس لکھتا ہے:

”جس وقت سلطان قلعہ ادھونی پر حملہ میں مصروف تھا تو اراکٹ کے مفتی  
سراج الدین محمود خاں کا انتقال ہو گیا۔ مفتی صاحب سے لوگوں کو بے حد  
عقیدت تھی اس لیے ان کا جنازہ بڑے توک و احتشام کے ساتھ مرنگا۔ ٹم  
روانہ کیا گیا مگر یہ معلوم یہ افواہ کس طرح اڑی کہ خود سلطان کا انتقال ہو گیا  
ہے اور اس کا جنازہ بڑی شان سے مرنگا گیا ہے۔  
یہ افواہ ایسی مشہور ہوئی کہ سٹرک سٹرک میں جو کھٹکتے ہیں عارضی طور پر  
گورنر تھا اس نے مدراس کے گورنر کے پاس ایک آدمی بھیجا کہ وہ سلطان  
کے جانشین کے پاس جا کر باوجود دینے کے لیے کسی خاص آدمی کو دربار میں لے کر

میر میرا خاندان کا ایک اور بڑا ٹمک حرام میر قمر الدین تھا۔  
یہ میر علی رضا کی ایک حرم کے بطن سے تھا۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو یہ سلطان کا سوتیلا  
میرا بھائی ہوتا تھا۔  
قارئین جانئے ہیں کہ سلطان کے والد حیدر علی خاں نے میر علی رضا کی بہن سے شادی کی تھی۔ یوں میر  
علی رضا سلطان کا ماموں تھا۔  
میر قمر الدین کی نظر شروع ہی سے گرم کٹہہ پر تھی بلکہ اس ایمان فروش کے حوصلے اس قدر بڑھے ہوئے  
تھے کہ وہ مملکت خدا داد کا حکمران بننا چاہتا تھا۔

اس سلسلے میں میر قمر الدین نے کوششیں بھی شروع کی تھیں۔ اس نے سلطان کی ایک بیٹی کا رشتہ بھی  
کسی کے ذریعے مانگا تھا مگر سلطان نے انکار کر دیا تھا۔  
تخت و تاج کی ہوس میں میر قمر الدین نے میر معین الدین کی طرح عیسو کی بھوتی یعنی آخری جنگ میں  
سلطان سے غدار کی اور انگریزوں سے مل گیا۔  
میر قمر الدین نے بھی گرم کٹہہ کی جاگیر اپنے نام لکھوائی تھی جبکہ یہ جاگیر انگریزوں نے میر معین الدین  
کو بھی دینے کا وعدہ کر رکھا تھا۔ اس سے انگریزوں کی بددیانتی، مکاری، دغا بازی اور عیاری پوری  
طرح ظاہر ہو جاتی ہے۔  
یہاں پر یہ سوال اٹھ سکتا ہے کہ انگریزوں نے ایک ہی جاگیر دو آدمیوں کو دینے کا وعدہ کس طرح کر

بھیجے۔ اس وقت قمر الدین کسی اور جگہ تھا۔

اسے جو معلوم ہوا کہ سلطان فوت ہو گیا ہے تو جس قدر فوج اس کے پاس تھی اور جتنی وہ حاصل کر سکتا تھا، اسے لے کر مرزا کا پٹم پہنچ گیا۔ سلطان نے اس کی بغاوت کو بڑی مشکل سے فرو کیا تھا اور دو سال کے لیے قمر الدین کو نظر بند کر دیا تھا۔

میسور کے اہمان فروشتوں اور نمک حراموں میں ایک اور بڑا نام میر قاسم علی بن بشیر نور الدین کا ہے۔ یہ بھی میر صادق اور میر سنگٹے کی طرح عجیب الفل سید زادہ تھا۔ اس کی تمام زندگی سلطان کی خدمت میں گزری تھی۔ اسی کا وطن حیدر آباد کی سرحد پر تھا۔

ایک دفعہ میر قاسم نے سلطان سے گھر جانے کی اجازت مانگی۔ سلطان نے اجازت دے دی اور یہ وطن روانہ ہوا۔ اس کی روانگی کے فوراً بعد پورنیا اور میر صادق نے سلطان سے شکایت کی کہ میر قاسم بہت ماسرکاری مال اپنے ساتھ لے جا رہا ہے۔

اسی اطلاع پر سلطان نے میر قاسم کو معسومانہ کے واپس لانے کا حکم دیا۔ چنانچہ اسے پکڑ کر واپس لایا گیا۔ اس کے ساتھ مختصر سامان تھا۔

سلطان کے حکم سے میر قاسم کے سامان کی تلاشی لی گئی مگر اس کے پاس سے کوئی مسرکاری مال برآمد نہ ہوا۔ سلطان نے اسے دوبارہ وطن جانے کی اجازت دیدی۔

ایک روایت یہ بھی ہے کہ پورنیا اور میر صادق نے سلطان سے میر قاسم کی جھوٹی شکایت کی تھی۔ اصل وجہ یہ تھی کہ میر قاسم اس وقت تک سلطان کے وفاداروں میں سے تھا۔ پورنیا اور میر صادق اپنی چال بازیوں سے سلطان کے تمام وفاداروں کو سلطان کے خلاف کرنے جارہے تھے۔

میر قاسم کی شکایت اس وجہ سے کی گئی تھی کہ سلطان اسے گرفتار کر کے دربار میں بلوائے گا اور دربار میں سب کے سامنے اس کی تلاشی ہوگی۔ ایک امیر کے لیے یہ بڑی سبکی اور بدنامی کی بات تھی اور یہی پورنیا میر صادق کا مقصد تھا۔

سلطان نے میر قاسم کو تلاشی کے بعد جانے دیا مگر وہ کم ظرف تھا۔ وہ اسی وقت سے سلطان کے

خلاف ہو گیا اور انتقام کے بہانے ڈھونڈنے لگا۔

میر قاسم جب وطن سے واپس آیا تو سلطان نے اسے مٹھان کرنے کے لیے مرزا کا پٹم کا قلعہ بنا دیا۔ چند برسوں کے بعد میر قاسم نے پھر وطن جانے کی اجازت مانگی اور یہ درخواست بھی کی کہ اب اسے ملازمت سے سبکدوش کر دیا جائے تاکہ وہ اپنے آخری ایام اپنے وطن میں گزارے۔

یہ ۱۷۹۸ء کے آخری ایام تھے۔

نیک دل سلطان نے میر قاسم کو نہ صرف جانے کی اجازت دی بلکہ اس کا اعزاز بڑھانے کے لیے ایک دن دربار عام میں میر قاسم کو مخاطب کر کے کہا:

”تم نے اپنے سلطان کی وفاداری سے خدمت کی ہے۔ اس لیے تمہارا سلطان تمہیں اجازت دیتا ہے کہ تم اپنے وطن جا کر آرام سے زندگی کے بقیہ دن گزارو۔

جو لوگ وفاداری سے سلطان اور سلطنت کی خدمت کرتے ہیں ان کی خدمت کے اعتراف کے طور پر ان کی قدر کو فی چلیسے اس لیے میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ سلطان کے دل میں تمہاری قدر و منزلت ہے تاکہ کہیں یہ نہ کہا جائے کہ سلطان نے تمہاری قدر نہیں کی تھی۔“

اس خطاب کے بعد سلطان نے میر قاسم کو خود اپنے دستِ خاص سے مندرجہ ذیل انعامات سے نوازا:

دو عدد زرین شالیں

ایک دوپٹہ

ایک مرصع زیور

ایک گھوڑا خاص شاہی اصطبل کا

ایک مرصع تلوار

ایک ڈھال

اس کے بعد سلطان نے فرمایا:

”تمہارا سلطان قدر وانی بھی کرتا ہے اور انعام بھی دیتا ہے۔“

میر قاسم آداب بجالایا اور خوش خوش رخصت ہوا۔

ایک بیان یہ بھی ہے کہ میر قاسم کو پورنیا اور میر صادق نے اپنے منصوبے کے تحت مرزا کا پٹم سے رخصت کر دیا تھا کیونکہ یہ وہی وقت تھا کہ جب انگریزوں اور غداروں کی سازشیں بار آور ہونے لگی

نہیں اور میر تقی کو سلطان سے اپنی توبہ کا بدلہ لینے کا موقع مل رہا تھا۔  
سلطان کے اس الطاف شاہنہ کا بدلہ اس نمک حرام نے جس طرح دیا وہ میڈوز کے اس خط سے  
صاف ظاہر ہوتا ہے۔  
وہ لکھتا ہے:

”میر تقی اپنے وطن حیدر آباد جانے کے بجائے انگریزوں سے جا کر  
ملتا ہے اور انگریز فوج کو موسمی کے محفوظ راستے سے لاکھ قلعے کے جنوب  
مغربی گوشے میں عین مقابل اس گنجان باغ میں ٹھہراتا ہے جہاں سے انگریزی  
فوج ۴ مئی ۱۷۹۹ء کو قلعہ پر حملہ آور ہوئی۔

قلعہ کا یہ پہلو سب سے کمزور تھا۔ انگریز سپہ سالار کو جس شخص نے  
اس کمزور پہلو سے مطلع کیا وہ بھی میر تقی تھا۔“

اس نمک حرام نے فقط اتنا ہی نہیں کیا بلکہ پوری ایمان فروشی کا ثبوت دیا۔ میڈوز کے چل کر اس  
کی غدار کی اس طرح تشریح کرتا ہے:

”دو پہر کا وقت تھا (۴ مئی) جب حملہ کی تیاریاں مکمل ہو چکیں تو جنرل  
بیرڈ فوج کو خندقوں سے لے کر نکلا اور دیا پار کر کے فصیل قلعہ پر چڑھا۔  
انگریز فوج میں جو سب سے آگے تھا وہ جنرل بیرڈ تھا۔ اس کی رہنمائی کے لیے  
ایک شخص اس سے بھی آگے آگے تھا اور وہ میر تقی تھا جو فصیل قلعہ پر پہرہ  
سے بھی پہلے چڑھا تھا۔“

اس سازش کا ثبوت اس بات سے بھی ملتا ہے کہ لارڈ ولزلی کو ان نمک حراموں کی کاروائی پر پورا  
پورا اعتماد اور یقین تھا کہ یہ لوگ سلطان کو ضرور دھوکہ دیں گے۔ اسی لیے اس نے جنرل ہارس کو قطعی حکم  
دیا تھا کہ:

”جب تک سرنگا پٹم پر قبضہ نہ ہو جائے صلح کی گفتگو نہ کی جائے کیونکہ  
اس شہر کے ہمارے قبضہ میں آجانے سے ہندوستان کی قسمت کا دروازہ  
ہمارے لیے کھل جائے گا۔“

پس—

جنرل ہارس نے سلطان کو صلح کے لیے جو شرائط بھیجی تھیں وہ کامل اطاعت بلکہ غلامی کے ذمے ہیں

آتی تھیں۔

اگر ہم مندرجہ بالا تحریر پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ لارڈ ولزلی کو جنگ سے پہلے ہی اس  
سازش کی کامیابی کا پورا یقین تھا۔

ہندو ذات کے ٹکڑاؤں میں یوں تو بہت سے نام شامل ہیں جنہوں نے نواب بہادر حیدر علی خاں  
اور پھر سلطان ٹیپو کے عہد میں سلطنت خداداد کو ختم کر کے میسور کے پرانے ہندو راجہ کو برسرِ اقتدار  
لانے کی کئی منظم سازشیں کیں۔

ان میں خاص خاص کھانڈے راؤ، ترمل راؤ، رنگیا اور شامیا وغیرہ شامل ہیں لیکن یہ نواب بہادر  
اور سلطان کو کوشش کے باوجود نقصان نہ پہنچا سکے۔ ان تمام لوگوں کی سازشیں پکڑی گئیں اور یہ سب  
اپنے کیفرِ کار کو پہنچے۔

لیکن— ان سب کے علاوہ ایک اور نام پورنیا کا بھی ہے:

پورنیا نے اگرچہ اپنی ترقی کے لیے بہت جدوجہد کی لیکن یہ اس قدر خطرناک سازشیں تھا کہ آخری  
وقت تک سلطان کو خریب دیتا رہا اور آخر سلطنت خداداد کا خاتمہ کرنے میں اس نے میر صادق جیسا  
ہی کردار ادا کیا۔

پورنیا، حیدر علی کے زمانے میں سرکاری ملازمت میں آیا۔ پہلے رسل در سائل کا افسرِ اعلیٰ مقرر ہوا۔  
پھر وزیرِ مالیات اور دیوان (وزیرِ اعظم) مقرر ہوا۔

وزیرِ مال ہونے کی وجہ سے اسے تمام سرکاری ٹیکوں اور ان محکموں کے افسرانِ بالا تک رسائی  
حاصل تھی اس لیے اکثر غدار اس کے اشاروں پر ناپچتے تھے۔

پورنیا نے افسردہ کورثوت دے کر سلطان کے محکمہ جاسوسی کو ناکارہ بنا دیا تھا۔ پھر آخری وقت  
میں یعنی میسور کی چوتھی جنگ کے دوران عین جنگ کے لمحات میں اس نے تنخواہ قیسم کرنے کے بدلے  
فصیل سے فوج کو جس طرح نیچے اتارا تھا اس کا حال بیان کیا جا چکا ہے۔

ماڈرن میسور کا مصنف پورنیا کا حال یوں بیان کرتا ہے:

”پورنیا ۱۷۹۶ء میں ضلع ترچنا پٹی کے موضع تردکپور میں پیدا ہوا تھا۔

اس کے باپ کا نام کرشنا چاری اور ماں کا نام کشمی امان تھا۔

پورنیا جب گیارہ سال کا ہوا تو اس کا باپ مر گیا۔ یہ بہت غریب تھا اس لیے اس کی ماں دوسروں کے گھروں میں کام کاج کرتی تھی۔ پورنیا کا ایک بڑا بھائی ونگٹا راؤ بھی تھا۔

۱۷۶۰ء میں یہ خاندان تزدکپور چھوڑ کر سختی منگلی آ گیا۔ یہاں پورنیا نے ایک بیٹے رنگیا کی ملازمت کر لی۔

رنگیا کے تعلقات مرنگا پٹم کے ایک بیٹے سے تھے جس کے تعلقات آگے شاہی محلات سے تھے۔ اس تعلق سے پورنیا اکثر مرنگا پٹم جانا آتا رہتا تھا۔ بعد میں پورنیا مرنگا پٹم کے اس بیٹے کے پاس ملازم ہو گیا۔ اب اس کی آمد و رفت شاہی محلات میں ہو گئی۔

یہاں اس کی شناسائی داروغہ محلات شاہی کرشنا راؤ سے ہوئی کرشنا نے نواب حیدر علی خاں سے سفارش کر کے اسے سرکاری ملازمت دلا دی۔ یہاں سے اس کی ترقی کا زمانہ شروع ہوا۔

حیدر علی خاں اور سلطان کی نوازشوں سے اس نے اس قدر ترقی کی کہ اس کو نوبت، نقارہ، پابکی اور عماری کے علاوہ طلائی، جیر، پکڑنے کی بھی اجازت تھی۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جس شخص کے ساتھ سلطان نے اتنی نوازشیں کیں آخر اس نے ایسی غداری، کینگی اور ننگ حرامی کا مظاہرہ کیوں کیا؟ اس سلسلے میں ماڈرن میسور میں لکھا ہے کہ:

پورنیا چونکہ ہندو تھا اس لیے میسور کی سابق رانی لکشمی نے اس سے درخواست کی کہ وہ میسور میں دوبارہ ہندو راج قائم کرنے میں اس کی مدد کرے۔ پورنیا نے رانی سے وعدہ کیا اور سلطان کے خلاف سازشوں میں شامل ہو گیا۔

مگر پورنیا بہت چلاک تھا اس لیے اس نے کھانڈے راؤ کی طرح کھل کر بغاوت نہیں کی (یعنی پوشیدہ رہ کر غداری کی)۔ اس کی اس پالیسی ہی کی وجہ سے انگریزوں نے اسے میسور کی نئی ہندو ریاست کا دیوان مقرر

کیا اور اس کے تقرر کو رانی نے فوراً قبول کر لیا۔

اس تحریر سے پتہ چلتا ہے کہ پورنیا کی غداری کس قدر گہری تھی۔ سلطان کو پورنیا پر اس آخر وقت تک اعتماد رہا اور اسے اس خداداد پر ذرا بھی شک نہ ہوا۔ میسور میں مشہور ہے کہ حیدر علی خاں نے اپنے آخری وقت میں سلطان کو ایک خط لکھا تھا جس میں تحریر تھا کہ:

”پورنیا اور میر صادق کو قتل کر دیا جائے۔“

مگر افسوس کہ سلطان نے باپ کی اس تحریر کو درخور اعتناء نہ سمجھا بلکہ اس نے ان پر اور زیادہ نوازشوں کی بارش شروع کر دی۔

اس سے سلطان کی طبیعت کے اس پہلو کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ حیدر علی کے برعکس غداروں اور ایسا فروشوں کو اخلاقی مارو سے کہ اپنا ہمنوا بنانا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں سلطان کی ہر کوشش پیٹھ ناکامی سے دوچار ہوئی۔

غلام علی لنگڑا، قمر الدین، معین الدین وغیرہ کے بارے میں سلطان کو علم تھا کہ وہ غداری کر رہے ہیں۔ بعض کو تو ایمان فروشی اور غداری کے تے ہوئے پکڑا بھی گیا لیکن سلطان نے ان کے ساتھ اعلیٰ ضرورت کا مظاہرہ کیا اور معاف کر دیا۔ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟

یہی کہ ان غداروں اور ننگ حراموں نے سلطنتِ خدا داد کا خاتمہ کر دیا۔

ماڈرن میسور کے مصنف کی مندرجہ بالا تحریر سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ پورنیا کے دماغ میں خود ہی میسور میں ہندو راج قائم کرنے کا خیال تھا اس لیے جب رانی لکشمی نے اسے اپنی سازشوں میں شریک ہونے کی دعوت دی تو پورنیا انکار نہ کر سکا۔

یہ ضرور ہے کہ پورنیا نے کسی سازش میں کھل کر حصہ نہ لیا لیکن یہ سب جانتے ہیں کہ ہندو درپردہ سازش کھلی ہوئی سازش سے بہت زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔

اس کے علاوہ یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ پورنیا کو کرشن راؤ کی سفارش سے سرکاری ملازمت ملی تھی در کرشن راؤ جب اپنی سازش میں ناکام ہو کر گرفتار ہوا تھا اور اسے قتل کرنے کے لیے لے جایا جا رہا تھا اس نے کہا تھا:

”..... میں نے جو آگ لگائی ہے وہ سلطان کے بھائے نہ بچھ سکے گی۔“

اس سے شبہ ہوتا ہے کہ کرشن راؤ کے دوسرے ساتھیوں میں پورنیا بھی شامل تھا جو اپنی چالاک کی وجہ سے پکڑا نہ جاسکا اس طرح کرشن راؤ کا یہ کہنا صحیح ثابت ہوا کہ اس کی لگائی ہوئی آگ کو سلطان نہ بجھا سکے گا۔ اسی لیے کہ کرشن راؤ کے بعد پورنیا جیسے بہت سے لوگ اس آگ کو جلانے اور ہوا دینے کے لیے موجود تھے۔

ہندوؤں کی سازش کا مرکز "سری رنگا" کا مندر تھا۔ وہاں یہ ہندو سازشی جمع ہوتے تھے ایک مصنف نے "سری رنگا" کے بت کے بارے میں کیا خوب جملہ لکھا ہے:

"اگر اس بت کے زبان ہوتی تو وہ کہہ سکتا کہ اس کے سینے میں کس قدر

راز پوشیدہ ہیں۔"

اس بات سے تو کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ سلطان اور فرانس کے درمیان جو عدنا نہ ہوا تھا اس کی نقل رانی میسور کو سونے پورنیا کے اور کوئی نہیں پہنچا سکتا تھا۔ رانی نے اس عدنا کے کی نقل اپنے ایجنٹ نزل راؤ کے ہاتھ گورنر مدراس کو بھیجی تھی جس نے انگریزوں کو سلطان کے خلاف چوکنا اور پہلے سے زیادہ ہشیار کر دیا تھا۔

پورنیا اس قدر گہرا تھا کہ اس کی سازش آخری وقت تک بے نقاب نہیں ہوتی لیکن جب سب کچھ ہو چکا ہوتا ہے اور پورنیا کو یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اب سلطنت خداداد کا خاتمہ یقینی ہے اور وہ بالکل محفوظ ہے تو پھر یہ نمک حرام علی الاعلان اپنی غداری کو ظاہر کرتا ہے اور تفصیل قلعہ میں شگاف پر اور جنوبی فصیل پر متعین فوج کو تنخواہ کے بدلے مسجد اعلیٰ کے پاس بلوایا گیا ہے اور اس طرح انگریز فوج کو قلعہ پر چڑھانے کی ہولت فراہم کرتا ہے۔

پورنیا نے کرشن راؤ کے اعلان اور اپنے شامیائی سازش کو علی جامہ پہنا کر ثابت کر دیا کہ کرشن راؤ نے ٹھیک کہا تھا کہ جو آگ اس نے لگائی ہے وہ سلطان سے نہ بجھے گی۔

پس۔

پورنیا کی گہری سازش کامیاب ہوئی اور سلطنت خداداد کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی کارکردگی کے صلہ میں پورنیا کو میسور کی نئی ہندو ریاست کا وزیر اعظم بنا دیا گیا! مورخ باسوں نے اپنی تاریخ میں لکھا ہے:

"یہ اسی سازش کا نتیجہ تھا کہ پورنیا کو میسور کا دیوان بنا دیا گیا۔"

مورخ رئیس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"جب سلطنت خداداد کا خاتمہ ہو گیا تو پورنیا کو نئی ریاست کا دیوان بنایا گیا۔

اگرچہ نزل راؤ کو رانی کی سفارش حاصل تھی مگر مڑوب نے رانی کو ایک خط لکھ کر سمجھا دیا۔ یہ خط مرہٹی زبان میں تھا اور اس پر "سری دب" کے دستخط تھے۔

ایک اور تاریخ میں مذکور ہے:

"پورنیا، حیدر علی خاں اور سلطان دونوں کی ملازمت میں رہ چکا تھا لیکن وہ بغیر کسی حرمت اور افسوس کے اب اپنے نئے ہندو آقاؤں کی ملازمت سے اس طرح غمگن ہو گیا جیسے ملک میں کوئی انقلاب ہی رونما نہیں ہوا۔"

نڈاری اور نمک حرامی خواہ ہندو میں ہو خواہ مسلمان میں ہے یہ بدترین گناہ! اس لیے جس طرح مسلمانوں میں میر صادق کا نام بطور منافق، غدار اور نمک حرام مشہور ہے اسی طرح پورنیا کا نام بھی ہندوؤں میں منافق، نمک حرام اور غدار کے طور پر مشہور ہے۔ یہاں تک کہ وہاں کی ایک علاقائی زبان میں ایک شاعر نے میر صادق اور پورنیا پر ایک نظم لکھی ہے جو ہر جگہ گراموفون پر گائی جاتی تھی۔ (واضح رہے کہ آج کل گراموفون کا رواج متروک ہو گیا ہے)۔

۴ مئی ۱۷۹۹ء کے ہنگامہ میں جو لوگ زندہ رہے ان غداروں میں خاص طور پر جو افراد قابل ذکر ہیں ان کے نام یہ ہیں:

پورنیا

قرالدین

راجہ خاں

میر غلام علی سنگرا

بدرازاں نانکھ اور

غلام علی خاں بختی!

ان غداروں کو (میسور کے پورنیا کے) کمپنی کی جانب سے شنشیں دی گئیں۔ پورنیا کو غداری کے صلہ میں



میسور کی نئی ہندو ریاست کا دیوان بنایا گیا۔ اس کے ساتھ ہی اسے کوہندو میں جاگیر بھی دی گئی جس کی سالانہ آمدنی تین لاکھ روپے تھی۔

یہ غدار سرنگاپٹم میں ۱۸۱۱ء میں مر گیا۔

پورنیا کی کوٹھی سرنگاپٹم میں اسکاٹ باغ کے جنوب مشرق میں دریائے کاویری کی جنوبی شاخ کے کنارے واقع ہے اور اس پر اس کے نام کا پتھر بھی لگا ہوا ہے۔ یہ کوٹھی آج بھی "پورنیا باغ" کے نام سے مشہور ہے۔

پورنیا کے ذکر کے ساتھ ہی تمل راڈ اور نارائن راڈ کے حالات لکھنا بھی ضروری ہیں کیونکہ یہ دونوں بھائی تینوں میں رہ کر سلطنت خداداد کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔

یہ دونوں ملگے بھاٹی تھے۔ ان میں سے تمل راڈ نے میسور کی رانی سے مدد لیا تھا کہ سلطنت کی بحالی کے بعد اسے میسور کا دیوان بنایا جائے گا لیکن انگریزوں نے پورنیا کو دیوان بنا کر نہ صرف اس کی ماری خواہشوں پر پانی پھیر دیا بلکہ ریاست میسور میں اسے قدام رکھنے سے بھی روک دیا گیا اور حکم دیا گیا کہ وہ مدراس ہی میں مقیم رہے۔

پر دہائش آف میسور میں لکھا ہے کہ:

"جب سلطان کی شہادت اور سلطنت خداداد کے زوال کی خبریں ان دونوں بھائیوں کو ملیں تو انہوں نے گاڑیوں میں بھر کر لوگوں میں شکر بانٹی تھی۔"

۴۔ مئی ۱۷۹۹ء مطابق ۲۸۔ ذیقعد ۱۲۱۳ ہجری کو جو معرکہ سرنگاپٹم میں ہوا اور جس میں سلطان فتح علی خاں پٹو نے شہادت پائی، اس معرکہ میں کام آنے والوں اور خاص خاص لوگوں کا ذکر کتاب الاعراس میں تفصیل سے دیا گیا ہے۔ اس کا کچھ حصہ تاریخین کی معلومات کے لیے ذیل میں دیا جا رہا ہے:

"بست و ہشتم ماہ ذی قعدہ ۱۲۱۳ھ بروز شنبہ در حرب نصاری  
پورش قلعہ پٹن پٹو سلطان بر حمت حتی پیوست و قریب دوازدہ ہزار  
سپاہ (بارہ ہزار ۱۲۰۰۰) خاص و عام در آں روز شہید و کشتہ شدند۔"

تاریخ

پٹو بوجہ دین محمد شہید شد

۱۲۱۳ھ

خاص خاص مرنے والوں اور شہیدوں کے نام ذیل میں دیے جا رہے ہیں:

- ۱۔ میر میراں محمد رضا خاں
- ۲۔ سید اشرف
- ۳۔ محمد حسین
- ۴۔ میر محمد صادق علی (ننگر ملت، ایمان فروش غدار)

- ۵۔ آصف سید محمد خاں
  - ۶۔ نواب حسین علی خاں شہید فرزند قطب الدین خاں
  - ۷۔ غلام حسین داروغہ نوشک خانہ
  - ۸۔ محمد یوسف داروغہ نعمت خانہ
  - ۹۔ علامہ حیدر خاں، میرزائے دفتر مسجد
  - ۱۰۔ میر میراں سید غفار شہید
  - ۱۱۔ میر خازن شیخ استغیل
  - ۱۲۔ آصف شیر خاں
  - ۱۳۔ خازن سید بدھن
  - ۱۴۔ میر نواب میر معین الدین
  - ۱۵۔ محمد براہیم عرض بگی
  - ۱۶۔ مولانا عبدالرحیم استاد دفتر مسجد
- سیددار و تپدار و نوردار سپاہی وغیرہ دوازدہ ہزار کس کشتہ شہرند  
از فرمان حق۔

اس فرست میں صرف دو ناموں کے ساتھ "شہید" لکھا ہوا ہے۔ اس میں ایک نام میر میراں سید غفار کا ہے۔

سید غفار کے بارے میں لکھا جا چکا ہے کہ یہ سلطان کے سب سے زیادہ قابل اعتماد اور وفادار  
افراد میں سے ایک تھا۔ اس کی تعیناتی ۴ مئی کو قسطنطنیہ کے شگاف اور قسطنطنیہ کے قریب اس باغ کے سامنے  
تھی جس میں ایک غدار میر قاسم نے انگریز فوج کو لاکھ چھپا دیا تھا۔  
چونکہ قلعہ کا ہی حصہ سب سے زیادہ کمزور تھا اس لیے حملہ اسی سمت سے ہونا تھا مگر میر میراں سید غفار  
کی موجودگی میں انگریز فوج کی ہمت نہ ٹھی کہ وہ قسطنطنیہ پر آسکتی۔  
چونکہ سازش تیار ہو چکی تھی اس لیے میر حسین الدین جو میر میراں سید غفار کا افسر تھا، اس نے سید غفار

سے کہا کہ وہ سلطان کے پاس جا کے انہیں مطلع کر دے کہ آج قلعہ پر حملہ ہو گا اس لیے عطا اور تیار رہیں۔  
سید غفار کو کیا پتہ تھا کہ اس کا افسر ہی ملک و ملت اور وطن سے غداری کر رہا ہے۔ وہ قسطنطنیہ کے لیے سلطان  
کی طرف روانہ ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی اجماعی فوجیں نے انگریزوں کو اشارہ کر دیا اور انگریز فوج بغیر کسی مزاحمت کے  
باغ سے نکلی، قسطنطنیہ پر پہنچی اور ادرپہر چڑھنا شروع کر دیا۔

جبکہ اس وقت سید غفار سلطان کو اطلاع دے کر واپس آیا تو انگریز فوج کو قسطنطنیہ پر چڑھتے دیکھ  
کر حیران رہ گیا۔

ابھی وہ حالات کا اندازہ بھی نہ کر پایا تھا کہ اس کے سر پر ایک مہر پھرتی بان دی گئی جو اس بات کی نشانی  
تھی کہ سید غفار اس پھرتی کے نیچے موجود ہے۔

یہ کام میر معین الدین نے کر لیا تھا۔

سید غفار کی نشان دہی ہوتے ہی اس پر انگریز فوج کی طرف سے گولیوں کی بارش شروع ہو گئی اور یہ وفادار  
اپنے ہی خون میں نہانا ہوا شہید ہو گیا۔  
اس کے ساتھ ہی انگریز فوج بے دھرمک قسطنطنیہ پر دوڑنے لگی۔

۴ مئی کی اس قیامت صغریٰ کا دو مہر شہید نواب حسین علی خاں تھا۔ یہ وفادار ۴ مئی کی صبح شہید ہوا تھا۔  
اس سے پہلے شب میں جو مال حسین علی خاں کا نکاح ہوا تھا۔ ایک شب کا دو ہما صبح ہی صبح اپنے مقام تعیناتی  
پر پہنچی۔ پھر دن کے تقریباً دس بجے اس کی لاش سلطان کے سامنے لائی گئی۔ مورچہ کی حفاظت کرتے ہوئے  
اسے گولہ لگا تھا۔

سلطان اس جوان سال اور صرف ایک شب کے دو ہما کو لاش بنا دیکھ کر آبدیدہ ہو گیا۔  
"ہمت خوان حیدری" کا مصنف لکھتا ہے کہ:

"جب نوجوان دو ہما کی لاش گھر پر لائی گئی تو اس کی ایک شب کی دھن  
کی آہ وزاری سن کر دیکھنے والوں کا کچھ بھٹکنے لگا۔ سوگوار دھن نے اپنی تمام عمر  
اسی طرح بسر کر دی۔ وہ مدت العز زندہ رہی مگر ہر دم اس کی زبان پر ہم۔ مئی  
کے واقعات رہتے تھے۔"

اب تک ہم سلطان ٹیپو کو یحیئیت ایک حکمران اور سلطان دیکھتے اور پرکھتے رہے ہیں اب آئیے سلطان شہید کو ایک انسان کے پیمانے پر جانچتے اور تولتے ہیں۔ اس میں ہم سلطان کے چہرے مہرے خدو خال، مشاغل اور عادات و اطوار کا جائزہ لیں گے۔

سلطان کی شکل و صورت کے بارے میں میجر آرن کی ایک تحریر پہلے لکھی جا چکی ہے۔ "نشانِ حیدری" کے مصنف اس کی تصدیق کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"سلطان کا رنگ گندمی تھا، ناک خدار اور آنکھیں پُر آب اور بڑی بڑی تھیں۔ چہرے کے خدو خال نہایت نازک تھے اور ہاتھ پاؤں بھی چھوٹے چھوٹے تھے۔ سلطان وارہی منڈا تھا۔ گردن پر بل پڑتے تھے۔ قد پانچ فٹ اور آٹھ انچ تھا۔"

سلطان کے خدو خال کے اس تذکرہ سے سلطان کی اس طاقت کا قطعی اندازہ نہیں ہوتا جو اس کے بازوؤں، پیٹھوں، کلائیوں اور خصوصیت سے پنجوں میں تھی۔

سلطان کی جسمانی طاقت ہی نے اسے ایک پھر پھر شکستیں شہر زور اور مہر شہسوار بنایا تھا۔ اس کی کلائیوں اور پنجوں میں یہ طاقت تھی کہ وہ شیروں اور چیتوں سے زور آزمائی کرتا تھا۔ ان درندوں کو سلطان نے پال رکھا تھا اور ان سے دروازہ زور آزمائی کرتا تھا۔

سلطان لباس بہت سادہ استعمال کرتا تھا۔ اس کا لباس شرعی ہوتا تھا۔ ٹھڈی کے نیچے ایک سفید رد مال باندھا کرتا تھا۔ کمر کی پٹی میں ایک پیش قبض اور تلوار رہتی تھی۔

گھوڑے کی سواری سلطان کو بہت پسند تھی۔ انتہائی مجبوری کی حالت میں پانکی یا کوئی دوسری سواری استعمال کرتا تھا۔

سلطان کا طرزِ کلام نہایت شیریں اور ملائم تھا۔ اس کی زبان سے کبھی کوئی سخت یا فحش کلمہ نہیں نکلتا تھا اور اکثر اس کی زبان پر یہ جملہ رہتا تھا:

"گیدڑ کی سوما لہ زندگی سے شیر کی ایک دن کی زندگی بہتر ہے۔"

سلطان عام طور پر فارسی زبان میں گفتگو کرتا تھا حالانکہ اسے کٹری اور دکنی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ چنانچہ صاحبِ حیات حیدری لکھتے ہیں:

"وہ معذور ہر ایک علم سے بہتر ضرورت بہرہ ور تھا۔ گفتگو فارسی زبان میں کیا کرتا۔ محض ایسا کہ کسی امر میں مطابق خیر الامور اور مصلحا کے اعتدال سے

باہر قدم نہ رکھتا تھا۔ ایسی مزاح و ہزل کا جس سے کسر شانِ اسلام پائی جاتی کیا امکان کہ اس پیرِ شریعت کی مجلس میں مذکور نکلا۔"

سلطان ٹیپو بغیر وحیت کا پہلا تھا۔ اس نے تمام عمر کسی کو ہاتھ اٹھا کر سلام نہیں کیا اور نہ دوسرے کو ایسے سلام کی اجازت دی۔

۱۷۹۲ء میں جب سلطان کو میسور کی تیسری جنگ میں محصور ہو کر محصور راہِ صلح کرنا پڑی اور لارڈ کارنولس کو ایک لاکھ کی رقم اور دیپے رینال کے طور پر انگریزوں کی تحویل میں دینا پڑے، اس دن سے سلطان نے ہنر پر سونا چھوڑ دیا۔ وہ فرس زمین پر ایک کھدر کا موٹا کپڑا بچھا کر موٹا تھا۔ اس نے قسم کھائی تھی کہ جب تک انگریزوں سے انتقام نہ لے لوں گا اس وقت تک چار پائی پر نہ سوؤں گا۔

سلطان شہید ہو گیا مگر اس نے دم آخر تک چار پائی سے پیٹھ نہیں لگائی۔

سلطان کو تضحیک اور تمسخر کی باتیں بالکل پسند نہ تھیں۔ کسی کو اس کے سامنے ایسی باتیں کرنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

سلطان نے ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت دیکھ کر اندازہ کر لیا تھا کہ مسلمانوں میں عجیب اور خصوصیت سے ہندوانہ خصلتیں اس قدر سرایت کر گئی ہیں اور انہوں نے غیر اسلامی رسم و رواج کو اتنا زیادہ اختیار کر لیا ہے کہ انہیں شناخت کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ جب تک یہ اپنی موجودہ حالت بدل کر زمانہ قدیم کے مسلمانوں جیسی سادگی اختیار نہیں کریں گے یہ دنیا میں ترقی نہیں کر سکتے۔

چنانچہ سلطان نے تمام تکلفات کو برطرف کر دیا اور اپنی نشست و برخاست، اسلام و آداب اور تحریر و تقریر میں ایسی سادگی اختیار کی جو آپ اپنا نمونہ بن گئی۔

سلطنتِ مغلیہ کے اثر سے درباریوں کو بادشاہ کے سامنے کئی کئی بار جھک کے بلکہ زمیں بوس ہو کے سلام پیش کرنا پڑتا تھا۔ بادشاہ کے سامنے ہاتھ باندھ کے کھڑا ہونا تو ایک عادت تھی۔ یہاں تک کہ مسجدوں کے اندر بھی امیر و مغرب کی تقریبی پیدا ہو گئی تھی اور لوگ مسجد میں داخل ہونے والے امرا اور وزرا کو تعظیم پیش کرتے تھے۔

سلطان نے اس طریقہ کو ختم کرنے کے لیے خود اپنے لیے یہ قاعدہ بنایا کہ وہ خاموشی سے سر جھکائے مسجد

۱۷ اسلام میں انشاء سے سلام کرنے کی ممانعت ہے۔ یقیناً سلطان اسی اسلامی حکم کی متابعت میں ایسا کرتا تھا۔

میں داخل ہو جاتا اور جہاں پر جگہ ملتی وہاں کھڑے ہو کر نماز پڑھ لیتا۔

سلطان کے معمولات بھی بہت سادہ مگر بے حد منظم تھے۔

سلطان علی الصبح بیدار ہوتا اور نماز فجر کے بعد کم از کم ایک گھنٹہ تلاوت کرتا۔ پھر نصف گھنٹہ نوشہہ کرتا جس جو اہل سنت و فہرہ کا معائنہ کرتا۔ اس کے بعد سیر کو جاتا۔

سیر سے واپسی پر سلطان ناشتہ کرتا۔ ناشتہ پر سلطان کے ساتھ تین چھوٹے شہزادے اور ایک غنشی ہوتا تھا۔

سلطان اکثر خطوط ناشتہ کے دوران ہی لکھتا تھا۔ اس کے ناشتہ میں زیادہ تر پھل اور دودھ ہوتا تھا۔

ناشتہ کے بعد سلطان فوج کے معائنہ کو جاتا۔

وہاں سے غارغ ہو کر محل آتا۔ اس وقت باہر سے آئے ہوئے خطوط اور رپورٹیں سلطان کے سامنے پیش کی جاتی ہیں اور اسی وقت احکامات صادر ہوتے تھے۔

رات کے کھانے پر بڑے شہزادے اور افران سلطنت ضرور موجود ہوتے تھے۔ کھانے پر فنِ تاریخ اور شعرائے کلام کا ذکر ہوتا۔

کھانے کے بعد چیل قدمی کی جاتی۔ پھر سلطان بستر پر چلا جاتا اور میندائے تک کسی نہ کسی کتاب کا مطالعہ کرتا رہتا۔

سلطان پہلے سہری اور پھر چوٹ پر سونا تھا لیکن میسور کی نیمری جنگ کے بعد جس میں سلطان کو عصور ہو کر انگریزوں سے صلح کرنا پڑی تھی اور اس کے دبیٹے انگریزوں کی تحویل میں بطور یرغمال چلے گئے تھے، تب سے سلطان نے چار پائی سے بیٹھ کر ناچھوڑ دیا تھا۔ وہ فرش پر کوئی موٹا کپڑا بچھا کر سویا کرتا تھا اور اس کا یہ معمول شہادت تک جاری رہا۔

سلطان کے روزانہ معمولات کے متعلق میسور گز بیٹر کا مصنف لکھتا ہے:

"سلطان میں صبح سے بڑا دھنپ رہتا تھا کہ وہ دن بھر بغیر آرام کیے اپنی سلطنت کے کاموں میں مصروف رہتا تھا اور ہر کام قرینہ اور باقاعدگی سے ہوتا تھا۔

سلطان روزانہ اپنے ہاتھ سے اس قدر خط و کتابت کرتا تھا کہ دیکھ کر اس کی جفا کشی اور دل و درماغ پر جھرت ہوتی تھی۔"

سلطان بہت بڑا غنشی تھا۔ طب، تجارت، معاملات مذہبی و فوجی اور بے شمار دوسرے امور میں اسے یکساں قابلیت اور درک حاصل تھی۔ اس کا ثبوت ان خطوط کو پڑھنے سے ملتا ہے جو اس نے دوسرے لوگوں کو لکھے تھے۔

زوالِ سلطنت خداداد کے بعد سلطان کا ذاتی کتب خانہ کرنل کرک میٹرک کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ وہ اپنی کتاب کے دیباچہ میں سلطان کی علمی قابلیت کے بارے میں اس طرح رقم طراز ہے:

"سلطان کی تحریر دوسری تحریروں سے بالکل متمیز تھی۔ تحریر مختصر مگر اس قدر پر معنی ہوتی تھی کہ ایک ایک لفظ سے نئی کئی معنی نکلتے تھے۔ اس کی تحریر کا خاص وصف یہ تھا کہ وہ ایک ہی نظر میں پہچانی جاتی تھی کہ یہ سلطان کے قلم سے نکلی ہے الفاظ میں حکم پایا جاتا تھا۔"

آر۔ ایچ۔ کیمل لکھتا ہے:

"سلطان نہایت آسانی سے نظم و نثر لکھتا تھا اور اس کے مضمون میں ایک خاص شان پائی جاتی تھی۔ اس نے کبھی کسی کو سلام نہیں کیا اور نہ کسی سے سلام قبول کیا۔"

کتاب "تحفۃ المجاہدین" اور دوسری کئی کتب جیسے وقائع منازل، احکام نامہ و دیگر سلطان کی خاص نگارانی میں لکھی گئیں۔ ان میں بہت سے مضامین اور اشعار خود سلطان کے تصنیف کردہ ہیں۔

سلطان اپنے فرامین اور دوسری تحریروں پر، جو منشیوں کے ہاتھ کی لکھی ہوتی تھیں، لکھا کر آغاز و ابتداء پر اپنے ہاتھ سے "بسم اللہ الرحمن الرحیم" اپنے قلم سے لکھتا اور اختتام عبارت پر اپنے دستخط ثبت کر دیتا تھا تاکہ اس میں کسی قسم کا اضافہ نہ ہو سکے۔

کتاب "تحفۃ المجاہدین" (فتح المجاہدین) میں فارسی اور اردو آیات اور احکام ہیں۔ کتاب میں مصنف کا نام ہے:

"میرزین العابدین شومسری۔"

مگر مصنف خود اقرار کرتا ہے کہ کتاب سلطان کی زیر نگرانی لکھی گئی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ سلطان کس قدر قادر الکلام شاعر اور نثر نگار تھا۔ اس سے اس کی علمی جنگی قابلیت اور فراخ دلی کا اظہار بھی ہوتا ہے۔

میرزین العابدین، حیدر آباد کے میر عالم کے بھائی اور سلطان کے میر منشی تھے۔ ان کے متعلق کوئی ثبوت

موجود نہیں کہ وہ زوال سلطنت خدا داد کی کسی سازش میں شریک رہے ہوں لیکن حیدر آباد اور میرٹھ کی سلطان کے ساتھ کھلی ہوئی دشمنی کو دیکھتے ہوئے سخت تعجب ہوتا ہے کہ سلطان نے انہیں کس طرح اس قدر اہم عہدہ دے رکھا تھا۔

سلطان کو ان پر کسی قسم کا شبہ نہیں تھا اور وہ بحیثیت ایک سچا مسلمان ہونے کے درمروں سے بھی ایسی ہی سچائی کی امید رکھتا تھا۔

سلطان کی علمیت اور علم دوستی کا نتیجہ تھا کہ اس نے مرزا گاجپٹم میں جمیع الامور کے نام سے اپنا زیر نگینی ایک یونیورسٹی قائم کی تھی۔

اس یونیورسٹی کا کتب خانہ نہایت اہم اور بیش قیمت کتب پر مشتمل تھا۔ زوال مرزا گاجپٹم کے بعد مرزا گاجپٹم میں لوٹ مار ہوئی، اس کے بعد بھی اس یونیورسٹی کے کتب خانے میں مندرجہ ذیل "تلمی کتب" موجود تھیں:

قرآن مجید	۴۴ جلدیں	تفسیر	۴ جلدیں
کتب و خلافت	۳۵ جلدیں	تسوف	۵۶ جلدیں
علم اخلاق	۲۴ جلدیں	فقہ	۹۵ جلدیں
احادیث	۴۲ جلدیں	النبات	۲۶ جلدیں
علوم و فنون (آرٹس)	۱۹ جلدیں	فلسفہ	۵۲ جلدیں
نجوم	۲۰ جلدیں	ریاضی	۷ جلدیں
حکمت (طب)	۶۲ جلدیں	تحقیق زبان	۴۵ جلدیں
فرہنگ و لغات	۲۹ جلدیں	کتب نظم	۱۹ جلدیں

ہندی اور دوسری نظم کی کتابیں	۲۳ جلدیں	ہندی اور دکنی انشاء	۴ جلدیں
ترکی نثر	۲ جلدیں	نقصن و حکایات	۱۸ جلدیں

یہ کتب خانہ ماسوائے چند کتب کے، تمام کا تمام ولایت بھیج دیا گیا۔ مرن چند کتابیں گلگتہ بھی بھیجی گئی تھیں۔

سلطان کے بارے میں میرزا اسٹوارٹ اور پروفیسر آر۔ ایس۔ گھوش لکھتے ہیں:

کتب خانہ کی ترتیب و تہذیب کے لیے ایک متمم مقرر تھا۔ سلطان کو تصنیف و تالیف کا بہت شوق تھا۔ اس کے حکم اور فرمائش سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں۔ یہ کتابیں زیادہ تر فوجی اور دیوانی معاملات پر مشتمل ہیں۔ سلطان نے اپنے فرامین کے متعدد مجموعے تیار کرائے تھے جو آج بھی یورپ کے کتب خانوں میں موجود ہیں۔

سلطان کا طریقہ یہ تھا کہ وہ جو کتاب پڑھ چکا اس پر سرٹت کر دیتا تھا۔ اس طرح اکثر کتابوں پر اس کی تہریں ثبت ہیں۔

۱۷۹۹ء میں جب سلطنت خدا داد زوال پذیر ہوئی تو مرزا گاجپٹم کا یہ کتب خانہ چھ سال تک نظر التفات سے محروم رہا اور کسی نے اس پر توجہ نہ دی۔ اس کے بعد میرزا اسٹوارٹ نے اردو، فارسی اور عربی خطوط کی ایک فہرست تیار کر لی جو ۱۸۰۸ء میں کیمبرج میں چھپ کے تیار ہوئی۔

اس کتب خانے کی جو چند کتابیں گلگتہ بھیجی گئی تھیں وہ ایشیاٹک سوسائٹی بنگال کے حوالے کر دی گئی تھیں۔

سلطانی کتب خانہ کی جو کتابیں اس سوسائٹی کے پاس ہیں ان کی تفصیل اس طرح ہے:

- ۱۔ رسالہ بدھ کا
- ۲۔ منتخب ضوابط سلطانی
- ۳۔ رسالہ بھجری
- ۴۔ ضابطہ انشاء
- ۵۔ راہ رفتن و سوارسی
- ۶۔ فتح الہما بدین (تحفۃ الہما بدین)
- ۷۔ روزنامہ وکلاٹے حیدر آباد
- ۸۔ وقائع منازل

اردو کی تمام کتابیں انڈیا میں لاٹری لندن میں ہیں۔  
بحر اسٹوارٹ نے اپنی فرست میں تمام کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے چند اہم کتابوں کا یہ ہیں:

- ۱۔ تذکرہ شعرائے ہندی مصنف: فتح علی حسین تصنیف: ۱۱۶۵ء
- ۲۔ علی نامہ مصنف: ملا نصر قی تصنیف: ۱۰۷۱ء
- ۳۔ گلشن عشق مصنف: " تصنیف: ۱۰۶۸ء
- ۴۔ کلیت قطب شاہ مصنف: قطب شاہ تصنیف: ۱۰۶۸ء

ان کتابوں کی تفصیل بہت طویل ہے اس لیے صرف نام درج کیے جا رہے ہیں:

- ۵۔ قصہ رضوان شاہ (خائن)
- ۶۔ قصہ ماہ بیکہ (خائن)
- ۷۔ قصہ بہرام گل اندام (طبعی)
- ۸۔ بھول بھن (ابن نشائی)
- ۹۔ طوطی نامہ (ابن نشائی)
- ۱۰۔ قصہ پدماوت دھنی (ابن نشائی)
- ۱۱۔ قصہ لعل و گوہر (عارف الدین خاں)
- ۱۲۔ بھوک بل (مترجم شہاب الدین)
- ۱۳۔ مفرح القلوب (مترجم حسین علی)
- ۱۴۔ دیوان سودا - قصائد سودا (مرزا سودا)
- ۱۵۔ مری گیش (ترجمہ)
- ۱۶۔ سند رکھار ہندی (ترجمہ)
- ۱۷۔ دہوری ہندی (درودیش گجراتی)
- ۱۸۔ روضۃ الشہداء (فارسی سے ترجمہ)
- ۱۹۔ رسالہ سرور دراک (مترجم سید الکبیر گجراتی)
- ۲۰۔ نشاط العشق شرح غوثیہ (ترجمہ)
- ۲۱۔ مفتاح الصلوٰۃ (مترجم فتح محمد بریلوی)
- ۲۲۔ خلاصہ سلطانی (سید امام الدین و محمد قاضی مرزا کاظم)
- ۲۳۔ کلید زبان تلنگی

ان کتب کے علاوہ دوسرے کتب خانے میں قرآن مجید کا وہ نسخہ بھی ہے جو شہنشاہ اورنگ زیب کا لکھا ہوا ہے اور سلطان ٹیپو کے زمانے سے دستیاب ہوا تھا۔ یہ قرآن شریف کا نسخہ اس وقت دس ہزار روپے ہدیہ کا تھا۔ نہایت ہی نفیس خط نسخہ میں لکھا ہوا اور عمدہ نقش و نگار سے مزین ہے۔

سلطان نے شرعی احکام کے لیے فتوے مرتب کروائے تھے۔ اس نے جمیع الامور کے نام سے جو بیوروٹی قائم کی تھی اس میں مذہبی تعلیم کے علاوہ دوسرے علوم و فنون کی بھی تعلیم دی جاتی تھی۔

سلطان کو ایسا دو اختراع کا بہت شوق تھا جتنا پچھ اس نے سینوں کے نام اجد کے حساب سے رکھے تھے۔ اس نے میسور کے تمام شہروں کے نام بھی بدل دیے تھے۔

ذیل میں دو چند نام دیے جا رہے ہیں جو سلطان نے پرانے ناموں کو تبدیل کر کے رائج کرائے تھے:

پرانہ نام	نیا نام
جیش	عسکر
بندوق	تفنگ
توپ	درخش
بان	شہاب
اشرفی	راحتی - احمدی - عدیفی
صن	فاردنی
اٹنی	باقری
دونی	کاظمی
آٹہ	آبیہ

سلطان ٹیپو، سلطان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک نہایت زائد اور متقی انسان بھی تھا۔ وہ بلا ناغہ نماز فجر کے بعد تلاوت کرتا تھا اور نماز کا اس قدر پابند تھا کہ جب مسجد اعلیٰ کا افتتاح ہوا تو سوال اٹھا کہ پہلی نماز کون پڑھا ہے؟

اس موقع پر بڑے بڑے علماء اور مشائخ موجود تھے۔ طے یہ ہوا کہ جو شخص صاحب ترتیب ہو وہ امام رہے۔

کرے مگر وہاں صاحبِ تربیت کوئی بھی نہ تھا۔

اس وقت سلطان نے کہا:

”الحمد للہ۔ میں صاحبِ تربیت ہوں۔“

اس طرح مسجدِ علی میں پہلی نماز کی امامت خود سلطان یسوی نے کی۔

ایک بار ایسا ہوا کہ سلطان نماز عید کے بعد والدہ ماجدہ کی عکسرا میں سلام کے لیے گیا۔ بعد تسلیم و نیاز کے سلطان وہیں ایک کمرے میں لیٹ گیا اور اسے نیند آ گئی۔

اس دوران نواب بہادر صید علی خاں کی دو منظور نظر کینز میں اپنے حجروں سے نکل کے سلطان کے پاس پہنچیں اور اس کے پیروانے لگیں۔

سلطان کی آنکھ کھل گئی۔ اسے کینزوں کی اس حرکت پر سخت طیش آیا۔ اسے اندازہ ہو گیا کہ کینزوں کا ارادہ کیا ہے:

وہ خوفِ خدا سے کانپ اٹھا۔

پھر اس نے ان کینزوں سے کہا:

”یہ تم نے کیا کیا۔ تم تو میری مائیں ہو۔ میں اس روسیاسی پر قیامت کے روز اپنے باپ کو کیا جواب دوں گا؟“

پھر سلطان نے ان کینزوں کو خواجہ مرا کے حوالے کیا اور حکم دیا:

”انہیں ایسی سزا دو کہ دوسروں کو عبرت ہو۔“

زنا سے سلطان کو اس قدر نفرت تھی کہ اس نے زانیوں کے لیے قتل کی سزا مقرر کی تھی۔

یہ واقعہ لکھا جا چکا ہے کہ انگریزوں سے ایک جنگ کے دوران اسے معلوم ہوا کہ پائیں گھاٹے میں چند مسلمان عورتیں انگریزوں کے ساتھ زنا کی مرتکب ہوئی ہیں۔ پس سلطان نے ان عورتوں کے قتل کا حکم دیا تھا۔

صاحبِ نشانِ حیدری لکھتے ہیں:

”سلطان اس قدر کامل الجہاد تھا کہ سوائے اس کے پیروں کے ٹخنوں اور

کلائیوں کے اس کے جسم کو کسی نے برہنہ نہ دیکھا۔ یہاں تک کہ وہ جام میں بھی

اپنے جسم کو چھلے رکھتا۔

حضرت عثمان کے بعد اس اعتبار سے دنیا میں سلطان جیسا کہ دوسری

حیرت انگیز مثال تھا۔“

سلطان کبیر شرم و جفا داری صرت اس کی ذات تک محدود نہ تھی بلکہ اس نے اس کا پرچار کیا۔ جیسا کہ اجا کیا۔ اس کے لیے قانون وضع کیا۔

ملا بار اور کرگ کی عورتیں قدیم زمانے سے مراد سینہ کھول کر باہر نکلتی تھیں اور صرف ایک غنیمت سماعتہ بند باندھتی تھیں۔

سلطان نے فرمان جاری کیا کہ کوئی عورت مراد سینہ کھول کر باہر نہ نکلے۔ اگر کسی نے فرمان کی خلاف ورزی کی تو اسے سزا دی جائے گی۔

چنانچہ۔ اس فرمان کے جاری ہوتے ہی وہاں کی عورتیں مراد سینہ پر کپڑا ڈال کر باہر نکلنے لگیں اور نہ بند بھی ملتا کہ دیا گیا۔ میسور میں چولی پہننے کا رواج بھی سلطان کے اسی فرمان کا رہنما بنتا ہے۔

رئیس نے اپنی تاریخ میں ہندو خواتین کی سلطنتِ خدا داد کے قیام سے پہلے کے حالات پر ایک طویل مقالہ لکھا ہے جس کا خلاصہ درج ذیل ہے۔

وہ لکھتا ہے:

”ہندو راج کے زمانہ میں عورتوں کی حالت حد درجہ گری ہوئی تھی۔ وہ ذلت

اور خوف سے سہمی زندگی گزارتی تھیں۔ سر بازار ان کی خرید و فروخت ہوتی تھی۔

بڑے بڑے شہروں میں سرکاری طور پر عورتوں کی فروخت کے لیے منڈیاں قائم

تھیں اور ان منڈیوں سے راجہ کو آمدنی ہوتی تھی جو ”سمایا جا را“ کہلاتی تھی۔“

سلطان نے عورتوں کی فروخت کو ممنوع قرار دے دیا اور عورت کا گھر سے بے جا دور باہر نکلتا جرم قرار دے دیا۔

انگریز مورخ مشرقی بادشاہوں کو بدنام کرتے ہیں کہ شاہی عکسراؤں میں سینکڑوں عورتوں کو بادشاہ اپنے عیش و آرام اور بدکاری کے لیے رکھتے تھے مگر سلطان کی ذات اس طرح کے کسی بھی عیب سے بالکل پاک اور مبرا تھی۔

دکس جیسا متعصب مورخ بھی سلطان کی پاک بازی کا اعتراف کرتا نظر آتا ہے۔ وہ اپنی تاریخ میں اس کے متعلق لکھتا ہے:

”سلطان کے عمل میں ایک وقت میں تین سے زیادہ بیگمات کبھی نہیں

رہیں۔ سلطان کی شادی دو خواتین سے ہوئی تھی۔ ان میں جب ایک کا انتقال

ہوا تو سلطان نے ایک اور شادی کی تھی۔ سلطان کی شہادت کے وقت اس کی کوئی بیگم زندہ نہ تھی۔

اس سے پہلے دو کینزوں کا سلطان کے بہرہ دانے کا واقعہ بیان کیا جا چکا ہے۔ اس سے بھی سلطان کی کمال حیا داری اور پاکیزگی ظاہر ہوتی ہے۔

والدین کی اطاعت گزاری میں سلطان اس درجہ برضا ہوا تھا کہ والدین خاص کردار کے ان احکامات کی بھی تعمیل کرتا تھا جو اس کے مزاج کے خلاف ہوتے تھے۔

میسور گزیٹیر نے اس کی تصدیق اس طرح کی ہے:

"سلطان کا نامیاں وصف یہ تھا کہ وہ اپنی والدہ کا مدد درجہ احترام کرتا تھا۔ ان کی نصیحت سے اس نے کبھی بے اعتنائی نہیں کی، اگرچہ بعض اوقات والدہ کی خواہشات اس کی مرضی کے بالکل خلاف ہوتی تھیں۔"

سلطان کی انسانی ہمدردی پر تو میسور کو راج بھی فخر ہے۔ شہر کے قریب چامند کی پہاڑی پر کالی دیوی کا مندر تھا۔ اس مندر میں ہندو دیوی کی خوشنودی کے لیے انسانوں کی قربانی دیتے تھے۔ یہ رسم ہندوؤں میں قدیم زمانے سے چلی آ رہی تھی مگر سلطان نے اس رسم کو "توبہ آدم" قرار دیا اور اس رسم کو قانوناً بند کر دیا۔

میسور گزیٹیر کی شائع کردہ کتاب "راہنمائے میسور" میں لکھا ہے کہ:

"اس پہاڑی کا نام کالی دیوی یا چامند کی ہے۔ ناپہر رکھا گیا تھا۔ کالی کی پوجا اس مندر میں ہوتی تھی جو پہاڑی چوٹی پر ہے۔"

زمانہ قدیم سے یہاں انسانی قربانی ہوتی تھی جو سلطنت حیدری (سلطنت خداداد) کے زمانہ میں سختی سے روک دی گئی۔"

اسی ہمدردی کے تحت سلطان نے پوری سلطنت خداداد میں سرکاری خرچ پر یتیم خانے قائم کیے۔ اس کام کی ابتدا حیدر علی خاں کے زمانہ میں ہو چکی تھی۔ سلطان نے اس میں اضافہ اور باقاعدگی پیدا کی۔

ان یتیم خانوں کے بارے میں دکنس اپنی تاریخ میں لکھتا ہے:

"سلطان نے ان یتیم خانوں میں ان بچوں کو داخل کیا جو گروگ کی بغاوت کے بعد اپنے والدین کے ساتھ امیر ہو گئے تھے۔ ان بچوں کو اسلامی تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سے سلطان کا مقصد اشاعت اسلام تھا۔ اس کے علاوہ ان

یتیم خانوں سے سلطان کی مراد یہ بھی تھی کہ جو بچے یہاں سے جوان ہو کر نکلیں وہ فوج میں بھرتی کر لیے جائیں۔

سلطان ترکی کے سلطان سلیم کی تقلید میں بنگوری فوج کی طرز پر اپنی فوج تیار کرنا چاہتا تھا۔

ترکی کے سلطان سلیم نے حکم دے رکھا تھا کہ عسائیوں سے جنگ میں جو لڑکے (بچے) گرفتار ہو کر آئیں ان کو ایک ایک جگہ رکھ کر پرورش کیا جائے۔ یہ بچے سلطان ترکی کے اپنے بچے کہلاتے تھے اور انہیں بھی بتایا جاتا کہ ان کے والدین سلطان اور ملتان ہیں۔

ان بچوں کو بہترین غذا اور عمدہ ترین سپہ گری کی تعلیم دی جاتی تھی۔ جوان ہو کر یہ بچے انتہائی بہادر اور سلطان کے سب سے زیادہ وفادار فوجی ہوتے تھے۔

سلطان نے ان کی ایک فوج قائم کی اور اس کا نام بنگوری رکھا۔ سلطان ان خاص فوجیوں سے اپنی اندرونی بغاوتوں کو ختم کرتا اور انہیں بہت خاص خاص جنگوں میں استعمال کرتا تھا۔

بنگوری فوج کے سواروں کے مردوں پر لمبی چوچ دار ٹوپیاں ہوتی تھیں اور یہ فوج دور ہی سے پہچان لی جاتی تھی۔

سلطان ترکی کی یہ فوج بہادر اور وفادار تو ضرور تھی لیکن آگے چل کر یہ اتنی خود سر ہو گئی کہ اسے مجبوراً ختم کر دیا گیا۔

سلطان شہید کی تخت نشینی سے پہلے میسور میں "غلامی" کا بھی رواج تھا۔ سلطان نے اسد اد غلامی کا ایک فرمان جاری کر کے اس برائی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔

اس حکم میں وضاحت کی گئی کہ لوگ اپنی مرضی سے دوسرے کی ملازمت اور نوکری تو اختیار کر سکتے ہیں مگر کسی کو ہمیشہ کے لیے غلام نہیں بنایا جاسکتا۔

سلطان کی رحمت کی ہزاروں داستانیں مشہور اور زبان زدِ عام ہیں۔ مرہٹوں سے جنگ کے دوران کا ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ:

سلطان کو یہ اطلاع ملی کہ سپاہیوں کی زیادتی سے خنزروہ ہو کر ایک گاؤں کی عورتوں نے دریا میں ڈوب کر اپنی جانیں دیدیں۔

سلطان یہ خبر سن کر غصے سے دیوانہ ہو گیا۔ اس نے ملزموں کو عبرت ناک سزائیں دیں تاکہ آئندہ اساد یتیم کو نہ ملے ہو۔



فوج کا ایک خاص فی سمجھے جاتے تھے۔

کرنل آر تھرڈزلی جو بعد میں ڈیوک آف ولنگٹن ہوا، لکھتا ہے:

"اس کی سوار فوج دنیا کی بہترین فوج ہے۔ ہمارے اس ملک میں داخل ہونے کے وقت سے وہ ہمارے پیچھے اس طرح لگی رہی کہ ہماری فوج میں سے ایک آدمی کا بھی کیمپ سے باہر نکلا مشکل ہو گیا تھا لیکن ہم ایک ایسے راستے سے آگے بڑھے جو بالکل غیر معروف تھا۔ اگر یہ نہ ہوتا تو میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہم بنگلور کو چھوڑ کر آگے نہ بڑھ سکتے تھے۔"

کرنل آر تھرڈزلی نے بھی اس تحریر میں صاف طور پر اعتراف کیا ہے کہ اس نے ایک غیر معروف راستہ اختیار کیا تھا اس لیے قلعہ سرنگاپٹم تک بغیر کسی مزاحمت کے پہنچ گیا۔ یہ غیر معروف راستہ اسی غدار میر قاسم کا بنایا ہوا تھا جو کہ انگریز فوج کو اس باغ ملک لے گیا تھا جس میں چھپی ہوئی فوج قلعہ سے دکھائی نہ دیتی تھی۔ اس کے بعد اسی ایمان فروزش نے اس فوج کو اس وقت بھی راستہ دکھایا تھا جب سید غفار کو میر حسین الدین نے سبز جھڑی کے پیچھے انگریز فوج کی گولیوں سے چھلنی کر دیا تھا۔

سلطان کی شکست کی وجہ اس کی جنگی قابلیت کا فقدان نہیں بلکہ اس کے امرا اور وزرا کی غداري تھی بالکل اسی طرح جس طرح عربوں کی غداري سے ترکی سلطنت اور قلا شور بازار کی بے ایمانی سے امیر امان اللہ خان کی حکومت (افغانستان) کا تختہ الٹا گیا تھا۔

جس طرح نواب حیدر علی خاں قلعہ بنانے میں مشاق تھے اسی طرح سلطان۔ ٹیپو بھی قلعہ تعمیر کرانے کے فن سے پوری طرح واقف تھا۔ اس کے بنائے ہوئے قلعے آج بھی موجود ہیں۔ اسی طرح سلطان انجیرنگ کے فن میں بھی ملاق تھا۔

کرنل ڈلزی اپنی یادداشتوں میں لکھتا ہے:

"جب ہم مل میں سلطان کے خاص کمرے میں پہنچے تو یہاں چار پائی کے

قریب میز پر آئیندس کا ایک نقشہ، چند کاغذات جن پر آئیندس کے نقشے بنے ہوئے

تھے اور پرکار وغیرہ کا ایک کبس رکھا ہوا تھا۔"

سلطان کی شجاعت اور بہادری میں تو کوئی شبہ کر ہی نہیں سکتا۔ وہ دست بدست جنگوں میں ہڈیاں خود

نثر کرے۔ ہوتا اور نقشہ زنی کے جوہر دکھاتا تھا۔

شیر کا شکار سلطان کی بہترین تفریح تھی۔ سلطان کی بہادری کا ایک واقعہ بہت مشہور ہے۔

اسی جنگ کے دوران مرہٹوں کی بہت سی عورتیں گرفتار ہو کر آئیں سلطان نے ان عورتوں کو بڑی عزت کے ساتھ الگ جیوں میں رکھا۔

اگرچہ اس وقت مرہٹوں کے ساتھ جنگ ہو رہی تھی مگر سلطان نے دوران جنگ ہی ان عورتوں کو گراں بہا تحائف دے کر سخت پرے میں مرہٹوں کے مرکز پونا بھجوا دیا۔

ایک شب میدان جنگ میں سلطان اپنے خیمے میں آرام کر رہا تھا کہ اسے کسی کے کراہنے کی آواز آئی سلطان بے چین ہو گیا۔ اٹھ کے باہر گیا اور خود حال دریافت کیا۔

معلوم ہوا کہ قیدی پیاس سے بے حال ہیں۔

سلطان نے انہیں خود پانی پلایا اور اس وقت تک خیمے کے اندر واپس نہیں گیا جب تک وہ قیدی سونیں گئے۔

سلطان ٹیپو تک وقت نمی قسم کے علوم و فنون کا ماہر تھا۔ بورنگ اپنی تاریخ میں سلطان کی صفات بیان کرتے ہوئے لکھتا ہے:

"وہ وزارت کا کام کر سکتا تھا۔ سپہ سالاری میں ملاق تھا۔ امیر البحر تھا اور

سب قسم کے علوم و فنون میں کامل مہارت رکھتا تھا۔

اس کی جنگی مہارت اور قابلیت اس حد تک بڑھی ہوئی تھی کہ جس وقت جنگی

بیڑا تیار کرنے کا حکم دیا گیا تو اس نے امیرانہم میں ہمازدوں کے نوئے تک

بیچے دیے تھے کہ ان نمونوں کے مطابق جہاز تیار کیے جائیں۔

خود کے ہنر سے کے متعلق ہدایت ہوتی تھی کہ تانبے کے بنائے جائیں

بہتر۔ ٹیپو کے لیے جنگی بھی نامزد کر دیا گیا تھا۔"

میدان جنگ میں سلطان کی قابلیت اور شہرت محتاج بیان نہیں۔ مگر اس پر اس کا مشہور دھاوا، بیللی، بریٹو واٹھ، فلورٹن اور منرو کی شکست اور دوسری لڑائیاں اس کا یقین ثبوت دیکھ کر ہی ہیں مگر ۱۷۹۹ء کی

جنگ میں میڈوز سے شکست کے متعلق ایک انگریز افسر لکھتا ہے:

"اس نے میدان جنگ میں اس قابلیت کا اظہار نہیں کیا جو حیدر علی کا طرہ

امتیاز تھا۔ اس نے سب سے بڑی غلطی یہی کی کہ اپنی سوار فوج میں نمایاں کی کر

دی اور اس کے عوض توپ خانہ کو بڑھا دیا جس کی وجہ سے میسوری کی بستی اور

چوتھی جنگ میں وہ اچانک حملے نہیں ہو پائے جو ان جنگوں سے پہلے حیدر

ایام شہزادگی میں شہزادہ بیو ایک فرانسیسی کے ساتھ جنگل میں شیر کا شکار کھینے گیا۔ یہ دونوں انتہائی مہم  
نہے کہ ایک ایک شیر مارنے آگیا۔

فرانسیسی نے فوراً اپنی بندوق سنبھالی اور چلا کہ شیر پر گولی چلائے۔ شہزادے کو اس کی یہ بات  
سخت ناگوار گزری۔ اس نے فرانسیسی سے بندوق چھین لی۔ پھر خود دو دھاری تلوار سونت کر شیر کی طرف بڑھا۔  
شیر جیت لگا کر شہزادے پر گرا۔

شہزادہ پینتر ابدل کر ایک طرف ہوا اور تلوار کا ایک ایسا ہاتھ مارا کہ شیر کی اگلی دونوں ٹانگیں قلم ہو گئیں۔  
زخمی شیر زور سے دھاڑا اور کٹی ٹانگوں کے ساتھ دوبارہ شہزادے پر چھلانگ لگادی۔  
شہزادہ اس بار بھی پینتر ابدل کر ایک طرف ہو گیا اور اس پر ایسا وار کیا کہ شیر کی پچھلی دونوں ٹانگیں  
بھی کٹ گئیں۔

اب شیر بغیر ٹانگوں کے زمین پٹا رہا تھا۔

اور . . . . فرانسیسی شکاری کا منہ حیرت سے کھلا ہوا تھا۔

سلطان کی یہی وہ مردانگی تھی کہ وہ آخری وقت تک واہ شجاعت دینا ہوا اڑتا رہا اور اس نے اپنے قول کی  
تصدیق کر دی کہ:

”شیر کا ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔“

سلطان نے کئی شیر اپنے محل میں پال رکھے تھے۔ شیر کی لڑائی، صفات اور اس کا رنگ سلطان کو اس قدر  
پسند تھا کہ اس کے محلات، اس کی تعمیر کردہ مسجد اور گنبد تمام اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔

سلطان کے تمام ہتھیاروں پر:

”اسد اللہ غالب“

کندہ تھا۔

میسور میں یہ روایت بھی زبان ذوی خاص و عام ہے کہ نواب بہادر حیدر علی خاں نے نظام الملک مسیور  
نظام علی خاں والی دکن کو پیغام بھیجا تھا کہ:

”مگر آپس میں شادیاں ہو جائیں تو آئندہ دونوں سلطنتوں میں اتحاد رہے گا۔“

اس سلسلہ میں نواب نے تجویز پیش کی کہ نظام الملک کی دختر سے سلطان ٹیپو کی شادی کر دی جائے۔

حیدر: ”دس شہزادے کی تصویر طلب کی گئی اور چند مشہور معمر حیدر آباد سے سرنگا پٹم بھیجے گئے تاکہ شہزادے  
کی تصویر بنا سکیں۔“

شہزادہ ان مصوروں کو عمل کے اسی حصے میں لے گیا جہاں اس نے اپنے شیر پال رکھے تھے۔ ایک معمر  
نے حیران ہونے پر پوچھا:

”شہزادہ بہادر۔ ان شیروں کا آپ کی تصویر سے کیا تعلق ہو گا؟“

شہزادے نے جواب دیا:

”میں ان شیروں سے کشتی لڑوں گا اور تم تصویر بناؤ گے کیونکہ مردوں کی بہترین تصویر ان کی  
جو انفرادی ہوتی ہے۔“

کاش!

شہزادے کی شادی نظام کی دختر سے ہو جاتی تو ممکن تھا کہ سرنگا پٹم اس عظیم المیہ سے دوچار نہ ہوتا جو ہم  
۱۷۹۹ء کو سلطان کی شہادت سے شروع ہوا۔

مگر — کارخانہ قدرت کے نظام پر کسی کو اختیار نہیں۔ اس وحدۃ لا شریک کے سبب ہی رنگ نرا  
اگر دینا رہے ہوتے ہیں۔

میسور گورنر کا مصنف سلطان کے اوصاف کے ذیل میں لکھتا ہے:

”اس کی سپاہیانہ زندگی، ذاتی بہادری اور بے جگری، اور ایسے وقت میں

بھی جب اس کی شکست یقینی تھی، اس کا اپنے آپ کو دشمن کے حوالے نہ کرنا۔

شجاعت اور جو انفرادی کردہ بے نظیر مثال ہے جس کے لیے وہ حد درجہ تعریف کا

مستحق ہے۔

ان لوگوں سے، جنہیں وہ اپنا دوست سمجھتا تھا، اس نے کبھی بے وفائی

نہیں کی۔

میسور کی چوتھی لڑائی میں (۱۷۹۹ء) انگریزوں کا مطالبہ تھا کہ اس کی ملازمت

میں جو چند فرانسیسی ہیں اس کے حوالے کر دیے جائیں تو اس کا تخت و تاج بچ

سکتا ہے۔

لیکن — اس کی شجاعت نے اسے گوارا نہ کیا۔“



”نیکو نیست باج وادان با کفار با قدرۃ بر جہاد“

ترجمہ:

”جہاد کی طاقت رکھتے ہوئے کافر کو خراج دینا نیکی نہیں ہے۔“

سلطان نے مسلمانوں میں جذبہ جہاد پیدا کرنے کے لیے ”مؤید المجاہدین“ کے نام سے اپنے جمعہ کے خطبات کی تدوین کا حکم دیا۔ یہی خطبات مسجدوں میں بھی پڑھے جلتے تھے۔ اس کتاب میں پچاس خطبات جمعہ اور دو خطبے عیدین کے ہیں۔

سلطان نے اس کتاب کی تصنیف کا سبب دیا پیر میں، خود اس طرح بیان کیا ہے:

”اس زمانہ میں کہ تیرھویں صدی، ہجری ہے اور اس وجہ سے سلطنت تیموریہ دہلی

پر خانہ زادوں اور ملک حراموں کی وجہ سے تباہی آگئی ہے اور ایک غیر قوم

روز بروز غلبہ پاتی ہوئی ملک پر مسلط ہوئی جا رہی ہے، خطہ ہند کے باشندے

کسب کمال سے عاری اور درس و تدریس اور احکام مذہب سے بے نیاز ہو گئے ہیں۔

اس لیے حکم سلطانی ان خطبات کی فارسی زبان میں ترویج کی جاتی ہے۔

اب تک خطبات جمعہ عربی زبان میں تھے مگر اکثریت اس زبان سے نا آشنا

ہو گئی ہے اس لیے فارسی کو موزوں سمجھا گیا۔“

ایک بڑے تعجب کی بات یہ ہے کہ سلطان اس قدر مذہبی جذبہ رکھنے کے باوجود بے انتہاء وادار اور بے تعصب فتاکشی متعصب مؤرخین نے سلطان کو بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ اس میں انگریزوں کا ایک مقصد پوشیدہ تھا۔

دراصل انگریز ہندوستان میں ”لٹراڈ اور حکومت کردہ“ کی پالیسی پر عمل پیرا تھے چنانچہ انہوں نے ایسی تواریخ مرتب کرائیں جنہیں پڑھ کر ہندو مسلمانوں کے خلاف ہو گئے۔

چونکہ انگریز اور ہندو دونوں ہی مسلمانوں کے خلاف تھے اس لیے ان کے گٹھ جوڑ سے جنوبی ہند کی تاریخ ایک خاص ڈھب سے ترتیب دے کر لکھی گئی۔ ایسی لکھی جانے والی تاریخوں میں کوئی حوالہ یا کوئی سند نہ ہوتی تھی۔

پھر یہ سلسلہ چل نکلا اور بعد میں آنے والی نسلوں میں یہی غلط تواریخ رواج پاتی گئیں ورنہ اگر ذرا سی بھی

تحقیق کر کے تاریخ لکھی جاتی تو میسور کا ذرہ ذرہ سلطان کی رواداری کا شہد تھا۔

ریاست میسور میں داخل ہوتے ہی ہمیں ہندوؤں کے مندر دکھائی دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض مندر ہزار ہزار سال سے بھی زیادہ قدیم ہیں۔

اگر سلطان ذرا بھی متعصب ہوتا تو ان مندروں اور عبادت گاہوں کو زمین بوس کر سکتا تھا لیکن اس نے تو اپنے زمانے میں ان مندروں کے لیے جاگیریں مقرر کی تھیں۔ ان جاگیروں کے کاغذات اور اس سلسلے میں سلطان کے فرامین اب بھی ان مندروں میں موجود ہیں اور ان کی بنا پر آج تک ان مندروں کو مرعات حاصل ہیں۔

ریاست کے دارالسلطنت مرنگاپٹم پر اترتے ہی سب سے پہلے نظریں دو بڑے بڑے مندروں پر پڑتی ہیں جو شیش کے بالکل قریب ہیں۔

سلطان کا محل ان مندروں کے بالکل پاس تھا۔ محل کے پیچھے بلکہ محل سے بالکل ملا ہوا ایک اور بڑا مندر ہے جگلو میں بھی محل سے بالکل متصل ایک مندر آج بھی موجود ہے۔

ان مندروں کے علاوہ مرنگی، میلور، بنجی گڑھ اور السور (بنگلور) وغیرہ میں سینکڑوں سال پرانے مندر موجود ہیں۔ سلطان نے ان سے کوئی تعزیر نہیں کیا بلکہ اپنی طرف سے ان کے اخراجات کے لیے جاگیریں عطا کیں۔ سلطان ان مندروں کے پتھروں اور ہجاریوں کی بہت عزت کرتا تھا جس کا ایک ثبوت ریاست کے آرکولوجیکل کی رپورٹوں سے بخوبی ملتا ہے۔

ایسی ہی ایک رپورٹ میں لکھا ہے:

”مرنگی کے مندر میں حیدر علی خاں اور سلطان ٹیپو کے تین تین خطوط اور

فرمان ملے ہیں۔ ان خطوط اور فرامین میں سلطان نے سن ہجری کے ساتھ ساتھ سن

(یہ سن سلطان نے ایسا جو کیا تھا) بھی استعمال ہوا ہے۔

ان میں سرخ رنگ کا کاغذ استعمال ہوا ہے اور بعض کی لوح پر سلطان کی تحریر

بھی لگی ہے۔

ان خطوط میں سلطان نے مرنگی کے گرو کا نام اور انقب پیلے لکھے ہیں اور

اپنے نام کے ساتھ کوئی خطاب یا انقب نہیں لگایا۔ ان خطوط سے میسور کی تیسری

لڑائی پر روشنی پڑتی ہے۔“

سلطان ٹیپو کی ہندوؤں کے ساتھ رواداری کی مثال ان خطوط سے ملتی ہے جو سلطان اور مرنگی مندر کے گرو نے ایک دوسرے کو لکھے تھے۔

قارئین جانتے ہیں کہ میسور کی تیسری جنگ میں انگریزوں کا نظام اور مرہٹوں کی متحدہ فوجوں نے سلطان پر حملہ کیا تھا۔ اس حملہ میں مرہٹوں کا سپہ سالار اگرچہ پر مورام تھا مگر اس نے اپنے حملے کے دوران مرہٹوں کو شکر برباد کر دیا تھا۔

چنانچہ مندر کے گردنے سلطان کو لکھا کہ:

”مرہٹی فوج نے مرہٹوں کے مندر کو لوٹ کے تباہ کر دیا ہے۔ مارزا دیوی کو اپنی جگہ سے اکھاڑ کر چھینک دیا گیا ہے۔ مندر کا سامان جس کی قیمت ۶۰ لاکھ کے قریب ہے اور مندر کے تمام ہاتھی گھوڑے جس مرہٹے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔“

گرو کے اس خط کے جواب میں سلطان نے اسے لکھا،

”ہم ان دشمنوں کو مرزا دے رہے ہیں جو ہمارے ملک پر چڑھائی کر کے ہمارے رعایا کو ستا رہے ہیں۔ اس لیے یہ آپ کا اور مندر کے دوسرے برہمنوں کا فرض ہے کہ دشمنوں کی تباہی کے لیے خدا سے دعا کریں کہ ہمارا ملک محفوظ اور رعایا خوش و خرم رہے۔“

ان لوگوں کو جو مقدس مقامات کی بے حرمتی کرنے سے باز نہیں آتے، بہت جلد انہیں اپنے کرتوتوں کا جزا بھگتنا پڑے گا۔ لوگ بدی کا کام ہنسنے ہوئے کہتے ہیں مگر جزا ہر دوتے ہوئے بھگتنا ہوگا۔ گروؤں سے دغا بازی خود اپنی نسل منقطع کرنے کے برابر ہے۔

اس خط کے ساتھ سلطان نے ایک حکیمانہ آصف کے نام بھیجا تھا جس میں حاکم علاقہ کو حکم دیا گیا تھا کہ دو سو راجسی (سوتے کی اشرفیاں) نقد اور ۲۰۰ راجسی کی اجناس گرو کی خدمت میں پیش کرنے۔ ایک دوسرے خط میں سلطان نے گرو کو تحریر کیا تھا کہ:

”آپ کو اختیار ہے کہ انعامی دیہات سے جن چیزوں کی آپ کو ضرورت ہو وہ حاصل کر لیں۔ اس رقم سے مارزا دیوی کے بٹ کو نصیب کرتے ہوئے برہمنوں کو کھانا کھلائیں اور ہمارے دشمنوں کی تباہی کے لیے دعا کریں۔ آپ کا بھیجا ہوا پراسا اور شالیں موصول ہوئیں۔“

آپ کے استعمال کے لیے ایک جوڑی شال اور دیوی کے بٹ کے لیے کپڑے ارسال کیے جاتے ہیں۔ آپ کی سواری کے لیے ایک ہاتھی روانہ کیا

جاتا ہے۔“

گرو نے سلطان سے شکایت کی تھی کہ ان کے جیلوں پر باہر جانے آنے پر سرکاری افسروں نے پابندی لگا دی ہے۔ سلطان نے اپنے ایک حکم میں اس پابندی کو فوراً منسوخ کر دیا۔

ماہ حیدری کا ریکارڈ بتاتا ہے کہ گرو نے مندر میں دو خاص رسوم ادا کرنے کے لیے سلطان کو درخواست پیش کی تھی۔ یہ رسوم مسلسل ۸ دن تک جاری رہتی تھیں۔

اس کے جواب میں سلطان نے ایک طرف تو نگہ کے آصف کو حکیمانہ بھیجا کہ وہ گرو کے پاس جا کر ان رسومات کے جملہ اشفاقات کر لے اور ہر طرح ان کی مدد کرے۔ اس کے ساتھ ہی سلطان نے گرو کو لکھا:

”آپ کی حسبِ مرضی پوجا کے دنوں میں روزانہ ایک ہزار برہمنوں کو کھانا کھلانے اور نقدی دینے کے متعلق آصف کو حکم بھیج دیا گیا ہے۔“



لہاڑی یا سنگالی نام کی ایک جنگلی قوم مرہٹوں کے مندر کے قریب واقع جنگل میں رہتی تھی۔ وہ اکثر مندر پر حملہ کر کے لوگوں کو پریشان کرتی رہتی تھی۔ اس سے محفوظ رہنے کے لیے گرو نے سلطان کو خط لکھا کہ سلطان نے فوراً سپاہیوں کا پرہ مندر کے گرد لگا دیا۔ پھر جنگلیوں کو باہر آنے یا مندر پر حملہ کرنے کی دوبارہ ہمت نہ ہوئی۔

مندر کے ایک اور ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ سلطان نے مارزا دیوی کے بٹ کے استعمال کے لیے ایک پاکی اور ایک دوسری پاکی گرو کے استعمال کے لیے بذریعہ جوہار فقیر محمد، گرو کو مرہٹوں کی بھیجی تھی۔ اس مندر کے ریکارڈ میں ایک اور خط موجود ہے جس میں سلطان نے مندر کے عامل سید محمد کو حکم دیا ہے:

”سوامی جی سمندری غسل کے لیے جانے والے ہیں۔ انہیں سفر میں تمام

ضروریات مہیا کی جائیں۔“

میسور کی تیسری جنگ میں مرہٹے اس مندر کا تمام سامان لوٹ کر لے گئے تھے۔ گرو نے سلطان سے درخواست کی کہ اسے مرہٹوں کے مرکز پونا جانے کی اجازت دی جائے تاکہ وہ خود وہاں جا کر پر مورام بھاد سے مندر کے سامان کی واپسی کے لیے گفتگو کر سکیں۔

سلطان نے فوراً ان کے جلنے کے لیے راہداری اور تمام سفری ضرورتوں کا انتظام کر دیا۔ مگر در آرام سے چڑھنے لگے۔

وہاں انہوں نے سامان کی واپسی کی بہت کوشش کی مگر انہیں کوئی کامیابی نہ ہوئی حالانکہ پونائیں انہوں نے ایک طویل عرصہ گزارا۔

مرنگری کا مندر جنوبی ہند اور میسور میں بہت منبرک خیال کیا جاتا تھا۔ اس مندر کا گرد وہاں کے راجاؤں کا راجاؤں کا رہنما تصور کیا جاتا تھا اور اسے تمام شاہی تقریبات میں مدعو کیا جاتا تھا۔

سلطان نے اپنی غیر مسلم رعایا اور ان کے مندروں کو جو مراعات دی تھیں ان کی تفصیل کے لیے الگ سے ایک کتاب کی ضرورت ہے۔ مختصر یہ کہ سلطان کے وہاں کے مندر دل کو جو تھارے اور برتن چلا کیے تھے آج بھی وہاں موجود ہیں اور اپنی زبان حال سے سلطان کی رواداری کا ثبوت پیش کرتے ہیں۔



**سلطان فیض شہید کی زندگی اور سلطنت خداداد کے عروج و زوال کی کہانی**  
اس قدر تفصیل سے بیان کرنے کے باوجود اب بھی تشنہ ادنا مکمل ہے کیونکہ سلطان کی ذات میں خداوندِ مکرم نے اس قدر صفات سمودی تھیں کہ اس کے ہر وصف کے بیان کے لیے ایک باب کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔

سلطان فیض پر اب تک جو کچھ لکھا گیا وہ اگرچہ کچھ کم نہیں مگر اس کی زندگی کے ابھی اور بہت سے ایسے گوشے ہیں جن پر لکھنے کی ضرورت ہے۔

سلطان کی ذات و صفات پر لکھنے والوں نے تو یہ لکھا ہے کہ:

’ہندوستان کی پرانی تاریخوں میں سلطان کے بارے میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ دراصل انگریزوں اور ہندوؤں کے گٹھ جوڑ سے تیار ہونے والی ایک مکمل سازش کے تحت لکھا گیا تھا جس کا مقصد سلطان کو ہندوؤں، مسلمانوں اور عالم اسلام میں بدنام کرنا تھا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ سلطان پر نہ صرف مزید تحقیق کی جائے بلکہ ہمارے دور کی تاریخوں میں غفلت یا کسی اور وجہ سے سلطان شہید کے بارے میں جو غلط بلکہ بے سرو پا باتیں لکھی گئی ہیں ان کی نشاندہی کی جائے اور انہیں تاریخوں سے حذف کرنے کا سرکاری اور غیر سرکاری طور پر انتظام ہونا چاہیے۔‘



سلطان کے حالات اور واقعات کے ذکر کے بعد یہ بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس شہر کا بھی مختصر حال بیان کیا جائے جسے سرنگا پٹم کہا جاتا ہے۔

اس شہر کو نہ صرف سلطنت خدا داد میسور کے دار السلطنت ہونے کا فخر حاصل ہے بلکہ یہ حقیقت ہے کہ یہ اپنے دور کا ایک عظیم الشان شہر تھا۔

آئیے دیکھتے ہیں کہ سرنگا پٹم،

ماضی میں کس حالت میں تھا؟

اور۔۔۔ آج کس حال میں ہے؟

اس صفحہ کے بالمقابل قلعہ سرنگا پٹم کا ایک نقشہ دیا جا رہا ہے جس میں ان تمام مقامات کی نشاندہی کی گئی ہے جہاں ۲۰ مئی ۱۹۹۱ء کو قیامت مضر کی برپا ہوئی تھی اور سلطان شیوا پنے ایمان مزدین، ننگ حرام اور خدا امرا اور وزراء کے ہاتھوں اپنے ہی خون میں نہا کر شہید ہو گیا تھا۔

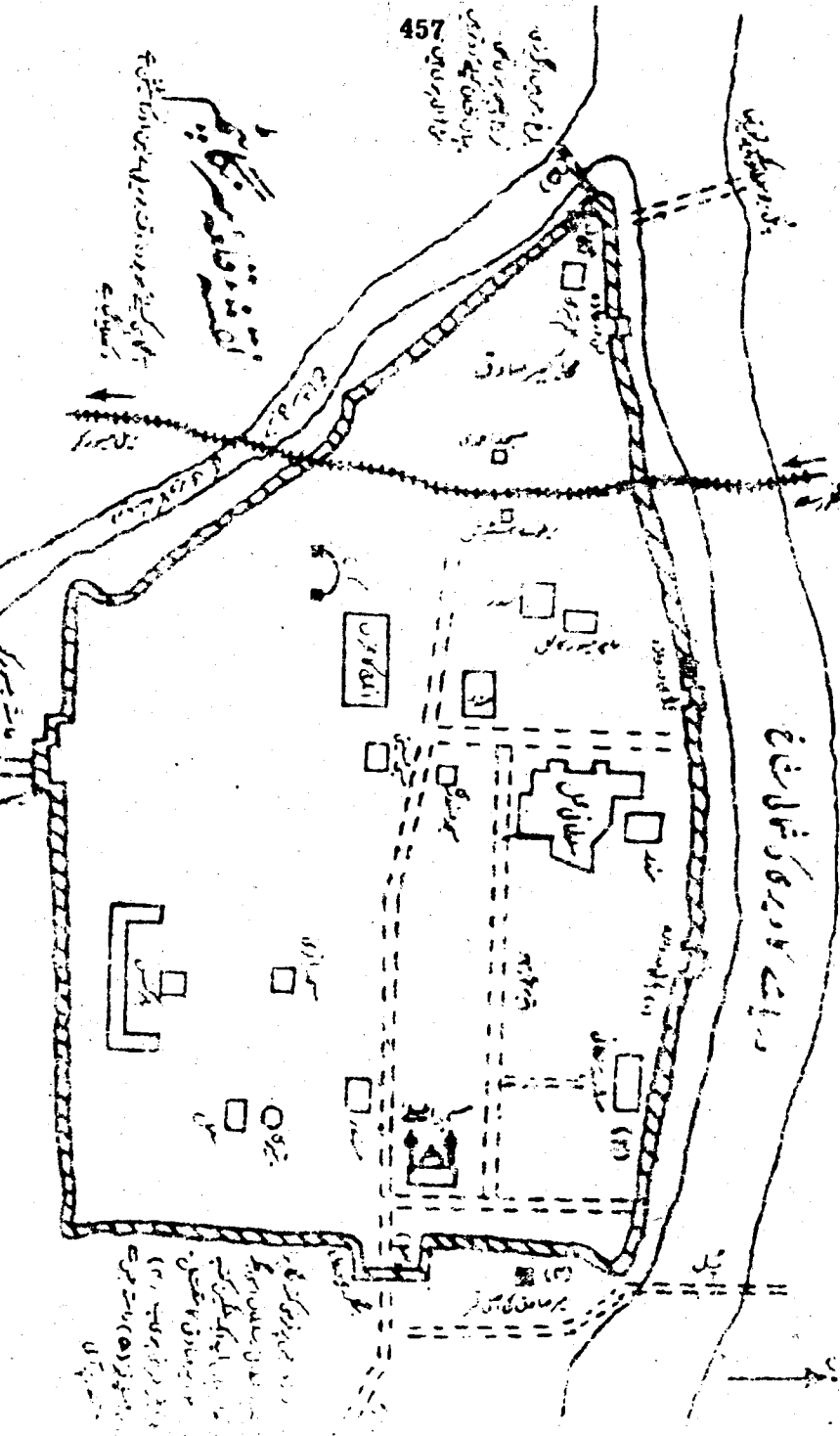
سلطنت خدا داد میسور کے دار السلطنت سرنگا پٹم کا جو حال سلطان شیوا کی زندگی میں تھا اسے اس طرح بیان کیا گیا ہے:

”شہر کار خدا داد میسور سرنگا پٹم کا نام سلطان نے ظفر آباد رکھا تھا یہ میسور کے جنوبی حصہ میں دریائے گاوری کا ایک جزیرہ ہے۔ اس کی لمبائی چار میل سے کچھ زیادہ اور چوڑائی ایک میل سے کچھ زیادہ ہے۔ اس شہر کی بنیاد نویں صدی عیسوی میں پڑی تھی۔

جنوبی ہند میں عہد قدیم میں وجیانگر کی ایک عظیم ہندو ریاست تھی۔ سرنگا پٹم کا راجہ وجیانگر کے ماتحت تھا۔ اس نے ۱۲۵۲ء میں راجہ کی اجازت سے سرنگا پٹم میں قلعہ تعمیر کرایا اور ۱۲۶۰ء میں اسے اپنی راجدھانی بنایا۔ اُس وقت سے ۱۷۹۹ء تک یہ شہر دار السلطنت ہی رہا۔

۱۷۶۱ء میں نواب حیدر علی خاں میسور کے قدیم راجہ خاندان کو معزول کر کے خود برسر اقتدار آئے۔ اس وقت سے لے کر ذوال سلطنت خدا داد یعنی ۲۰ سال تک اس شہر کو جو عروج حاصل رہا وہ تاریخ کا ایک درخشاں اور تابندہ باب ہے۔

حیدر علی خاں نے سرنگا پٹم کے پرانے قلعہ کو گرہ کر اس کی جگہ نیا قلعہ تعمیر کیا۔



حیدر علی خاں کے بعد ان کے بیٹے سلطان شیونے اس میں متعدد تبدیلیاں کیں۔ قلعہ کے اندر دوسری فصیل اور خندق بنوائی۔ انگریزوں نے اس فصیل کو گرا کر خندق پر گروادی تھی۔

زوال سے قبل ۱۷۹۲ء میں سرنگاپٹم کی جو کیفیت تھی اسے کارنوالس کاسٹان آفیسر میجر ڈیرام یوں بیان کرتے ہیں:

”اس وقت قلعہ سے لے کر لال باغ تک آبادی ہی آبادی تھی۔ اس کا مشرقی حصہ گنجام کہلاتا ہے جو ایک کچی مٹی کی دیوار سے گھرا ہے (یہ وہی گنجام ہے جہاں خدایر میر صادق کا محل تھا۔ گنجام جلتے ہوئے اسے ایک وفادار سپاہی نے آگ لگا کر دیا تھا)۔ اس کے اندر جو شہر ہے وہ برابر برابر بڑی تقسیم ہے اور ہر مربع کے چاروں طرف وسیع، فراخ اور خوش نما شہر ہیں جن کے دونوں طرف سایہ دار درخت لگے ہیں۔ اس میں وہ تاجر رہتے ہیں جو نوئی اور شہری ضروریات کے لیے ہر قسم کی اشیاء فروخت کرتے ہیں۔

گنجام سے مشرقی جانب وہ بلع ہے جو لال باغ کے نام سے موسوم ہے۔ یہ نہایت خوش نما باغ ہے اور اس میں انواع و اقسام کے پھل دار درخت لگے ہیں۔ روشوں کے دونوں طرف شمشاد کے درخت اپنا سایہ ڈال رہے ہیں۔ شہر کے مغربی جانب قلعہ کی سفید دیواریں ہیں جن کے اوپر سے قدیم مندروں اور مسجدوں کے مینار نظر آتے ہیں۔ یہ ایک بے حد دلکش منظر پیش کرتا ہے۔

قلعہ اور باغ کے درمیان فی حصہ کی گنجان آبادی کو دیکھا جائے تو یہ اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہند کا یہ عروس ابلاد اُس دور کا متمول ترین، خوبصورت ترین اور سب سے زیادہ سکون بخش خطہ زمین تھا۔

۱۸۰۴ء میں یعنی سرنگاپٹم کے زوال کے بعد ایک انگریز مورخ یہاں آیا۔ وہ لکھتا ہے:

”شہر کی آبادی ۳ لاکھ کے قریب ہے۔“

سلطنتِ خدا داد میسور کے اس خوبصورت دارالسلطنت میں داخل ہونے کے لیے دریا کا دہری پر دوپٹے ہیں۔ ایک شمالی جانب اور دوسرا جنوب میں ہے۔ شمال مغربی

سمت میں سلطان نے دہلی دروازے کے مقابل ایک پل کی بنیاد رکھی تھی جو اب بھی موجود ہے۔

قلعہ میں داخل ہونے کے لیے متعدد دروازے ہیں۔

مشرق میں بنگلوری دروازہ

جنوب میں میسوری دروازہ اور کاتھی دروازہ

شمال میں پانی دروازہ اور

شمال مغرب میں دہلی دروازہ ہے۔“

آج — اس جزیرے میں مسجدِ اعلیٰ اور باغ، مقبرہ امجد احمدی کے سوا اور کوئی چیز باقی نہیں۔ قلعہ کے اندر پٹن میں تھوڑی سی آبادی ہے۔

قلعہ کا مشرقی حصہ جو گنجام باغ کہلاتا تھا آج ویران ہے۔ اس کے قریب لال باغ تھا لیکن اس کا وجود بھی باقی نہیں رہا۔

سلطانی محلات کو ڈھا دیا گیا ہے صرف ایک ننگستہ دیوار بکتہ لگانے کے لیے چھوڑ دی گئی ہے۔ کتبہ پر حرف یہ لکھا ہے:

”یہاں سلطانی محل تھا۔“

سلطانی محل ایک عالی شان، خوبصورت مگر سادہ اور چھوٹی سی عمارت تھا۔ وسط میں ایک کشادہ اور وسیع کمرہ تھا جس میں سلطان کی رہائش تھی۔ اس کے اندر چاروں طرف ایک سنہری کانس بنی ہوئی تھی اور اس پر ایک فٹ چوڑے اور لمبے الفاظ میں آیاتِ قرآنی لکھی ہوئی تھیں۔ ان آیات پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا۔

محل کے مشرق میں مسجدِ اعلیٰ ایک چھوٹے چھوٹے محلات تھے جن میں شہزادے اور سلطان کے دوسرے عزیز بزرگ اقارب رہتے تھے۔

محل کے عین مغرب میں مریارنگا کا مندر تھا۔ ساتھ ہی راجہ کا محل تھا۔ جنوب میں محل سے ملحق ایک اور مندر ہے۔ اس طرح شمال مشرق میں ایک قدیم مندر ہے۔

سلطانی محل کے تین اطراف میں گودام تھے۔ زمانہ حصے کو جلنے والے راستے پر شیر بندے ہوتے تھے۔ محل کے اندام کے وقت بے شمار چیزیں فروخت کر دی گئیں۔ ان میں سے سنگ سیاہ کے ستون آج بھی بنگلوری جامع مسجد میں لگے ہوئے ہیں۔

سلطانی محل کے ساتھ بنگلوری دروازے سے ملحق مسجدِ اعلیٰ کی بنیاد ۱۲۰۲ھ میں رکھی گئی تھی۔ اس کے



سر بنگلہ مینار آج بھی شکوہ سلطان کو ظاہر کرتے ہیں۔

یہ وہ مسجد ہے جس کے در و دیوار پر فدا یانِ آزادی کے لہو کے پھینٹے پڑے ہوئے ہیں۔ اس عمارت کے درجے ہیں:

اوپر کے حصے میں مسجد ہے جس پر پہنچنے کے لیے دونوں طرف پختہ سیڑھیاں بنی ہیں۔ میناروں پر جانے کے لیے بھی سیڑھیاں بنی ہیں۔

سلطان کی خانہ بہنگا نہ یہیں ادا ہوتی تھی۔

سلطان مسجدِ اعلیٰ میں عمارت سے داخل نہیں ہوتا تھا تاکہ نمازیوں کے استغفران میں یا مسجد کے احترام میں کوئی فرق نہ پڑے۔

مسجد کے بڑے کمرے میں شمالی جانب ایک چھوٹا دروازہ تھا جو اب بند کر دیا گیا ہے۔ سلطان اسی دروازے سے داخل ہو کر پہلی جگہ پر فی الفور عبادت میں مشغول ہو جاتا تھا تاکہ خدا کے گھر میں تمام بندے ایک ہی صف اور ایک ہی مقام پر رہیں۔

سلطان کا دیوانِ عام دریا دولت کے نام سے مشہور ہے۔ یہ دریائے کا دیر کی شمالی شاخ سے۔۔۔ لگ بھگ کے فاصلے پر واقع ہے۔ عمارت دو منزلہ ہے۔ دو مری منزل کے ایک جھروکے میں سلطان کی نشست گاہ تھی۔ سامنے براہ راست جس میں امرا و وزراء کی نشستیں تھیں۔

دیواروں پر معنی خیز تصویریں ہیں۔ ان میں مندرجہ ذیل افراد کی تصاویر شامل ہیں:

نانا فرخزاد، مرہٹہ وزیر پونا

محمد علی والا جاہ

نظام الملک

نواب کرٹپہ

نواب شاہنور

ایک فریم میں سرنگا پٹم کا نقشہ بھی دیا گیا ہے جس پر سلطان کے دستخط کا عکس بھی ہے۔

دریا دولت باغ سے مشرقی سمت گزرتے ہوئے سلطان شہید کا مقبرہ آتا ہے جو سلطان نے خود تیار کرایا تھا۔

مقبرہ کے اندر بیری (شیر کا) رنگ کیا گیا ہے۔ اس میں تین قبریں ہیں:

۱۔ نواب حیدر علی خاں کی

۲۔ سلطان کی والدہ ماجدہ کی

۳۔ خود سلطان کی۔

مقبرہ کی عمارت سلطوت و جلال کا عبرت افزا منظر ہے۔ مقبرہ کے باہر مغربی دروازے پر چوکھٹ کے دائیں بائیں تاریخی درج ہیں۔ یہ تاریخیں سید شیخ الجعفری میر حسین علی کی لکھی ہوئی ہیں اور کہتے ہیں ۱۲۱۳ھ میں سید عبدالقادر نے بنائے تھے۔

صحن میں مسجد اقصیٰ ہے۔ اس میں بھی بیری رنگ کیا گیا ہے جو سلطان شہید کی شیروں کے ساتھ دلچسپی کا منظر ہے۔

گنجنام کے راستے میں عید گاہ کے قریب ایک مینار ہے جس پر انگریز مقتولین کے نام درج ہیں جو ۱۸۵۷ء کی جنگ میں ہلاک ہوئے تھے۔

اس کے قریب ہی تنگ وطن میر غلام علی سنگھ کی کوٹھی اور ایک مقبرہ ہے جس میں دو زمانہ قبریں ہیں اس کے مغربی جانب غدار دھمک حرام پور نیا کا باغ ہے۔

سلطان شہید کی جگہ شہادت پر ایک چوبی کھڑا ہے۔ لوگ اس جگہ بیٹھ کر ماتم کنیاں ہوتے ہیں۔ امریکی مورخ برنارڈ ڈووالی کلف نے یہیں بیٹھ کر اپنا مرتبہ لکھا تھا۔

انگریزوں نے عوام کی توجہ ہٹانے کے لیے پانی دروازہ کے قریب ایک کتبہ لگا دیا تھا کہ سلطان اس دروازے کے شمال میں شہید ہوا تھا۔ حالانکہ حقیقت میں سلطان مشرقی دروازے یعنی بنگلہ وری دروازے کے قریب شہید ہوا تھا۔

یورپ میں سلطان کی زیادہ تر باقیات و نذر سر کیبل اور برگ شاخ میں موجود ہیں جن کی تعداد ۲۳ بتائی جاتی ہے۔

ان میں اہم اشیائیں ہیں:

۱۔ سلطان کے تخت ہما کے قدموں کا ایک طلائی شیر

۲۔ جواہرات سے مزین کپڑا

۳۔ جواہرات سے مزین کلاہ

۴۔ جامنی رنگ کا چوڑا اور اسی رنگ کی ٹخلیں خود جس پر طلائی کام ہے۔

۵۔ ایک ٹوپ

۶۔ گھوڑے کا سار اور گھوڑے کا خود وغیرہ!

## حضرت علیؓ کرم اللہ وجہہ

جناب علیؓ رضی کرم اللہ وجہہ پر بہت کچھ لکھا گیا ہے اور قیامت تک لکھا جاتا رہے گا مگر معروف سیرت نگار جناب سید علیؓ آبادیؒ (رحمہم اللہ) کے غیر جانبدار اور محرک نظم نے ایک بالکل نئے اور اچھے انداز سے سیرت امیر المؤمنین کرم اللہ وجہہ کو مکمل کر کے سیرت نگاری کا حق ادا کر دیا ہے تقریباً سات سو صفحات پر مشتمل یہ سیرت ایک مقدس درس کا درجہ رکھتی ہے۔ فوراً طلب کیجئے

بڑا سا نوٹہ سفید کاغذ ہدیہ: ۱۵۰/۰۰ روپے

مکتبہ القریش سرگڑھ، چوک روڈ بازار لاہور

یہ چیزیں تو اس قیمتی سرمایے کا عشرِ عشر بھی نہیں جو سلطان کے محل سے لوٹی گئی تھیں۔ ان اشیاء کی مالیت کا اندازہ لگانا بھی دشوار ہے۔

Pakistanipoint.com

خفقہ یہ کہ جب سلطان ہی کو ان کے امرا اور وزراء نے شہید کر دیا تو اس کی باقیات کا کیا غم! یہ تو ایک کامیابی حقیقت ہے کہ مسلمان کو کبھی کسی دوسری قوم نے اس قدر نقصان نہیں پہنچایا جس قدر نقصان خود اسے اپنے ہی مسلمان ہم قوموں کی غلامیوں کی وجہ سے پہنچا۔

ان حالات کو کھتے ہوئے دل رزنا اور آنکھیں روتی ہیں:

رفیقو کیا کموں رونائیں اپنی چشم گزریاں کا  
بہیں کتنے ہی دریا گمہ نچوٹوں ہاٹ داماں کا

# (سيف الله) خالد بن ولید

خالد بن ولید (سيف الله) کے جنگی کارنامے نہ صرف اُن کی ولولہ انگیز قیادت کی وجہ سے مسلمانوں میں انتہائی مقبول ہیں بلکہ اُن کی فتوحات کو مغربی ممالک بھی بڑی دلچسپی سے پڑھتے ہیں۔

خالد بن ولید دنیا کی جنگی تاریخ میں شاید واحد سپہ سالار ہیں جس نے کسی جنگ میں بھی شکست نہیں کھائی۔ جنگ موتہ میں انہیں اس وقت سپہ سالاری دی گئی جب مسلمانوں کے تین عظیم جنرل شہید ہو چکے تھے اور صرف تین ہزار کا اسلامی لشکر وولا کھرومیوں کے گھیرے میں آیا ہوا تھا مگر وہ اپنی بے مثل شجاعت اور اعلیٰ جنگی حکمت عملی سے پورے لشکر کو رومیوں کے جنگل سے چھڑا لائے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے 'سيف الله' کا خطاب پایا۔

اپنے جانے پہچانے ناول نگار الماس ایم کے قلم سے۔ بڑا سائز، عمدہ سفید کاغذ، بہترین طباعت  
 مکتبہ القریش سرگھر روڈ چوک روڈ بازار لاہور